ہندوستانی معاشرہ عہدِ وسطیٰ میں

نیشنل بک ٹرسٹ۔ انڈیا

ہندوستانی معاشرہ عہدِ وسطیٰ میں

ترقی اردو بورڈ کی کتاب

ہندوستانی معاشرہ عہدِ وسطیٰ میں

کنور محمد اشرف

مترجم
قمرالدین

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
نئی دہلی

پیش لفظ

حکومت ہند نے اردو زبان میں کتابیں تیار اور شایع کرنے کے لیے ترقی اردو بورڈ قائم کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یونیورسٹیوں، علمی انجمنوں، مصنفوں، مترجموں، استادوں اور ناشروں کے اشتراک و تعاون سے اردو میں سائنس کی کتابیں، بچوں کی ضرورت اور دلچسپی کی کتابیں اور یونیورسٹی کی کتابیں لکھوائی اور شایع کی جائیں اور ان موضوعات پر دوسری زبانوں کی مستند کتابوں کے ترجمے شایع کیے جائیں۔ اس اسکیم کے تحت چھ سو سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف کے مختلف مراحل میں ہیں۔

زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ سوشل ویلفیر کے اہتمام میں نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی وساطت سے شایع ہو رہی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب طالب علموں، استادوں اور ان تمام حلقوں میں پسند کی جائے گی جنھیں ایک قومی زبان کی حیثیت سے اردو کے فروغ اور ترقی میں دلچسپی ہے۔

(نور الحسن)

وزیر تعلیم، حکومتِ ہند

فہرستِ مضامین

حصہ دوم۔ معاشی حالات

حصہ سوم۔ سماجی حالات

ضمیمات

عرضِ ناشر

"ہندوستان کے لوگوں کی زندگی اور معاشرت" مرحوم ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف کی لافانی تصنیف ہے۔ تاریخ کے طالب علموں کے لیے یہ کتاب کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ تیس سال سے بھی زیادہ عرصے سے یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کر رہی ہے۔ یہ کتاب اس دور میں تصنیف ہوئی جب تاریخ کا مطالعہ محض حکمرانوں کی زندگیوں اور ان کے عسکری کارناموں تک ہی محدود تھا۔ ڈاکٹر اشرف نے تاریخ کے مطالعے کے لیے بلاشبہ نئی راہیں متعین کر کے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کی ہے اور تحقیق کو نئے طریقوں سے روشناس کرایا ہے۔ اس میں ان سیاسی، معاشی اور سماجی قوتوں کے باہمی اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے جن کا وسطِ ہند کے سماج کی ترتیب میں بڑا ہاتھ رہا۔

سیاسی حالات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف رقم طراز ہے "ہندوستان کی دیہی برادریوں کی زندگی اس قدر تنگ نظری پر مبنی ہے، اس کے طبقات اس قدر جداگانہ ہیں اور مجموعی طور پر اس کا نقطۂ نظر اس قدر پیشہ ورانہ ہے کہ ملک کی سیاسی زندگی کے لیے اسے قطعی مفید قرار نہیں دیا جا سکتا۔" ان کا وجود ہندوستان کے حکمرانوں کے مطلق العنان رجحانات کی راہ میں رکاوٹ بننے کے بجائے ان کے لیے ممد و معاون ثابت ہوا۔ مصنف نے مسلمانوں کے مطلق العنان طرزِ حکومت کی بنیادوں کو تلاش کرنے کے بعد ہندوستان کے ماحول اور اسلامی معیار کی روشنی میں سلطان کے صحیح مقام کے تعین کی کوشش کی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ جب بغداد نے مرکزی حیثیت حاصل کی تو اس وقت مسلمان اسلام کے انحطاط پذیر اثرات کو بہت پیچھے چھوڑ چکے تھے اور مسلمان خلفاء صحیح معنی میں قدیم شاہانِ ایران کی نقل اور ان کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ اس نئے ماحول میں مذہب اور روحانی اکتساب کے لیے قطعاً

گنجائش نہ تھی۔ ہندوستان پر قبضے کے بعد یہاں کے زرخیز میدانوں اور دیگر وسائل نے عیش وعشرت کے لیے نئے مواقع فراہم کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت سراسر قوت کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ اس کے نظم ونسق میں جبر لازمی قرار پایا۔ شاہی خزانہ سلطان کی ذاتی ملکیت بن گیا اور عوام کی دولت اسراف اور فضول خرچی میں صرف ہونے لگی۔ ان پہلوؤں کی جانچ مصنّف نے مندرجہ ذیل عنوانات کی روشنی میں کی ہے مثلاً سلطان کی ذاتی اور سرکاری حیثیت۔ خصوصی حقوق یافتہ طبقہ اور دیگر سماجی طبقات۔ علما اور دیگر مذہبی گروہ۔

معاشی حالات کے تحت مصنّف نے پیداوار کی معاشی تنظیم میں دیہاتی برادری کی اہمیت پر زور دیا ہے جس کا خاص پہلو یہ ہے کہ یہ پیداوار خصوصاً مقامی ضرورت تک محدود تھی۔ مقابلتہً بڑے پیمانے پر چلنے والی صنعتوں کے چند مراکز بھی تھے۔ عوام کی معاشی زندگی میں انتظامیہ کے فرائض کے سلسلے میں مصنّف کا خیال ہے کہ مجموعی طور پر پیداوار کے طریقے میں کوئی خاص اصلاح۔ دولت کی جائز مساویانہ تقسیم یا مختلف سماجی طبقات کی معاشی حالت میں بہتر توازن پیدا کرنا حکومت کی حکمتِ عملی میں شامل نہ تھا، بلکہ مصنّف کے الفاظ میں "حکومت کی دل چسپی اس امر میں زیادہ تھی کہ لوگوں کی معاشی زندگی کا معیار اسی سطح پر قائم رہے۔" سماج کے معاشی ڈھانچے کا دائرہ عمل زمین کی پیداوار کی صلاحیتوں کی حد تک ہی محدود رہا۔ اس دور میں نہ کوئی معاشی انقلاب آیا اور نہ اس انقلاب کی ضرورت محسوس کی گئی۔ زمین کے اندر غیر محدود دولت مضمر تھی۔ پیداوار کے وسائل اور رقبہ کے لحاظ سے بھی زمین غیر محدود تھی اور ان سب عوامل نے انتظامی وصول یابی اور مجموعی طور پر حکمران طبقے کی بالادستی کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔

سماجی زندگی مشترکہ خاندان کے رواج پر مشتمل تھی۔ زندگی رسم ورواج کی بنیادوں پر چلتی تھی۔ اس ماحول میں ان کا ذہن جس سانچے میں ڈھلا اسی طرح کے ان کے عقائد ہو گئے۔ میلے، تیوہار اور کھیل کود، وہ گھریلو ہوں یا گھر کے باہر، ان کی زندگی کو دل چسپ بناتے اور اسی طرح ان کے سماجی رشتوں میں قریبی ربط پیدا کرتے تھے۔

مصنّف نے ان سب پہلوؤں کا تجزیہ کرکے مواد کو بڑے واضح اسلوبِ بیان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان خوبیوں نے کتاب کو بہت دل چسپ اور پراز معلومات بنا دیا ہے۔ اس کی دوبارہ اشاعت ان لوگوں کی ضرورت کو پورا کرے گی جو عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں دل چسپی رکھتے ہیں۔

دیباچہ

مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ جب زیر نظر کتاب سب سے پہلے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالے کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں پیش کی گئی اس وقت مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوگی۔ اس لیے قدرتی طور پر مجھے بڑی تسکین ہوئی جب سنہ ۱۹۳۵ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے اسے شائع کرنے کی پیش کش کی اس کے بعد ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے اس کتاب کو اپنے پوسٹ گریجویٹ نصاب تعلیم میں شامل کیا اور ہندوستان و بیرونِ ہند کے متعدد مورخین نے اسے اپنی منتخب فہرست کتابیات میں جگہ دی۔ اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ اس فیاضانہ قدر افزائی پر مجھے اپنی کم مائگی کا کتنا احساس ہے۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی کے جس شمارے میں یہ مقالہ شائع ہوا تھا، ذخیرہ ختم ہوتے ہی اس کتاب کی ضرورت کے مطالبے میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا اور متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبا نے مجھے باصرار مجبور کیا کہ میں اس کی اشاعت کا فوراً انتظام کروں اور مجھے اتنا وقت بھی نہ مل سکا کہ میں اس پر نظر ثانی یا اضافہ کر سکتا۔ بہرحال مجھے اس کا بخوبی احساس ہے اس کتاب سے جو زمانہ وسطیٰ کے ایک حصے کی سماجی زندگی کے صرف چند پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے اس ضرورت کی تکمیل کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ اس کے لیے ایک ایسے مقالے کی ضرورت ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہو اور جس میں دستاویزی شہادتیں مہیا کی گئی ہوں۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں اس عظیم کام کو پورا کرنے کی اپنے طور پر ناچیز سعی کر رہا ہوں۔ اس کی اشاعت میں یقیناً تھوڑا سا وقت لگے گا۔
میں بیگم اشرف اور کروڑی مل کالج کے اپنے ساتھی جناب نندلال گپتا کا بھی شکر گزار ہوں۔

کنور محمد اشرف

دہلی

۸ر اپریل ۱۹۵۹ء

تعارف

الف : مضمون کی وسعت

مندرجہ ذیل صفحات میں اکبر کے دور میں مغلیہ حکومت کے قیام سے پیشتر سلاطینِ دہلی کے زمانے کے ہندوستان کی سماجی حالت کے خاکے کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حدودِ مملکت اور زمانہ کا انتخاب وضاحت طلب ہے۔

حدود۔ ہندوستان

آٹھویں صدی ہجری کے عرب جغرافیہ دانوں نے ہندوستان اور چین کے بحری ساحل کے متعلق اچھی خاصی واقفیت رکھنے کے باوجود ان دونوں ممالک (ہند و چین) کا ذکر بہت مبہم الفاظ میں کیا ہے۔ سندھ کے اس پار کے ممالک کی کھوج بہت کم کی گئی تھی اور چین کے بارے میں یقین کیا جاتا تھا کہ یہ ملک سندھ کے شمال اور شمال مشرق کے ایک غیر معینہ خطے میں واقع ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں ہمالیہ کی ناقابلِ عبور دیواروں کا خیال نہیں رکھا گیا۔ درحقیقت کئی صدیاں گزر جانے کے بعد سلطان محمد تغلق کے کمایوں (قراجل) کی پہاڑیوں پر حملہ کے بارے میں تصور کیا گیا کہ یہ حملہ جزیرہ نمائے چین کے کسی حصے پر تھا۔ اسی طرح جب محمد بختیار خلجی نے شمالی بنگال یا آسام پر حملہ کیا تو دراصل اس کا خیال تھا کہ وہ ترکستان پر حملہ کر رہا ہے۔ مغربی دنیا نے ہندوستان کو سرسری طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک دریائے سندھ تک، دوسرا دریائے سندھ اور دریائے گنگا کے درمیان اور تیسرا ان دونوں علاقوں کے اس پار۔ ملکہ الزبیتھ کے زمانے تک بھی جان فریبٹن کو ہندوستان کے مغربی ساحل کے پار اور دکن کے شمالی علاقے کے بارے میں صحیح اندازہ نہ تھا کجا کہ اسے ہندوستان کے اس تیسرے علاقے کے بارے میں معلومات ہوتیں جو مالابار کے نام سے پکارا

جاتا ہے جو کچھ تک پھیلا ہوا ہے اور دریائے گنگا کا علاقہ ہے۔ اس کی معلومات صرف اس حد تک ہیں کہ وہاں دارچینی اور موتی کافی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ کہ وہاں عوام و خواص بیل کی پوجا کرتے ہیں۔(۲) ایک واضح حقیقت جوان مشاہدات سے ابھرتی ہے یہ ہے کہ دریائے سندھ اور گنگا کے میدانوں کو ایک جداگانہ جغرافیائی اکائی تصور کیا جاتا تھا، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ حصے باقی جزیرہ نما کی بہ نسبت ایک مخصوص تہذیب و تمدن کے حامل ہیں۔

شمالی اور جنوبی ہند کو قدرتی رکاوٹیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ تاریخ میں دونوں حصوں کے اتصال کے مواقع بہت کم آئے ہیں۔ یہ مواقع بھی اتنے کمزور تھے کہ دونوں حصوں کے عوام میں تہذیبی اتحاد پیدا کرنے میں بالکل غیر مؤثر ثابت ہوئے۔ مختلف ادوار میں اولوالعزم اور حوصلہ مند شہنشاہوں نے چکرورتی کی حیثیت سے ابدی شہرت حاصل کرنے کے لیے پورے ہندوستان کو ایک تاج کے نیچے متحد کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی ان شدید خواہشات کو ذرائع آمدورفت اور انتظامی مشکلات نے بارآور نہ ہونے دیا۔ سلطان محمد تغلق کا مملکتِ ہند کے لیے ایک مرکزی دارالخلافہ کا مشہور تجربہ قطعاً ناکام ثابت ہوا۔ کئی صدی بعد مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے دکن پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور اپنی عمر کا آدھا حصہ ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے میدانِ جنگ میں گزار دیا۔ آخر کار محمد تغلق کے جانشینوں کی طرح اورنگ زیب کے جانشینوں نے بھی اپنی حکومت کو شمالی مقبوضات تک ہی محدود رکھ کر دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ یہ بات تقریباً ایک تاریخی قانون کی حیثیت سے تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ہندو اور مسلم دورِ حکومت میں کسی حکومت کا شمالی ہند تک ہی قیام اس کی قوت اور مضبوطی پر دلالت کرتا تھا اور دکن کی طرف اس کی توسیع اس کی تباہی اور انتشار کا پیش خیمہ تھی۔ یہ قانون درحقیقت موجودہ زمانے کے انتظامی حالات پر لاگو نہیں ہوتا۔ ان دونوں علاقوں کے قریبی حصوں میں معمولی یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن جیسے جیسے ہم اور آگے بڑھتے ہیں بتدریج بڑھتے ہوئے اختلافات کو آسانی سے

---

(۱) ملاحظہ ہو فریبیش ص ۱۳۶
(۲) فریبیش ص ۷

دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ زبان، مذہبی فرقے، فن تعمیر، لباس، ظاہری وضع قطع، خوراک وغیرہ
سچ یہ ہے کہ سماجی زندگی کا ہر پہلو ایک دوسرے سے قطعی مختلف دکھائی دیتا ہے[1] اس
حالت میں ان دونوں علاقوں کی (جنھیں وینسنٹ اسمتھ نے بجا طور پر جغرافیائی حصے کہا ہے)
پیچیدہ اور مخصوص کہانی کا الگ الگ ترقی کرنا حیرت انگیز بات نہیں ہے[2] اس لیے ان امور
کی روشنی میں ہندوستان کے سماجی نشوونما کا مطالعہ جزیرہ نمائے ہند کے ایک جداگانہ
تہذیبی علاقے کی حیثیت سے زیادہ آسان ہوگا۔

بہرحال جب ہم ہندوستان کی تہذیبی اور ملکی حدود کا تعین کرتے ہیں تو ہمیں
کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حکومت کا مرکزی نظم و نسق، جو عام طور پر دہلی سے ہوتا
تھا، ملک کو عملاً متحد رکھنے والی واحد قوت تھی۔ اس عملداری کا علاقہ ایک شاہی خاندان
سے دوسرے خاندان تک ہی نہیں بلکہ ایک بادشاہ سے دوسرے بادشاہ تک بھی مختلف ہوتا
تھا۔ منفی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دراصل دریائے سندھ کے مغربی حصے کو ہندوستان
میں شامل نہیں سمجھا جاتا تھا کیوں کہ سلاطینِ دہلی کا اس علاقے پر کوئی موثر سیاسی تسلط
نہ تھا۔ ہاں وقتاً فوقتاً اس کے کچھ حصوں کو زیر کرنے کی کبھی کبھی کوششیں کی جاتی رہیں[3]
کشمیر بھی اسی طرح ہندوستان کے باقی حصوں سے کٹا ہوا تھا اور اس طرح بیرونی براہِ راست
اثرات سے بھی دور تھا[4]

اسی طرح گونڈوانہ، راجپوتانہ اور آسام کے علاقے بھی کم و بیش قابلِ رسائی نہ
ہونے کی وجہ سے سلاطینِ دہلی کی موثر دخل اندازی سے محفوظ رہے۔ یہ بتایا جا چکا
ہے کہ سلطنتِ دہلی کی حدود وقتاً فوقتاً ادلتی بدلتی رہیں۔ مثال کے طور پر تیمور کے

---

[1] ملاحظہ ہو ایلفنسٹن، ص ۱۸۷

[2] ملاحظہ ہو اسمتھ، جلد سوم۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سلیٹر باب اول ص ۱۳ تا ۱۴۔ دکن کی دراوڑی تہذیب کی ابتدا۔

[3] تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص ۱۲۵، سلطان ناصرالدین محمود کے ایک جنرل کا غزنی پر قبضہ

[4] کشمیر پر مغلوں کے دلچسپ مشاہدات۔ شیر شاہ کی پیشقدمی کے خلاف ایک پناہ گاہ کی حیثیت سے۔ ملاحظہ ہو اکبرنامہ، جلد اوّل ص ۱۶۹

حملہ کے بعد جب بہلول لودھی کو تختِ دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے بلایا گیا تو تقریباً
ہر شہر کا اپنا ایک حاکم تھا اور برائے نام سید حکمران کا اقتدار صرف دہلی اور اس کے
قرب و جوار کے دیہاتوں تک محدود تھا اور دہلی کے خوش طبع لوگ مزاحاً کہا کرتے
تھے "حکومتِ شاہ عالم از دہلی تا پالم" (دہلی کا ایک قریبی گاؤں[۱])۔ اس کے برخلاف سلطان
محمد تغلق کی حکومت دکن میں کافی دور تک پہنچ چکی تھی ۔ اس حد تک کہ اسے زیادہ مرکزی مقام
دیوگیر جنوب میں ہی دارالخلافہ کی غرض سے تلاش کرنا پڑا۔ مختلف سلطنتیں انھیں دو اکائیوں
کے درمیان قائم رہیں اور ان حکومتوں کے رقبے مختلف بادشاہوں کے طرزِ حکومت کے یا
ان کی تلوار کی قوت پر ہی منحصر رہے۔ اندازاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی حدود میں
کم و بیش یکساں سیاسی اثرات کے حامل حصے پنجاب، دریائے سندھ، گنگا اور جمنا کے
میدانوں، گوڑ یا لکھنوتی تک اور اودھ کا زرخیز علاقہ مع متعدد قلعوں جیسے اجمیر، بیانہ،
رنتھمبور، گوالیار اور کالنجر شامل تھے۔ اس میں ہمالیہ جہاں ہندو راجہ بغیر کسی دخل اندازی
کے حکومت کرتے تھے، شامل نہ تھے۔ اور پہاڑ کے دامن میں دوسرے علاقے جس میں کٹیہار
کا وسیع علاقہ، موجودہ روہیلکھنڈ اور اودھ کے دیگر پہاڑی علاقے بھی شامل تھے جن
کے بارے میں اس وقت تک رسائی نہیں ہوئی تھی[۲]۔ بہرحال سیاسی حدود کسی علاقے کے تہذیبی
اثرات ناپنے کا صحیح پیمانہ نہیں ہوتے کیوں کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ راجپوتانہ کے ناقابلِ عبور
علاقوں نے بھی اپنے پڑوسی علاقوں کے تہذیبی اثرات کو اپنے اندر اس حد تک جذب
کر لیا کہ ایک مغل اور ایک راجپوت کے درمیان امتیاز کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا تھا۔

زیرِ مطالعہ زمانہ (۱۲۰۰ تا ۱۵۵۰ عیسوی) نہ صرف شمالی ہند بلکہ کسی حد تک پورے
ہندوستان کے سماجی نشوونما کے مطالعے کے لیے یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ مورخین
میں تاریخ ہند کو تین زمانوں یعنی قدیم، وسطیٰ اور جدید ادوار میں تقسیم پر اتفاق رائے نہیں
ہے۔ کچھ مورخین تاریخ ہند کے عہدِ وسطیٰ کو پانی پت کی ۱۵۲۶ء کی جنگ تک متعین کرتے

۱۔ ملاحظہ ہو تاریخ داؤدی، ص ۶

۲۔ ملاحظہ ہو، سر ولزلی ہیگ کے خیالات "ہارمس ورتھ یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ"، ص ۳۱۶۸۔ نیز شیر شاہ کے
ایک لاکھ تیرہ ہزار پرگنوں (انتظامی اکائی) کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ شیر شاہی، ص ۴، ۵، ۷

ہیں۔کچھ لوگ اکبر کی آمد تک اور کچھ لوگ انگریزوں کی حکومت کے قیام تک ۔ اسی طرح مورخین عہدِ قدیم کے تعیّن کے سلسلے میں بھی متفق الرائے نہیں ہیں۔یہاں ہماری خواہش کسی ایک رائے سے بحث یا کسی ایک تقسیم کو قبول کرنے کی نہیں ہے ۔ زیادہ تر حالات میں یہ تقسیم بے بنیاد ہے اور بالکل من مانی معلوم ہوتی ہے ۔ ایک ایسے سماجی ڈھانچے کے لیے ان اصطلاحات کا استعمال کرنے سے جس میں ہزاروں سال سے کوئی اہم مادّی تبدیلی نہ ہوئی ہو تاریخی پس منظر کے واضح ہونے کے بجائے انتشار کا زیادہ امکان ہے۔ ان اصطلاحات کو تاریخ یورپ سے جس کے لیے صنعتی انقلاب ایک واضح خطِ تقسیم ہے اخذ کرنا زیادہ مناسب نہیں ہے اس لیے کہ صنعتی انقلاب نے یورپی سماج کی بنیادوں کو بدل کر رکھ دیا تھا۔اس کے برخلاف ہندوستان کے سماجی نشوونما کے زمانے، خواہ انھیں ہم کسی نام سے بھی پکاریں تاریخی دستاویزات کی روشنی میں کم و بیش یکساں خصوصیات کی حامل ہیں۔ حتیٰ کہ موجودہ زمانے تک جب کہ سماجی بنیادوں میں اساسی تبدیلی رونما ہوچکی ہے کافی حد تک وہی قدیم طریقہ باقی ہے۔

لہٰذا جب ہم مسلمانوں کی حکومت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم تاریخ ہند کے کسی نئے دور میں داخل نہیں ہوتے بلکہ اس عظیم سماجی نشوونما کی ایک منزل میں قدم رکھتے ہیں جو تاریخ ہند کی ابتدا سے جاری ہے اور جس کی ابھی تکمیل ہونا باقی ہے۔اس صورتِ حال سے بہرحال اس زمانے کی اہمیت میں یا ہندوستانی تہذیب کو اس کی دین میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ واضح کرنے کے لیے کسی تشریح کی ضرورت نہیں کہ ہندوؤں کا سماجی نظام دنیا کے مضبوط ترین اور سب سے زیادہ دیرپا نظاموں میں سے ایک ہے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ وہ اوّلین قوت جس سے ہندوؤں کو مستقل سابقہ پڑا زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں ان سے زیادہ سے زیادہ اختلاف رکھتی تھی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندوؤں کے پورے نظام کے برعکس تھی۔ مسلمانوں کے ٹکراؤ کے نتیجے کے طور پر قدیم ہندو نظام تقریباً بالکل ختم ہوگیا تھا۔ سیاسی اور سماجی تقسیم ہموار ہوگئی تھی۔ ذاتوں کی تقسیم میں جزوی تبدیلی ہوگئی تھی۔ مذہبی رجحانات نے ایک نئی سمت اور قوت حاصل کرلی تھی۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کا مجموعی طور پر ایک تصور ممکن ہوسکا اور ان حالات ہی کی روشنی میں ہم ہندوستان

کی مسلم حکومت کو ، مبہم طور پر ہی سہی سمجھنے کے قابل ہو سکے[1] مسلمانوں کی حکومت کے ابتدائی دور کا مطالعہ اس وجہ سے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کہ تہذیبِ ہند کی یہ تعمیری قوتیں اس زمانے میں اثر انداز ہوئیں اور اگرچہ یہ طاقتیں کسی حد تک نامکمل اور غیر مہذب ڈھنگ سے اثرانداز ہوئیں پھر بھی یہ قوتیں ایک ایسی مضبوط بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوگئیں جن پر آئندہ زمانے میں مغلوں نے اپنی شاندار عمارت تعمیر کی۔ اکبر کے زمانے تک جیسا کہ آئندہ صفحات سے اجمالی طور پر واضح ہوگا بنیادی کام ہو چکا تھا اور اور اس کے جانشینوں نے اس نمونے کی پیروی کی جو ان کے پیش رو افغان اور ترک شہنشاہ قائم کر چکے تھے۔ یہ دور ان حالات کی وجہ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد ہم ہندوستانی سماج کو مغلوں کی دین اور موجودہ سماجی ارتقا کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔

موجودہ مطالعے کی نوعیت اور اہمیت کے سلسلے میں بھی اس موقع پر کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ یہ بات بلا جھجک قبول کی جا سکتی ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد مغرب کے لوگوں کی زندگی بعض لحاظ سے بہت آرام دہ ہو چکی ہے۔ ہر جگہ کوشش کی ایک نئی دھن، حالات کی تبدیلی اور مزید آگے بڑھنے کی ایک لگن موجودہ یورپی سماج کے مطالعے کو سبق آموز بناتی ہے اور آگے بڑھنے پر ابھارتی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستانی عوام کی زندگی بڑی حد تک ایسی ہی ہے جیسی کہ عہدِ وسطیٰ میں یورپ کے عوام کی زندگی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کچھ اہلِ نظر یہ یقین کرنے لگے ہیں کہ چوں کہ ہندوستانی عوام میں ترقی کا جذبہ نہیں ہے اس لیے ان کی کوئی تاریخ بھی نہیں ہے۔ درحقیقت وہ آج جس حالت میں ہیں کل بھی اسی حالت میں تھے اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے[2]۔ اس خیال کو اس حقیقت سے بھی تقویت پہنچی کہ ہندوستان کے واقعات اور تاریخیں صرف بادشاہوں کے حالات اور جنگوں سے سروکار رکھتی ہیں۔ آئیے ان اہم مشاہدات پر ایک نظر ڈال لیں۔ یہ حقیقت کہ مشرق کے لوگ نہیں بدلتے بعض مستثنیات کو چھوڑ کر کسی حد تک ہی صحیح ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو، ایف، ڈبلیو تھامسن، ص ۲۳

[2] لین پول۔ تعرف ص ۵

ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ ایک صنعتی طرزِ زندگی کے مقابلے میں زراعتی طرزِ زندگی کی ترقی کی رفتار لازماً سست ہوتی ہے۔ ایک زراعتی ملک کی ترقی کہیں صدیوں میں جاکر ہوتی ہے اور اگرچہ یہ ترقی غیر محسوس ہوتی ہے لیکن بہرحال غیر یقینی نہیں ہوتی۔ کسی نئی سماجی قوت کے اثر سے یہ رفتارِ ترقی تیز ہوجاتی ہے۔ ایک خاص منزل پر جب یہ تہذیب پختہ ہوجاتی ہے تو اس کے سماجی ڈھانچہ میں رہتے ہوئے ترقی کے مزید امکانات ختم ہوجاتے ہیں اور اس میں جمود اور تنزل شروع ہوجاتا ہے یا پھر ترقی کی ایک نئی منزل میں قدم رکھتی ہے لیکن اس انتشار میں اس کے جملہ سماجی شعبے اس حد تک مکمل ہوچکے ہوتے ہیں جس حد تک کہ سماجی ڈھانچہ میں رہتے ہوئے ان کی تکمیل کا امکان ہے۔ بہرحال عوام کو ایک ترقی یافتہ منزل تک لے جاچکے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں بظاہر تیزی سے تبدیلی رونما نہ ہونا ہندوستانی تہذیب کی کم مائیگی پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس کی پختگی کی ترقی یافتہ منزل کی دلیل ہے اور اسی لیے گہرے مطالعے کا مستحق ہے۔ زیرِ مطالعہ دور میں ہندوستانی تہذیب کو ایک ایسی قوت نے نشوونما دی جو زراعتی سماج کی رفتارِ ترقی کو تیز تر کردیتی ہے۔ بہرحال دوسرا پہلو ایک بالکل مختلف اہمیت کا حامل ہے۔ زمانہ حال تک تاریخ اپنے مورخوں کے ہاتھوں خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید اور ایشیا کے ہوں یا یورپ کے اپنی وسعت کے تصور کے لحاظ سے ان کی علیٰحدگی پسندانہ اور محدود طرزِ فکر کی وجہ سے نقصان اٹھاتی رہی ہے خصوصاً قدیم مشرقی درباروں کے واقعہ نگاروں نے خود کو بادشاہوں اور ان کی جنگوں تک محدود رکھا اور اس طرح تاریخ کو انسانوں کے قتل اور غارت گری کی ایک دستاویز میں تبدیل کردیا، لیکن وہ رکاوٹیں جنھوں نے تاریخی تحقیقات کو محدود کردیا تھا اب ختم ہوتی جارہی ہیں۔ اب یہ بات عالمگیر حیثیت سے تسلیم کی جارہی ہے کہ کوئی بھی بات نہ اب تاریخ کی "شان سے پست" ہے اور نہ اس کے دائرۂ نظر سے باہر۔ اور جملہ طبقات سے تعلق رکھنے والے انسانوں کے اعمال اور ان کی "تکلیفات ایک مورخ کی تحقیقاتی توجہ کا موضوع ہیں۔ اب تو یہ دعویٰ بھی کیا جارہا ہے کہ درحقیقت جب تک کوئی مورخ اپنے فرائض اس وسیع تر نظریے کی روشنی میں پورا نہیں کرتا وہ جس زمانے کی تاریخ بھی لکھے گا اس کی صحیح تصویر کو مسخ ہی کرے گا مختصر یہ ہے کہ بقول ہارون شا یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ تاریخ مطالعہ کے لیے کوئی الگ مضمون

نہیں ہے بلکہ یکساں متعلقہ موضوعات میں سے ایک موضوع ہے جنھیں مجموعی طور پر سماج کی جنرل سائنس کا نام دیا جا سکتا ہے۔[1] ہم پہلے زمانے کے ایک ایسے درباری واقعہ نگار کے ساتھ تو اعانت کر سکتے ہیں جس نے اپنے مربّی کی تعریف کی بدولت اپنی روزی کمائی ہو لیکن وہ ان علمی تقاضوں کو پورا نہ کر سکا جن کی توقع بیسویں صدی میں ایک مورّخ سے کی جاتی ہے۔

موجودہ موضوع کے ماخذوں کا ذکر کرنے سے پیشتر میں اس کی وسعت کے سلسلے میں اپنی حدود واضح کردوں۔ میں نے اس سلسلے میں خاص کر ادبی ذخیروں کی شہادت پر زیادہ بھروسہ کیا ہے اور کتبات سکہ جات و تعمیرات کے اعداد و شمار سے کچھ مدد ضرور لی ہے لیکن بہت ہی کم سنسکرت کی کتابوں کے میں نے صرف انگریزی ترجمے استعمال کیے ہیں اور میں اصل کتابوں کے استعمال کی ذمّہ داری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس استثنا کے ساتھ میرا مواد بہت کامل طور پر جامع تو نہیں ہے البتہ اتنا وسیع ضرور ہے کہ اس زمانے کی ہندوستانی تہذیب کے مطالعے میں کارآمد ہو۔ مندرجہ ذیل صفحات میں سلاطینِ دہلی کے ابتدائی زمانے کی سماجی زندگی سے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کن طویل تحریر نہیں بلکہ ایک خاکہ ہے شہری انتظام، مال گزاری کے طریقے، فوج، ذرائع آمد و رفت، تعلیم اور علم و ادب کی ترقی حتیٰ کہ عوام کی مذہبی زندگی سے متعلق امور کے بارے میں حوالے اس میں شامل نہیں۔ اس میں میں نے اپنے مطالعے کو سماجی زندگی کے چند پہلوؤں تک ہی محدود رکھا ہے۔ ان حدود میں رہتے ہوئے میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ایک مکمل نقشہ ہی کہا جا سکتا ہے جسے مقامی اور صوبائی تفصیلات کی بنیاد پر جو مختلف مقامات میں مختلف ہوتی تھیں غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔

(ب) کتاب کے ماخذ

میں اپنی کتاب کو ماخذوں کے مختصر جائزے ہی تک محدود رکھوں گا۔ اس جائزہ میں ایک مفصل جانچ نہ تو ممکن ہے اور نہ مناسب۔ میں یہ بات شروع ہی میں تسلیم کر لیتا

---

[1] مقالہ، سائنس آف ہسٹری۔ آؤٹ لائنز آف ماڈرن نالج۔ ص ۸۰۹

ہوں کہ میں نے محض چند پہلوؤں ہی کی تحقیق کی ہے اور مواد کے صرف ایک حصہ کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک موثر جستجو سے زیادہ مفید اور وسیع معلومات مہیا ہوں گی۔ بہرحال ایسے ماخذوں کا غیر تنقیدی مطالعہ کرنے کے سلسلے میں ایک احتیاط ضروری ہے۔ جب کوئی شخص مناسب تاریخی کتابوں سے ہٹ کر تصوراتی افسانوں خیالی روایتوں اور شاعری اور عوامی قصّوں کی پُر فریب دنیا میں گھومتا پھرتا ہے۔ اُس کے مفروضات کے چکروں میں پڑنے کا خطرہ ہے جس کی وجہ سے مطالعے کے نتیجوں کی علمی خوبیاں مفقود ہوجاتی ہیں۔ اس خطرے سے بچنے کی میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے اور کسی واقعہ پر بھروسہ کرنے سے پیشتر میں نے تائیدی اور تردیدی حقائق کو پیش نظر رکھا ہے۔ سماجی تاریخ کے مطالعہ سے متعلق مواد مختلف قسم کی کتابوں میں بکھرا ہوا ہے جیسے روزنامچے، امیرخسرو کی تصانیف، متداول روایات اور افسانے، نظم اور گیت، ہندو اور مسلم صوفیاء کی کتابیں، عملی فنون سے متعلق کتابیں اور قانون واخلاقیات پر خلاصہ جات، غیرملکی سفیروں کے تاثرات اور چند درباری اور ذاتی خطوط کے ذخیرے۔

روزنامچے

ہم عصر مورخین کے لکھے ہوئے کم وبیش متعلقہ روزنامچوں کی ایک طویل فہرست ہے، پھر بعد کے زمانے کی تالیف شدہ وہ کتابیں ہیں جو عام حیثیت کی ہیں اور جو ان روزنامچوں اور اسی طرح کے دوسرے مواد کی بنیاد پر لکھی گئیں ہیں۔ یہ گذشتہ اور ہم عصر واقعات سے متعلق ہیں۔ میں نے مندرجہ ذیل کتابوں سے رجوع کیا ہے:

تاریخ فخرالدین مبارک شاہ، تاج المآثر، طبقاتِ ناصری، تاریخ فیروزشاہی از ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروزشاہی از سراج عفیف، تاریخ مبارک شاہی، ظفرنامہ از علی یزدی، واقعات مشتاقی (یا تاریخ مشتاقی)، تاریخ داؤدی، تاریخ شیرشاہی، سرگزشتِ بابر، جوہر، گلبدن بیگم اور بایزید۔ ہمایوں نامہ از خواندمیر، آئینِ اکبری اور اکبرنامہ از ابوالفضل۔ عام تاریخوں میں سے میں نے طبقاتِ اکبری۔ منتخب التواریخ اور تاریخ فرشتہ (یا گلشن ابراہیم) سے رجوع کیا ہے۔ یہ تعیّن یا شمار کسی بھی طرح مکمل نہیں اور امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید تاریخی مواد سامنے آئے گا۔ بعد کے زمانے کے ترک سلاطین اور ان

کے جانشینوں کے عہد میں خطوط کے سلسلے میں زیادہ سرگرمی ظاہر نہیں کی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد تاریخی اور ادبی قیمتی کتابیں مفقود ہوگئیں۔ اگر وہ کتابیں موجود ہوتیں تو ہماری معلومات میں بہت سی اہم تفصیلات کا اضافہ ہوتا[1] مثال کے طور پر جب سرڈینی سن روس نے حاجی دبیر کی عربی تاریخ کا مطالعہ کیا تو اسے یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ حاجی دبیر پہلے مورخ ہیں جنھوں نے حسین خاں کی تاریخ بہادر شاہی سے استفادہ کیا ہے۔ حالاں کہ بہت سے دوسرے مورخین نے اس سے استفادہ کرنے کا غلط دعویٰ کر چکے تھے[2] حاجی دبیر کی تصنیف کے ان حصّوں کی تحقیق کے بعد جو ہمارے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں مجھے یقین ہے کہ مورخ نے ہماری معلومات میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ کچھ حالات میں وہ حقائق کی نئی ترجمانی کرتے ہیں۔ دیگر حالات میں وہ ایسی مزید معلومات بہم پہنچاتے ہیں جن کے ظاہر کرنے سے محتاط اور معاصر درباری واقعہ نگار اجتناب کرتے تھے۔ ہمیں زیرِ نظر زمانے میں بدایونی اور خافی خاں جیسے مورخین کی موجودگی پر تعجب نہیں کرنا چاہیے جن کی اس زمانے کے حالات پر آزادانہ رائے تاریخِ ہند کو سمجھنے میں ہمارے لیے بہت زیادہ معاون ثابت ہوگی۔ حاجی دبیر کے فاضل مدوّن کے مطابق حسین خاں نے اپنی کتاب سولھویں صدی میں لکھی۔ اب اگر ہماری نئی معلومات کا انحصار جو حاجی دبیر نے بہم پہنچائی ہیں حسین خاں کی کتاب پر ہی ہے تب بھی بعد کے مورخین نے اپنی تاریخوں کے لیے ایسی قدیم تاریخوں پر ہی بنیاد رکھی ہوگی جن سے آج ہم ناواقف ہیں۔ میں نے اصل موضوع سے تجاوز یہ ظاہر کرنے کے لیے کیا ہے کہ ہم عصر تاریخی کتابوں کے سلسلے میں ہمارا علم بہت محدود ہے اور ہمارا مزاج مستقل مزاج مورخ کے لیے تحقیق کا اچھا خاصہ میدان کھلا ہوا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو، مرزا ص ۲۰۳۔ شہاب الدین کی تصنیفات کے مفقود ہونے کے سلسلے میں جس سے امیر خسرو متعدد مواقع پر رجوع کرتا رہا ہے۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ بدر چاچ نے محمد تغلق کے زمانے کی منظوم تاریخ لکھی تھی اور فردوسی کی یادگار تصنیف شاہ نامہ کے نام پر بھی بلند و بالا نام دیا تھا۔ نواب ضیاء الدین آف لوہارو کا خیال ہے کہ یہ کتاب بھی اب ناپید ہے۔

[2] روس۔ جلد دوم۔ تعارف۔ ص XVII تا XXVIII

اس سلسلے میں مختصراً بعض تاریخوں کے ایسے مفید اور مخصوص پہلوؤں کی طرف توجہ دلاؤں گا جو سماجی زندگی کے بہتر جائزے کے لیے مفید ہیں۔ حسن نظامی کی تاج المآثر گو ایک رزمیہ اور بے قاعدہ اور پرجوش ہے اور اختراعات و قیاسات پر مبنی ہے لیکن بالکل غیر مفید نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس میں متعدد مقامات پر تہواروں اور تفریحات کا حال بیان کیا ہے، ملکی انتظام کے منشا اور رجحان پر مفید روشنی ڈالی گئی ہے۔ برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور طبقاتِ ناصری کے برٹش میوزیم کے مخطوطات مزید مگر ناکافی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ معلومات ببلوتھیکا انڈیکا اور میجر راورٹی کے طبقات کے ترجمے میں نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شہاب الدین ابوالعباس احمد بن یحییٰ کی تصنیف مسالک الابصار فی ممالک الامصار کی معلومات کا ذریعہ اگرچہ براہِ راست نہیں لیکن اس بنا پر اس کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف محمد تغلق (۱۲۹۷ تا ۱۳۴۸ عیسوی) کے ہم عصر تھے اور حالاں کہ انھیں بذاتِ خود ہندوستان کے حالات کا مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا، پھر بھی ہندوستان کے لوگوں کی متواتر آمد و رفت رکھنے والے افراد ان کی معلومات کا بہترین ذریعہ تھے۔ مشرقی ممالک میں ان کی تصنیف کی بڑی قدر رہی اور زمانہ ما بعد کے مورخین نے ان کی کتاب سے حوالے دیے ہیں۔ اس سلسلے میں نزہت القلوب کے مصنف کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے[1]۔ ان کا حقائق کو جمع کرنے کا طریقہ اگرچہ بنیا ہے لیکن ناقدانہ اور عملی ہے[2]۔ سوانح حیات میں مختلف وجوہات کی بنا پر ملفوظاتِ تیمور کے

---

[1] ملاحظہ ہو، ڈاوسن۔ ایلٹ اینڈ ڈاوسن جلد سوم، ص ۴، ۵۔ اس کتاب کے کچھ حصے حکومتِ مصر نے شائع کیے ہیں لیکن ہندوستان سے متعلق صفحات ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ TOME XIII OF THE NOTICES ET EXTRACT DE MSS FR. میں چھپ چکا ہے (جس کے انگریزی ترجمے کے لیے میں ایک کرم فرما کا ممنون ہوں۔ اس کے کچھ حصے ایلٹ اینڈ ڈاوسن جلد سوم میں ملتے ہیں مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صبح الاعشا از قلقشندی۔

[2] اپنی کتاب کے دیباچے میں مصنف نے بتایا ہے کہ جب کبھی اس کی ملاقات ہندوستان کے کسی باشندے سے ہوئی اس نے ہر ایک سے جداگانہ وہ سوالات پوچھے جن کے بارے میں اسے معلومات مہیا کرنی تھیں۔ ان جوابات میں سے اس نے صرف ان امور کو اپنی کتاب میں شامل کیا (باقی اگلے صفحہ پر)

مستند ہونے پر اختلاف کا اظہار کیا گیا ہے کیوں کہ اس کا اصل مخطوطہ نایاب ہے اور بعد کے زمانے میں اس کی دریافت سے متعلق حالات مشکوک ہیں۔ تمام حالات کے جائزے کے بعد پروفیسر ڈاؤسن نے ملفوظات کے اصلی اور مستند ہونے پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ انھیں کتاب کے مدعا سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ یا تو خود تیمور کی لکھی ہوئی ہے یا تیمور نے خود اپنی نگرانی میں اس کو لکھوایا ہے[ل] گو کہ ملفوظات میں ہندوستان کی سماجی زندگی سے متعلق بہت کم حوالے ملتے ہیں لیکن ان سب کی تصدیق علی یزدی کے ظفرنامہ اور نظام شامی کی کتاب سے ہوتی ہے۔ بابر کی خود نوشت سوانح کے لیے میں نے دربارِ اکبری کے شاعر عبدالرحیم خانخاناں کے فارسی ترجمہ پر بھروسہ کیا ہے جس نے واقعاتِ بابری کا ترجمہ شہنشاہ اکبر کی خدمت میں ۱۵۹۰ء میں پیش کیا۔ مترجم ترکی فارسی اور ہندی کے ایک بلند پایہ عالم تھے اور مصنف کے صحیح منشا اور ہندوستان کی سماجی نشوونما کے مشاہدے کے لیے انھیں بہترین ذرائع حاصل تھے۔ ترکی زبان کے ترجمہ سے مقابلہ کرنے پر (انگریزی ترجمہ اے۔ ایس۔ بیورج) میں نے یہ دیکھا کہ فارسی ترجمہ (برٹش میوزیم کا مخطوطہ) میں ہندوستان کے متعلق چند مزید حقائق ہیں۔ گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کے لیے میں نے اے۔ ایس۔ بیورج کے اصل بلند مرتبہ مطبوعہ نسخہ پر انحصار کیا ہے۔

افغانوں (لودھی اور سور) کے مطالعے کے سلسلے میں میں نے تاریخ شیر شاہی، تاریخ داؤدی اور واقعاتِ مشتاقی سے رجوع کیا ہے۔ تاریخ شیر شاہی ایسے متعدد افراد کی سوانح حیات کے سلسلے میں بہت مشہور ہے جو ان واقعات کے عین شاہد تھے۔ انھیں افراد نے بعد میں اپنے تجربات مصنف سے بیان کیے اور مصنف کے تجربات کو پوری توجہ اور تحقیق[ےے] کے بعد

جن پر سب کا اتفاق تھا۔ وہ ان افراد سے کافی عرصے تک نہیں ملا۔ اس طویل عرصے میں وہ لوگ اپنے جوابات فراموش کر چکے ہوں گے۔ لہٰذا اس نے انھیں سوالات کو پھر ان کے سامنے رکھا۔ اگر ان کے جوابات سابقہ جوابات کے مطابق معلوم ہوتے وہ انھیں اپنی کتاب میں شامل کرتا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ جوابات اس نے ایسے افراد سے حاصل کیے تھے جو صاحبانِ علم و اقتدار تھے، جنھیں ان سب معاملات کی براہِ راست معلومات حاصل تھیں۔ ملاحظہ ہو نوٹسیز وغیرہ۔ ص ۱۹۵ - ۱۹۶

ل ایلٹ اینڈ ڈاؤسن۔ جلد سوم۔ ص ۵۶۳

ےے تاریخ شیر شاہی۔ ص ۲

اپنی کتاب میں شامل کر لیا۔ دوسری دو تاریخیں اس کے مقابلے میں اس قدر ادراک و شعور اور تاریخی بصیرت سے نہیں لکھی گئیں۔ تاریخ داؤدی میں متفرق جزوی اور بے ربط واقعات ہیں اور اس کی حیثیت ایک غیر مسلسل تذکرہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اسی طرح "واقعات مشتاقی" بھی بے ترتیب ہے اور اس میں طویل انحراف ہیں۔ مزید براں یہ دونوں کتابیں حیرت انگیز واقعات اور توہمات سے پُر ہیں۔ خصوصاً واقعات مشتاقی میں کہیں کہیں اس دور کے مشہور صوفیا، کرام حکام کی تاریخی تفصیلات ہیں۔ عجیب و غریب کرامتوں کی بیہودہ کہانیاں وہمی مورتوں، بھوت پریت، سحر اور شعبدہ بازی کی کہانیاں ہیں جو مصنف کی اور اس دور کی ضعیف الاعتقادی کو ظاہر کرتی ہیں[1]۔ اس حالت میں یہ بتانا غیر ضروری ہے کہ اگر ادر باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اس دور کی مذہبی زندگی کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان غلط اور بیکار امور کا علم غیر معمولی افادیت کا حامل ہے۔

وقائع تاریخ میں دوسری دل چسپ کتاب خواندمیر کا ہمایوں نامہ ہے۔ اس مشہور مصنف کی یہ آخری تصنیف ہے۔ خواندمیر نے یہ کتاب مغل شہنشاہ ہمایوں کی خصوصی فرمائش پر ۹۴۱ھ/ ۱۵۳۴ء میں لکھی۔ اس کتاب کا خاص وصف یہ ہے کہ اس میں ہمایوں کی جاری کردہ نئی تدابیر اور نرالی نئی معلومات کا ذکر ہے[2]۔ حاجی دبیر کی عربی زبان میں گجرات کی تاریخ (ARABIC HISTORY OF GUJARAT) کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے جو اب ایک شاندار ایڈیشن کی شکل میں ملتی ہے۔

آخر میں ابوالفضل کی مشہور تصنیف آئینِ اکبری کا ذکر کیا جا سکتا ہے جسے بلاک مین نے بڑی قابلیت سے شائع کیا ہے اور بلاک مین اور جیرٹ نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ فاضل مصنف اور مدیروں (EDITORS) نے اس کتاب کے محاسن کی بڑی تعریف کی ہے۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس کی یہ تصنیف ایک قاموس یا دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ہر قسم کی اہم اور مفید معلومات مل سکتی ہیں اور جس کی طرف

---

[1] ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن۔ جلد چہارم۔ ص ۵۳۷۔ افغانوں کے بارے میں زیادہ مربوط حالات کے لیے ملاحظہ ہو مخزنِ افغانی از نعمت اللہ۔ تصنیف ۱۶۱۳ عیسوی۔

[2] خواندمیر۔ ص ۱۲۵

زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد حوالہ جات، معلومات اور تفریح کے لیے رجوع کرتے ہیں[1] بلاک مین نے صحیح طور پر فارسی وقائع میں آئینِ کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں عوام کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاریخ میں عوام پہلی بار ہمارے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وقت کے عظیم مسائل، کلیات، جن پر اس دور میں یقین کیا جاتا تھا، اصول جن کی تقلید کی جاتی تھی اور توہمات جن کی پیروی کی جاتی تھی، ہمارے سامنے سچے اور واضح الفاظ میں پیش کیے ہیں[2] مواد کے جمع کرنے کے سلسلے میں ابوالفضل نے ہمیں بتایا ہے کہ اس نے معلومات جمع کرنے کے لیے کس قدر غیر معمولی کاوش کی ہے۔ اس نے لوگوں کے زبانی جوابات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کو ایک سوال نامہ دیا اور ان کے مناسب غور و خوض پر مبنی ان سوالوں کے جوابات حاصل کیے۔ ہر موضوع کے لیے جس پر اس نے اپنی کتاب میں بحث کی ہے اس کے پاس ایسی اچھی طرح سوچی سمجھی ہوئی ۲۰ دستاویزات تھیں۔ اس نے توجہ سے مقابلہ اور غور و فکر کے بعد ان جوابات کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے[3] البتہ اس عظیم الشان تصنیف کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جس کے پیشِ نظر وہ دورِ حاضر کی علمی تصانیف کا مقابلہ نہیں کرتی، وہ یہ کہ اس میں ابوالفضل نے تفصیل سے اپنے ذرائع معلومات کا ذکر نہیں کیا ہے، نہ ان افراد کے نام دیے جنھوں نے اس کے لیے معلومات مہیا کیں۔ ایک جگہ وہ اتفاق سے ذکر کرتا ہے کہ جستجو کے دوران ایک بار اُسے کچھ قدیم کتابیں ملیں لیکن ان قدیم کتابوں کے عنوانات یا ان کی دیگر تفصیلات نہیں دیں۔ اور اس طرح ہمیں بالکل تاریکی میں رکھا ہے[4]

---

[1] ملاحظہ ہو آئینِ اکبری۔ جلد سوم۔ ص ۲۸۲۔ "یہ ہر قسم کے علم کا خزانہ ہے۔ نہ صرف ماہرین اور ہنرمند ہی اس سے رجوع کر سکتے ہیں بلکہ مسخرے اور بہروپیے تک اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بچوں کے لیے یہ کتاب تفریح کا ذریعہ ہے اور بڑوں اور دانشوروں کے لیے علم کا خزانہ۔ عقلمند بزرگوں کے لیے اس میں مختلف زمانوں کی پختہ عقل و طبقہ امرا و نیک افراد کے لیے اس میں صحیح رویہ کے اصولوں کا مجموعہ ہے۔

[2] آئینِ اکبری (انگریزی ترجمہ) جلد اوّل۔ تعارف ص V

[3] آئینِ اکبری۔ جلد دوم۔ ص ۲۵۵

[4] آئینِ اکبری۔ جلد دوم۔ ص ۲۵۲

مزید برآں بحیثیت شہنشاہ کے اکبر کی عظمت اور اس کی دنیاوی زندگی کی وضاحت کے سلسلے میں اس کا تبصرہ غیر متوازن ہے کیوں کہ اس نے جدت پسندی اور حکمت ودانائی کو تمام تر اکبر کی طرف منسوب کیا ہے اور اس طرح اس نے نہ صرف ترکوں اور افغانوں کی دینی بلکہ اکبر کے پیش رو بادشاہوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کو قطعی طور پر اور ارادتاً نظر انداز کیا ہے۔ بہ نسبت ہمارے، اس کے لیے ہندوستان کے بہت سے سماجی اصولوں کی ابتدا اور نشوونما کا سراغ لگانا زیادہ آسانی سے ممکن تھا۔ آئینِ اکبری سماجی تاریخ کی ایک مشہور کتاب ہے لیکن اس کی اہمیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں اکبر کے زمانے تک کے نشوونما کا اندراج ہے جب کہ اکبر نے عنانِ حکومت سنبھالی اور سماجی نشوونما کے کام کے سلسلہ کو ایک قدم آگے بڑھایا ورنہ اس کی اہمیت اتنی ہی ہوتی جتنی کہ اس سے قبل پچاس سال پیشتر لکھی ہوئی کسی کتاب کی اور اس کی ضخامت و اہمیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ اس حالت میں بھی وہ ہم عصر سماجی اور سیاسی حالات کی ایک قابلِ اعتماد تاریخ سمجھی جاتی۔

II امیر خسرو

تاریخی مواد کے ذکر کو ختم کرنے سے پیشتر اصل موضوع سے انحراف کرتے ہوئے ہم امیر خسرو کی کتابوں کی تاریخی اہمیت اور خود امیر خسرو کا بہ حیثیت مورّخ جائزہ لے لیں۔ ہماری معلومات کا ایک معتد بہ حصہ اس کی کتابوں کا مرہونِ منت ہے۔ اس نے کم از کم تین نظمیں اور ایک کتاب نثر میں لکھی ہے۔ قران السعدین، مفتاح الفتوح (فتح الفتوح) اور نُہ سپہر منظوم ہیں اور خزائن الفتوح نثر میں ہے۔ یہ کتابیں مستند طور پر تاریخی ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی اور نظمیں بھی ہیں۔ اگر ہم ان میں دو منظوم کتابوں کا اور اضافہ کر لیں تو ان کی تعداد چھ ہو جاتی ہے۔ وہ دو کتابیں ہیں دیولرانی خضر خاں یہ اگرچہ ایک رومانی داستان ہے لیکن اس میں ہم عصر تاریخی واقعات کا ذکر بھی ہے۔ دوسری کتاب تغلق نامہ ہے جو غاصب خسرو خاں کے عروج وزوال اور غیاث الدین تغلق کے تخت نشین ہونے سے متعلق ہے۔ یہ کتابیں کم و بیش چالیس سال (۱۲۸۵ تا ۱۳۲۵ء) کے اس دل چسپ دور کے مسلسل واقعات پر مشتمل ہیں جس میں مصنف نے

زندگی گزاری اور اکثر مندرج واقعات کا بطور خود مشاہدہ کیا[۱]

جہاں تک سواد کو پیش کرنے کا تعلق ہے امیر خسرو اپنے قارئین سے کوئی بات پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا۔ مثال کے طور پر وہ یہ بات صفائی سے تسلیم کرتا ہے کہ اس نے قران السعدین شاہی حکم کی تعمیل میں لکھی ہے۔ سلطان نے خاتم المصنفین کہہ کر اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے ایک ایسا بڑا انعام دینے کا وعدہ کیا جو اسے ہمیشہ کے لیے تمام دنیاوی تردوات سے آزاد کر دے گا۔ کتاب کا خاکہ اور اس کی وسعت شاہی سرپرستی میں متعین کی گئی[۲] دوسرے سرپرست سلطان جلال الدین خلجی تھے۔ جب سلطان نے مصنف سے کتاب لکھنے کو کہا تو اس نے اخلاقی طور پر زیادہ مضبوطی محسوس کی۔ اس نے صفائی سے سلطان کو بتایا کہ شعری روایات اور مدح کے متفقہ معیار کے تحت جب بھی وہ تاریخی حقیقتوں سے ہٹنے پر مائل ہوا ہے تو اس کے ضمیر نے اسے ملامت کی ہے اس لیے امیر خسرو نے بادشاہ سے کہا کہ وہ حسبِ موقع حقیقت سے منہ نہ موڑے گا[۳] بہرحال امیر خسرو نے سلسلہ وار کئی بادشاہوں کی خدمت کی ہے جو ترتیب وار سلطان معزالدین کیقباد جلال الدین خلجی، علاءالدین خلجی اور مبارک شاہ خلجی ہیں۔ اور جب کوئی ایمان دار آدمی ایک طویل عرصے تک کسی درباری ماحول میں رہتا ہے تو اس کے اخلاقی معیار میں عموماً کسی قدر تبدیلی آجاتی ہے۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ شاعر نے اپنے بیٹے کو کچھ عرصہ بعد متنبہ کیا کہ وہ اس کے نقشِ قدم پر نہ چلے کیوں کہ اس نے اپنی پوری زندگی نقصہ

---

[۱] حیدرآباد (دکن) کے میرے ایک دوست مولوی ہاشمی نے حال ہی میں امیر خسرو کے تغلق نامہ کا ایک نسخہ گوشۂ گمنامی سے نکالا ہے۔ اصل میں اس نسخہ کو ایم۔اے۔او۔ کالج (بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ) علی گڑھ کے مولانا رشید احمد مرحوم نے دریافت کیا تھا۔ انھوں نے امیر خسرو کی تصنیفات کی اشاعت کے سلسلے میں ایم۔اے۔او۔ کالج کے عہدے داران کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ اس مخطوطے پر جسے میں نے جزوی طور پر استعمال کیا ہے لگی مہر سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی اصلی ہے۔ فرشتہ اور دیگر تاریخوں میں اس سے جو اقتباسات لیے گئے ہیں ان سے اس کی فہرست مضامین کو اور تقویت ملتی ہے۔

[۲] قران السعدین۔ ص ۱۶۹ ـ ۱۷۰

[۳] کلیات خسرو۔ ص ۸۹۰

کہانی کا تانا بانا بننے میں گزاری ہے[1] اس طرح سے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ امیر خسرو نے اپنی تصنیفات میں دو رنگی سے کام لیا ہے۔ وہ ایک مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ درباری بھی رہا اور حیرت انگیز طور پر اپنی تصنیفات اور اپنی شخصیت کی تینوں حیثیتیں بھی پوری کرتا رہا۔ خاص طور پر خزائن الفتوح کی اپنی ایک خاص افادیت ہے۔ اس میں مصنف نے سلطان علاء الدین کی ابتدائی ۱۵ سالہ زندگی کے سلسلہ وار حالات دیے ہیں اور اس کی جغرافیائی اور دیگر تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ان میں سے کچھ واقعات کا عینی مشاہدہ کیا ہے حتیٰ کہ جنوبی ہند کے واقعات کا بھی وہ عینی شاہد ہے۔ یہ صرف ہم عصر تاریخی واقعات اور حقائق ہیں جو قابلِ تعریف صحت اور وسیع تر تفصیلات کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں[2]۔ مجموعی طور پر ہم امیر خسرو کے بارے میں پروفیسر کوویل کی اس رائے سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ حالاں کہ اس کا طرزِ تحریر مبالغہ آمیزی اور استعاری تفصیلات سے پُر ہے لیکن تاریخی حقائق خاص صحت کے ساتھ دیے گئے ہیں[3]۔ تذکرۃً میں یہاں یہ بھی اضافہ کر دوں کہ زمانہ مابعد کے بہت سے مورخین نے اس زمانے کے واقعات کی روایت اس کے بیان کے مطابق کی ہے اگرچہ اکثر نے اپنی معلومات کے ذریعہ کو ظاہر نہیں کیا[4]۔ بہرحال

---

[1] کلیات خسرو۔ ص ۲۴۵ و ۶۷۴

[2] حال ہی میں علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب نے جنرل آف انڈین ہسٹری میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔

[3] جنرل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۸۶۰ء۔ ص ۲۷۷

[4] معزالدین کیقباد کی تخت نشینی کے واقعات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ مبارک شاہی وغیرہ اور اس کے باپ بغرا خان کا اس کی تخت نشینی سے اختلاف۔ دہلی کے تخت سے اس کی دست برداری کے اعلان کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ جنگ کے امکانات ختم ہو کر باپ بیٹے میں بڑی خوش گوار ملاقات ہوئی۔ یہ واقعات قران السعدین سے لیے گئے ہیں۔ اسی طرح علاء الدین کی حکومت کے آخری سالوں کے واقعات کے لیے دیول رانی خضر خاں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ علما اور مورخین مثلاً بدایونی و نظام الدین نے خان شہید شہزادہ محمد کی وفات پر امیر خسرو کے مرثیے سے متعدد حوالے دیے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ مبارک شاہی ص ۶۰۔ ۲۵۹ اور ۲۷۴۔ ۲۷۵۔

میں نے امیر خسرو کو وسیع ترمعنی میں ہم عصر سماجی زندگی کی تاریخ کے لیے اہم ترین مورّخ تصوّر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے نہ صرف اس کی تاریخی کتابوں اور تاریخی نظموں کا ہی بغور مطالعہ کیا ہے بلکہ اس کا مکمل دیوان، اس کی کلیات خصوصاً مطالع الانوار کا مطالعہ کیا جو اس زمانے کے رسم ورواج اور اخلاقی حالت کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ میں نے اس کی نثرنگاری پر ضخیم اور دقیق کتاب اعجازِ خسروی کا بھی مطالعہ کیا ہے عوام کے خیالات وآرار کو حقارت سے دیکھنے والے فن کار یا واقعہ نگار کی حیثیت سے خسرو خود کو درباری ماحول اور چند تعلیم یافتہ اور مہذّب لوگوں کے واقعات تک ہی محدود کرسکتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک سماجی مورّخ کی حیثیت سے وہ ابوالفضل جیسے عالم کی طرح پہلو بچا کر لکھ سکتا تھا۔ لیکن خسرو کا تعلق عوام الناس سے تھا۔ اس نے عوام کا ایک حصّہ بن کر زندگی گزارنے میں اپنی بہتری سمجھی۔ جس وقت ایک درباری یا ایک عالم کی حیثیت سے سامنے آتا ہے تو وہ شعوری طور پر ایک خاص رول ادا کرتا ہے۔ اس وقت اس کے صوفیانہ اور اخلاق و مذہب میں محتاط خیالات قطعی طور پر افسردگی لیے ہوتے ہیں۔ گو کہ یہ وقفہ بہت عارضی ہوتا ہے اور اولین موقع ملتے ہی وہ اس نقاب اور افسردگی کی تاریکی کو اتار پھینکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ہنسنا ہنسانا شروع کردیتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عوام کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ علمی فضیلت اور دنیاوی بلندی اسے ان کا ہم رنگ ہونے سے باز نہیں رکھ سکتی وہ کبھی کبھی غیر ترقی یافتہ ذہن کا سا بازاری پن ظاہر کرتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات جہلا کی طرح ناشائستہ مذاق کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ جب وہ عوام الناس کے درمیان ہوتا ہے تو اپنے گذشتہ شاہانہ ماحول اور روحانی بلندی کو غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور نہ صرف افراد اور اشیار بلکہ خود اپنے بارے میں بھی ایمان دارانہ اور بے لاگ رائے ظاہر کرتا ہے۔ اس طرزِ فکر کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کرنے کی کوشش کرتے وقت وہ کبھی کبھی یہ محسوس کرتا ہے کہ صاف اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی زبان موقع و محل کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب نہیں ہے اور اسے مشکل میں ڈال سکتی ہے۔ یہ فراست اسے سخن سازی پر مائل کرتی ہے۔ وہ اب ارادتاً شان دار طرزِ بیان اختیار کرتا ہے جو مرصّع زبان، بے جا عبارت آرائی، ذو معنی الفاظ (Puns) اور معمّوں پر مشتمل ہوتا ہے وہ اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی بے چین اور

مضطرب روح کو سکون پہنچانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ اس طرح اس نے الفاظ کے انبار میں اپنے مدعا کو بڑی خوبی سے چھپایا ہے۔ اس کے باوجود اس کا مفہوم ان لوگوں پر آسانی سے واضح ہو جاتا ہے جو اس کے احساسات اور ماحول سے واقف ہیں۔ اعجازِ خسروی کے بارے میں یہ میری اپنی رائے ہے جو صریحاً اپنی قوتِ بلاغت کا، الفاظ کے استعمال میں مہارت کا اور انشا پردازی کے مروجہ نو طریقوں میں دسویں کا اضافہ کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے[۱] اگر اسے سطحی نقطۂ نظر سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی دستاویزات حسبِ معمول بہت پر شکوہ طرزِ تحریر کی حامل ہیں اور بہت کم مواد الفاظ کے حیرت انگیز گورکھ دھندے میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر انھیں دستاویزات کو توجہ سے دیکھا جائے تو یہ ایک متنوع، دل چسپ اور مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں بہت سے سماجی واقعات کا واضح بیان اور اخلاقی اصولوں اور سماجی طریقوں کا حوالہ ملتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ سماجی اہمیت کی معلومات کا بے ربط محاورات اور غیر یقینی لطائف کی موجودگی میں مطالعہ کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اور یہ تو علمی نقطۂ نظر سے کسی طرح مناسب نہیں کہ ان سے تاریخی حوالہ جات کے لیے رجوع کیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ مصنف اپنے اسرار میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا لیکن اس کا یہ تامل صرف دکھاوے کا ہے۔ اعجازِ خسروی کسی بادشاہ کے حکم یا کسی امیر یا صاحبِ اقتدار فرد کی خوشنودی کے لیے نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ ایک نجی دستاویز ہے جس میں مصنف نے کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس نے جو پابندیاں خود پر عائد کی ہیں وہ صرف اسلوبِ بیان کی ہیں اور یہ عائد کردہ ذاتی پابندیاں اس دور کے سیاسی حالات کے لحاظ سے ٹھیک ہیں۔ امیر خسرو کی اعجازِ خسروی کی قدر و منزلت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تقابلی ادب کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے[۲]

---

[۱] اعجازِ خسروی۔ ص ۵۳

[۲] ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن۔ جلد سوم۔ ص ۵۶۶۔ حیرت ہے کہ اس کتاب کا جو واحد اقتباس سرایچ۔ ایم۔ ایلیٹ کے لیے ایک منشی نے نقل کیا تھا اور جو انھوں نے اپنی کتاب (جلد سوم۔ ص ۶۷۔ ۵۶۶) میں شامل کیا ہے وہ ہے جس کے شامل کرنے کی سب سے کم ضرورت تھی۔ یہ اقتباس ایک مراسلہ ہے جو کسی سرکاری عہدے دار حاجب نے ولی عہد کو لکھا ہے۔ اس میں منگولوں پر فتح اور غزنی پر (حاشیہ جاری۔)

III ادب

ہم مستشرقین کی کوششوں کے شکرگزار ہیں جن کی وجہ سے ہمیں ہندو اور مسلمان صوفیاء اور مذہبی مصلحین کی دیگر متعدد کتابوں کے علاوہ بہت سے دیگر مضامین پر بھی کتابیں مہیا ہوئی ہیں۔ مثلاً متداول روایات و عقائد اور افسانے۔ شاعری اور گیت علمی فنون اور سیاسی و شرعی فرامین کے چند خلاصہ جات۔

(۱) متداول روایات و عقائد

سماجی تاریخ کے ایک طالب علم کو چند الفاظ میں روایات و عقائد کے غائر معاشرہ کے سلسلے میں بتایا جاسکتا ہے۔ نہ اس میں ایک درباری واقعہ نگار کی سی فصاحت اور حسن ہوتا ہے اور نہ دوسری تاریخی کتابوں یا تاریخی دستاویزات کی طرح صحت و فصاحت۔

(بقیہ گذشتہ حاشیہ) شاہی افواج کے قبضے کی خبر دی گئی ہے۔ مرتب کا خیال ہے کہ اس مراسلے میں ایک ایسے مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس پر مورخین خاموش ہیں۔ اصل عبارت جلد چہارم ص ۱۴۴- ۱۵۶ (مخطوطہ لکھنؤ) میں نقل کی گئی ہے۔ سرایچ۔ایم۔ایلیٹ اور ان کے منشی دونوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ اس مراسلے کی حیثیت اصل شاہی مراسلے کی سی نہ تھی بلکہ انشا پردازی کا ایک نمونہ تھا۔ اپنی کتاب کے جلد چہارم کے صفحہ ۱۸ پر امیر خسرو نے یہ بات واضح کردی ہے کہ اس جگہ جو خط شامل کتاب ہے وہ اس کی اپنی اختراع ہے۔ ص ۲۲ پر اس نے اس امر کا پھر اعادہ کیا ہے کہ "اس نے مصنوعی خطوط لکھنے میں اپنی قوتِ تخیل کو بہت استعمال کیا ہے۔ اس نے دوسرے لوگوں کی قوتِ تخیل سے بھی استفادہ کیا ہے جو پہلے ایسا ہی کرچکے تھے اور اس طرح ایک خوب صورت کتاب کی شکل دے دی ہے۔ ان مفرد اور مرکب الفاظ، مختصر اور طویل ترکیبوں اور مختصر اور طویل تحریروں کو مرتب کرکے ایک خوب صورت کتاب ترتیب دی ہے اور اس کتاب میں جو خطوط شامل ہیں وہ بالکل سرکاری معلوم ہوتے ہیں۔" اس حقیقت کا بیان غزنی پر قبضہ منگولوں کی شکست اور خط کا طرز کسی گذشتہ تاریخ سے لیا ہوگا جب کہ شیر خاں نے سلطان ناصرالدین کے نائب کی حیثیت سے غزنی پر قبضہ کیا تھا جس کا حوالہ پہلے کسی موقع پر دیا جاچکا ہے۔

لیکن اپنے طور پر یہ انسان کی روحانی زندگی کی تاریخ کو ترتیب دینے کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہ دعویٰ شعرا یا مفکرین کی تخلیقات کی طرح تو نہیں ہو سکتا البتہ کم وبیش عوام کی غیر مربوط رائے کی نمائندگی کرتا ہے[۱] روایات وعقائد کے علمی مطالعے کا مطالبہ اب دھیرے دھیرے تسلیم کیا جا رہا ہے۔ زیر بحث زمانہ محمد اوفی کی جوامع الحکایات کے افسانوں کی ترتیب سے شروع ہوتا ہے۔ مصنف سلطان التتمش کے دور میں رہا اور اس نے اپنی عظیم تصنیف کو اس کے وزیر نظام الملک جنیدی کے نام معنون کیا ہے۔ اس کتاب کو بہت خوب صورتی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کے عنوانات کے مطابق اسے ابواب وحصص میں بڑی خوبی سے تقسیم کیا گیا ہے۔[۲] اس زمانے میں کسی مسلمان واقعہ نگار سے اس کے ملک کی سماجی زندگی سے بہت قریبی تعلق کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے جوامع الحکایات بیرونی مسلم ممالک کے مراکز جیسے غزنی، بغداد وغیرہ کی زیادہ تفصیلات فراہم کرتی ہے اور اس میں دہلی یا ملتان کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے۔ پھر بھی یہ سلاطین کی زندگی پر کافی دل چسپ روشنی ڈالتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ ودیاپتی ٹھاکر کی کتاب "پرش پریکشا" گو کہ دیگر ہم عصر اخلاقی کتابوں کی طرح روایتی طریقے پر ہی لکھی گئی ہے ہمارے لیے بہت مفید ہے[۳] ہندوؤں کے اخلاقی تصورات کی جانچ سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور ہم عصر اور قدیم سماجی زندگی کی مثالوں کے ذریعے اس کی اخلاقی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ تاریخی امثال کا انتخاب کرتے وقت مسلمانوں اور ہندو پست اقوام کو فراموش نہیں کیا ہے۔ مجموعی طور پر اس

---

[۱] کریپ۔ تعارف۔ ص XV

[۲] ایم۔ نظام الدین نے ۱۹۲۹ء میں گب میموریل فنڈ کی جانب سے اس کتاب کے مضامین کی فہرست کو ایک مفید تعارف کے ساتھ شائع کیا ہے۔

[۳] ودیاپتی ٹھاکر کی تاریخ کا تعین نہیں ہوا ہے۔ پی۔ کے۔ چٹرجی کی رائے ہے کہ وہ ۱۴۰۰ سے ۱۴۳۸ تک یقیناً زندہ تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز کلکتہ یونیورسٹی ۱۹۲۷ء ص ۳۶) میں نے ایک قدیم انگریزی ترجمہ سے استفادہ کیا ہے جو غالباً اسکول یا کالج کے لیے بمبئی سے شائع ہوا تھا۔

زمانے میں سنسکرت ادب تنزّلی کی طرف مائل تھا اس لیے ہم ترقی پذیر پراکرت یا صوبائی زبانوں کے مطالعے سے زیادہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

شیر شاہ کے دور میں اودھ کے مشہور شاعر ملک محمد جائسی گزرے ہیں جنھوں نے فخر کے ساتھ اپنی شیریں زبان اودھی میں نظمیں لکھیں اور گائیں۔ بعض لحاظ سے وہ امیر خسرو سے بھی زیادہ عظیم تھے کیوں کہ امیر خسرو نے اپنی تصنیفات کو مسلم سماج اور اسلام کے مروّجہ طرزِ فکر تک ہی محدود رکھا جب کہ جائسی نے ہندو مذہب اور اسلام دونوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی زندگی کے طرزِ فکر میں وہ مسلمان کم اور ہندو زیادہ تھے۔ وہ ہندوستان کا قدیم ترین دیسی شاعر ہے جن کی کتابیں آج تک باقی ہیں[1]۔ اپنی مشہور کتاب پدماوت میں جائسی نے چتوڑ کے راجہ رتن سین کی مشہور کہانی کے واقعات دور افتادہ سمہالیہ کی شہزادی پدماوت کے ساتھ راجا کی شادی، اس کی علاءالدین خلجی سے جنگ اور دہلی میں نظر بندی اور آخرکار اپنی رانی کی عقل مندی اور اپنے دو وفاداروں کی شجاعت کی وجہ سے اس کا شاہی قید خانے سے حیرت انگیز طور پر بچ نکلنا وغیرہ واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ کہانی کا سمہالیہ (جسے عام طور پر لنکا سمجھا جاتا ہے) جنوبی ہند کی کسی ہندو ریاست کے دارالخلافہ کے علاوہ کوئی اور جگہ نہیں ہے۔ سمندروں اور جنوبی ممالک کا بیان (ہندوؤں کی ڈرامائی روایات پوری کرنے کے لیے) اس قدر حیرت انگیز ہے کہ اس میں شک ہے کہ آیا کبھی مصنف کو دوآبے یا اودھ کی سرحد سے باہر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ دوسری کتاب مالوے کے باز بہادر اور روپ متی کا افسانہ ہے جسے احمد العمری نے لکھا تھا اور جو آج کل کرنپ کے ترجمے کی شکل میں Lady of The Lotus. کے عنوان سے چھپ چکی ہے۔ یہ نظم دل چسپ لیکن غم انگیز ہے اور مالوے کی سماجی زندگی پر ضمنی روشنی ڈالتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو گریرسن۔ پدماوت۔ تعارف ص ۲۔ ملک محمد جائسی کی دو نظمیں پدماوت اور اکھراوت اب دستیاب ہیں۔ پدماوت کے ایک حصے کو گریرسن اور دویدی نے ۱۸۹۶ء میں مرتب کیا تھا۔ لیکن ہندو عالم کی موت پر کام بند کرنا پڑا تھا۔ اکھراوت کو بنارس کی ناگری پرچارنی سبھا نے سنہ ۱۹۰۴ء میں شائع کیا تھا۔

(۲) نظم اور گانے

امیر خسرو اور امیر حسن کے علاوہ اس زمانے میں دوسرے متعدد شعرا تھے جن کی کتابیں آج کل نایاب ہیں۔ بدر چاچ کی نظمیں ملتی ہیں اور بدایونی نے اپنی تاریخ میں دوسرے شعرا کے مختصر حوالے دیے ہیں لیکن ان نظموں کی قدر و قیمت ہمارے موجودہ مقصد کے لیے ناکافی ہے۔ ان کی زبان غیر ملکی اور ان کا طرزِ بیان بہت رسمی ہے۔ مجموعی طور پر فارسی شعرا، ہندوستان کے ان شعرا سے بہت مختلف تھے جنھوں نے اپنی زبان ہی میں شعر کہے۔ ان میں بنگال کے چنڈی داس اور مکندرام مشہور ہیں۔ کوئی بھی سماجی تاریخ کا طالب علم ان سے مسرت اور فائدہ حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتا[1] نظم کے میدان میں زیادہ اہم سرگرمی مذہبی گیتوں (بھگتی گیت) کے سلسلے میں دکھائی گئی جو سماجی حالات کے مطالعے کے لیے بہت اہم اور مفید ذریعہ ہیں۔ ان کا طرزِ بیان عام طور پر افسردہ اور سماجی زندگی پر ان کا تبصرہ کسی حد تک غیر متوازن ہے۔ اس کے باوجود ان میں معلومات کا خزانہ ہے اور یہ ان گہرے جذبات کو ظاہر کرتی ہیں جنھوں نے اس دور کے عوام میں حرکت پیدا کی۔ ہندوستان کے ہر حصے میں ان گانوں کے بڑے قیمتی مجموعے ہیں جن میں چند مشہور و معروف مندرجہ ذیل ہیں:

للّا کشمیر میں۔ پنجاب میں نانک۔ گنگا کے شمالی میدان میں کبیر۔ بہار اور اڑیسہ میں ودیاپتی ٹھاکر اور بنگال میں چیتنیہ۔ یہ لوگ اس دور کے ہندوستان کے عوامی

---

[1] مکندرام کا زمانہ سولھویں صدی کا آخری حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس کی نظموں کے کچھ دلچسپ اقتباسات جے۔ این۔ داس گپتا کی کتاب "بنگال ان دی سکسٹینتھ سینچری" Bengal in the Sixteenth Century میں دیے گئے ہیں۔ ٹی۔ ڈی گپتا نے حال ہی میں اپنی کتاب "آسپکٹس آف دی بنگال سوسائٹی" کو جنرل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز سے ۲۰-۱۹۲۷ء میں شائع کیا ہے۔ بنگال کی سماجی تاریخ کے مطالعے کے لیے بنگالی زبان کے ادبی مواد سے خصوصاً استفادہ کیا ہے جس میں بنگالی نظم، رزمیہ نظموں اور عوامی گیتوں کا معائنہ کیا گیا ہے۔

امرار کی زندگی اور طور طریقوں کو بھی ناپسند کرتے تھے لیکن وہ برسراقتدار طبقے کی طاقت سے اس حد تک خوف زدہ تھے کہ نہ ان سے شدید اختلاف کرسکتے تھے اور نہ ان پر ایمان دارانہ تنقید۔ قدامت پسندانہ اسلام کی متفقہ روایت کے علاوہ ان کے پاس عوام کو دینے کے لیے بہت کم تھا اور اس طرح انھوں نے اپنے آپ کو بدعتی اور عدم تقلید کے الزام کا موجب قرار دیا۔ اس لیے صوفیار کی تصانیف ہمارے موجودہ مقصد کے لیے بہت کارآمد ہیں۔ البتہ میں نے (متوفی ۱۳۸۷ء) کی ذخیرۃ الملوک اور صحیفۂ شیخ صدرالدین (متوفی ۱۵۳۶ء) سے استفادہ کیا ہے۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کا طرز فکر بہرحال کسی حد تک مختلف ہوتا ہے۔ اگر وہ کفار (غیر مسلموں) کی زندگی سے دل چسپی نہیں رکھتا تو بھی وہ مسلمانوں کو ان کے برُے اثرات سے دور ہی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ ایک کافر کو مسلمان بنا کر آخرت میں جزا حاصل کرنے میں بالکل دل چسپی نہیں لیتا۔ مذہب کی عملی شکل میں ایک صوفی اور راسخ العقیدہ مسلمان میں فرق کرنا کسی قدر مشکل ہے سوائے ان شدید حالات کے کہ جب ایک صوفی اسلام پر چند مخفی اور صوفیانہ خیالات کو زبردستی ترجیح دیتا ہے اور قرآن و حدیث کے معنی و مفہوم کی تشریح اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے کرتا ہے اور راسخ العقیدہ اسلامی عقائد کی لغوی ترجمانی کے خلاف عمل کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ قدیم عقائد کے طرز پر لکھی ہوئی دو کتابیں ہیں امیر خسرو کی مطلع الانوار اور یوسف گدا کی تحفۂ نصائح۔ خسرو کی کتاب جس کا ذکر کیا جا چکا ہے اپنے دور کے عقائد کی ایک ناگوار تفسیر ہے۔ وہ مسلمانوں کے ہر فرقے اور اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر بحث کرتا ہے۔ تحفۂ نصائح میں تفقد کے مقابلے میں وضاحت زیادہ ہے۔ پندونصائح پر مبنی اپنی نظم میں انھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا ہے۔ راسخ العقیدہ حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کا عمومی جائزہ لیا ہے۔ اس میں زیادہ دل چسپی کے ساتھ اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہندوستان کے قدامت پسند مسلمانوں کی زندگی میں کس حد تک ہندو رسوم و عقائد اور دوسرے عام توہمات داخل ہو چکے تھے[۱]

[۱] یوسف گدا مشہور شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنی کتاب کو ۱۳۹۳ء میں ترتیب دیا۔ (دیکھیے فہرست کتب صفحہ ۳۴۷) کتاب میں صرف ۷۷۶ اشعار ہیں لیکن مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس نے قدیم عقاید و اعمال کو کلی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تحفۂ نصائح از یوسف گدا۔ صفحہ ۲۹)۔

(۲) علمی فنون اور خلاصہ جات

کارآمد فنون پر بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو ہم عصر سماجی زندگی کے مطالعے کے لیے زیادہ مفید ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب نعمت خانہ ناصرشاہی میں جو مطبخی فن پر ایک خلاصہ ہے، خوشبو، صابن، عطر بنانے اور مختلف قسم کے کھانے اور نفیس غذائیں تیار کرنے کی متعدد ترکیبیں درج ہیں[1]۔ دوسری کتاب ہدایت الرّامی تیراندازوں اور ان سب کے لیے جو تیرکمان کے استعمال میں دل چسپی لیتے ہیں ایک جامع رہنمائی کرتی ہے[2]۔ اس قسم کی کتابوں میں اہم ترین کتاب فقۂ فیروز شاہی ہے۔ یہ مذہبی اور معاشرتی قوانین کا ایک خلاصہ اور ایک دل چسپ تاریخ ہے۔ یہ شروع میں کسی یعقوب کرانی نے تصنیف کی تھی جو کتاب کو ختم کیے بغیر ہی انتقال فرما گئے۔ مصنف کی وفات کے بعد کتاب فیروزشاہ تغلق کے علم میں لائی گئی۔ اس نے اس پر نظرثانی اور اضافے کا حکم دیا اور اس طرح کتاب موجودہ شکل میں تیار ہوئی۔ اس میں قانونی ہدایات ہیں جو غالباً محکمۂ قضا کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی تھیں۔ لیکن اس بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال بے خوف و خطر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی نیم قانونی مجموعوں کی صرف اس بنا پر تاریخی اہمیت کم نہیں ہوتی کہ آج کل کے مجموعۂ قوانین کے مقابلے پر نہیں آتے۔ دوسری کتابوں کی بہ نسبت ان کتابوں نے سماجی حالات واضح طور پر پیش کیے ہیں اور اس طرح ان کی اہمیت متعین کی

---

[1] انڈیا آفس کے مخطوطہ کے واحد نسخہ پر (جسے ۱۶۳۴ء اور ۱۶۳۵ء کے درمیان نقل کیا گیا) نہ تاریخ تصنیف ہے اور نہ مصنف کا نام۔ ایتھے نے بھی اس کی تصنیف کی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی ہے۔ (ملاحظہ ہو ایتھے ص ۱۴۹۹) اس کے مضامین کی فہرست اور اصل مخطوطے کی تحقیق کے بعد مجھے یقین ہے کہ اس کی تصنیف مالوے میں وہاں کے خلجی سلاطین کے دور میں ۱۵۰۰ء سے پیشتر ہوئی تھی۔ اس کی حیثیت شاہی باورچی خانے کے لیے سرکاری رہنما کی سی ہے جس میں مصنف کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

[2] ہدایت الرّامی بنگال کے حسین شاہ کے دور میں تصنیف ہوئی (۹۰۴ء تا ۹۲۷ء) (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ریو۔ ص ۴۸۹)

جا سکتی ہے[1] دوسری کتاب ضیاءالدین برنی کی فتاوئے جہاں داری ہے جو کلی طور پر شرعی فتووں، فہمائشوں اور ہدایات پر مبنی نہیں ہے (ملاحظہ ہو ایتھے) بلکہ کسی حد تک کسی شہزادے کے لیے سیاسی رہ نما کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کے سیاسی اخلاقیات کا ایک مجموعہ ہے۔ اسی طرح کی ایک ہم عصر تصنیف آداب الملوک از فخرالدین مبارک شاہ کے ساتھ اپنے زمانے کے سیاسی خیالات پر قدرے روشنی ڈالتی ہے لیکن ان مجموعوں کا لہجہ علمی ہونے کے بجائے نظریاتی ہے۔ بہرحال ان کی قدر وقیمت اس دور کے سماجی نشوونما کی وضاحت میں بہت کم ہے۔ تاہم ہمیں اپنے موجودہ مقصد کے لیے ان کے عنوانات پر تفصیلی بحث مقصود نہیں ہے۔[2]

غیر ملکی سیّاح

بعض لحاظ سے ہم عصر سماجی تاریخ کے لیے اہم ترین مواد غیر ملکی سیاحوں کے بیانات سے فراہم ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان میں مختلف ممالک سے مختلف اوقات میں آئے اور ہندوستان میں ایک قابلِ تحسین بے تعلقی اور علمی تجسّس کے ساتھ گھومے۔ بدقسمتی سے چند مستثنیٰ سیاحوں کو چھوڑ کر ان کا دائرۂ عمل چند ساحلی شہروں اور سمندر کے ملحق ایک پتلی سی پٹی کے علاقوں تک محدود رہا۔ اور غالباً وارتھیما کے علاوہ سبھی سیاح اس ملک کی زبان سے بالکل ناواقف تھے۔ ان خامیوں کے باوجود ان کے بیانات بہت قیمتی ہیں۔ خاص طور پر ایک پہلو سے کہ صرف غیر ملکی سیاحوں نے ان ناگوار رسم ورواج کو تحریر کیا ہے جنھیں عام طور پر معیوب سمجھا جاتا ہے[3] یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے

---

[1] فقہ فیروزشاہی کا خاکہ مسلمانوں کی قانونی کتابوں کی تقلید پسند نظریہ کے مطابق اس میں عربی متن اور ہدایات کی فارسی میں تشریح کی گئی ہے اور ان سوالات پر دیگر فنی قانون دانوں کے خیالات کو بیان کیا گیا ہے۔

[2] انڈیا آفس کے مخطوط مجموعے کو یہ عنوان دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک تلخیص کا نام آداب الحرب ہے جو برٹش میوزیم کے منتخب مجموعوں میں سے ایک ہے

[3] بنگالی سماج کے مطالعے کے لیے ڈی. ڈی. گپتا کا مشہور مقالہ جو صرف بنگالی ادب کی بنیاد پر لکھا گیا ہے اس سلسلے میں سماجی حقائق کو پیش کرنے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔

کہ ملک کے انتہائی بے رحمانہ سماجی رسم ورواج میں سے کسی ایک کو بھی ہندو یا مسلمان مصنفین، شعرا اور مذہبی مصلحین میں سے کسی نے بھی توجہ اور اظہارِ خیال کے قابل نہیں سمجھا۔ اگر کوئی شخص غلامی، بیواؤں کے جلانے، چھوت چھات، بچپن کی شادی، انتہائی نفسانی خواہشات اور نفسانی بے راہ روی کے بارے میں معلومات جمع کرنا چاہے تو ہندوستان کی تصنیفات میں ان امور کی تلاش اور جستجو کرنا تقریباً بیکار ہوگی۔ گرونانک جیسے عظیم سماجی مصلح اور کبیر، چیتنیہ، نظام الدین اولیا جیسے صوفیا اور پیشوا تک ان اہم برائیوں پر اپنی رائے ظاہر کیے بغیر گزر جاتے ہیں اور اگرچہ انھوں نے غیر معمولی جوش کے ساتھ ملاگیری کی مخالفت کی ہے لیکن اس نمایاں اور مجاہدانہ طریقہ سے وہ ان اہم برائیوں کے خلاف کوشش نہیں کرتے۔ ان مسلمان مورخین کو جو ان حالات کو زیادہ صحت مندانہ اور آزادانہ طرزِ فکر سے پیش کر سکتے تھے۔ انھیں ان واضح سماجی برائیوں کی وجہ سے انسانی شخصیت کی تباہی پر کوئی خاص شکایت کا موقع نظر نہیں آیا۔ اس کا سبب یہ تھا، جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائے گا یہ سب کچھ ان کی زندگی کے طرزِ فکر کے پیشِ نظر ان کی طبیعت کے خلاف نہیں تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ سماجی برائیاں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی نظر میں سماجی ڈھانچے کی عام خصوصیتیں تھیں۔ ۱۳ ویں سے ۱۶ ویں صدی تک غیر ملکی سیاح متواتر ہندوستان آتے رہے۔ ۱۳ ویں صدی میں مارکو پولو آیا جس نے تقریباً ۱۲۷۳ء میں مشرقی ممالک کی سیاحت کے لیے طویل سفر شروع کیا۔ ۱۴ ویں صدی میں اسی قدر مشہور اور ہمارے لیے بے حد اہم سیاح ابنِ بطوطہ آیا جس نے اپنی زندگی (۱۳۲۵ تا ۱۳۵۴ء) اس دور کی دنیائے اسلام کی سیاحت میں صرف کی۔ ۱۵ ویں صدی میں کم سے کم پانچ سیاح آئے جن کے بیانات ہم تک پہنچ سکے ہیں۔ یہ صدی ۱۴۰۵ء سے چینیوں کی ایک بحری سفارت سے شروع ہوتی ہے جس کے مسلمان معتمد ماہوان کے بنگال اور مالابار کے بارے میں اپنے مشاہدات تحریر کیے ہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد نکولو کونتی (۱۴۱۹ تا ۱۴۴۴ء) آیا۔ اس صدی کے تقریباً وسط سنہ ۱۶۶۳ء میں ایرانی سفیر عبدالرزاق وجے نگر میں آیا۔ نکیتن اور اسٹیفنو اس صدی کے اختتام تک آئے۔ ۱۶ ویں صدی کے شروع میں ورتھیما (۱۵۰۲ تا ۱۵۰۸ء) تقریباً ۱۵۱۸ء میں باربوسا آیا اور زیرِ بحث زمانہ کے اختتام تک (۱۵۵۳ تا ۱۵۵۶ء)

ترکی امیرالبحر سیدی علی رئیس آئے۔ اگر غیر معمولی تلاش سے کام لیا جائے تو کچھ نئے سیاحوں کے بیانات کا روشنی میں آنا کوئی حیرت انگیز بات نہ ہوگی[1] ان سیاحوں میں سب سے زیادہ عالم ابن بطوطہ، عبدالرزاق اور سیدی علی رئیس تھے[2] چوں کہ عبدالرزاق نے صرف دجے نگر کے حالات لکھے ہیں اس لیے ہم سے براہِ راست اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بہترین اور مکمل ترین حالات ہمیں ابن بطوطہ سے معلوم ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی کسی نے ملک کے اندرونی حصوں میں اتنی دور تک جانے میں خود کو خطرے میں نہیں ڈالا۔ نہ اتنے طویل عرصے تک کسی نے قیام کیا اور نہ کسی نے

---

[1] ان سفیروں کے شائع شدہ حالات میں "مارکوپولو" از ہنری یول کو بڑی اہمیت حاصل ہے مارکوپولو" کا نیا ترجمہ ایلزبیتھ کے دور میں جان فریمپٹن نے کیا تھا (۱۵۷۹ء) ہ اور اب کے ایڈیشن کی صورت میں دستیاب ہے۔ اس اڈیشن میں نکولو کونٹی کا نیا اور زیادہ مکمل ترجمہ بھی ہے جو میجر کے انڈیا ان دی ففٹینتھ سنچری "India in the fifteenth Century" میں دیے گئے ترجمے سے بہتر ہے کونٹی کی پیرو ٹیفور کے ساتھ ہندوستان سے متعلق گفتگو کی دوسری تفصیلات پیرو ٹیفور کے سفرنامے میں شایع ہوئی ہیں جو براڈوے ٹریولرز سیریز کے تحت شائع ہو چکا ہے۔ ماہوان کے حالات جارج فلپ نے ترجمہ کرکے جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی سے ۹۴-۱۸۹۵ء میں شائع کیے۔ عبدالرزاق اسٹیفینو اور نکیٹن کے حالات محولہ بالا میجر کی کتاب میں دیے گئے ہیں اور ہکلویت سوسائٹی نے انھیں شایع کیا ہے۔ ابن بطوطہ کا مکمل انگریزی ترجمہ دستیاب نہیں اس لیے میں نے اپنے مطالعے کے لیے عربی متن سے استفادہ کیا ہے جو ۱۸۷۰-۱۸۷۱ء میں قاہرہ سے شایع ہوا تھا۔ وارتھیما اور باربوسہ کے انگریزی ترجمہ لندن ہکلویت سوسائٹی نے شایع کر دیے ہیں۔ سیدی علی رئیس کے حالات ویمبرے کے انگلش ترجمے کی صورت میں دستیاب ہیں۔ اس کا ایک نیا اور بہتر ترجمہ شایع ہو رہا ہے۔

[2] فریمپٹن۔ تعارف صفحہ IX مارکوپولو کے حالات پر تنقید کے لیے۔ یورپی سفیروں کے مشاہدات کم و بیش جنوبی ہند تک محدود ہیں اور انھوں نے سماجی زندگی کے چند حقائق ہی کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔ انھیں کا اعادہ بھی ہوا ہے اور وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی دوسرے کی کتابوں سے اخذ کیے گیے ہوں۔

اتنے وسیع پیمانے پر سماجی حالات قلم بند کیے۔ اس کی شہادت براہِ راست اور ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ اس کے تجربات قریبی اور گہرے ہیں۔ لوگوں سے قریبی ملاقات کے مواقع اسے بہت زیادہ ملے ہیں اور آخر کار وہ اپنے مشاہدات کو ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھ کر ضبطِ تحریر میں لاتا ہے جہاں وہ اپنے ملک میں ہے اور باحفاظت ہے اور اس کا امکان بہت کم ہے کہ اس نے حقائق کو پوشیدہ رکھا ہو یا ان کی غلط نمائندگی کی ہو۔ اسی طرح اس کا بیان اُس دور کے ہندوستان کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہاں سیّاح ہندوستان کے باشندوں ہی کی طرح ان میں گھل مل کر رہتا ہے شادی کرتا ہے (جیسا کہ اس نے دوسرے ممالک میں کی) بچے ہوتے ہیں۔ وہ سرکاری ملازمت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ دہلی کے سلطان کی طرف سے چینی شہنشاہ کے دربار میں جانے کے لیے ایک معتمد سفیر کی حیثیت سے مقرر کیا جاتا ہے۔ وہ زاہدانہ زندگی بھی بسر کرتا ہے جو اس دور کا عام روحانی خبط ہے اور ایک پناہ گزین کی حیثیت سے اِدھر اُدھر چھپتا پھرتا ہے لیکن پھر بھی دوسرے متعدد لوگوں کی طرح ابن بطوطہ کی بھی ذہنی حدود ہیں۔ وہ کبھی کبھی صوفیاء کی کرامات و حیرت انگیز واقعات پر یقین کے سلسلے میں ایک سچے بربری کی طرح ضرورت سے زیادہ آرزومند رہتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنے طویل سفروں کی نہ یادداشت رکھی اور نہ باضابطہ اشارے تحریر کیے اور نہ ہندوستان کے سیاسی زندگی کے وسیع تر حقائق کا توجہ سے اور باقاعدہ مطالعہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مشاہدہ کرنے میں متعدد غلطیاں کی ہیں اور کبھی کبھی حقائق کے بیان میں دل چسپ غلط بیانیوں سے کام لیا ہے[1] سیدی علی رئیس کے بیانات اگرچہ

---

[1] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو کتاب الرحلہ، جلد دوم، صفحہ ۱۱، ۱۱۷، ۲۱، ۳۰، ۲۱۔ ان میں چند دل چسپ غلط بیانیاں بھی ہیں کہ سلطان معز الدین کیقباد نے دہلی کی قطب مینار تعمیر کرائی، یہ کہ اوپر جانے والا راستہ ایک ہاتھی کے اوپر جانے کے لیے بھی کافی تھا، یہ کہ غیاث الدین بلبن سلطان ناصر الدین محمود کو قتل کر کے تخت نشین ہوا تھا، یہ کہ جب غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا تو تخت نشینی کے لیے باپ بیٹے میں نزاع تھا اور آخر کار جب اول الذکر سلطان بن گیا جونا خاں (بعد میں محمد تغلق) نے باپ کے خلاف تلنگانہ پر حملے کی رہ نمائی کرنے کے بہانے دکن میں کامیاب بغاوت کی۔

مختصر، لیکن دل چسپ ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے حقائق کو سمجھنے اور کسی قوم کی تہذیب کا اندازہ لگانے کے لیے اس کا ذہن بہت باشعور تھا۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے ابتر سیاسی حالات اور ترکی حکومت کے لیے اس کی محبت اور عقیدت نے اسے ہندوستان سے جلد لوٹنے پر مجبور کیا۔

کم اہم ذرائع معلومات ۔ خط وکتابت

کم اہم ذرائع معلومات میں ذاتی اور سرکاری خطوط کے مجموعوں کو شامل کیا جاسکتا ہے جیسے محمد گاوان کی ریاض الانشاء، طاہرالحسینی کا انشا نامہ اور ترکی کے بایزید دوم اور محمود دوم کے خطوط۔ ان سب میں ہندوستان کے متعلق حوالے ملتے ہیں۔ سردست زیر نظر ہندوستان کے سماجی مطالعے کے لیے بس یہی شہادت اس وقت پیش کی جاسکتی ہے۔

کبھی کبھی ایک معقول اعتراض کیا جاتا ہے کہ صرف مسلم اور دیگر ذرائع سے حاصل کی ہوئی سماجی زندگی کی یہ تصویر ہندو سماج کے ساتھ انصاف کرنے میں ناکام رہے گی یا پھر اسے ہمدردی اور رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے گی۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ مسلمان مورخین اور علماء نے دانستہ طور پر ہندوؤں کی سماجی زندگی کی غلط نمائندگی کی ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی تہذیبی تنازعہ نہیں تھا درحقیقت تہذیبی قوتیں ان دونوں کے مکمل اتحاد کے لیے تیزی سے کام کر رہی تھیں ان قوتوں کی موجودگی میں اس طرح کے امتیاز کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مسلمانوں میں تاریخی تصانیف کی ترقی کی ایک بہت صحت مند اور طویل روایت ہے اور ذہنی ایمان داری کی مثالیں ضیاء الدین برنی اور عبدالقادر بدایونی جیسے کٹر مورخین کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ امیر خسرو اور ملک محمد جائسی کے ساتھ ہم ایک بالکل مختلف اور کم وبیش قومی نظریے کے دور میں قدم رکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندو علماء اگر کچھ تھے بھی تو وہ چند علمی مرکزوں میں عزلت گزیں تھے جیسے کشمیر یا بنارس اور سماجی زندگی کے اہم دھاروں سے قطعاً الگ تھلگ تھے۔ یہ بات بھی مشتبہ ہے کہ ان لوگوں کو مناسب تہذیبی روایات یا اچھے مورخ بننے کے لیے صحیح طرز فکر وراثت میں ملا تھا۔

مسلم ماخذوں پر تعصب کا الزام تو لگایا نہیں جا سکتا ہاں دیگر حدود البتہ قابلِ غور ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخوں میں سماجی تعلق کم ہی ملتا ہے۔ ان کے لیے درباروں شہروں یا چند مذہبی حلقوں سے باہر کی زندگی کوئی کشش نہیں رکھتی۔ عام طور پر ان لوگوں کو ہندو سماج حتیٰ کہ نچلے طبقے کے مسلمانوں تک کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی جن کی زندگی ہندو عوام سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ ظاہر ہے یہ ہندو سماج کے مطالعہ کے لیے بنیاد ناکافی تھی۔ بدقسمتی سے راجپوتانہ کی دستاویزات کی جو ہندو تہذیب اور ہندو نظام حکومت کا واحد مرکز تھا ابھی تک اچھی طرح چھان بین نہیں کی گئی ہے۔ ہماری معلومات کا اہم ماخذ ابھی تک جیمز ٹوڈ کی قدیم نامی گرامی تصنیف ہے۔ ہمیں امید ہے کہ راجپوتوں کی دستاویزات اور معلومات کے دیگر ماخذوں کا تنقیدی مطالعہ کبھی نہ کبھی اس زمانے کے ہندو سماج سے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کرے گا۔

صرف مندرجہ بالا مواد کی روشنی میں ہندوستان کی سماجی حالت کی مکمل تصویر پیش کرنا بظاہر ناممکن ہے۔ ان حالات میں یہ امر تسلی بخش ہے کہ ہندوستانی سماج کے کم و بیش غیر متبدل حالات میں سماجی تاریخ کا ایک طالب علم اپنے حقائق و نتائج کو ہمیشہ موجودہ زمانہ حالات کے آثار سے مقابلہ کر کے جانچ سکتا ہے اور موجودہ مشاہدات کی روشنی میں ماضی کی ایک صحیح تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں ایسا طرزِ فکر اگرچہ عموماً مددگار ثابت ہوگا تاہم اس میں دو باتوں کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ ہمارا وسطی دور تقریباً چار صدی کی سماجی نشوونما کے ذکر پر مشتمل ہے اور اس میں مغرب کی صنعتی ترقی کی نئی سماجی قوت کا نفاذ بھی شامل ہے۔ خیال غالب یہ ہے کہ اس زمانے کے حالات ہندوستان میں روز افزوں سماجی پیچیدگی کو نئے سماجی مفہوم اور نیا مواد فراہم کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں۔ دیگر یہ کہ امپیریل گزیٹیر آف انڈیا۔ کروک اور گریرسن جیسے مصنفین اور چند سرکاری روداد کے علاوہ ہندوستان کا سلسلہ وار اور باقاعدہ سماجی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے تجربہ کار متداول عقاید و روایات نویسوں اور ماہرینِ عمرانیات کی توجہ کی منتظر ہے۔ میں نے جہاں کہیں ضرورت پیش آئی موجودہ زمانے میں ان باقی ماندہ

آثار کا ذکر حوالہ جات میں زمانہ حال کی کتابوں سے کیا ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے خاکے کا تعلق ہے میں نے اس میں متعدد سیاسی اور سماجی اجزار کا مطالعہ بھی شامل کیا ہے جو میرے نزدیک ہندوستان کے سماجی نشوونما کی مناسب عکاسی کرنے میں مددگار معلوم ہوتا ہے۔ معاشی حالات کا ذکر کرتے ہوئے میرا مدعا سماجی زندگی کو بہتر ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے معاشی اعداد و شمار دینا ہے[1] جہاں تک اصل عبارات کا تعلق ہے میں نے ان کے لفظی ترجمہ کی بجائے آزاد ترجمہ کیا ہے۔ کہیں کہیں میں نے نسبتاً طویل اقتباسات کا صرف خلاصہ دینے پر اکتفا کیا ہے۔ مختصرات صرف مخطوطات اور شایع شدہ کتب کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں اور ماخذ میں اصل کتاب کے بجائے یہ اشارے کیے گئے ہیں۔ مقالہ کے آخر میں کچھ عام نکات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے دو ضمیموں کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے جیسے وقت مقام اور سکوں وغیرہ انداز اور سلاطین دہلی کی حکومت کا تاریخ وار ذکر۔

---

[1] ملاحظہ ہو جرنل آف انڈین ہسٹری الہ آباد ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۴۷۔ جس میں اس دور کے معاشی حالات پر ایک اہم رسالے کی تصنیف کی تفصیلات ہیں۔

حصّہ اوّل

سیاسی حالات

حصّہ اوّل

سیاسی حالات

سلطنت اور مسلم سماج پر اس کا ردِّ عمل

یہ امر ابھی تک کسی قدر غیر واضح ہے کہ سلطان کا لقب کب اور کس طرح وجود میں آیا۔ اس لفظ کا سب سے پہلے استعمال ان فرمانرواؤں نے کیا جنھوں نے بغداد[1] کے سابق صوبوں میں آزاد حکمرانوں کی حیثیت سے اپنی حکومتیں قائم کی تھیں۔ سلطنت اور سلطان کی اصطلاحات ایک مشترک مادّے سے ماخوذ ہیں جس کے معنی طاقت اور اقتدار کے ہیں اور عموماً اس طرزِ حکومت کے لیے استعمال کی جاتی ہیں جو دنیائے اسلام میں حضرت محمد کے اولین چار خلفا کے فوراً بعد وجود میں آیا لیکن جو حقیقت میں قرآن[2] کے بتائے ہوئے اصولوں پر مبنی نہ تھا۔ سلاطینِ دہلی کے زمانے میں اقتدارِ اعلیٰ اور فرماں روائی کے نظریہ کا مطالعہ بہت دل چسپ ہے کیوں کہ یہ نہ صرف ان کے سیاسی افکار پر روشنی

---

[1] جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۲۸ برائے بواحد حکران جسے سلطان الدولہ کہا جاتا تھا اور جس نے سنہ ۴۱۵ھ میں وفات پائی۔ محمود غزنوی نے بواحد حکومت پر سنہ ۴۱۹ھ میں حملہ کیا۔ سلجوقوں کا یہ خطاب اختیار کرنے کے لیے ملاحظہ ہو آرنالڈ۔ ص ۲۰۲

[2] قرآن مجید ۲۰ : ۳۰ اور مترجم کے نوٹ کے لیے دیکھیے ص ۲۳ ، ۲۴۰۔ قرآن کا منشا تھا کہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو جس میں اللہ کے حکم سے اس کی مخلوق پر خلیفہ حکومت کرے۔ اس کے برخلاف سلطنت مذہبی حکومت نہیں ہے بلکہ ایک لا مذہبی حکومت ہے جس میں انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرتا ہے۔

ڈالتا ہے بلکہ وسیع طور پر ان کی زندگی کے پورے نظریات کو واضح کرتا ہے۔ قرآن کی نظریاتی خلافت سے سلاطینِ اسلام کے استبدادی طرزِ حکومت تک کی یہ اہم تبدیلی وضاحت طلب ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیمات کم و بیش قابلِ اطمینان حد تک مدینہ کے قبائلی ماحول اور وہاں کی مضبوط جمہوری روایات پر اثر انداز رہیں لیکن جیسے ہی اسلام ایک شہری حکومت کی حدود سے باہر نکل کر پھیلنا شروع ہوا قرآن کی تعلیمات ایک وسیع تر سیاسی ڈھانچے کو متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں اور مشورہ[1] کا نامکمل اور تشنہ نظریہ کبھی بھی ایک قابلِ عمل سیاسی دستور کی حیثیت سے موزوں نہ بن سکا۔ بہرحال اسلام کی سیاسی اور علاقائی توسیع بہت تیزی سے جاری رہی۔ جلدی ہی منتشر عرب قبائل کو ایک ایسی مضبوط اور مستحکم حکومت کے زیرِ اثر لانے کی ضرورت محسوس کی گئی جس کا دائرہ کار وسیع تر اور روز افزوں تھا۔ قرآن کے احکام اور مدینہ اور اس کے چاروں ابتدائی خلفاء کے مثالی دور کی اہمیت ایک مضبوط اور مستحکم سیاسی ڈھانچے کی ضرورت کے پیشِ نظر کم تر ہو گئی۔ یہ نادر حقیقت ہے کہ عرب مفکرین ملوکیت کے عروج کے مسئلے پر فلسفیانہ ڈھنگ سے سوچنے کے عادی ہیں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سماجی نظام کے قیام اور بقا کے لیے ضروری ہے۔ ان کے خیال کے مطابق بادشاہی تہذیب کے لیے ایک ناگزیر ابتدائی شرط ہے۔ وہ یہ کہتے بھی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ ایک غیر انصاف پسند اور جابرانہ بادشاہی ایک مطلق العنان آزادی[2] سے بہتر ہے۔ مختصر یہ کہ اب مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ وہ طوائف الملوکی اور مطلق العنانی میں سے کسی طرزِ حکومت کو اپنے لیے منتخب کریں اور انھوں نے اوّل الذکر طرزِ حکومت کو اپنے لیے پسند کر کے دانشمندی کا ثبوت دیا۔ اس زمانے میں وہ علما جن کی زندگیاں مدینہ تک ہی محدود تھیں اور جو مدینہ

---

[1] قرآن ۴۲ : ۳۸۔ "ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں"

[2] "طوائف الملوکی کی ایک ساعت سے ایک ظالم ملوکیت بہتر ہے" ملاحظہ ہو کریمو ص ۲۵۔ اس سلسلہ میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ الماوردی کی احکام السلطانیہ میں قرآن یا اسلامی قانون میں سلطنت کے موجودہ ڈھانچے کو خلافِ قانون قرار دینے کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔

سے باہر کے سیاسی حالات سے باخبر نہ تھے اسلامی قانون کو ایک ایسی شکل دے رہے تھے جو اسلامی حکومت کے حالات میں موزوں نہیں تھی۔ اس زمانے میں مدینہ اسلامی عصبیت کا مرکز تھا اور دمشق اسلامی حکومت کا دارالخلافہ۔ اب دونوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی ختم ہوگئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ بالکل ابتدا ہی سے اسلامی قوانین کا ایک معتد بہ حصّہ اپنے کردار کے اعتبار سے بالکل نظریاتی ہو کر رہ گیا اور ایسے بہت سے قوانین وضوابط وجود میں آئے جن کا عملی طور پر شاید ہی کبھی استعمال ہوا ہو[1]

مسلم سماج میں ابھی اور بہت بڑی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ مدائن یعنی کسریٰ کے قدیم دارالخلافہ (ctesiphon) کی فتح اور مرکز خلافت کے بغداد تبدیل ہونے کے ساتھ ہی ایرانی خیالات تیزی سے اسلام میں داخل ہونے لگے جنھوں نے کچھ ہی زمانہ میں اسلام کی ظاہری شکل کو تبدیل کردیا۔ ایرانیوں سے سابقہ پڑنے پر عربوں کو ایک قدیم قوم کی سیاسی روایات اور ان کی قطعی علمی حیثیت کا علم ہوا۔ عرب کی سیاسی روایات ایرانی روایات سے بالکل مختلف تھیں۔ اس وجہ سے بہت قلیل مدّت میں متعدد خانہ جنگیاں ہوئیں۔ اور عربوں کے لیے مصیبت بن گئیں۔ انھیں یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا مفتوحہ علاقہ کتنی آسانی سے ان روایات کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ مسلمانوں نے کس طرح اتنی آسانی سے قدیم نظریۂ شہنشاہیت کو جذب کیا اور وہ کس طرح ایک مفتوح قوم کی تہذیب و تمدن کا آسانی سے شکار ہو گئے[2] ایرانی تہذیب کا افسوں عربوں پر کچھ ایسا کارگر ہوا کہ انھوں نے اس میں سے اپنے فائدہ کے خیالات ہی کو اخذ کرنا ضروری نہیں سمجھا بلکہ اسے مکمل طور پر اور زندگی کے ہر شعبہ میں اختیار کر لیا۔ سیاسی نظم ونسق میں سے انھوں نے ایرانی اصولوں کے بنیادی اجزا کو اپنایا۔ مختلف شعبوں کی تنظیم کا ایرانی طریقہ لیا۔ ایرانی بادشاہ کی انفرادیت کو قبول کیا اور

---

[1] آرنلڈ۔ ص ۲۵

[2] اقبال کی رائے کے لیے دیکھیے اقبال: پیام مشرق (لاہور ۱۹۲۴ء) ص ۱۲۶

برہمنے بہ غزنوی گفتہ کرامتم نگر

تو کہ صنم شکستہ، بندہ شدی ایاز را

ایرانی حرم، خواجہ سرا، غلام اور نوکر، سرکاری رسوم، لباس، شاہی نشانات، فوجی نظم ونسق کے ضوابط اور ساز و سامان، اصولِ جنگ اور درحقیقت نظم و نسق سے متعلق ہر قابلِ قدر چیز کو اپنالیا۔ معاشرتی عادات میں سے انھوں نے شکار، پولو، شطرنج، شراب، موسیقی اور بہار کے تیوہار نوروز کو اپنایا اور ایرانی تہذیب میں سے انھوں نے جملہ ایرانی خیالات کو بمع علمِ تعبیرِ خواب اور مجوسیوں کے غیب دانی اور پیش گوئی[۱] کے اعتقاد کو بھی قبول کرلیا۔ ان سب خیالات میں سے جو عربوں نے قبول کیے اہم ترین تصور ایرانی بادشاہوں کے نائب الٰہی ہونے کا نظریہ تھا۔ بغداد کے مرکز سے یہ خیالات غزنی اور اسلامی حکومت کے دیگر حصوں میں پھیلے اور وہاں سے ہندوستان آئے۔ غزنی میں جو سلاطینِ دہلی کے سیاسی خیالات کا سرچشمہ تھا کچھ شعبوں کے سربراہوں کے نام بھی قدیم ایرانی درباروں کے طرز کے تھے[۲] وہ تاج جس نے سلطان مسعود کے سر کو زینت بخش کیا سرہ کے تاج کا نقشِ ثانی تھا[۳] درحقیقت غزنوی سلاطین کا پورا تصورِ حیات، رسوم اور عمل کسی طرح بھی ساسانی سلاطین سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ دوسرے نقطۂ نظر سے ایران کی اس قومی روایت کا بہترین اظہار رزمیہ نظم شاہنامہ میں ہوا جو دربارِ غزنی کی سرپرستی میں تصنیف ہوئی۔ محمد کے ایک پیرو کی لکھی ہوئی اس مشہور کتاب نے قدیم ایران کے افسانوی جواں مردوں کو لافانی شہرت عطا کی۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ایرانی ملوکیت کی نمایاں خصوصیت اس کا یہ دعویٰ تھا کہ بادشاہ خدا کا نائب ہے۔ اپنی رعایا کے لیے وہ اس کا مالک اور آقا، ان کی زندگی، آزادی اور جائداد پر متصرف، قانون اور حقوق کی تنہا بنیاد، خود غلطی کرنے کی صلاحیت سے معرّا، ناقابلِ مزاحمت اور ایک نوع کا زمین پر مجازی خدا تھا۔ اس کا لطف و کرم خوشی کا ضامن تھا اور اس کی ناراضگی پر لوگ خوف سے کانپتے تھے۔ اس کے سامنے سب انتہائی اطاعت و فرماں برداری سے کورنش بجالاتے تھے[۴] اسلام مطلق العنانی کے اس بے باکانہ اظہار سے

---

[۱] ملاحظہ ہو راؤلینس "سیونتھ مونارکی" باب XXVII

[۲] ملاحظہ ہو راؤلینس صفحہ ۶۴۱، ۶۴۲ مثلاً دبیر، آخور بیگ

[۳] ایضاً۔ صفحہ ۶۴۰ اور تاریخِ فرشتہ، جلد اول۔ صفحہ ۴۲

[۴] راؤلینس "فایو گریٹ مونارکیز" جلد سوم۔ صفحہ ۲۰۲

ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا کجا کہ ایک ایسے شخص کی الوہیت سے ہم آہنگ ہوتا جس پر مطلق العنانی کے پورے نظریہ کا انحصار تھا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے الوہیت کی اس صفت کو سلطان کی شخصیت کے بجائے سلطنت سے متعلق کر دیا گیا اور اسے ظل اللہ سے موسوم کیا گیا[1] بہرحال اس سے سلطان کی اس عزت و وقعت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی جو اس کی رعایا اسے انسانی شکل میں خدا کا سایہ مان کر کرتی تھی[2] خصوصاً ہندوستان میں سلطان کے اس رتبہ کو چھپانے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ لوگ سلطان کی موجودگی میں اسے تعظیماً سجدہ کرتے تھے اور اس کی غیر موجودگی میں جب اس کا نام لیا جاتا تھا تو انتہائی ادب سے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جب لوگ دہلی سے دور ہوتے تھے تو سلطنت کے مرکز دہلی کی طرف ادب سے سر جھکاتے تھے[3] جب کوئی شخص خالی تختِ شاہی کے پاس سے گزرتا تھا تو تسلیم بجا لاتا تھا حتیٰ کہ سلطان کی غیر موجودگی میں خالی تخت پر شاہی نشان کی حیثیت سے کھڑاؤں اور تیر کمان رکھ کر ان کی تعظیم کی جاتی تھی[4] مغل شہنشاہ ہمایوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ عوام کے سامنے آتا تھا تو اس کے سامنے ایک پردہ ڈال دیا جاتا تھا اور پردہ اٹھتے ہی حاضرین پکار اٹھتے تھے " ظل الٰہی کی تجلی کا مشاہدہ کرو"[5] اس شہنشاہ کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ مافوق الفطرت قوتوں کا حامل ہے[6] ان حالات میں کسی واقعہ نگار کا سلطان کے افسران کو خدا کے دربار میں حاضر ہونے والے جبرئیل اور دیگر فرشتوں سے تشبیہ دینا قابلِ معافی ہے[7] ابو الفضل نے اس سلسلے میں ایک

---

[1] تاریخ فخرالدین مبارک شاہ۔ صفحہ ۱۲

[2] ملاحظہ ہو فتاوائے جہانداری میں ایک دل چسپ حوالہ۔ صفحہ ۱۹۰

[3] کلیاتِ خسرو۔ صفحہ ۲۲۱۔ کتاب الرحلہ جلد دوم صفحہ ۴۷ اور ایضاً جلد اول صفحہ ۹۲

[4] کتاب الرحلہ جلد دوم اور کھڑاؤں کی پوجا کے لیے منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۸۵ - ۳۸۴۔ موخرالذکر رسم قدیم ہندو رسوم سے لی گئی ہوگی جیسا کہ رامائن میں ذکر ہے۔

[5] پردے کی اس رسم کے لیے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۴۴۶۔ اس خیال کو دوسرے حوالہ جات سے بھی تقویت ملتی ہے۔ ساسانیوں کی اس قدیم رسم کے سلسلے میں آئندہ صفحات میں ہوارٹ کا قول نقل کیا گیا ہے۔ فوق الانسانی قوتوں کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ الواقعات صفحہ ۵۷

[7] تاریخ فیروز شاہی از برنی صفحہ ۵۷۸۔

قدم اور آگے بڑھانے کی جرأت کی ہے۔ اس نے انسان کامل کے صوفیانہ نظریہ کو یہ ثابت کرکے اتمام تک پہنچا دیا کہ اکبر انسانی زندگی کے رموز کو پوری طرح سمجھ چکا ہے اور ایک یوگی کی طرح حقیقت کو جذب کر چکا ہے[1] اسی لیے اس موقع کی مناسبت سے ایک رسم شروع کی گئی۔ جب اکبر عوام کے روبرو آتا تھا تو ایک آدمی بہ آوازِ بلند "اللہ اکبر" پکارتا تھا (جس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ خدا بڑا ہے یا خدا اکبر ہے یعنی خدا اکبر کی شکل میں موجود ہے) اور دوسرا شخص "جل جلالہ" کہہ کر جواب دیتا تھا یعنی خدا اس کا رتبہ بلند کرے۔ اس سے ایک مقصد یہ بھی حل ہوتا تھا کہ اکبر کا نام (جلال) اس میں شامل تھا[2]

بہ ظاہر ان حالات میں مسلمانوں کے لیے قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگی پیدا کرنا بہت مشکل تھا۔ ان علمارِ دین کے بارے میں جنھوں نے ملوکیت سے مصالحت کر لی تھی اور ان صوفیا اور متدین افراد کے بارے میں جنھوں نے نہ صرف ملوکیت بلکہ پورے اسلامی سماج سے قطع تعلق کر لیا تھا آئندہ صفحات میں بیان کیا جائے گا۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ان معاملات میں سلاطین کے لیے حالات اس حد تک سازگار تھے کہ علاء الدین خلجی نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ محمد تغلق بھی اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا اور اکبر نے واقعی ایک نئے دین کی بنیاد ڈال دی[3]

ان حالات میں نظریاتی طور پر دہلی کا سلطان ایک مطلق العنان فرماں روا تھا۔ وہ کسی بھی قانون کا پابند نہ تھا، اس پر کسی بھی طرح کی کوئی عاملانہ روک ٹوک نہ تھی۔ وہ اپنی مرضی کے علاوہ کسی کی بھی مرضی کا پابند نہ تھا۔ عوام کو صرف اپنے فرائض پورے کرنے تھے۔ وہ کسی طرح کے حقوق کا مطالبہ نہ کر سکتے تھے اور ان کی زندگی کا واحد مقصد اس کے احکام کی بجاآوری تھا۔

---

[1] اکبرنامہ، جلد اول، صفحہ ۵

[2] ملاحظہ ہو آئینِ اکبری جلد اول صفحہ ۱۹۰۔ اسی طرح کی ایک مثال اور "پولی کریٹیکس آف جان آف سیلسبری" یعنی زمین پر خدا کے عکس کے لیے ملاحظہ ہو سپیکولم جلد اوّل صفحہ ۲۱۳ و ۲۲۶، ۲۷۔ نیز شاستری پریفیس Shashi Preface صفحہ XIII

[3] علاؤالدین کے لیے دیکھیے برنی صفحہ ۲۶۴۔ ۲۶۲۔

[4] عقیدہ مصلحت بمقابلہ تعلیمات قرآن کے لیے برنی صفحہ ۴۰۰۔۴۰۱۔ ملاحظہ ہو۔ (بقیہ دوسرے صفحہ پر)

ہندوستان کے اس ماحول میں عوام کی اطاعت کیش، ہندوؤں کے رسوم ورواج اور سیاسی روایات نے سلطان کے لیے حالات کو مزید سازگار بنا دیا۔ قدیم زمانے میں ہندوستان پر ظالم اور عادل دونوں طرح کے حکمران حکومت کر چکے تھے لیکن ان کا جابر یا کریم النفس اور عادل ہونا ان کی ذاتی صفات پر منحصر تھا۔ اس طرزِ حکومت میں سیاسی معاملات میں شرکت عوام کا حق تصور نہیں کیا جاتا تھا[1] یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں نے ایک جابرانہ طرزِ حکومت کو کس طرح پروان چڑھنے دیا جب کہ یہاں کے دیہاتوں میں مختلف فرقے اور قومیں آباد تھیں۔ ہندوؤں کی سماجی زندگی کے ان دو عناصر کی سیاسی اہمیت بیان کرنے کے لیے مزید تفصیل میں جانا ضروری ہے۔

ہندوستان کی دیہاتی برادریاں جنھیں ایک بار سر ہنری مین روشناس کرا چکے ہیں بہت سے پرجوش اور غیر نقادانہ مداحوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ یہ

(بقیہ حاشیہ) ہمایوں کا اختیاراتِ حکمرانی ایک غلام سقہ کو تحفہ کے طور پر پیش کرنا اور کامران کا اس پر اعتراض۔ تذکرۃ الواقعات ص ۲۵ ب اور اکبرنامہ جلد اول ص ۱۹۰۔ ملاحظہ ہو بنگال کے کسی سلطان کا وہ دلچسپ واقعہ جب اس نے اصفہان کے کسی ملاقاتی تاجر کے نام لکھ دیا تھا اور اس کے مصاحبین اتنا بھی بتانے کی جرأت نہ کر سکے کہ اصفہان اس کی حکومت میں شامل نہیں ہے۔ کس طرح حالات پر قابو پایا۔ راورٹی۔ ص ۵۷۹ برنی کی رائے کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی (قلمی نسخہ) ص ۱۱۴۔ اس سے مشابہ پرنس ہنری کو اوکلیو کا مشورہ دیکھیے اسپیکولم جلد سوم ص ۵۰۰ کہ "Love is both Hook and Key of Succes" ملاحظہ ہو تذکرۃ الواقعات صفحہ ۱۰۶ جہاں ہمایوں نے اپنے خدام کو صفوی حکمران کے ۱۲۰۰ محافظوں کی بے مثال قربانی کی یاد دہانی کرائی ہے جب کہ صفوی حکمران کے گرے ہوئے رومال کو حاصل کرنے کے لیے پہاڑی نالے میں چھلانگ لگا دی تھی اور آخری آدمی تک نے اس مقصد کے لیے جان قربان کر دی تھی

[1] ٹوڈ نے بیان کیا ہے کہ کس طرح راجپوت حکمران کی خوبیاں ملک کو خوش حالی کی بلندیوں پر پہنچا دیں گی اور اسی طرح اس کے جانشین کی خامیاں اسے قعرِ مذلت میں گرا دیں گی جلد اول صفحہ ۳۷۶ نیز جلد دوم ص ۹۳۹ پر اس نے بیان کیا ہے کہ راجپوتوں کی حکومت میں لوگ مستقل طور پر حکومت کے کاموں سے الگ تھلگ رکھے جاتے تھے۔

مداح ان برادریوں کو خود کفیل اور خود اختیاری سیاسی برادریاں کہتے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتے حتیٰ کہ ان کا موازنہ یونان کی شہری حکومتوں تک سے کر دیتے ہیں. کسی زمانے میں ان برادریوں کو آریوں کا مخصوص نسلی تحفہ سمجھا گیا. بہرحال اب یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ یہ دیہاتی برادریاں کسی خاص ملک یا قوم کی امتیازی خصوصیت ہونے کے بجائے انسانی سماجی ترقی کی ایک اہم شکل کی نمائندگی کرتی تھیں. کسی بھی برادری کے حق کا اظہار افتادہ زمینوں اور جنگلوں اور خالی جگہوں کے باقاعدہ استعمال پر ہوتا ہے. غالباً ان کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وہ چند داخلی معاملات میں بعض قاعدے وضع کرنے میں بزرگوں کے انتخاب میں اور اس کے اراکین کے درمیان ان بالواسطہ ٹیکسوں کے تقسیم کرنے میں جو حکومت ان پر عائد کرتی تھی، آزاد ہیں[۱] اگر اس معاملے میں زمانہ قدیم کے ہندوستان کی دیہاتی برادریوں سے متعلق دستیاب شدہ دستاویزات پر انحصار کیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ یہ برادریاں ہندوستان کے حکمرانوں میں مطلق العنانی کے رجحانات کو روکنے کے بجائے ان کی معاون ثابت ہوئیں ہندوستان کی دیہی برادریوں کی زندگی اس قدر تنگ نظری پر مبنی تھی کہ اس کے مختلف طبقوں میں اس قدر فرق تھا اور ان کا پورا نظریۂ حیات اس قدر پیشہ ورانہ تھا کہ ملک کی سیاسی زندگی کا مفید سرمایہ نہ بن سکیں. غیر معمولی خطرات کے زمانے میں یہ دیہات خود اپنا دفاع کر لیتے تھے[۲] اور دیہاتوں کو حملہ آور کی یورش سے محفوظ رکھتے تھے لیکن متحدہ عمل کی یہ مثالیں

---

[۱] بل، جلد اول، صفحہ ۳۱۴ - ۳۱۳ - ہندوستان کی دیہاتی برادریوں کے سلسلے میں ہاؤس آف کامنز کی رپورٹ - روس کی دیہاتی برادریوں کے لیے دیکھیے کووے لوسکی Kowalevsky صفحہ ۷۲ - ۸۳ - ۸۲ - ۹۲ - ٹوڈ نے جلد اول صفحہ ۵۷۴ پر نقل کیا ہے کہ دیہی پنچایتوں سے غیر اہم معاملات سے متعلق قوانین سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتی تھی. حکومت نہ ان سے بھاری محصول وصول کرتی ہے اور نہ ان کی رہنمائی کے لیے قوانین ہیں اور نہ ان کی حفاظت کے لیے پولیس.

[۲] مزاحمت کی ایک مثال کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم، صفحہ ۹۲ - ۹۴ - اسی طرح کی دوسری مثالیں تیمور کے حملے کے حالات میں دیکھی جا سکتی ہیں.

کم و بیش اسی طرح کی ہیں جیسا کہ ٹڈی دل کی یورش سے اپنی فصل کو محفوظ کرنا یا اپنے مکانات کو ڈاکوؤں کی ٹولیوں سے بچا لینا۔ اپنی اور اپنے وطن کی حفاظت کے لیے جس قدر قربانی کی ضرورت تھی اس کے مقابلے میں یہ مثالیں کسی خاص وسیع تر سیاسی بیداری کا ثبوت مہیا نہیں کرتیں۔ ان معاملات میں بھی جائداد سے محروم افراد اور دیہاتوں کے بیرونی حصوں میں رہنے والے نیچ ذات کے افراد کا طرزِ عمل غیر یقینی ہوتا ہوگا۔ اس سے بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی دیہی برادریاں جن کی تعداد آبادی کے لحاظ سے اکثریت کی حامل تھی مسلم سلاطین کے لیے کبھی کسی خاص انتظامی مسئلہ نہیں بنیں[1] اس موقع پر ہمیں ان کے سماجی اور معاشی پہلوؤں سے بحث نہیں کرنی ہے۔

دوسرا عنصر ذات پات کا وہ طریقہ ہے جس کا ناگزیر منطقی نتیجہ دھرم کا نتیجہ ہوا۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ ذات پات اور دھرم کے ہندوانہ نظریہ نے خیرات اور انسان و حیوان دونوں کی اہمیت کی ہمت افزائی کی اور عوام میں عام قناعت کا جذبہ پیدا کیا[2] مزید برآں یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ذات پات کا رواج ہندو سماج کو زندہ اور برقرار رکھنے میں بہت مدد و معاون ثابت ہوا ہے۔ ان امور کی اگرچہ کافی اہمیت ہے پھر بھی ذات پات کی بنیاد پر سماج کی تقسیم کا نظریہ مبنی بر انصاف ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اس کا مطلب ہے اونچی ذات کے افراد کی نیچی ذات کے افراد پر مستقل بالادستی۔ جس کا نتیجہ دونوں کے تنزل کا موجب ہوتا ہے۔ ذات پات کی تقسیم کے طریقے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ دو طبقات کو جنم دیتا ہے۔ ایک علماء اور طاقت ور انسانوں پر مشتمل طبقہ جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ چند پیدائشی خصوصیات کا حامل ہے اور اس کے بعض حقوق موروثی ہیں۔ دوسرا طبقہ محنت کش عوام کا ہے اور جسے اونچی ذات کے افراد حقیر سماجی رتبہ دیتے ہیں اور انسانوں کی تقسیم کے اس انوکھے نظام کو مقدس اور قطعی قانونی سمجھتے ہیں۔ کرم (یعنی فعل انسانی اور اس کے نتیجے میں سزا یا جزا) کے عقیدہ نے اس نظریہ کو روحانی بنیاد عطا کی ہے۔ یہ دلیل قطعی طور پر صرف مذہبی ہے۔ یہ سماج کی غیر مساویانہ تقسیم کی ذمہ داری ایک ایسے اخلاقی

---

[1] مورلینڈ کی رائے۔ Agrarian System etc ص ۲۳۔

[2] مثال کے طور پر ایف۔ ڈبلیو۔ تھامس

طریقہ پر ذاتی ہے جس کی مالک و مختار صرف خدا کی مرضی ہے اور مخلوقِ خدا کو اپنی اس گری ہوئی حالت کے لیے صرف اپنے آپ کو ذمّہ دار قرار دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔[1] ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھرم کا نظریہ یا مختلف ذاتوں کے درمیان تقسیم کار کا نظریہ وجود میں آیا۔ اس اصطلاح کو کسی غیر ملکی زبان میں ادا کرنا مشکل ہے۔

ان نظریات کا ہندو سیاسی طرزِ فکر پر دور رس ردِّ عمل ہونا لازمی تھا۔ ہندوؤں کے مذہبی خیالات نے حکومت اور جماعت دونوں جگہ بالادستی حاصل کرلی اور ہندو حکومتیں مذہبی اصول اور ضوابط کے اجرا کا وسیلہ بن گئیں۔ حکومت کے ہر شعبے کو مذہب نے اس کی مناسبت سے اس کے فرائض سپرد کر دیے جن کی خلاف ورزی نہ صرف حکومت ہی کی نظر میں جُرم تھی بلکہ خدا کے نزدیک بھی ایک گناہ تھا۔ حکومت کے اس نظریہ کے تحت راجا کو حکومت کرنے کا حق خدا کی طرف سے ملا تھا اور اس کی حیثیت ایک دیوتا کی سی تھی جو برہمن کے مشورے کے سوا کسی کی رائے کا پابند نہ تھا۔ کچھ اس طرح کا بھی انتظام کیا گیا کہ حاکم فیض رساں، مخیّر اور عادل ہو اور حکومت کا یہ سلسلہ چلتا رہے۔ لیکن اگر حاکم ایسا نہ ہو تو بھی عوام کو اس کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کرنے کا حق نہ تھا۔ کسی ظلم کی اپیل صرف اس کے ضمیر کی آواز تک محدود تھی اور اگر وہ مذہبی احکام کی خلاف ورزی کرتا تو عوام کے لیے صرف یہ خیال باعثِ تسکین تھا کہ موت کے بعد دوسری ناگزیر زندگی میں قانون خود ظالم سے اس جنم کے ظلم کا بدلہ لے گا۔[2] جب برہمنوں کی مذہبی بالادستی کے اثرات ختم ہونے لگے تو ہندو راجاؤں نے اپنے طور طریقوں میں مسلمان سلاطین کی سی مشابہت پیدا کرلی۔[3] اس کی ایک مثال موجود ہے

---

[1] کارپنٹر ص ۳۲۱، اور دھرم کے مفہوم کے لیے پرُش پریکشا ص ۱۱۰ - ۱۱۱۔

[2] ایف ڈبلیو تھامس، ص۔ ۹ - ۱۰۔ ودیاپتی سازش کو گناہ تصوّر کرتے ہیں۔ دیکھیے پرُش پریکشا ص ۱۱۵۔

[3] ایک مثال ہندو حکمراں عوام کے نزدیک وہ ہے جو علم تعذیر میں ماہر ہو، عیش و عشرت سے لطف اندوز ہوتا ہو، چاروں طرف اس کی فتوحات کی دھوم مچی ہو۔ اپنے تمام دشمنوں کو جنگ میں قتل کر چکا ہو۔ آگ کی نذر چڑھاتا ہو۔ دیوتاؤں پر قربانی چڑھاتا ہو اور محتاجوں میں سونا تقسیم کرتا ہو۔ دیکھیے پرُش پریکشا ص ۱۶۴ - ۱۶۶۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاست (سیاست اور ڈنڈنیتی) کے لیے
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جب ایک بار مہارانا سانگا ابراہیم لودھی کے خلاف جنگ کرتے ہوئے زخمی ہوا اور اس کی وجہ سے اس کی ہیئت کچھ بگڑ گئی تو وہ تخت حکومت پر قدم رکھتے ہوئے ہچکچایا کیوں کہ ہندوستان میں ایک قدیم اور عام رواج یہ تھا کہ جب ایک بت میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی یا اس کے جسم کا کوئی حصہ ٹوٹ جاتا تو وہ پوجا کے ناقابل قرار دے دیا جاتا تھا اور اس کی جگہ دوسرا بت مندر میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح چوں کہ تختِ شاہی بھی عوام کے لیے پوجا کی جگہ کی سی اہمیت رکھتا تھا اس لیے اس پر قدم رکھنے والا حکمران بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جس میں کوئی نقص نہ ہو اور حکومت کے جملہ کاموں کو بحسن و خوبی انجام دے سکے[1]۔ اس مقام پر مقدس ملوکیت کے نظریے کے حسن و قبح پر بحث کرنا مناسب نہیں، البتہ مسلمانوں کے ہندوستان کو فتح کرنے سے ذرا پہلے کے حالات پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ جب ایک حاکم نائبِ الٰہی کی حیثیت سے بلند رتبہ پاتا ہے تو وہ دوسرے فانی انسانوں کی طرح بد قسمتی اور تکالیف برداشت کرنے کے استحقاق سے بالاتر ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی حیثیت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ وہ صرف اسی وقت تک حکومت کرتا ہے جب تک کہ وہ کامیابی کے ساتھ کر سکے اور ایک معمولی سانحہ یا ایک اتفاقی شکست اس کی حکومت کے پورے سیاسی ڈھانچے کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اس قسم کے طرزِ حکومت میں عوام الناس جو پہلے ہی ذہنی طور پر تمام معاملات سے غیر متعلق سے رہتے تھے اپنے حاکم کی خوشحالی اور اس کی حکومت کے سیاسی اتار چڑھاؤ سے کچھ واسطہ نہیں رکھتے۔ ان حالات میں یہ بات غور طلب ہے کہ کیا حکمران طبقہ سے باہر بھی عوام میں وطن دوستی کا جذبہ پرورش پاتا ہے۔ راجپوتوں کی ایک مضبوط اور متحدہ حکومت قائم کرنے کی فطری نااہلیت

(بقیہ حاشیہ) اصطلاح میں معنی اور اہمیت کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ قیاس یہ بھی ہے کہ غالباً قدیم ایران ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے سیاسی خیالات کا مشترکہ سرچشمہ تھا جہاں سے دونوں نے اپنے سیاسی خیالات مختلف اوقات میں آزادانہ حاصل کیے لیکن اس کے لیے زیادہ ثبوت ابھی مہیا نہیں ہو سکے ہیں۔

[1] ملاحظہ ہو ساردا، مہارانا سانگا ص ۸۹-۵۸۔

[2] لاٹ کے جذبات کے لیے دیکھیے ٹپل، ص ۲۰۷، اور نانک کے سلسلے میں میکالف جلد اوّل - ص ۱۰۹-۱۱۶۔

نے ہندوستان میں سیاسی حالات کو اور خراب کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں ایک غیر ملکی سیاسی قوت کے قیام کے لیے ان کی رضامندانہ یا غیر رضامندانہ منظوری حاصل ہو گئی۔[۱]

ان مجموعی سیاسی عناصر کی جمع شدہ قوت کے زیر اثر ہندوستان کے سیاسی ڈھانچے نے طاقت ور غیر ملکی حملہ آوروں کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ ہندوستان کے عوام ہونوں۔ سیتھین۔ کشان۔ یونانیوں۔ ایرانیوں اور راجپوتوں کی حکومت کے تجربات رکھتے تھے۔ ان کے لیے کسی عرب، ترک یا کسی دوسرے مسلمان حاکم سے نفرت کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ جیسے ہی عربوں نے سندھ کی سرزمین پر قدم رکھا ہندو جاٹ ان کی مدد کے لیے تیار ہو گئے اور نیچ ذات کے افراد کے لیے خوش آمدید کہا۔ عوام کی ایک بڑی اکثریت نے حاکم وقت اور غیر ملکی حملہ آوروں کی جنگ کو بے اعتنائی کی نظروں سے دیکھا اور حاکم وقت کی شکست ان کے لیے وجہ نجات ثابت ہوئی۔ ترک حملہ آوروں کی آمد پر بھی حالات تقریباً ایسے ہی تھے

آئیے اب ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کریں اور یہ دیکھیں کہ سلطان جو نظریاتی طور پر کلی اور غیر محدود اختیارات کا مالک تھا، عملی زندگی میں کس طرح چند واضح تبدیلیوں کو برداشت کرتا تھا۔ مندرجہ بالا حالات کے پیش نظر سلاطین دہلی نے اپنے سابقہ ہندو راجاؤں کی طرح اپنے فرائض کو جہاں گیری اور جہاں داری تک محدود رکھا۔ چھوٹی، خوشحال اور خوش انتظام ریاستوں کی فتح ابھی سلاطین دہلی کے منصوبوں میں شامل نہ تھیں۔ اس وقت کوئی بھی سلطان اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع تر کرنے کا خواہش مند نہ تھا۔ یہاں تک کہ دکن کے حملے کو ملکی انتظام کی خاطر ایک ضروری حکماتی کارروائی تصور کیا گیا[۲]۔ اس کی ابتدا

---

[۱] دیکھیے ظفر الوالہ ص ۸۰۷۔ وہ دل چسپ مثال جس میں رنتھمبور کے رانا ہمیرا دیو کی ماں خود راجپوت سردار کو اپنے دشمن دہلی کے سلطان علاء الدین خلجی کو قتل کرنے سے باز رکھتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ سلطان کو اخلاقی طور پر راجپوتوں پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ راجپوتوں کے بارے میں ٹوڈ کی رائے کے لیے دیکھیے جلد اول صفحہ ۴۸۳ جوامع الحکایات، ص ۴۶ پر دیکھیے ایک متحدہ حکومت کا خاکہ عملی طور پر

[۲] دیکھیے ایڈورڈ تھامس ص ۱۸۷

یوں ہوئی کہ التمش کے مقبوضات میں استحکام پیدا ہونے سے پیشتر ہی سلطان بلبن کے دل میں دوسرے علاقوں کی تسخیر کے خیالات کا غلبہ ہونے لگا۔ اور ان خیالات کی تکمیل کے لیے اس نے ریاضی کے اصول کے انداز پر سوچنا شروع کیا۔ اسے اس بات کا بہت افسوس تھا کہ اس کی حکومت کے اندرونی انتظامی حالات اسے دور دراز ہندو حکومتوں پر اپنے خیالات پر عمل پیرا ہونے کی اجازت نہیں دیتے[1] یہ حالت درحقیقت ایک ایسے سلطان کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی جسے اپنے آپ کو روزانہ کے انتظامی کاموں ہی میں مصروف رکھنا پڑتا تھا جب کہ دوسرا ہم پسند اور خوش قسمت رہنما میدانِ جنگ میں اپنی افواج کی رہنمائی کر رہا تھا یا کسی قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا[2] فاصلہ یا طبعی دشواریاں فتح کی اس آرزو کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی تھیں۔ بختیار خلجی بہت پہلے تبت کی فتح کی طرف اپنا رجحان ظاہر کر چکا تھا[3] کچھ عرصے کے بعد محمد تغلق نے خراسان، اس کے مغربی علاقوں اور آس پاس کی دیگر حکومتوں کی تسخیر کا نقشہ بنایا۔ اس سلسلے میں سلطان علاء الدین خلجی کی حیثیت سب سے نمایاں ہے۔ چوں کہ اس نے پوری دنیا کو فتح کرکے سکندر ثانی بننے اور دوسرے شہنشاہوں کی طرح دہلی کی حکومت کا انتظام اپنے نائب کے ذریعہ کرانے کا خواب دیکھا[4] جب سلطان نے کچھ عملی وجوہ کی بنا پر اپنی فتوحات کا دائرہ صرف دکن تک محدود رکھنا پڑا تو یہ حالت اس حوصلہ مند فرماں روا اور اس کے عالی خیالات کے لیے

---

[1] اس ضابطہ سازی کے لیے ملاحظہ ہو برنی۔ ص ۵۱۔ بلبن کو یقین تھا کہ وہ ایک نیا علاقہ فتح کر کے اسے منظم کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے پاس ایک لاکھ جنگ جو سپاہی اور بارہ ہزار افراد کی ایسی جمعیت ہو جو وہاں آباد ہونے کے لیے تیار ہو۔ راجپوتوں کے اس طرح کے خیالات کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۵۹۴ دو ہزار آدمیوں کے ساتھ آپ کو کھچڑی کھانے کو ملے گی، ایک ہزار کے ساتھ دال بھات اور پانچ سو کے ساتھ جوتی کھانے کو ملے گی یعنی سخت توہین ہوگی۔

[2] شیر شاہ کے جذبات کے لیے دیکھیے تاریخ شیر شاہی۔ ص ۵۱۔ ایک اہم فقرے کے لیے دیکھیے قران السعدین ص ۴۸۔ ۴۹۔

[3] راورٹی۔ ص ۵۶۰

[4] اس مسئلہ پر علاء الدین کے خیالات کے لیے دیکھیے برنی (قلمی نسخہ) ص ۱۲۷

تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلاطین ایک ملک کے بعد دوسرا ملک فتح کرتے رہے حتیٰ کہ اتنی بڑی حکومت کا انتظام مشکل ہو گیا اور یہ وسعت ہی انھیں لے ڈوبی۔ بہر حال دہلی سلطنت کا پورا زمانہ متواتر نئے علاقوں کی تسخیر اور جنگ میں گزرا۔ سلطنت کی اس نمایاں خصوصیت نے خاص طور پر سلطان کے غیر محدود اختیارات کو کسی حد تک محدود کر دیا۔ حدودِ سلطنت میں اندرونی امن کے بغیر غیر ملکی فتوحات ممکن نہ تھیں اور سلطان کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ کسی دشمن کے ساتھ بر سرِ پیکار ہونے سے پیشتر اپنی رعایا کے ساتھ پر امن تعلقات قائم کرے۔[1]

مزید برآں ملک کے نظم و نسق کی ضرورت سے سلاطین کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ مہذب حکومت کے چند بنیادی اصولوں کو تسلیم کریں اور مختلف جماعتوں کے مابین انصاف کے ایک معیار پر سختی سے قائم رہیں۔ اسی طرح محصولات اور حکومت کے عائد کردہ دیگر واجبات کو وصول کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ کسانوں اور کاریگروں کی بڑی جماعت کی حفاظت اور بچاؤ کا ذمہ لیں۔ یہاں تک کہ انھیں حکمران طبقے کے ظلم و ستم سے بھی بچائیں جس سے بظاہر یہ ثابت ہو جائے کہ سلطان ان کے جذبات کی قدر کرتا ہے اور پذیرائی کرتا ہے۔ ہندوستان دوسرے زراعتی ممالک کی طرح قدیم رسم و رواج اور روایات کا حامل رہا ہے۔ یہ تو ممکن تھا کہ مسلم سلاطین اور ان کے امرا، ہندوؤں کے عجیب قوانین اور مضحکہ خیز رسوم پر ہنسیں اور ان کا مذاق اڑائیں یا ان کی ان رسوم کی اصلاح کی کوشش کریں جو صریحاً وحشیانہ دکھائی دیتی ہوں لیکن وہ پبلک میں ان کا مذاق تک نہیں اڑا سکتے تھے کجا کہ ان کے بجائے اپنے رسوم و رواج نافذ کر دیتے۔ دراصل بت شکن مسلمانوں نے جلد ہی ہندو دھرم اور ہندو رسم و رواج کو اس حد تک سراہنا اور انھیں جذب کرنا شروع کر دیا تھا کہ تیمور نے جو ایک مقدس مسلمان حملہ آور تصور کیا جاتا ہے اسی بات کو دہلی کی اسلامی حکومت پر حملہ آور ہونے کے لیے عذر بنا لیا۔[2]

---

[1] عفیف کی دانشمندانہ رائے کے لیے ملاحظہ ہو ایک شعر۔ تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۱۷۴۔ اپنی رعایا کے ساتھ امن سے رہنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ کوئی حکمران اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکے کیوں کہ ایک انصاف پسند رعایا کی فوج میں اس کی رعایا کا ہر فرد شامل ہو جاتا ہے۔

[2] دیکھیے ظفرنامہ خاقانی ص ۱۲۳ اور ظفرنامہ از شرف الدین علی یزدی ۲۲۲۔

سلطان کے غیر محدود اختیارات پر دوسری پابندیاں ان دینی عقائد کی وجہ سے عائد ہوئیں جس دین کو وہ دوسرے مسلم امرا کی طرح مانتا تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں دینی اصول کا اتنا سخت پابند نہ ہو یا اس دین کی تبلیغ و اشاعت کی طرف اتنی سنجیدگی سے توجہ نہ دے لیکن وہ دینی ارکان و رسوم کی بظاہر عزت کرنے پر مجبور تھا۔ جہاں تک دہلی کے ابتدائی سلاطین کا سوال ہے ان کا صرف عقیدہ فاتح جماعتوں میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لیے کافی تھا اور اسلام کے احترام نے عوام کے دل میں سلطان کے لیے وقعت پیدا کی جس سے سلطان کی شہرت اور ناموری میں مزید اضافہ ہوا[1]

سلطان کا مقام پہلے ہی کچھ کم بلند نہ تھا۔ اس تصور نے کہ وہ زمین پر خدا کا سایہ ہے اسے مزید عظمت عطا کی۔ اس بات نے سلطان کو مجبور کیا کہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کریم النفسی اور فیاضی کا ایک بلند معیار قائم کرے۔ اس سلسلے میں اولوالعزمی، شجاعت، عفو و درگزر، فیاضی، کریم النفسی اور دوسری بہت سی عظیم صفات کی ایک طویل اور باعظمت روایت سلطان کی شخصیت کے گرد قائم کی گئی جس نے ایک مطلق العنان کی حکومت کو نہ صرف ممکن بنا دیا بلکہ اس میں کشش بھی پیدا کر دی۔ ہندوستان و ایران دونوں ملکوں کی روایات اس سلسلے میں مددگار ثابت ہوئیں[2]

چند عملی اور انتظامی وجوہات کی بنا پر سلطان کو ایک معین اور واضح حکمت عملی پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ ابتدا میں سلطان نے اپنے سپاہیوں اور امرا کو فیاضانہ مشاہرہ اور اپنی سلطنت کی رعایا کے ساتھ بہت کریم النفسی اور شفقت کے ساتھ حکمرانی کرنے پر محدود رکھا۔ وقت گزرتا رہا۔ حملہ آوروں کا جنگ جویانہ جوش ختم ہوگیا، ملک میں امن قائم ہوا اور جنگ جو سپاہی کے ہاتھ میں تلوار کے بجائے ہل دکھائی دینے لگا تو سلطنت کے فرائض میں پرسکون انتظامی امور کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد ہی سے سلطان کو اس کی رعایا کا محافظ تصور کیا جانے لگا۔ سلاطین نے شارع عام کی حفاظت کی دیکھ بھال اپنے فرائض میں شامل

---

[1] مسلمانوں کے حملوں کی مذہبی حیثیت کے لیے دیکھیے محمود آف غزنی از محمد حبیب

[2] ان خوبیوں کے لیے دیکھیے اخلاق و رسوم پر باب۔ راجپوت تاریخ سے مثالوں کے لیے ٹوڈ۔ جلد اوّل۔ ص ۳۶۶۔ ۳۶۷

کر لی۔ تجارت کے سلسلے میں آسانیاں فراہم کی گئیں۔ قحط سالی اور دیگر آفاتِ سماوی کے مواقع پر اپنی رعایت کی اعانت کا ذمّہ لیا اور عوام کو بلا رو رعایت انصاف دیا اور ظلم کے خلاف دادرسی کی۔ سلطان کی یہ پدرانہ خصوصیات سلطنت کے آخری زمانہ تک زیادہ سے زیادہ ہوتی رہیں[1]

مختصر یہ کہ حالاں کہ نظریاتی طور پر سلطان کے اختیارات کی کوئی قابلِ تصور حد مقرر نہ تھی لیکن حالات کی حقیقی صورت اور عملی ضرورتوں نے سلطان کی فرماں روائی کی راہ میں متعدد حدود مقرر کر دیں۔ یہ حدود ہندوستان کے حالات کا تقاضا تھیں اور ان سے سماج کا صحت مند نشوونما ممکن ہو سکا[2]

اب ہم اپنی تحقیق کے دوسرے پہلو کی طرف آتے ہیں وہ یہ کہ کس طرح اور کس حد تک مسلم ریاست کے خالص غیر دینی طرز سے اسلام کی مذہبی اقدار متاثر ہوئیں۔ شروع میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جس زمانے میں اسلام کی حکومت کا مرکز مدینہ کے بجائے دمشق قرار پایا تو کس طرح اسلام کی عملی سیاست قرآن کے اصولوں سے علیٰحدہ ہوتی گئی۔ حکومت کے مرکز کے تبادلے کے ساتھ ساتھ شاہانِ اسلام کے طرزِ فکر میں بھی بڑی وسیع تبدیلی رونما ہو گئی تھی جس کا پیغمبرِ اسلام تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ محمد صلعم کی پوری زندگی غریبی اور ناداری میں گزری تھی۔ آپ کو اپنے فقر پر نہ صرف فخر تھا بلکہ آپ نے اپنی امّت کو بار بار اس بات کی ہدایت کی ہے کہ وہ اس معاملے میں آپ کی پیروی کریں[3]۔ آپ کے صحابہ اور

---

[1] علاء الدین کے کارناموں میں امیر خسرو نے نہ صرف دکن کی جنگوں کا ہی ذکر کیا ہے بلکہ اس نے ان قوانین کا بھی ذکر کیا ہے جو سلطان نے ضابطہ انصاف جاری کرنے، عوام کی خوش حالی اور حکومت کی حفاظت کے لیے مقرر کیے۔ اعجازِ خسروی۔ جلد اوّل، صفحہ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۶۔ ۳۷۔ ۳۸

[2] وسطِ ایشیا کے ایک قدیم سیاسی مفکر کے خیالات کے لیے دیکھیے Lybyer ص 19
کسی سرزمین کی حکمرانی کے لیے افواج و افراد ناگزیر ہیں۔ فوج رکھنے کے لیے دولت کی تقسیم ضروری ہے دولت اس وقت ممکن ہے جب کہ عوام خوش حال ہوں اور خوش حالی صرف اس صورت میں ہوتی ہے جب کہ قوانین کا مکمل نفاذ ہو۔ اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی کمی ہے تو پھر چاروں چیزوں کا ہونا ناممکن ہے۔ اور جب یہ چاروں چیزیں نہیں ہوتیں تو حکومت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔

[3] چند احادیث کے لیے ملاحظہ ہو وینزوک ص ۱۸۸

تابعین نے آپ کی سادہ اور غریبانہ زندگی کی روایت کو قائم رکھا۔ ہمسایہ مملکتوں کے عظیم شہروں خصوصاً مدائن کی فتح کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے دارالخلافہ میں دولت کی ریل پیل ہونے لگی اور مسلمانوں میں دنیاوی آرام و آسائش کا شوق پیدا ہونے لگا تو صالح اور دور اندیش مسلمانوں کو دنیاوی ترقی اور روحانی انحطاط سے تشویش ہونے لگی۔ لیکن اس رجحان کو اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے روحانی طرزِ فکر کے انحطاط کو کوئی چیز نہ روک سکی۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان کے زمانے میں صرف ایک متقی اور مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاری کو ریگستان میں صرف اس بات پر جلا وطن کر دیا گیا کہ انھوں نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی دولت اور مادی طرزِ فکر کو بُرا کہا تھا۔ جب اسلامی حکومت بغداد منتقل ہوئی تو ابتدائی اسلام کی یہ نشانیاں زوال پذیر ہو کر چھوڑی جا چکی تھیں اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے مسلم خلفاء اور سلاطین قدیم ایرانی شہنشاہوں کے صحیح جانشین اور پیرو ہو گئے۔ نئے ماحول میں مذہب اور روحانی ترقی کے لیے کم و بیش کوئی گنجائش نہ تھی[۱] دوسری طرف بہتر مقاصد کے حصول کے خلاف نفسانی اور شیطانی خواہشات کا جوش و خروش سے اظہار ہونے لگا۔[۲] جب مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم جمائے تو زرخیز میدانوں اور دیگر ذرایع نے غزنوی سلاطین کے لیے ان کے پہاڑی علاقوں یا اسلامی دنیا کے دیگر حصوں کی بہ نسبت عیش و عشرت کے لیے بہتر مواقع فراہم کیے۔ جب اسلامی حکومت کو عروج حاصل ہوا تو اس میں ملوکیت کے مزاج اور حقوق کے علاوہ بہت سے غیر اسلامی عناصر شامل ہو چکے تھے۔ مثال کے طور پر سلطنت کے قیام کا انحصار صرف طاقت پر تھا اور انصرامِ امورِ مملکت کے لیے ظلم ضروری تھا۔ سرکاری خزانہ سلطان

---

[۱] اس سبق آموز کہانی کے لیے دیکھیے میور ص ۲۲۵

[۲] محمود غزنوی کی دل چسپ کہانی کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۶۱۔ نیشاپور کے ایک دولت مند تاجر کو قرمطی عقاید کی بنا پر بدعتی کی حیثیت سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تاجر نے اپنی تمام دولت بادشاہ کو دینے کا وعدہ کر لیا اس لیے منصف بادشاہ نے ملزم کو ایک صداقت نامہ لکھ دیا جس میں اس کے عقاید کی صحت کی توثیق کی گئی تھی اور اسے بری کر دیا۔

[۳] ہرات میں شہزادہ مسعود کے رہائشی محلات۔ شہوت پرستانہ ماحول اور ننگی زنانہ تصاویر کے خفیہ کروں نیز شراب نوشی کے متعدد واقعات کے لیے دیکھیے تاریخ بیہاقی از مسعود ص ۱۳۵

کی ذاتی ملکیت تھا۔ فضول اور غیر ضروری اخراجات پر خوب روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ بلا امتیاز مذہب وملت ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون بہانا حکومت کی پالیسی کا ایک حصہ تھا[۱] قرابت کے حقوق کی بھی ملوکیت میں کوئی پاسداری نہ تھی۔ قرابت داروں کا قتل اور خوں ریزی خواہ وہ مذہب اور انسانیت کے لحاظ سے کتنی ہی نفرت انگیز کیوں نہ ہو عام بات تھی اس میں کسی شرم یا رائے عامہ کی مخالفت کا کوئی خوف نہ تھا[۲] بعض لحاظ سے اسلامی قوانین پر کچھ ایسے نئے قوانین کو فوقیت دی گئی جن کا شریعت کے ساتھ کوئی لگاؤ نہ تھا لیکن جن کا وجود حکومت کی بہتر کارکردگی کے لیے ضروری تھا[۳] اس طرح سلطنت میں بہت سے مشہور اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کی گئی۔ مثال کے طور پر بادشاہ کا انتخاب، قانونِ وراثت، جائداد کے حصے اور تقسیم کے اصول اور حرام حلال کے درمیان فرق ختم ہوگیا اور جیسا کہ اس زمانے کے ایک تجربہ کار سیاست داں کی رائے ہے سلطنت نے ایسے قوانین وضع کر لیے جن کا اسلامی قوانین سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ سلطنت کے قوانین کا جن لفظوں میں خلاصہ بیان کیا جا سکتا ہے وہ ہیں سلطان کی خواہش[۴] قرآن نے سیاسی نظریات کی انتہائی غیر واضح تشریح بھی

۱۔ حکومت کے بنیادی اصول کے لیے دیکھیے تاریخ داؤدی۔ ص ۶۔ ظلم اور فضول خرچی کے لیے برنی ص ۱۸۸، ۱۸۹ نیز ص ۲۹۲-۲۹۳۔ سرکاری خزانہ کی حالت کے لیے۔ سلطنت میں مسلمانوں کا خون بہانے کے لیے برنی ص ۲۳۵، ۲۳۶ اور قلمی نسخہ ص ۱۰۰۔ قرآن کے واضح احکامات ہیں کہ مسلمانوں کا خون بہانا اسلام کے خلاف ایک سنگین جرم ہے (قرآن ۴: ۹۳) نیز بلبن کے سلسلے میں برنی کا بیان جو اگرچہ دیگر معاملات میں مذہبی تھا لیکن خون بہانے سے پرہیز نہ کرتا تھا۔ برنی۔ ص ۴۷ - ۴۸۔

۲۔ خسرو کی رائے کے لیے دیکھیے دیول رانی خضر خاں ص ۲۴۱۔ ترکی سلطان محمد دوم کا وہ دل چسپ قانون جس کے مطابق تخت کے وارث کو اپنے بھائیوں کو قتل کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ Lypyer ص ۹۔

۳۔ برنی نے سزا کے سات سنگین واقعات بیان کیے ہیں جن میں سے چار واقعات کا اسلامی فقہ میں کہیں ذکر نہ تھا۔ برنی۔ ص ۵۱۱۔

۴۔ سلطان جلال الدین اور اس کے بھتیجے احمد چپ کے مابین سبق آموز مباحثے کے لیے دیکھیے برنی (قلمی نسخہ) ص ۹۶۔ ۹۷)

اس نمایاں اور واضح مطلق العنانی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی تھی تاہم علما کے ہاتھ میں کوئی ایسی طاقت نہ تھی جس سے وہ سلطنت کو سیاسی نظریات کی تبدیلی پر مجبور کرسکتے اس طرح عملی سیاست اور مذہبی تصورات کے فرق میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب علماء کے لیے صرف دو راستے رہ گئے تھے۔ یا تو وہ سلطان کو اس کے غیر محدود اختیارات میں اُسے بالکل آزاد چھوڑ دیں یا اس سے سمجھوتا کریں۔ انتہا پسند صوفیوں اور زاہد بزرگوں نے ایک طریقہ اختیار کیا اور علماء نے دوسرا۔ مذہبی معاملات میں شدت اختیار کرنا ایک ایسے ملک میں جو چاروں طرف سے غیر مسلموں سے گھرا ہوا ہو ناقابل عمل اور غیر دانش مندانہ فعل تھا۔ تقلید پسند علماء طویل عرصے سے جمہوری طرز حکومت سے متعلق رہ چکے تھے اور انھیں شدید خانہ جنگی میں شہادت پانے کی تمنا نہ تھی۔ محتاط علما کا ایک طبقہ اور تارک الدنیا بزرگ مجموعی طور پر دنیا سے قطع تعلق کرنا بہتر سمجھتے تھے تاکہ وہ روحانی ترقی پر پوری توجہ دے سکیں۔ جو ان کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتی تھی[1] جیسا کہ اس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اگرچہ سرکاری معاملات میں دخل اندازی کے قطع نظر سلاطین کا ذاتی رجحان مذہب کی طرف یہ تھا کہ وہ مذہب کی عزت اور اس کے اصولوں کی حفاظت کے خواہش مند رہتے تھے۔ ان حالات میں تقلید پسند علما کے ساتھ سمجھوتا کرنا نسبتاً آسان تھا۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں ایک مدبر اور عالم ان حالات کا تجزیہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق سلطان کے مذہبی اعمال مندرجہ ذیل مخصوص فرائض تک محدود تھے۔ عیدین اور جمعہ کی نمازوں کا خطبہ پڑھنا، مذہبی ممنوعات کی حدود اور وسعت مقرر کرنا۔ رفاہِ عام کے لیے ٹیکس جمع کرنا، مذہب کی حفاظت کے لیے جنگ لڑنا، جب دونوں فریق مسلمان ہوں تو ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا اور شکایات سننا، حکومت کی حفاظت کے لیے مختلف طریقے اختیار کرنا، باغی اور امن دشمن عناصر کی بیخ کنی

---

[1] خسرو کے بیان کے لیے دیکھیے دیول رانی خضر خاں ص ۲۱-۲۲۔ حافظ کے لیے دیکھیے براؤن جلد دوم، ص ۲۷۹۔ شعر

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

کرنا، اور مذہب اور مذہبی معاملات میں ایسی بدعنوانی کو کچلنا جو اسلام کی روح کے منافی ہو[1] مزید برآں سلطان خزانے سے کچھ رقم مذہبی اور رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کرتا تھا۔ یہ اس کا لطف وکرم تھا۔ حالاں کہ یہ اس کے مذہبی فرائض میں شامل نہ تھا[2] آگے چل کر ضیاء الدین برنی نے بیان کیا ہے کہ التتمش اسلام وسلطنت کے باہمی ربط پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ سلطنت کی بنیاد غیر اہل کتاب افراد نے ڈالی اور اس کا ڈھانچہ بالکل غیر مذہبی بنیادوں پر قائم ہوا۔ اس نے صاف گوئی سے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس طرزِ حکومت میں سلطان کے لیے دین پناہ ہونے کے لیے چار مخصوص حالات کے علاوہ قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی۔ اولاً اسلامی عقائد کو اس کی اصل شکل میں باقی رکھنا۔ اس سے مراد یہ تھی کہ جارحانہ شرک والحاد کو سختی سے دبا دیا جائے اور اسلامی عقائد کی تبلیغ واشاعت کے لیے مختلف ذرائع استعمال کیے جائیں۔ ثانیاً سلطنت کی حدود میں مذہبی اصولوں سے روگردانی پر سزا دینا۔ ثالثاً حکومت کے مذہبی عہدوں پر خدا ترس اور صحیح معنوں میں مذہبی افراد کا تقرر کرنا اور رابعاً بلا کسی رو رعایت کے ہر شخص کے ساتھ یکساں انصاف کرنا[3] یہ دعویٰ اس سے پیشتر کی گئی تشریح سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہے۔ عملی طور پر اس سے ایک واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سلطان چند با اثر اور مذہبی افراد کا کچھ عدالتی عہدوں پر تقرر کر دیتا تھا اور اس طرح مخالفوں سے ممکن، خطرناک اور قابل رہ نماؤں کو چھین کر انھیں بالکل بے دست وپا کر دیتا تھا۔ مزید برآں جیسا کہ اس سے پیشتر بیان کیا جا چکا ہے اس نے اسلام کی ایک ایسے عمومی طریقے سے حفاظت کی جو ہر حالت میں سلاطین کی انفرادی حیثیت اور ان کے وجود کو ہندو آبادی کے وسیع سمندر میں قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا۔

اپنے مذہبی فرائض کو ایک مناسب شکل دینے کے لیے سلاطین دہلی نے متعدد فرضی رسوم کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے شیخ الاسلام اور صدر الصدور جیسے مذہبی مناصب قائم کیے جن کا ذکر اس مقام پر خارج از بحث ہے۔ رسوم میں طریقہ بیعت (امام یا اسلام

---

[1] دیکھیے فخر الدین مبارک شاہ کے لیے تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، ص ۱۳-۱۴

[2] مثال کے طور پر دیکھیے ایضاً ص ۳۵

[3] برنی ص ۴۱-۴۴

کے مذہبی رہ نما سے حلفِ وفاداری) کو قائم رکھا۔ نئے حکمران کی تخت نشینی پر خطبہ میں اس کے نام کا اضافہ ہونا ضروری تھا اور یہ خطبہ جامع مسجد کے منبر پر پُر وقار انداز میں پڑھا جاتا تھا۔ نئے سکوں پر کوئی مناسب روایت کندہ کرائی جاتی تھی[1] سلطان عام طور پر ایک مصحف بردار کا تقرر کرتا تھا جو قرآنِ پاک کو پورے احترام اور اعزاز سے لے کر چلتے تھے[2] مذہبی اداروں اور دینی تعلیم کے لیے معقول رقم مقرر کی جاتی تھی اور متعدد مساجد کی تعمیر کرائی جاتی تھی۔ سلطان نمازِ جمعہ میں شامل ہوتا تھا اور ہر حالت میں نمازِ عیدین میں پوری شان و شوکت کے ساتھ شرکت کرتا تھا[3] اس کے علاوہ وہ اسلامی قانون کی کھلی خلاف ورزی کرکے عوام کے احساسات کے خلاف اشتعال انگیز اور جارحانہ اقدامات کرنے سے باز رہتا تھا۔ مثال کے طور پر اس کی بیویوں اور خواص کی حد سے زیادہ متجاوز تعداد حرم کی چار دیواری تک محدود رہتی تھی اور بہت ہی غیر معمولی مواقع کے علاوہ شراب نوشی بھی صرف نجی محفلوں میں کی جاتی تھی۔ ہندو راجاؤں کے خلاف سیاسی جنگوں کے مواقع پر بہت زیادہ مذہبی سرگرمی اور جذبہ جہاد کا مظاہرہ کیا جاتا تھا حالاں کہ اصولی طور پر حکومت کی ہندو رعایا کے خلاف ناعاقبت اندیشانہ جوش برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ شاہی حلقوں میں تصوف اور مذہبی اقوال اکثر زیرِ بحث آتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک مثال پیش کردینا کافی ہے ایک ریاستی سلطان اس حد تک محتاط تھا کہ وہ اپنے دسترخوان کے لیے مہیا کی جانے والی سبزیوں تک کے جواز کی جانچ کرتا تھا۔ حالاں کہ یہ بات ضرورت سے زیادہ لایعنی معلوم ہوتی تھی جب کہ دوسری طرف وہ ایک مسلمان حاکم سے برسرِ پیکار تھا اور اس جنگ کو وہ پورے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ لڑ رہا تھا[4] علماء اپنے طور پر سلطنت کو مذہبی

---

[1] بیعت کے لیے دیکھیے راورٹی، ص ۶۴۹ ۔ ۶۴۶۔ نیز تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۵۴۹

[2] خسرو قرآن بردار کے عہدے پر فائز تھا۔ برنی ص ۱۹۸

[3] عید کے شاہی جلوس کے لیے دیکھیے تفریحات پر باب

[4] اس قصے کے لیے دیکھیے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم ص ۳۶۱۔ سلطنت میں ہندوؤں کی حالت کے لیے دیکھیے ہندوستان ریویو سنہ ۱۹۲۷ء میں پروفیسر محمد حبیب کا مضمون "دی ایمپائر آف دہلی" وغیرہ وغیرہ۔ دشمنی کے پر خار میدان کو دوستی اور محبت کے میدان میں تبدیل کرنے کے لیے اس کی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور اخلاقی مدد بہم پہنچانے کے لیے نئے نئے مذہبی نکتے پیدا کر رہے تھے یا ایسی باتیں تلاش کر کے لاتے تھے جن سے سلاطین دہلی کی حیثیت کو تقویت پہنچتی تھی۔ قرآنی حکم "اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولوالامر منکم" کی تشریح بڑے عمدہ ڈھنگ سے کی گئی۔ سلاطین دہلی کو اولوالامر منکم سے تعبیر کیا گیا۔ ایسی ہی مناسب معاون احادیث تلاش کی گئیں اور انھیں ایسے معنی پہنائے گئے کہ امام (یعنی سلطان) کے احکام کی فرماں برداری رسولِ اکرم یا اللہ کے احکام کی فرماں برداری کے مترادف ہے۔ اس طرح ایک سادہ سی منطق کے لیے سلطان کا رتبہ احکام کی پابندی کے سلسلے میں نائب الٰہی کی حد تک بلند کر دیا گیا۔ شاہی احکام کی خلاف ورزی نہ صرف اس دنیا میں قابلِ سزا تھی بلکہ قیامت کے روز بھی لرزہ خیز سزا کی مستحق تھی۔ مسلمان اپنے امام کو چننے کا حق استعمال نہ کر سکتے تھے۔ انھیں محض اس کے احکام کو بجا لانا تھا خواہ سلطان غلام ہو یا حبشی یا اس میں جسمانی اعتبار سے کوئی نقص ہو[۱]۔ دوسری طرف علماء ایک نئے اصول کی تبلیغ کر رہے تھے کہ غیر مذہبی ریاست مذہب کی جڑواں بہن ہے دونوں میں فرق صرف فرائض کی نوعیت کا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سلاطین کے فرائض خدا کے رسولوں سے کسی بھی طرح کم نہ تھے۔ دراصل جس طرح انبیا دنیا کو روحانی معاملات میں ہدایت دیتے ہیں اسی طرح سلاطین بھی غیر مذہبی معاملات کا انتظام کرتے ہیں جو اسی کام کا ایک تکمیلی جز ہے[۲]۔ اس اصول کو انھوں نے اس حد تک وسعت دی کہ شاہی احکام کی مزاحمت کرنے والے سخت مجرم ہیں خواہ یہ حاکم ظالم اور صریحاً غلطی پر ہی کیوں نہ ہو اور

(بقیہ گذشتہ حاشیہ) کوششیں مشہور ہیں حالاں کہ اس سلسلے میں اکثر یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ اگر اس کے آباؤ اجداد نے اس کے لیے یہ میدان تیار نہ کیا ہوتا تو اس کی کوششیں تقریباً لاحاصل رہتیں۔ اس سلسلے میں ابوالفضل کے خیال کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۲۔

[۱] اس سلسلے سے متعلق تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ فخرالدین مبارک شاہ، ص ۱۲-۱۳۔ قرآنی آیت کے لیے قرآن شریف ۴: ۵۹۔

[۲] مذہب کے مطابق حکومت کی حیثیت کے لیے دیکھیے تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۳۳۱ محمود گوان کی ایک قرآنی آیت (۲۱: ۱۰۵) کی پرفراست تشریح کے لیے دیکھیے ریاض الانشا از محمود گوان۔ ص ۳۶ روئے زمین کی وراثت انھیں لوگوں کو ملتی ہے جو پرہیزگار ہیں۔

خواہ مزاحمت کرنے والا شخص حکومت میں مساوات اور انصاف کو بحال کرنے کی علی الاعلان کوشش کیوں نہ کر رہا ہو[۱] اس حالت میں شاہی احکام سے روگردانی کرنے والا صرف حکومت ہی کی نظر میں خطرناک مجرم نہ تھا بلکہ اسلام کے مقدس اصولوں کے پیش نظر بھی ایک قابل نفرت مجرم قرار پاتا تھا۔ اور اگر اسے قتل کیا جاتا تھا تو اسے باعزت طریقے پر دفن تک نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کی موت پر نہ کوئی ماتم ہوتا تھا اور نہ کوئی خوبی بیان کی جاسکتی تھی۔ اسی طرح علماء نے حکومت کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ وہ عوام کی کوئی بھی جائداد یا روپیہ ضبط کرلیں جو وہ جنگی ضرورت کے تحت مناسب خیال کرتے ہوں اور اُسے اسلام کے جاں نثاروں میں تقسیم کردیں[۲] مختصر یہ کہ علماء نے من اطاع السلطان فقد عطا الرحمٰن کے دعوے کی تائید کی[۳] جب مغل شہنشاہ اکبر نے ہندوستان کے مسلمانوں کا بلاشرکت غیرے مذہبی اور غیر مذہبی رہنما ہونے کا دعویٰ کیا اور پورا ملک بلا کسی خاص مخالفت کے اس کی اطاعت کرنے لگا تو یہ اس ارتقا کی تکمیل کے لیے ایک فطری قدم تھا۔ اس انتظام کے تحت امام عادل (سلطان) کو یہ حق حاصل ہوگیا کہ وہ کسی بھی فقہی اختلافی مسئلے ہیں علماء کے اتفاق رائے سے طے شدہ فتویٰ کو منسوخ کردے اور قرآنی احکام کی تشریح اپنی صوابدید کے مطابق کرے۔ اس کے فیصلے کو پورے ملک میں ردّ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ دنیاوی حکومت کی آخری معراج تھی۔ اسلام حکومت سے اس

---

[۱] برنی۔ خواندمیر اور فرشتہ کے خیالات کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۷۔ ہمایوں نامہ از خواندمیر ص ۱۲۲۔ اور تاریخ فرشتہ میں مقدمہ۔ بعد کے دور میں یہ خیال اس حد تک مقبول ہوچکا تھا کہ لوگ کتاب تصنیف کرتے وقت اپنے ابتدائی صفحات میں شہنشاہیت کی دینی اور روحانی حیثیت کو واضح کرتے تھے۔ مثال کے طور پر دیکھیے ابوالفضل۔

[۲] پوری بحث کے لیے دیکھیے فقہ فیروزشاہی۔ ص ۱۹۱-۱۹۲۔

[۳] اس کتبہ کو محمد تغلق کے سکوں پر کندہ کرانے اور اس مشہور لیکن ضعیف حدیث کو چالاکی سے استعمال کرنے کے لیے دیکھیے تھامس ایڈورڈ ص ۲۴۹-۲۵۰۔ نیز چاندی کے بجائے پیتل کے سکے چلانے کے لیے دیکھیے برنی ص ۸۔ یہ سمجھنا بہرحال غلط ہے کہ یہ قرآن کا حکم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ حدیث کسی بھی مستند کتاب میں نہیں ملتی۔ اس سے اس خیال کو اور تقویت ملتی ہے کہ یہ حدیث جعلی ہے۔

طرح نہ صرف کم تر ہو گیا بلکہ دراصل اور حقیقتاً اس کا تابع ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی حیثیت خدائی ہو گئی اور کریم النفسی اور جبر و جور سلطان کی ملکوتی صفات قرار پائیں[1]۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بدایونی جیسے متعدد قدامت پسند علماء نے ان حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا یا اگر کیا بھی تو انتہائی کراہیت کے ساتھ اور جلال الدین خلجی کی طرح چند ابتدائی سلاطین نے مذہب کی مخلصانہ پابندی کی کوشش کی لیکن ایسی چند مستثنیٰ مثالیں حالات کے ناگزیر رخ کو موڑنے کے لیے ناکافی تھیں۔

اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ان سیاسی حالات کا ردِعمل سیاسی سماج کی ابتدا اور سیاسی فرائض کے اصولوں سے متعلق فلسفیانہ خیالات پر پڑا۔ اس خیال کو بہت بڑی حد تک ہابس کے تیار کردہ خطوط پر ضابطہ کی شکل دی گئی تھی[2]۔ دہلی سلطنت کے قیام کی ابتدا ہی میں دوسری متعدد احادیث کی طرح ایک حدیث زبان زدِ عام ہو گئی تھی۔ بیان کیا جاتا تھا کہ حضور اکرم صلعم نے فرمایا لولا السلطان لاکل الناس بعضھم بعضاً۔ اگر سلطان نہ ہوں تو لوگ ایک دوسرے کو کھا جائیں۔ فخرالدین مبارک شاہ نے اس حدیث کو قوی حدیث کی حیثیت سے اس کے راوی کی تحقیق کیے بغیر اپنی دونوں کتابوں میں نقل کیا ہے[3]۔ دیگر احادیث کی طرح جن سے نظریۂ سلطنت کی تائید ہوتی ہے غالباً یہ حدیث بھی ہندوستان سے باہر ہی وضع کی گئی اور اسی قسم کے مقصد کی تکمیل کے لیے حملہ آوروں

---

[1] اکبر کے محضر پر بحث کے لیے دیکھیے منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۱۰۔ نیز جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۴ء۔ ایذا رسانی سلطان کے خدائی حقوق میں شامل ہے۔ دیکھیے طبقات اکبری جلد اوّل ص ۱۔

[2] قدرت کی حکومت کے تحت زندگی اور ایک واحد حاکم اعلیٰ کے قیام کے بڑھتے ہوئے احساسات کا ذکر کرتے ہوئے تھامس ہابس کہتا ہے Leviathan. ص ۱۳۱ کہ "ایسی مشترک قوت کے قیام کے لیے جو عوام کی غیر ملکی حملوں سے حفاظت کر سکے، ایک دوسرے کی زیادتی سے بچا سکے اور ان کی اس طرح حفاظت کرے کہ وہ اپنی محنت اور زمین کی پیداوار کے سہارے پھلیں پھولیں اور قناعت کی زندگی گزاریں، یہ ضروری ہے کہ عوام اپنی پوری قوت و طاقت ایک فرد کے سپرد کر دیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

[3] تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۱۳ نیز آداب الحرب از فخر مدبر ص ۱۱۳

کے ساتھ ہندوستان آئی۔ بہر حال یہ جلد ہی اتنی مشہور ہوگئی کہ امیر خسرو اور عفیف جیسے محتاط مورخین نے بھی اسے شرعی عقیدے کے جز اور ایک ٹھوس اخلاقی اور سیاسی اصول کی حیثیت سے تسلیم کرلیا۔[1] آخر میں محمد تغلق نے اسے اپنے سکّے پر ایک روایت کی حیثیت سے کندہ کرایا جس سے اس کی صحت کے بارے میں رہا سہا شک و شبہ بھی دور ہوگیا۔[2] جب سلطان کے گورنر اور نائب جداگانہ آزاد حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو انھوں نے دیگر شاہی ساز و سامان کی طرح سیاسی نظریات بھی دہلی سے مستعار لیے اور یہ عقیدہ ریاستی حکومتوں میں بھی اتنا ہی مقبول ہوا۔[3] ہم عصر سیاسی اور سماجی زندگی کے حقائق نے اس دعوے کو جائز سمجھ لیا۔ صرف حکومت امن، حفاظت اور انتظام کی ضامن معلوم ہوئی۔ یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ہندو مصلحین مسلمانوں کے اقتدار کے مسئلے پر خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے پچھلے کرموں کا ناگزیر نتیجہ ہے لہٰذا انھوں نے کبھی اس کی طاقت کو کچلنے کے لیے کوئی تجویز رکھی اور نہ کبھی عوام الناس کو اختیارات تفویض کیے جانے کی مانگ کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں عوام کی خود حکومت کرنے کی صلاحیتوں کے بارے میں بڑا شبہ تھا۔[4] کسی سلطان کی موت، طویل غیر حاضری یا مسلسل بیماری ایک عالم گیر اضطراب کا باعث بن جاتی تھی۔ سلطان کی اچانک موت سے عظیم انتشار برپا ہو جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر ہوشیار وزرا سلطان کی کامل

---

[1] امیر خسرو کی رائے کے لیے دیکھیے اعجاز خسروی جلد دوم ص ۹۔ امیر خسرو بہر حال اس اصول کو قبول کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ عفیف کی رائے کے لیے دیکھیے عفیف ص ۳۔

[2] اصل عبارت ہے لولا السلطان لکل الناس بعضہم بعض۔ ایڈورڈ تھامس (ضمیمہ پلیٹ ۴) نے سکّے کی مندرجہ بالا عبارت کا ترجمہ کرنے میں معمولی سی غلطی ہی کی ہے۔ حالاں کہ جو عبارت میں نے دی ہے اس کا ترجمہ دوسری طرح کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے "اقتدار اعلیٰ ہر انسان کو نہیں دیا جاسکتا (لیکن) کچھ لوگوں کو دوسروں کے اوپر مسلط کردیا جاتا ہے۔"

[3] مثال کے طور پر دیکھیے تاریخ مظفر شاہی

[4] کبیر ایسے وقت کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے جب لوگ خود اپنے اوپر حکومت کرسکیں۔ شاہ ص ۲۲۰

صحت، اس کی نقل و حرکت حتیٰ کہ دشمنوں کے مقابلے میں اس کی فتوحات سے متعلق من گھڑت سرکاری اطلاع شایع کرتے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ ایک مرکزی اقتدارِ اعلیٰ کی غیر موجودگی میں خود کو انتہائی غیر محفوظ محسوس کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عالمگیر یقین کلّی پیدا ہو گیا کہ سلطنت کا وجود ناگزیر ہے اور یہی امن و نظم و نسق اور حفاظت کے حصول کا واحد ذریعہ ہے[1]۔ یہ زمانہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر کے راجپوتوں کے تسلط کے اس دور کی طرف عود کرنا مناسب نہ تھا جس میں مستقل خانہ جنگی اور ایک دوسرے کی حدود پر عام حملہ ایک عام بات تھی اور جو غیر ملکی حملہ آور کی آمد کے ساتھ ہی ختم ہوئی۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پیشتر یہاں مسلمانوں کے ایک ایسے طبقے کا ذکر کرنا ضروری ہے جو قرآن کے اصل معنی کے پابند رہے اور جنھوں نے رسولِ خدا کی سنت اور آپ کے خلفا کے مسلک کے علاوہ کسی اور بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے مسلم سیاست کے ان سب تاریخی ارتقاء کو قبول کرنے سے سختی کے ساتھ مخالفت کی جن کا ذکر ہم مندرجہ بالا

---

[1] محمد تغلق کی موت کے بعد سندھ میں افراتفری کے لیے دیکھیے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم ص ۱۷۳۔ طویل عرصے کے لیے سلطان فیروز شاہ تغلق کی غیر حاضری میں جب وہ سندھ اور اڑیسہ میں گیا ہوا تھا اس کے وزیر کی کارگزاری کے لیے دیکھیے عفیف۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے ابوالفضل۔ آئینِ اکبری۔ جلد اوّل ص ۳۶۴۔ سیدی علی رئیس کی وہ تدابیر جو اس نے ہمایوں کے انتقال کے موقع پر اپنائیں۔ مقصد یہ تھا کہ عوام کو اس وقت تک شبہ تک نہ ہونے دیا جائے جب تک کہ اکبر واپس دارالسلطنت میں نہ آ جائے۔ سرکاری طور پر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ طبیعت کی معمولی ناسازی کے بعد شہنشاہ صحت مند ہیں اور اس اعلان کو عملی طور پر ثابت کرنے کے لیے ایک حربہ استعمال کیا گیا۔ ملا بکاسی نام کے ایک شخص کو جو حیرت انگیز طور پر شہنشاہ سے مشابہ تھا، ہمایوں کی جگہ شاہی تخت پر بٹھایا گیا۔ اسے شاہی لباس پہنا کر اس کے چہرے اور آنکھوں پر نقاب ڈال دی گئی۔ حاجب اور معتمد حسب معمول اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اطبا کو بڑے بڑے انعامات دیے گئے۔ اس سردار کا بیان ہے جس نے یہ تدبیر نکالی تھی "بادشاہ کی صحت یابی پر عام طور سے یقین کر لیا گیا۔"

صفحات میں کر چکے ہیں اور علما کے رویہ کے برعکس انھوں نے سمجھوتے کی ہر تجویز کی اس طرح مخالفت کی جیسے وہ شیطانی قوتوں سے دور رہنا چاہتے ہوں۔ ان کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک کوئی سمجھوتہ قابلِ قبول نہ تھا جب تک کہ وہ اسلام کی اصلی روح اور ان مقاصد کو ظاہر نہ کرتا ہو جن کے لیے اسلام نازل ہوا تھا۔ انھیں اپنے اس نظریہ پر پختہ یقین تھا کہ محمد صلعم انسانیت کے لیے اللہ کا آخری پیغام پیش کر چکے ہیں اور یہ پیغام روئے زمین پر مسلمانوں کے ہر عمل کے لیے رہ نما ہے۔ اس کے برخلاف مسلم حکومت کا نشو و نما زندگی کے تلخ تجربات میں ہوا تھا اور آخری ہتھیار کے طور پر وہ مخالفت کی ہر کوشش کو کچلنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ مسلمان عوام اس کے جملہ غیر اسلامی خصوصیات کی تائید کرتے تھے اور مسلمانوں کی ایک معتدبہ تعداد واضح طور پر مادیت پسند اور حقیقت پسند تھی۔ اس طرح آں حضرت کے زمانے کی طرح لوگوں کو بلانے والے افراد مسلم آبادی کے ایک معمولی سے حصّے پر مشتمل تھے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں کبھی کبھی جب کہ اسلامی حکومت بے نظمی کا شکار تھی انھوں نے مستعدی کے ساتھ طاقت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن باوجود اپنے عقیدے میں راسخ ہونے کے چوں کہ وہ انتظامی صلاحیتوں سے بے بہرہ تھے اور دشمن پر غالب آنے کے لیے مناسب سیاسی جوڑ توڑ اور دیگر تدابیر استعمال نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھیں عام طور پر جنگوں میں شکست ہوئی یا وہ آپس ہی میں لڑتے رہے[۱]۔ حکومت کے بہتر نظم و نسق کے ساتھ ساتھ اس قسم کے افراد میں اپنی کم مائگی کا احساس روز افزوں ترقی کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو ایسے لوگ افسردہ دلی اور مایوسی کا شکار ہو گئے اور زہد و ترکِ دنیا کی راہ اختیار کی یا ان لوگوں کے ساتھ صلح کر لی جنھیں اب تک وہ شیطانی قوتیں خیال کرتے تھے۔ یہ روحانی بحران اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں ظاہر ہوا جیسا کہ اس دور کے شکست خوردہ ادب اور نظریہ ظہور مہدی سے ظاہر ہے۔ اسلام کی ابتدا سے ہزار سال پورے ہونے اور ظہور مہدی کے بعد اسلام کو اس کی اصل پاکیزہ حالت میں بحال کرنے کی توقعات زور پکڑ گئیں[۲]۔

---

[۱] خارجیوں کی ناکامی کے تجزیے کے لیے دیکھیے میور ص ۲۹۰۔ ان کے عقاید کے لیے دیکھیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم ص ۹۰۶۔

[۲] اس موضوع پر ایک قدیم کتاب جس کا عنوان The Book of Strife تھا دیکھیے کرینکوو اسلامی کلچر جلد سوم، ص ۵۶۱-۵۶۲۔

ان عقائد کو برسراقتدار خاندانوں کے ساتھ سیاسی دھڑابندی کے لیے بڑی چابکدستی سے کام میں لایا گیا اور اس طرح جلد ہی ان کی روحانی اہمیت زائل ہوگئی۔ ان کی جگہ زہد و ریاضت اور تصوف نے، جو اس دور میں بہت مقبولیت حاصل کر چکے تھے لے لی۔ ان امور کا محمد صلعم اور قرآن کی تعلیمات نے مشکل ہی سے تصور کیا ہوگا[1] ایک صوفی کے باریک بیں تجزیہ اور سماجی حالات کے بارے میں اس کی رائے میں یا اس کی پرجوش اور شدید منطقی دلائل میں کسی بھی قسم کی خامی نہیں پائی جا سکتی۔ ایک صوفی کے خیال کے مطابق ایک منظم مسلم سماج میں روحانی زندگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ ان دونوں میں باہمی اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ بھی واضح تھا کہ وہ لوگ جو دنیا کی خاطر جیتے ہیں شیطان کے پنجوں میں گرفتار ہوتے ہیں اور دین دار لوگ صرف روح کی خاطر زندہ رہتے ہیں[2] کسی صوفی کے لیے کسی سیاست داں سے ملنا اس کی اپنی بنیاد پر آسان تھا۔ بادشاہ کے ظل اللہ ہونے کے پیچیدہ استدلال اور اسے حق بجانب ثابت کرنے والی وجوہات کو اس نے مسترد کر دیا اسلام کے لیے اپنی وفاداری کا اظہار کرنے والا مخالف خود کو ایک صوفی یا زاہد و عابد کی نظروں میں مضحکہ خیز بنا لیتا تھا۔

لیکن عملی اور ناقابلِ درگزر کچھ امور کسی صوفی کے کمزور پہلو بھی تھے۔ اگر منطق اس کے موافق تھی تو پورے منظم سماج کی قوت سلطان کی ایک آواز پر لبیک کہنے کو تیار اور ایک دنیادار شخص کے لیے آسان تھی۔ مثال کے طور پر روٹی کے مسئلے یا بالفاظ دیگر خود کو زندہ رکھنے کی ایک بے رحم ضرورت کا اس کے پاس کیا حل تھا۔ ایک متشدد صوفی کا جواب یہ تھا کہ اگر خوراک مہیا کرنے اور دنیاوی ضروریات پورا کرنے کے ذرائع سلطان کے اختیار میں ہیں تو وہ ان کے بغیر گزارہ کرنا منظور کرے گا بہ نسبت اس کے کہ وہ ان ضروریات کو ایک فاسد ذریعہ سے پورا کرے۔ شاہی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکوں کو وہ حرام بلکہ زہر خیال کرتا تھا۔ ایک صوفی کی دلیل جیسا کہ امیر خسرو نے نقل کی ہے یہ تھی کہ اگر سلطان کا دیا ہوا ایک سکہ ایک درویش کے پاس رکھے ہوئے سو سکوں میں مل جاتا ہے تو وہی واحد سکہ ان میں مل کر اپنے

---

[1] قرآن ۲۷، ۵۷

[2] قصائد۔ بدر چ۔ ص ۹۵

آپ پاک ہونے کے بجائے ان سب کو ناپاک کرنے کے لیے کافی ہے[1] مسلمانوں اور قرآن کو ماننے والوں کے لیے فوجی پیشہ ہمیشہ دل کش رہا ہے لیکن تارک الدنیا بزرگ اس پیشے کو اختیار کرنے پر بھی اس قسم کی پابندی لگاتے تھے کیوں کر ان کے خیال میں یہ اسلام کی دنیوی اقتدار کے قیام جیسی بڑی بڑائی میں معاون تھا[2] اس طرح کے افراد کے شدید اور جنگجویانہ جذبات کا اظہار افغانوں کے دور میں مہدوی تحریک کی شکل میں ہوا۔ (آخری صدی کی وہابی تحریک میں بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار تھا) اس تحریک کو کم وبیش ناکام ہونا تھا۔ اس قسم کے افراد کا یہ جذبہ اگرچہ الم ناک تھا لیکن تھا برتر جو وقتاً فوقتاً اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں ظاہر ہوتا رہا۔ ایک شہید کا تاج ہر سرزمین میں مذہبی تقدس کے شعلہ کو روشن رکھتا ہے اور یہ مردہ روحانی پیکر صرف انسانی روح کے گہرے جذبات کی بقا کا اظہار کرتا ہے لیکن اسلامی دنیا بہ مشکل ہی ان جملہ غیر مستقل جذبات کے لیے موزوں تھی۔ علماء کی روحانی اہمیت کچھ بھی رہی ہو وہ کامیابی کے ساتھ ہندوستان کے مسلم سماج کی نشوونما میں مدد و معاون ثابت ہوئے۔ اس کی نشوونما میں حائل ہونے کے لیے انھوں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو رکاوٹ نہیں بنایا۔ سیاست سے ان کے قریبی تعلق نے ان کے محدود اور مذہبی رجحان کو اس حد تک وسعت عطا کی کہ ان میں سے کچھ نے خلق خدا کی خدمت کو خدا کی عبادت کا درجہ دینے میں جھجک محسوس نہیں کی۔ ایک بادشاہ کے مذہبی فرائض کا ذکر کرتے ہوئے کشمیر کے صوفی ہمدانی ایسی معمولی باتوں کو بھی اس کے فرائض میں شمار کرتے ہیں، جیسے کہ چوروں اور ڈاکوؤں سے شارع عام کی حفاظت، دریاؤں پر پُل تعمیر کرانا، اور حفاظتی چوکیاں قائم کرنا وغیرہ[3] یہ سب اس سے بہت مختلف ہے جس سے فی زمانہ یا دور ماضی میں علما اور مذہبی افراد سے توقع کی جاتی تھی۔ اگرچہ علما اتنے دلیر تو نہ تھے جو مسلم ریاست کو وہ راستہ اپنانے سے باز رکھتے تاہم کم از کم انھوں نے مسلم سماج کو ایک اجنبی ملک میں اپنی اس امداد سے محروم نہیں رکھا جو مسلم تہذیب کے نشوونما میں معاون ثابت ہوئی۔

یہ تھا حشر اللہ کے اس آخری پیغام کا جو اس کے آخری نبی انسانوں کے لیے لائے تھے۔

---

[1] اعجاز خسروی جلد چہارم ص ۱۹۵ - ۱۹۸ برائے مکمل تفصیل

[2] اعجاز خسروی جلد چہارم ص ۲۷۲

[3] ذخیرۃ الملوک از شیخ ہمدانی ص ۱۱۰ ب

سُلطان

(الف) سُلطان کی ذاتی حیثیت

مندرجہ بالا صفحات میں اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کے تجزیے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ سلطان اور ریاست کا مقصد کم و بیش یکساں تھا۔ سلطان کی شخصیت کی ذاتی اور سرکاری حیثیت سے تقسیم کسی حد تک بے قاعدہ ہے۔ زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے مختلف طبقات کے سماجی طرزِ فکر اور ان کی ذاتی زندگیوں پر سلطان کے گہرے اثرات کی اہمیت کو واضح کرنے کی غرض سے یہ تقسیم کی جائے۔ رعایا سلطان کی (یا ہندو حکومت میں راجہ کی) اس حد تک حرف بہ حرف نقل کرتے تھے جس حد تک ان کی قوتیں اور ان کے ذرائع انھیں اس کی اجازت دیں۔ مختصر یہ کہ سلطان کی ذاتی زندگی عام طور پر سماج کے رُخ کو معین کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی تھی۔[1]

ایران کے ساسانی شہنشاہوں کی طرح سلاطینِ دہلی کا منتہائے نظر یہ تھا کہ وہ رفیع الشان محلات تعمیر کرائیں۔ پُرشکوہ دربار منعقد کریں اور ایک عالم کو اپنے سامنے جھکتے ہوئے دیکھ کر لطف اندوز ہوں۔ وافر خزانے جمع کریں اور اپنی پسند کے لوگوں کو دولت بخشنے کے لیے دولت کے جملہ مالی ذرائع اپنے قبضے میں کریں۔ سونے اور جواہرات پر ان کا پورا تصرف ہو جس سے وہ لالچی اور امیدوار لوگوں کو تحفتہً بخشتے رہیں۔ اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے مسلسل جنگ کرتے رہیں۔ روزانہ خانگی ضروریات کے لیے کارخانے اور ملازمین اور حرم بڑے پیمانے پر ہوں اور ان پر لامحدود دولت خرچ کر کے اطمینان حاصل کریں۔ مختصر یہ کہ ان کا جذبۂ خود پسندی مطمئن ہو اور انھیں شایانِ امتیاز حاصل ہو۔ شاہانہ ساز و سامان کے اہتمام

---

[1] برنی کے خیالات کے لیے دیکھیے تاریخ فیروز شاہی ص ۷۰۵

کے بغیر ایک بادشاہ مشکل ہی سے صحیح معنوں میں بادشاہ اور اس عظیم رتبہ کے لائق تصور کیا جاتا تھا۔ یہ غزنوی شہنشاہوں کا نصب العین تھا جیسا کہ ایک مورخ نے اس کا مختصر خاکہ کھینچا ہے اور اسی طرف اور سلطان محمود کی امتیازی شان کی طرف سلاطین دہلی حصولِ فیضان اور رہنمائی کے لیے دیکھتے تھے۔ درحقیقت یہی اس زمانے کا عالم گیر نظریہ تھا[1]

شاہی کارخانہ جات

خود کو اس عظیم مرتبہ کا اہل ثابت کرنے کے لیے سلطان اپنی سلطنت میں زیادہ سے زیادہ کارخانے جاری رکھتا تھا۔ اس کے محلات، اس کے حرم، اس کے غلام مصاحبین اور ملازمین کا عملہ اور آخر کار صرفِ خاص آسانی سے اس کو سلطنت کے ہر فرد سے بلند و بالاتر کر دیتے تھے۔

محلات

محلات کی تعمیر کرانا ایرانی بادشاہوں کا قدیم اور پسندیدہ طریقہ تھا۔ ہر بادشاہ اپنی ایک الگ رہائش گاہ پسند کرتا تھا۔ وہ ان عمارات کو استعمال کرنا پسند کرتا تھا جو اسے سابق حکمران سے ترکے میں ملی ہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے محلات اس کی حکومت کی یادگار کے طور پر باقی رہیں[2] اسی طرح ہندو راجہ ان محلوں میں رہنا جہاں پہلے کوئی آدمی مر چکا ہو منحوس خیال کرتے تھے۔ سلاطینِ دہلی بھی حتی الامکان اس روایت کے پابند رہے اور پرانے محلات کو بمع ان کے سازوسامان کے چھوڑ کر اپنے محلات نئے سرے سے تعمیر کرانے لگے[3] مسلمانوں کی حکومت کے ابتدائی دور میں دو محلوں کا ذکر ملتا ہے پہلا ذاتی رہائش کے لیے یعنی دولت خانہ اور دوسرا دفتری کاروبار کے لیے۔ ان کے نام سلسلہ وار قصرِ فیروزی اور قصرِ سفید تھے۔ ناصر الدین محمود کے زمانے تک ایک تیسری قسم کا محل کوشک سبز بھی وجود میں آگیا[4] بعد

---

[1] فتاویٰ جہاں داری ص ۹۹ - ۱۱۰

[2] ہوارث ص ۹۶

[3] کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۴۷

[4] راورٹی ص ۶۶۱ - برنی (قلمی نسخہ) ص ۹۶

میں یکے بعد دیگرے نہ صرف مختلف خاندانوں بلکہ شہنشاہوں نے نئے شاہی شہروں کی بنیاد ڈالنی شروع کی۔ ان میں شاہی محلات، بازار، باغات، مساجد، سڑکیں اور مورچے تعمیر کرائے۔ اس حد تک کہ موجودہ دہلی تقریباً ایک درجن قدیم شہروں پر مشتمل ہے مثلاً سیری، کلوکھیری، شہر نو، تغلق آباد، فیروز آباد، شاہ جہاں آباد اور قدیم راجپوت خاندانوں کے دارالخلافے کچھ زمانے بعد فیروز تغلق نے مختلف لوگوں کو محض شرفِ باریابی بخشنے کے لیے تین محل مخصوص کیے یعنی امرا کو، اپنے مصاحبین کو اور عوام کو۔ محلات اور شاہی شہروں کے بارے میں مزید تفصیلات آئندہ باب میں دی جائیں گی۔

حرم

سلاطین (ان میں ہندو راجہ بھی شامل ہیں) مجموعی طور پر انتہائی شہوت پرست تھے جس حد تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ان کا بیشتر وقت عورتوں اور داشتاؤں میں صرف ہوتا تھا۔ ان میں چند ایسے بھی تھے جو چیدہ حسین عورتوں کے حصول کے لیے مستقل شعبے رکھتے تھے لیکن ان کی شہوانی پیاس پھر بھی نہیں بجھتی تھی[1]۔ ہندو راجاؤں اور مسلم سلاطین کی

---

[1] جنوبی ہند کے ہندو راجاؤں کی انتہائی شہوت پرستی اور ان کی ہزاروں بیویوں اور غلاموں کا ذکر تقریباً سب غیر ملکی سیاحوں نے کیا ہے جو جنوبی ہند گئے تھے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی مثالوں کے ضمن میں مالوے کے ہندو راجہ کی وہ مثال دیکھیے جس کے حرم میں دو ہزار بیویاں تھیں۔ ان میں مسلمان عورتیں بھی تھیں۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم ص ۳۶۸۔ چپانیر کے راجہ کی دل چسپ مثال کے لیے جیو پا راول کے ساتھ عیش و عشرت میں اس قدر مستغرق تھا کہ افغان حملہ آوروں نے شہر پر قبضہ کر لیا اور اسے آخری وقت تک احساس بھی نہ ہوا۔ دیکھیے واقعاتِ مشتاقی ص ۲۹۔ اس سلسلے میں مسلمان حکمرانوں کی مثال دینے کی ضرورت نہیں ہے تاہم یہ بتانا ضروری ہے کہ معزالدین کیقباد ہر طرح کی شہوت پرستی میں مبتلا تھا اور بڑی عالی ظرفی سے اپنی رعایا کے اسی طرح کے گناہوں کو معاف کر دیتا تھا۔ دراصل اس کا خیال یہ تھا کہ اگر وہ خود بھی جملہ عیش پرستیوں میں مبتلا رہا اور اس کی رعایا بھی اسی طرح عیش کرتی رہی تو اس ذریعہ سے اسے دنیا میں شہرت اور مرنے کے بعد جنت ملے گی۔ دیکھیے برنی ص ۹۹۔ مالوے کے سلطان غیاث الدین خلجی نے گو کہ عورتوں کی فراہمی کے لیے مستقل شعبہ قائم کر رکھا تھا لیکن وہ ہمیشہ تاسف کرتا رہا اور اسی غم میں موت سے ہم کنار ہوا کہ اسے زندگی بھر اس کی پسند کی عورت نہیں ملی۔

ایک خاص بیگم ہوتی تھی جس کے بچے تخت وتاج کے وارث بنتے تھے یا بالفاظ دیگر
جہاں پُرسکون اور غیر نزاعی وراثت ممکن تھی۔ ان کا اوّل حق ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس
خاص بیگم کے دوسرے حقوق بھی تھے مثلاً اگر کوئی نابالغ لڑکا تخت پر بیٹھتا تو اُسے اس
کی سرپرستی کا حق حاصل ہوتا تھا۔[1] دوسری بیگمات، داشتاؤں نیز خواص کے درمیان انتخاب
کا کوئی طے شدہ اصول نہ تھا۔[2] یہ صحیح طور پر فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ عورتوں کی عزت سلطنت
کی حدود میں سلطان کی دست رس اور مداخلت سے کس حد تک محفوظ تھیں۔ مجموعی طور پر
ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سلطان ہندو عوام کے نازک جذبات کو مجروح کرنے سے پرہیز کرتا تھا لیکن
یہ سب سلطان کے ذاتی خیالات پر منحصر تھا کیوں کہ سلطان کے اس طرز عمل کے تدارک کی
کوئی صورت نہ تھی۔[3] معزول سلطان کی بیگمات کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ فاتح معزول بادشاہ
کی بیگمات سے شادی کرنے میں خود کو قطعی حق بجانب تصور کرتا تھا۔ ایسی بیویوں یا
داشتاؤں سے ان کی مرضی کے خلاف شادی کرنے کے دستاویزی ثبوت ہیں۔[4] ہندو راجا

---

[1] راجپوتانہ میں پٹ رانی کے خصوصی حقوق ہوتے تھے اور میواڑ کے رانا کے ساتھ پٹ رانی کو بھی بھرے دربار میں تخت نشیں کیا جاتا تھا۔ دیکھیے ٹوڈ، جلد سوم ص ۱۳۷۰ جلال الدین خلجی کی بڑی ملکہ اپنے بیٹوں کی سرپرست بنی اور غلطیاں کرتی رہی۔ اس نے اس وقت بھی غلطیاں کیں جب علاؤ الدین سلطان کو قتل کر کے دہلی میں داخل ہوا۔

[2] "بیگمات کی تعداد کا انحصار ضرورت اور شہزادے کی طبیعت کی رغبت پر منحصر تھا۔ ہفتہ کی دنوں کی تعداد کے مساوی بیگمات رکھنا عام بات تھی جب کہ کنیزوں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔" ٹوڈ، جلد اول ص ۲۵۴

[3] اس مسئلے پر ہندوؤں کے خیالات کے لیے دیکھیے پدماوت (ہندی) ص ۲۲۳-۲۲۴۔ غیر شائستہ حرکات کے سلسلے میں واقعات اور عورتوں کی مجبوری محض پر خسرو کی رائے کے لیے دیکھیے مطلع الانوار ۱۹۹

[4] غیاث الدین تغلق کو اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ غاصب خسرو خاں مبارک خلجی کی بیویوں کو اپنے نکاح میں لائے لیکن اسے صرف اس بات پر اعتراض تھا کہ اس نے عدت کے سلسلے میں مقررہ وقفے کا خیال نہیں رکھا۔ دیکھیے ظفرالوالہ جلد سوم ص ۸۵۴۔ اسی طرح مبارک شاہ نے خضر خاں کی عزیز بیوی دیول رانی کو شادی کرنے پر مجبور کیا جس کا اشارۃً ذکر امیر خسرو نے اپنی کتاب دیول رانی خضر خاں میں کیا ہے۔

عموماً پدری نسبت سے فرماں روا کی حیثیت سے قدیم اور پسندیدہ روایت پر عمل کرتے تھے حالاں کہ یہ کوئی عام تسلیم شدہ اصول نہ تھا۔[1]

اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہی حرم سرا میں سلطان کی بیگمات اور داشتاؤں کے علاوہ دوسری خواتین بھی ہوتی تھیں مثلاً ماں، بہنیں اور بیٹیاں۔ درحقیقت اس میں تمام رشتہ دار خواتین شامل تھیں۔ سلطان کی ماں خصوصاً (جسے راجپوتوں میں ماں جی کہتے تھے) سلطان کی خاص بیگم سے کہیں زیادہ بلند حیثیت رکھتی تھی۔ ایرانی روایات اور راجپوت رسوم دونوں میں حاکمِ وقت کی ماں زیادہ اثر و اقتدار کی مالک ہوتی تھیں بہ نسبت اس زمانے کے جب وہ بادشاہ بیگم تھی۔[2]

حرم کی حدود میں سلطان کی زندگی اس حد تک نجی تھی کہ مورخین نے زندگی کے اس پہلو پر جو کچھ بھی تحریر کیا ہے وہ قطعاً ناکافی ہے۔ سلطان التمش کے رضیہ کے تاج و تخت کا وارث قرار دینے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سلطان اس سے گہری محبت کرتا تھا اور اس کی تعلیم و تربیت میں اس نے بڑی توجہ اور دلچسپی لی۔ مورخین نے سلطان علاؤالدین خلجی اور اس کی بیوی کے تعلقات کی ناخوش گواری کا سرسری الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ یہ ناخوشگواری ان کے خیال کے مطابق دکن میں اس کے پہلے حملے کی وجہ بنی اور گھریلو پریشانیوں سے نجات پانے کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا۔ حاجی دبیر نے اس واقعے کی صحت کو ثابت کرنے کے لیے ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔[3] علاؤالدین خلجی کا بیٹا شہزادہ خضر خاں اپنی دوسری

---

[1] بھنی سلطان کی وجے سنگو کے ساتھ ایک لڑکی کی خاطر جنگ کے لیے دیکھیے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم ص ۳۹۱۔ جب راجا رتن سین دہلی گیا ہوا تھا تو اس کی غیر موجودگی میں ایک پڑوسی راجپوت راجا نے پدماوت کو حاصل کرنے کے لیے منصوبہ بنایا تھا۔ دیکھیے پدماوت (ہندی) نیز اسی طرح کے ایک دوسرے واقعے کے لیے دیکھیے پرشن پریکشا ص ۷۲-۷۳۔

[2] راجپوتوں کے لیے دیکھیے ٹوڈ۔ جلد سوم، ص ۱۳۷۰۔ ایرانی روایات کے لیے راولنسن۔ فائیو مونارکیز وغیرہ جلد سوم ص ۲۲۰۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد التمش کی بیوہ شاہ ترکان کے اثرات کے لیے دیکھیے راورٹی ص ۶۳۲۔ محمد تغلق کی والدہ کے جداگانہ خیراتی اداروں کے لیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۷۲۔

[3] علاؤالدین خلجی ایک عورت سے محبت کرتا تھا جس کا نام مہک تھا۔ یہ محبت اس کی بیوی اور خوشدامن

(بقیہ دوسرے صفحہ پر)

بیوی دیول رانی کی محبت میں سرشار تھا۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ شہزادے کی خود نوشتہ ذاتی سوانح عمری جس میں ان کے عشق اور شادی کی پوری داستان درج ہے اس کی نظم دیول رانی خضر خاں کی بنیاد ہے۔ یہ کتاب شہزادے کے قتل کے بعد شائع ہوئی۔ اس کتاب نے اس جاں نثار جوڑے کے عشق اور ان کے المیہ انجام کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اس موضوع پر ہمیں مغل دور سے پہلے بہت کم معلومات بہم ہوئی ہیں۔ حرم کی زندگی کے اندرونی حالات ہمیں مغل دور میں ملتے ہیں۔ بابر اور گلبدن بیگم کے سوانح جات اور زمانہ مابعد کی تحریریں حرم سے متعلق خوش و خرم گھریلو زندگی اور پیار اور محبت کے ماحول کی اچھی تصویر کشی کرتی ہیں جس کی وجہ سے بہت سے ضعیف الاعتقاد سیاح عجیب و غریب کہانیوں اور شرم ناک واقعات پر یقین کرنے لگے ہیں[1]۔

جہاں تک شاہی حرم کے انتظامات کا تعلق ہے برسر اقتدار سلطان پورے شاہی خاندان کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا۔ شاہی خاندان کے جملہ افراد بمع اس کی بیگمات کے اس کے احکامات کے پابند تھے[2]۔

(بقیہ حاشیہ) سے زیادہ عرصے تک پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ اس عورت سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس سے کسی طرح بھی دست بردار ہونے پر تیار نہ تھا۔ اتفاق سے ایک روز جب دونوں یکجا تھے ماں بیٹی آگئیں اور حالات نے بڑی ناخوش گوار صورت اختیار کر لی۔ شاید دونوں نے مہک کو مارنا شروع کر دیا اور علاؤالدین اسے ان کے ہاتھوں سے زبردستی چھڑانے پر مجبور ہو گیا۔ اس چھینا جھپٹی میں اس نے اپنی بیوی کو بھی طمانچہ مارا جو جلال الدین خلجی بادشاہِ وقت کی بیٹی تھی۔ انھیں ناخوش گوار حالات کی وجہ سے علاؤالدین دکن چلا گیا۔ دیکھیے ظفرالوالہ جلد دوم۔

[1] جب گلبدن بیگم کو زیادہ حفاظت اور آرام کے پیش نظر ہمایوں سے جدا کیا گیا اور مرزا کامران کی نگرانی میں رکھا گیا اس وقت ہمایوں کے لیے گلبدن کے احساسات کے لیے دیکھیے ہمایوں نامہ ص ۴۶۔ دیگر متعدد حوالہ جات کے لیے دیکھیے ہمایوں نامہ اور بابر نامہ۔

[2] انگلینڈ کی بادشاہ بیگم کی حیثیت کے لیے دیکھیے "بک آف دی کورٹ" ص ۶۵، "لیکن عام حالات میں جب تک قانوناً اسے وضاحت کے ساتھ مستثنیٰ نہ کر دیا گیا ہو وہ (بادشاہ بیگم) اسی سطح پر ہے جس سطح پر اس کی رعایا کے افراد۔ ہر لحاظ سے وہ بادشاہ کی رعایا ہے نہ کہ اس کے برابر۔ شہنشاہ کے پوتے پوتیوں کی دیکھ بھال اور خوشنودی سنہ ۱۷۱۸ء تک ایک متنازعہ فیہ مسئلہ تھا۔ آخرکار جارج اوّل نے اسے

(باقی اگلے صفحہ پر)

حرم کے جملہ مکین اور شاہی خاندان کے جملہ افراد اپنی معروضات سلطان کے سامنے پیش کرتے تھے اور وفاداری کے ساتھ اس کے احکامات بجالاتے تھے۔ حرم کے اندر جملہ مکین محل کے محفوظ جداگانہ حصوں میں رہتے تھے جن کی حفاظت ہر وقت پہرہ دار کرتے تھے پردہ پر بڑی توجہ دی جاتی تھی۔ ان کی دیکھ بھال اور خدمت کے لیے بھروسہ کی لونڈیاں اور خواجہ سرا نیز متعدد مرد اور ملازم خواتین اور غلام مقرر ہوتے تھے[1] حرم کی اندرونی دیکھ بھال کی ذمہ داری حاکمہ کی اور بیرونی خواجہ سرا کی تھی۔ خواجہ سرا کا عہدہ بہت بھروسے اور ذمہ داری کا تصور کیا جاتا تھا[2] مغل شہنشاہ اکبر کے حرم میں زنانہ ناظروں اور نگرانوں کا ایک مستقل عملہ تھا۔ ان کے علاوہ ایک خاتون عہدہ دار اشرف (اسٹورکیپر) ہوتی تھی جو رسد اور دیگر حسابات کی ذمہ دار تھی۔ وہ ہر سال کے جملہ اخراجات کا جانچ شدہ حساب اور آئندہ سال کے خرچ کا تخمینہ پیش کرتی تھی۔ رات کو زنانہ نگران پوری عمارت اور اس کے اندر رہنے والے مکینوں کی حفاظت کی ذمہ دار تھی۔ خواجہ سرا اپنے عملے کے ساتھ دروازے پر تعینات رہتا تھا اور وفادار راجپوت سپاہی عمارت کے گرد گردش کرتے رہتے تھے[3] حکومت مالوہ میں شاہی حرم ایک چھوٹے پیمانے پر حکومت کی شکل کا ہوتا تھا جس کی اپنی مستقل افواج اور فنون اور کاروبار سے متعلق قوانین اور ایک بڑا بازار ہوتا تھا۔ مرد یعنی صرف بادشاہ باہمی جھگڑوں کو طے کرنے اور تنخواہ طے کرنے کا مجاز تھا[4]

(بقیہ حاشیہ) ججوں کے سامنے ان کی رائے لینے کے لیے پیش کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ مدت بعد رایل میرج ایکٹ کا نفاذ ہوا۔ ایضاً ص ۸۰۔۸۱۔ متعدد معروضات کے لیے دیکھیے گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ۔

[1] گلبدن بیگم ص ۱۸

[2] ایلیٹ اینڈ ڈاوسن میں حاکمہ کا ترجمہ Directoress of female Department کیا گیا ہے۔ دیکھیے ص ۱۲۸۔ دہلی کے مشہور کوتوال فخرالدین کی بیٹی سلطان معزالدین کیقباد کے حرم کی نگران تھی۔ خواجہ سرا کے لیے دیکھیے دیول رانی خضر خاں ص ۱۰۱۔ علاؤالدین کے حرم کی نگران کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۷۴۔

[3] آئینِ اکبری جلد اول ص ۴۰۔ وجے نگر کے حرم کے انتظامات کے لیے دیکھیے ص ۳۲

[4] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم ص ۳۶۲۔ راجپوت حرم (راولا) کے انتظام کے لیے حکمران

غلامانِ شاہی (بندگانِ خاص)

غلاموں کے رتبے کے بارے میں ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے لیکن یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانے میں اور ابھی حال ہی کے زمانے تک بھی غلام رکھنے کا دستور قائم تھا اور ہر امیر اور باعزت شخص چند غلام ضرور رکھتا تھا۔ شاہی غلام یا بندگانِ خاص تعداد میں کافی ہوتے تھے اور مختلف ملکوں کے باشندوں پر مشتمل تھے۔ ان میں قدرِ اشتراک فقط ایک ہی تھی وہ یہ کہ وہ سب ایک ہی مالک کے نمک خوار اور وفادار ہوتے تھے۔ نہ ان غلاموں کے مقامی لوگوں سے تعلقات تھے اور نہ ان کی اپنی ذاتی دل چسپیاں ہی تھیں اس لیے سلطان حکومت کے دیگر افسران اور امرا کی بہ نسبت ان کی وفاداری اور فرض شناسی پر زیادہ بھروسہ کر سکتا تھا۔ بادشاہ اور آقا کی حیثیت سے سلطان کے ان پر اختیارات غیر محدود تھے۔ وہ انھیں قتل کر سکتا تھا، کسی دوسرے کو دے سکتا تھا یا جس طریقے سے بھی وہ مناسب خیال کرتا فروخت کر سکتا تھا۔[1] عملاً سلطان اور غلاموں کے تعلقات ناخوش گوار نہیں ہوتے تھے اور سلطان کو ان پر اپنے انتہائی اختیارات کے استعمال کی ضرورت کم ہی پیش آتی تھی۔ اس کے برخلاف غلاموں کی پرورش بیٹوں اور محرمِ راز کی طرح ہوتی تھی۔ کبھی کبھی جب کہ وارث سلطنت کی صلاحیت مشتبہ ہوتی تھی یا وہ کسی اور وجہ سے حکومت کی باگ ڈور کامیابی سے سنبھالنے کا اہل نہ ہوتا تھا تو سلطان کے وہ غلام جنھیں زندگی کے نشیب و فراز کا تجربہ تھا حکومت کے کام کو نامساعد حالات میں بڑی کامیابی سے چلاتے تھے۔[2] قطب الدین ایبک، التتمش اور بلبن شاہی غلاموں کی تین غیر معمولی

(بقیہ حاشیہ) ہیں کن صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔" ایک ایسے کام کے مقابلے میں ملک کا انتظام ایک تفریح سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا چوں کہ تمام سازشیں راولا میں ہی پرورش پاتی ہیں۔" دیکھیے ٹوڈ جلد اول۔ ص ۲۸۵

[1] ایک مثال کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۷۳-۲۷۴

[2] اس مسئلے پر سلطان محمد بن سام کے احساسات کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۱۰۔ اس سلطان نے اپنی پوری حکومت اپنی غلاموں کے لیے چھوڑی۔ انھیں غلاموں نے دہلی کی حکومت پر بھی قبضہ کیا اور ۶۰ سال سے زیادہ عرصہ تک ان کا خاندان برسرِ اقتدار رہا۔

مثالیں ہیں جنھوں نے نہ صرف اقتدار حاصل کیا بلکہ تختِ حکومت پر بھی متمکن ہوئے۔[۱]

عام طور پر شاہی غلاموں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ علاؤالدین خلجی کے پاس پچاس ہزار غلام تھے۔ محمد تغلق کے غلاموں کی تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی باہمی شادیاں کرنے اور ان میں سے کچھ کو آزاد کرنے کے لیے سلطان ہفتے میں ایک دن صرف کرتا تھا۔[۲] فیروز تغلق اپنے غلاموں کی تعداد میں اضافہ کی خواہش کے لیے مشہور تھا۔ وہ اپنے سالانہ خراج کے بدلے غلام بھیجنے کے لیے اپنے امرا کی ہمت افزائی کرتا تھا۔ ایسا کرنے کی صورت میں انھیں شاہی خزانے سے کچھ رعایت ملتی تھی۔ فیروز کے زمانے میں اس کے غلاموں کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں سے کچھ کو سلطان نے دوسرے شہروں میں آباد کیا اور ان کی تنخواہیں مقرر کردیں جب کہ دوسروں کو اس نے فنونِ لطیفہ اور مذہبی تعلیم میں لگایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے تقریباً بارہ ہزار دستکار اور معمار تھے اور تقریباً چالیس ہزار شاہی ساز و سامان کی تیاری میں مصروف رہتے تھے۔ ضمناً ہندوستان کی روز افزوں مسلمان آبادی میں غلاموں نے معتد بہ اضافہ کیا ہے۔

ان حالات میں حکومت پر شاہی غلاموں کا اثر قابلِ لحاظ ہوتا تھا۔ سلطان تمام قوت و اختیارات کا منبع تھا اور غلام دوسرے تمام لوگوں کی نسبت سلطان سے قریبی متعلق تھے اور شاہی تعلق کے نتیجہ میں انھیں نفع اور نقصان دونوں کا ہر وقت موقع تھا۔ سلطانہ رضیہ کے زمانے تک غلاموں نے اپنی اہمیت کو برقرار رکھا۔ فیروز تغلق کے جانشینوں کے دور

---

[۱] دیکھیے تاج المآثر (۱۱)، ص ۹۵۔ نیز راورٹی ص ۶۰۳-۶۰۴ و ۸۰۲۔

[۲] ہیول کا خیال ہے کہ شاہی غلام مختلف فنون میں اس لیے ماہر ہوگئے تھے کیوں کہ مسلمانوں کے حملوں اور غیر محفوظ زندگی کی وجہ سے ہندو فنکار ملک چھوڑ کر جا چکے تھے۔ دیکھیے ہسٹری آف آرین رول ص ۳۲۱۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ علاؤالدین کے زمانے میں تقریباً ۷۰۰۰ فن کار تھے جن میں ۷۰۰۰ معمار اور سنگ تراش تھے۔ یہ لوگ اپنے فن میں اس قدر ماہر تھے کہ ایک عمارت کی تعمیر زیادہ سے زیادہ دو ہفتے میں کر لیتے تھے۔ دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۱۷ ہندوستان سے ہندو فن کاروں کا ملک چھوڑ دینا یوں مشکل معلوم ہوتا ہے چوں کہ شمال مغربی سرحد پر ہر وقت منگولوں کا خطرہ منڈلاتا رہتا تھا۔

میں ان کا اثر فیصلہ کن رہا[1] وہ عموماً امیر کے درجے تک ترقی کر گئے جیسا کہ دوسرے باب میں ذکر کیا جائے گا۔

نجومی، درباری شعرا اور موسیقار

قدیم ہندو راجاؤں کے درباروں میں نجومیوں کے تقرر اور نجومیوں پر ان کا اعتقاد مشہور ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان سلاطین ان سے زیادہ مختلف نہ تھے۔ زائچوں کا ہر جگہ عمل دخل تھا۔ فال نکالی جاتی تھی، خوابوں کی تعبیریں لی جاتی تھیں، جادو ٹونوں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ ان حالات میں شاہی زندگی کی ادنیٰ سے ادنیٰ تفصیلات بھی درباری نجومیوں، جادوگروں اور پُراسرار علوم کے ماہرین ہی طے کرتے تھے۔ ہمایوں جو علم نجوم میں ماہر تھا ایک تجربہ گاہ کی تعمیر کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس طرح اس نے ایک ممتاز عالم اور جے پور کے بانی راجہ جے سنگھ کے کام کے لیے پیش بندی کی۔ ہندو اور مسلم سماج آج بھی علم نجوم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتا[2]

درباری شعرا اور موسیقار ہندوستان کے سبھی درباروں کا بہترین اثاثہ رہے ہیں۔ اکثر سلاطین فارسی شعر و شاعری کے دلدادہ تھے اور بعض سلاطین فی البدیہہ شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ منتخب غزلیں گانے کے لیے موسیقاروں کا وجود بھی اتنا ہی ضروری تھا اور اس سلسلے میں سلاطین صرف قدیم ایرانی روایات پر عمل کر رہے تھے[3]

---

[1] راورٹی ص ۶۳۵

[2] دیکھیے محولہ بالا راورٹی ص ۶۲۳ اور برنی ۱۴۲۔ دیکھیے تزکِ بابری اور تیمور کی سوانح میں سے فال نکالنے کے متعدد دل چسپ واقعات۔ ٹیپو سلطان کی ڈائری (انڈیا آفس) میں خواب اور ان کی تعبیر کے متعدد واقعات دیے گئے ہیں۔ ہمایوں کے واقعات میں ہر قسم کی ضعیف الاعتقادی کی مثالیں ملتی ہیں۔

[3] آلاتِ موسیقی اور ایرانی روایات کے لیے دیکھیے ہوارٹ ص ۱۴۵-۱۴۶۔ یہ آلات ہندوستان میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ حسن نظامی نے بانسری، چکارا، دھری بانسری اور بربط کا ذکر کیا ہے دیکھیے دارتھیا ص ۱۰۹۔

اسی طرح ہندو راجاؤں کے درباروں کے لیے بھی درباری شعرا اور موسیقار اتنے ہی ضروری تھے۔ اس موضوع پر ہم آئندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے۔ اسی طرح ہر دربار میں متعدد مسخرے، کرتب دکھانے والے اور نقال ہوتے تھے[1]

کسی دربار سے متعلق بعض قسم کے افراد کی تقسیم کرنا بہت مشکل ہے۔ انھیں مختصر الفاظ میں شاہی مقربین کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس طبقہ کا مزاج اور اس کی ساخت ہر سلطان کے دور میں بدلتی رہتی تھی۔ وہ پست اور غیر مہذب ہو سکتے تھے یا اس کے برخلاف سلطان کے ذاتی رجحان کے مطابق شریف اور مہذب۔ اس زمانہ میں ان کا اثر و اقتدار بہت زیادہ ہوتا تھا۔ سلطنت کے ابتدائی دور میں شاہی مقربین مسلمان ہی چُنے جاتے تھے۔ لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ہندوؤں نے دھیرے دھیرے سلطان کے مزاج میں اعتماد حاصل کر لیا اور آخر کار وہ سلطان کے مزاج کو مکمل طور پر تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے[2]

مصاحبین (ندیم)

مصاحبین یا ندیم سلطان کے عملے میں اہم ترین اور دل چسپ ترین اہمیت کے حامل تھے۔ یہاں ہمیں مہذب اور شائستہ لوگوں کے ایک ایسے طبقے سے سابقہ پڑتا ہے جس نے موجودہ زمانے تک ہندوستانی اُمرا کے طور طریق اور تہذیب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ دراصل ندیم کی اصطلاح سلطان کے گہرے دوست (یار شراب) کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن کوئی بہتر اصطلاح نہ ہونے کی صورت میں مصاحب کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے سلطان کے عیش و عشرت اور مسرتوں میں اضافہ کر کے اس کے خالی اوقات میں تفریح و تفنّن کا سامان کرنا ان کے خاص فرائض میں شامل تھا۔ ان میں سے چند تقریباً ہر مقام پر مصاحب یا نوکر کی حیثیت سے سلطان کے ہم رکاب رہتے تھے۔ اصولی طور پر حکومت میں ان کی کوئی سرکاری

---

[1] اعجاز خسروی میں پورا باب دیکھیے نیز تاریخ معصومی ۶۴

[2] ان کے اثرات کی مثال کے لیے دیکھیے راورٹی ص ۶۳۵۔ دیول رانی کو حاصل کرنے میں علاؤالدین کے منظورِ نظر بنجم کی سعی کے لیے دیکھیے دیول رانی ص ۸۷۔ کھتریوں (ایک طبقہ جو اکثری قوم سے مختلف ہے) کے اثرات سیدوں کے زمانے میں دیکھیے تاریخ مبارک شاہی ص ۴۵۶-۴۵۷

حیثیت نہیں تھی اور جہاں تک دستاویزات سے پتہ چلتا ہے وہ سلطان سے سرکاری معاملات پر گفتگو کرنے کے مجاز نہ تھے جب تک کہ ان کی رائے طلب نہ کی جائے یا وہ خاص طور پر مشورہ کے لیے دربار سے منسلک نہ ہوں۔ تخت سلطنت سے ان کا قریبی تعلق اور خصوصاً فرماں روا کی قلبی کیفیات اور ذاتی کمزوریوں کے مطالعے کے مناسب مواقع نیز اس کی خواہشات پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت کی وجہ سے انھیں شاہی معاملات پر کافی اثر و اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔[1]

کسی ندیم کی ذہنی استعداد اور لیاقت کافی وسیع اور جامع ہوتی تھی۔ وہ مختلف اوصاف کا حامل ہوتا تھا۔ وہ مردانہ لباس سے متعلق ساز و سامان اور ذاتی زیب و زینت کے جزئیات سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ انھیں اوصاف نے فنون لطیفہ کی صورت اختیار کر لی۔ اس کی گفتگو بہترین شستہ اور شائستہ زبان میں ہوتی تھی۔ اس کا دماغ مختلف علوم کی آماجگاہ ہوتا تھا مثلاً سوانح جات کا مطالعہ، قرآن، نظمیں، عوامی قصے کہانیاں اور مابعدالطبیعات نیز پراسرار اور اسلام کے صوفیانہ مسائل اور آخری بات یہ کہ وہ شطرنج اور سرا بگھی کا باکمال کھلاڑی ہوتا تھا اور موسیقی کے بعض ساز بجانے میں ماہر۔ لیکن ان سب اوصاف سے بھی زیادہ اس کی فن کارانہ صلاحیتوں کا اظہار سلطان کے نفسیاتی ردعمل، اس کے مخصوص مزاج کی بوالعجبیوں کے مطالعہ کے ذریعہ انھیں ہر وقت خوش رکھنے میں ہوتا تھا۔[2] راجپوت بھاٹ شائستگی اور لطافت میں سلاطین کے ندیموں کے معیار پر پورے نہیں اترتے حالاں کہ ان کے اپنے آقاؤں سے گہرے تعلق اور موقع پڑنے پر ان کی بہادری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ شاہی مصاحبین گھٹیا اور حقیر درجہ کی خوشامد کی

---

[1] دیکھیے ابوالفضل کی رائے آئین اکبری جلد اول ص ۵۔ اگر وہ صراط مستقیم سے ہٹ جائیں تو ساری دنیا پر مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔ برنی نے متعدد مقام پر ذکر کیا ہے کہ جلال الدین خلجی سرکاری معاملات میں اپنے بھتیجے احمد چپ سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ نیز برنی نے ہی قاضی مغیث الدین کا وہ بے لاگ مشورہ بھی نقل کیا ہے جو اس نے علاؤالدین کو دیا تھا۔ برنی کے سلطان محمد تغلق کو مشورے کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۹۵۔

[2] محمد اوفی کی اس مسئلے پر رائے کے لیے دیکھیے جوامع الحکایات ص ۱۸۷۔

وجہ سے ذلیل ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے اس حد تک پستی کا مظاہرہ کیا کہ خود ان کی نظر میں ان کا وقار باقی نہیں رہا[۱] فی زمانہ ندیم (مصاحب) کی اصطلاح چاپلوسی اور مردانہ اوصاف کی کسی حد تک کمی کے ساتھ منسوب ہو کر رہ گئی ہے۔

گھریلو عملہ

حرم، غلاموں اور دیگر ملازمین اور اپنے مصاحبین کے علاوہ سلطان اپنی ذاتی حفاظت اپنی تفریحات اور عام گھریلو ضروریات کے لیے بڑی تعداد میں لوگوں کو ملازم رکھتا تھا جو مختلف شعبوں سے متعلق ہوتے تھے۔ ان کے الگ افسران اور نگران ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہیں سلطان کی جیب خاص سے ادا کی جاتی تھیں اور وہ براہِ راست سلطان کو جواب دہ ہوتے تھے۔ سلطان کی اہم ترین ضروریات میں اس کی ذاتی حفاظت اس کی اولین ضرورت تھی[۲] دو مختلف افسران سر جاندار اور سر سلح دار اس خدمت کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے۔ سر جاندار عہدے میں سر سلح دار سے برتر ہوتا تھا اور شاہی حفاظتی دستہ کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ وہ حکومت کا ایک اہم امیر ہوتا تھا اور اس کی تنخواہ بھی زیادہ ہوتی تھی[۳] وہ شاہی حفاظتی دستہ کی قیادت اور نگرانی کرتا تھا۔ یہ دستہ شاہی غلاموں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ لوگ اپنی جاں نثاری اور کارگزاری کے لیے مشہور تھے[۴] سلطان کی ذاتی حفاظت اور بچاؤ سر جاندار کی ذمہ داری تھی اور اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے اسے خصوصی اختیارات حاصل تھے[۵] افسر دوئم یعنی سر سلاح دار شاہی زرہ بردار دستہ کی قیادت کرتا تھا۔ شاہی تلوار اس کی نگرانی میں رہتی تھی[۶] مجموعی

---

[۱] اس طبقے کے چند لوگوں سے اکبر کی نفرت کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول، ص ۳۱۹

[۲] لوگوں میں عیوب، ہوس اور لالچ نیز حکمران کی حفاظت کے لیے مکمل طور پر پیش بینی کے لیے دیکھیے بلبن کی رائے۔ برنی ص ۸۰۔

[۳] راورٹی۔ ص ۳۷۰۔ ملک سیف الدین کو ضروریاتِ زندگی کے لیے تین لاکھ جیتل ملتے تھے۔

[۴] دورانِ جنگ سب جنگجو سپاہیوں کی بہ نسبت شاہی غلاموں نے قربانی اور جرأت کی مثال قائم کی اور خود کو بلا خوف تند و پر شور دریاؤں اور آگ کے شعلوں کے سپرد کر دیا۔ دیکھیے فتاویٰ جہانداری ص ۷۱۔

[۵] سر جاندار کے ظلم و خوں ریزی کے لیے دیکھیے راورٹی ص ۲۷۰ [۶] اعجازِ خسروی جلد سوم ص ۱۴۱

طور پر اس کے فرائض رسمی قسم کے تھے۔ یہ ساسانی شہنشاہوں کے کمان برداروں سے بہت مختلف تھے[1]

گھریلو خدمات سے متعلق دیگر افسران میں سرآب دار (جو مغل دور کے آفتابچی کا مورثِ اعلیٰ تھا) سلطان کے کپڑوں کی دھلائی اور لباس سے متعلق دیگر انتظامات کی دیکھ بھال کرتا تھا اور سلطان جب کبھی باہر جاتا وہ پانی کے برتن (کروتی) ساتھ لے کر اس کے پیچھے چلتا تھا[2] خریطہ دار شاہی قلم دان کی دیکھ بھال پر مقرر ہوتا تھا۔ تحویل دار شاہی سرمایہ کی دیکھ بھال کرتا تھا[3] چاشنی گیر (جو مغل دور کے بکاول کا جدِ اعلیٰ تھا) شاہی باورچخانہ کی نگرانی کرتا تھا اور خود شاہی دسترخوان کی دیکھ بھال اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ بچے ہوئے کھانے کو باورچی خانے میں واپس لے جاتا تھا[4] سرجامہ دار شاہی توشہ خانے کا نگران ہوتا تھا اور سلطان کے لباس سے متعلق ساز و سامان اور سلائی کا ذمہ دار ہوتا تھا[5] تشت دار پانی کے بلوریں قرابہ اور سلفچی کے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور ساقی خاص شراب اور دیگر مشروبات کے ساتھ۔ اسی طرح مشعل دار محل کی روشنی کے انتظام اور چراغوں، شمعوں، شمع دانوں، روشنی کے کھمبوں اور جھاڑ فانوس وغیرہ کی نگرانی پر مامور ہوتا تھا[6]

گھریلو کاموں سے متعلق ہر لمحہ نگرانی کرنے والے افسران کی تعداد کافی طویل ہے لیکن مندرجہ بالا صرف چند افسران کا ذکر کردینا ہی یہاں کافی ہے[7] یہ تمام کارکن اپنے فرائض کی انجام دہی کی

---

[1] قدیم ساسانیوں کے دور میں کمان دار کو حکمران کے بالکل پیچھے کھڑا ہونے کا حق حاصل تھا دیکھیے راؤلنس۔ جلد سوم ص ۲۰۹

[2] برنی (قلمی نسخہ) ص ۱۵ نیز دیکھیے اس کے فرائض کے لیے جوہر کی تفصیلات تذکرۃ الواقعات ص ۱۳۰

[3] کتاب الرحلہ جلد سوم۔ ص ۶۳

[4] مغل دور میں شاہی باورچی خانہ کے ناظم کے لیے دیکھیے بیورج جلد دوم ص ۵-۱۱ چاشنی گیر کے فرائض کی تفصیلات کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۶۳

[5] ایضاً ص ۸۲

[6] تینوں افسران کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے راورٹی ص ۸۵،

[7] دیکھیے عفیف ص ۲۷۲۔ ۲۷۱۔ ۳۳۸۔ برنی ص ۵۳۷۔ دیگر افسران مثلاً عطر دار، چھتردار، شمع دار اور پردہ دار (شاہی شامیانہ وغیرہ) کے لیے دیکھیے قرآن السعدین ص ۱۴۵،

امداد کے لیے ماتحتوں اور شاگرد پیشہ لوگوں کا ایک مستقل عملہ رکھتے تھے۔

شاہی تفریحات کی دیکھ بھال کرنے والے افسران کے ذکر میں اس وقت صرف ان ہی افسران تک محدود رکھوں گا جو گھوڑوں اور ہاتھیوں کے شاہی اصطبل اور شاہی کشتیوں کی نگرانی پر مامور تھے۔ اس کے بعد تفریحات کی تفصیل آئے گی۔ گھوڑوں کے اصطبل کی نگرانی کی ذمہ داری ایک اہم امیر کے سپرد ہوتی تھی جسے امیر آخور یا امیر بک (خالص فارسی زبان میں اسے امیر اصطبل شاہی) بھی کہا جاتا تھا اور ہاتھی خانے کی دیکھ بھال کرنے والا حاکم شحنہ پیل کہلاتا تھا۔ محمد تغلق کے زمانے میں شحنہ پیل کی تنخواہ عراق جیسے بڑے صوبے کی آمدنی کی برابر ہوتی تھی[1]۔ ان اصطبلوں میں رکھے جانے والے جانوروں کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ شیر شاہ نے سلطنت میں شاہی ڈاک کے انتظام کے لیے ۳۴۰۰ گھوڑے رکھے تھے اور اوسطاً ۵۰۰۰ ہاتھیوں کی کفالت کرتا تھا[2]۔ شحنۂ بحر و کشتی نام کا ایک جدا افسر ہوتا تھا جو دریا پر ہونے والی شاہی تفریحات کی دیکھ بھال کرتا تھا اور اگر ضرورت پڑتی تو شاہی افواج کے دریا عبور کرنے میں بھی مدد دیتا تھا[3]۔

کارخانہ جات

ان افسران اور ان کے محکموں سے متعلق سامان کی فراہمی کا انتظام شاہی ذخائر یا کارخانہ جات

---

[1] شحنہ پیل کی تنخواہ کے لیے دیکھیے قصائد ۱۲۰؛ حج ص ۶۷۰، راورٹی ص ۸۵۷؛ اشارات وغیرہ ص ۳۰۲

[2] دیکھیے تاریخ شیر شاہی میں تفصیلات ص ۴۷

[3] رادھا کمد مکرجی کا خیال ہے کہ مسلم دور کی ابتدا میں اس افسر کے فرائض بحری معاملات سے متعلق تھے لیکن مجھے اس سلسلے میں کوئی ایسا ثبوت نہیں مل سکا ہے جس سے اس افسر کا تعلق بحری معاملات سے قائم کیا جاسکے بلکہ شاہی افواج کو دریا پار کرانے میں مدد دینا اور پلوں کی دیکھ بھال کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ یہ دونوں فرائض بری فوج کی نقل و حرکت کے ماتحت تھے اور ان سے بحری نقل و حرکت سے مراد نہیں لی جاسکتی دیکھیے A History of India Shipping and Navaline activity ص ۱۸۹؛ تاریخ فیروز شاہی (قلمی نسخہ) میں برنی نے طغرل کے خلاف بحری حملے کا ذکر نہیں کیا ہے صرف بنارس میں ایک دریا عبور کرنے کا ذکر ہے برنی۔ ص ۸۸-۸۶۔

کے ذمہ تھا۔ یہ طریقہ بھی غالباً ایران سے ہی لیا گیا تھا[۱] ان افسران اور دیگر محکموں کی ضروریات فراہم کرنے کے علاوہ ان کارخانہ جات میں علم خانہ، کتاب خانہ، گھڑیال خانہ اجواہر خانہ اور شاہی چراگاہ کی دیکھ بھال کے لیے جداگانہ شعبہ جات ہوتے تھے۔ شاہی اصطبلوں کی ضروریات فراہم کرنا اور شاہی عمارتوں کی دیکھ بھال بھی انھیں کارخانوں کے ذمہ تھی۔ عمارات کی دیکھ بھال کے لیے ان کے پاس معماروں کی بہت بڑی فوج ہوتی تھی۔ غرض یہی محلات اور دوسری شاہی عمارتوں کے لیے معمولی خدمتیں اور اندرونی انتظام کے لیے ملازم اور خدمت گار مہیا کرتے تھے۔ لیکن یہ اندازہ کسی بھی طرح مکمل معلوم نہیں ہوتا۔ ان کارخانوں کا نگران ایک ممتاز امیر ہوتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے اس کے ماتحت متصرف ہوتے تھے۔ یہ ماتحت افسران بھی عالی مرتبہ امراء ہوتے تھے اور ان کا تقرر خود سلطان کرتا تھا۔ ان سب کو بڑی بڑی تنخواہیں ملتی تھیں۔ شاہی ذخائر کی نگرانی کا کام بھی اتنا ہی نفع بخش تصور کیا جاتا تھا جتنا کہ ملتان جیسے بڑے شہر کی صوبہ داری کا[۲]

صرفِ خاص (ملک)

اس پورے نظام کو برقرار رکھنے کے لیے سلطان کے ذرائع تقریباً غیر محدود ہوتے تھے۔ سونے اور چاندی کے ذخائر کے علاوہ سلطان پوری حکومت میں سب سے بڑا زمیں دار ہوتا تھا۔ درحقیقت تنہا سلطان ہی کی جائداد کو مسلمہ طور پر قانونی حیثیت حاصل تھی۔ اسے کسی بھی زرخیز ترین زمین کے قطعات کو چننے اور ان کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے پورے سرکاری ذرائع کو استعمال کرنے کا مکمل حق حاصل تھا۔ صرفِ خاص (ذاتی زمینوں) کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے افسران کا ایک الگ عملہ مقرر تھا۔ ہم اس پہلو پر دوسری جگہ روشنی ڈالیں گے[۳]

---

[۱] قدیم ایران کے لیے دیکھیے ہوارٹ ص ۹۶

[۲] عفیف ص ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹

[۳] آب پاشی کی نہروں کی دیکھ بھال اور آب پاشی کے نئے محاصل (حاصل شرب) لاگو کرنے کے لیے فیروز تغلق کی پریشانی کے لیے دیکھیے عفیف ص ۱۳۰۔ سلطان نے کچھ بنجر زمین کو بھی آباد کیا تھا اس (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سلطان کے نجی خانگی انتظامات اور اس کے اشغال کی نوعیت سے متعلق رائے قائم کرنے کے لیے محمد تغلق کے بارے میں مسالک الابصار کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ مصنف رقمطراز ہے " اس شہزادے کے خرچ پر ۱۲۰۰ اطبا رکھے گئے ہیں، .... اشاہین باز ہیں جو گھوڑوں پر سواری کرتے ہیں اور شکار کے لیے تربیت یافتہ پرندے ساتھ رکھتے ہیں۔ ۳۰۰ ہانکا کرنے والے آگے جا کر شکار کا انتظام کرتے ہیں۔ ۳۰۰۰ پھیری والے دوکاندار شہزادے کے ہمراہ جاتے ہیں جب وہ شکار کے لیے جاتا ہے۔ ۵۰۰ ہم نشین دستر خوان پر شریک ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ۱۰۰۰ غلام موسیقاروں کی کفالت کرتا ہے جنھیں خصوصی طور پر موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی ۱۲۰۰ موسیقاروں کی کفالت کرتا ہے اور عربی، فارسی اور ہندوی پراکرت زبانوں کے .... اشعرا کی کفالت بھی کرتا ہے اس کے اپنے دستر خوان پر کھانے کے وقت صبح شام خان۔ ملک۔ سپہ سالار، امرا اور دیگر افسران یعنی تقریباً بیس ہزار افراد موجود ہوتے ہیں۔ دوپہر اور شام کے کھانوں میں سلطان کے دسترخوان پر تقریباً ۲۰۰ علما جمع ہوتے ہیں جو اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں اور علمی موضوعات پر اس کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔" ایک راوی جس کا بیان شاہی باورچی کے بیان پر مشتمل ہے شاہی باورچی خانے کے لیے روزانہ ۲۵۰۰ بیل، ۲۰۰۰ بھیڑیں اور دیگر جانور اور پرندے ذبح کیے جاتے تھے۔[۱]

(ب) سلطان کی سرکاری حیثیت

شہنشاہوں کے اعزاز کو ہمیشہ اولین اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ سلطنت کے نئے تصور اور شاہی اعزاز کے خودساختہ خدائی بنیاد کی وجہ سے شاہی اعزاز کی ضرورت

(باقی حاشیہ) کے محاصل اور آمدنی بھی شاہی خزانے میں جمع ہوتے تھے اور کچھ حصہ خیراتی اداروں پر صرف ہوتا تھا۔ پیداوار کے اضافے کے لیے دیکھیے حصۂ چہارم

[۱] دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاسن جلد سوم ص ۵۷۸ - ۵۸۰ اور Notices etc جس میں ملک کا ترجمہ le vol ، کیا ہے۔

غیر محدود اضافہ ہوگیا۔ دہلی کے سلاطین نے محتاط طریقے سے ایران کے ساسانی پیش رو بادشاہوں کی نقل کی جس میں عیش وعشرت اور خودنمائی کا شوق غیر معمولی تھا۔[1] ایک ایسے غیر ملک میں اس کی ضرورت اور زیادہ تھی۔ سلطان کے جاہ وجلال اور اس کی قوت و شان کے مظاہروں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں رعب اور دبدبہ بٹھانے کے علاوہ عوام سے اپنی حکومت تسلیم کرانے کا کوئی اور بہتر ذریعہ نہ تھا۔ ایسی متعدد مثالیں تحریری شکل میں موجود ہیں جن میں سلطان کی موجودگی اور اس کی وضع قطع سے اس کے دشمنوں کے دلوں پر اس کا خوف طاری ہوگیا۔ درحقیقت لوگ اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ اگر سلطان کی شخصیت عوام میں دھاک بٹھانے اور ان کے دلوں پر خوف طاری کرنے میں ناکام رہتی ہے تو کسی ملک کی حکمرانی کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ وہ ایک تومان (دس ہزار سپاہی) کی قیادت کرے یا کم از کم یہ ہو کہ ایک چھوٹے سے صوبے پر حکومت کرے۔[2] ان حالات کے پیش نظر

---

[1] Perfect Prince میں King کے Dignitee of a کے سلسلے میں Occleve کے مشورے کے لیے دیکھیے Speculum جلد سوم ص ۴۹۹۔ ہوارث میں Hormuzd چہارم کے بارے میں Theophylactus کی رائے کے لیے دیکھیے ص ۱۴۷-۱۴۴۔ "اس کا تاج سونے کا اور قیمتی جواہرات سے مرصع تھا۔ اس میں جگمگاتے لعل اور یاقوت سے تیز روشنی نکلتی تھی اور اس کے گرد موتیوں کی قطاریں زمرد کی خوبیوں کے ساتھ مل کر ایسی روشنی دیتے تھے کہ آنکھیں اس کو دیکھ کر حیرت سے کھلی رہ جاتی تھیں۔ اسے دیکھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی Ctesiphon کے محل میں سامنے کا حصہ محرابوں سے مزین تھا اور اس میں کھڑکیاں نہ تھیں البتہ چھت میں ایک سو پچاس روشندان تھے جن کا قطر پانچ انچ سے زیادہ نہ تھا جن میں سے پراسرار روشنی آتی تھی۔ بڑے کمرے کے آخری سرے پر تخت تھا۔ جب پردہ اٹھتا تھا تو شہنشاہ بڑے طمطراق سے شاہانہ لباس زیب تن کیے اپنے تخت پر رونق افروز ہوتا تھا جس پر ہیرے اور جواہرات جڑے ہوتے تھے۔ تاج کے وزن کو سنبھالنے کے لیے چھت سے ایک سنہری زنجیر لٹکتی رہتی تھی۔ یہ منظر اس قدر پرشکوہ ہوتا تھا کہ وہ شخص جو اسے پہلی مرتبہ دیکھتا تھا، غیر ارادی طور پر جھک جاتا تھا۔

[2] سلطان کے دربار میں باریابی کی تفصیلات، نیز جب کوئی سفیر یا ہندو باج گزار راجہ پہلی بار تختِ شاہی کے روبرو نذر گزارنے کے لیے پیش کیا جاتا تھا تو سلطان کے رعب ودبدبہ کی وجہ سے کانپنے لگتا اور بے ہوش تک ہو جاتا۔ ان پرشکوہ مناظر کی خبر سے باغی عناصر پر بڑا اچھا اخلاقی اثر

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

سلطان کے لیے متعدد امتیازی حقوق مخصوص کر لیے گئے تھے مثلاً شاہی خطابات، خطبہ، سکّہ اور چند دیگر ایسی علامات جو اسے ملک کے جملہ افراد سے امتیاز عطا کریں۔ وہ صرف دربار میں عوام کی شکایات سننے کے لیے، فوجی قیادت کے وقت یا شکار کے موقع پر ہی عوام کے روبرو آتا تھا اور ہر حالت میں ایک شاندار جلوس اس کے ہمراہ ہوتا تھا۔

خطابات

ایسا خطاب اختیار کرنے کا حق صرف بادشاہ کو حاصل تھا جو اس کے قطعی اور بلاشبہ اختیارات پر دلالت کرتے ہوں اور یہ خطاب سلطان کا تھا۔ تیمور کے حملہ کے بعد سیدوں نے اقتدار حاصل کیا اور رایاتِ اعلیٰ اور مسندِ اعلیٰ کے القاب اختیار کیے[۱] جیسے ہی ہندوستان میں اقامت پذیر افغانوں کے مختلف طبقات نے شیر شاہ کی قیادت کو تسلیم کیا اس نے اعلیٰ حضرت کا لقب اختیار کر لیا لیکن جیسے ہی اسے کافی قوت و اقتدار حاصل ہوا اس نے مکمل شاہی اختیارات ظاہر کرنے کے لیے سلطان کا لقب اختیار کر لیا[۲] شاہی القاب کے علاوہ سلاطین کچھ ایسے القاب بھی اختیار کرتے تھے جو امارتِ مسلمہ پر ان کی مذہبی قیادت پر دلالت کرتے تھے۔ اس کا ذکر اس سے پیشتر کیا جا چکا ہے۔ جب لوگ اس سے بات کرتے تھے تو وہ اسے خداوندِ عالم کہہ کر خطاب کرتے تھے اور اپنی بات کہنے سے پیشتر اس کی طویل زندگی

(بقیہ حاشیہ) پڑتا تھا۔ دیکھیے برنی ص ۲۵ و ص ۳۳۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ایک بار جب محمد تغلق سپاہیوں کی معمولی سی تعداد کے ساتھ نمودار ہوا تو باغی افغان جن کی تعداد بہت زیادہ تھی، سلطان کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جلد دوم ص ۰۷۔ گورونانک کے نظریہ کے بارے میں دیکھیے میکالف جلد اوّل ص ۲۰۔ گورونانک کی رائے میں حکمران وہ ہے جس کی حفاظت بزدوں سے کی جائے، جس کے لیے شادیانے بجتے رہیں، جو تخت پر بیٹھے اور جس کے سامنے لوگ باادب رہیں۔ اسلامی حکومت کے مرکز کے مدینے سے بغداد تبدیل ہو جانے کے بعد خلیفہ کے ہمراہ جلاّد چلتا تھا۔ آرنالڈ ص ۲۸

[۱] منتخب التواریخ ص ۲۸۵

[۲] تاریخ شیر شاہی ص ۳۴

اور اس کی سلطنت کی حفاظت کے لیے دعائیہ کلمات ادا کرتے تھے[1]

خطبہ اور سکّہ

تخت نشین ہونے والے شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھنا اور اس کا نام کندہ کرا کے سکہ جاری کرنا اقتدارِ اعلیٰ کے دو ایسے صریحی اور اعلانیہ کام تھے جن سے کسی سلطان کی تخت نشینی کا اعلان کیا جاتا تھا۔ یہ دونوں باتیں علی الترتیب خطبہ اور سکّہ کہلاتی تھیں[2] کسی اہم فتح کی یادگار کے سلسلے میں بھی نئے سکے جاری کیے جاتے تھے۔ یہ دونوں باتیں صرف شہنشاہ کے لیے مخصوص تھیں۔ جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں دہلی سے الگ ہوگئی تھیں انھوں نے بھی اس روایت پر عمل کیا[3]

علاماتِ شاہی

(الف) تاج وتخت : سلاطینِ دہلی کا تاج ایرانی اور غزنوی بادشاہوں سے مختلف ہوتا تھا۔ یہ صرف آرائش کی ایک چیز نہ تھی بلکہ اس کی حیثیت سر کے لباس کی سی تھی۔ اس میں ہیرے جڑے ہوتے تھے۔ اس کی شکل گول تھی اور یہ ڈھیلا اور پیشانی سے ذرا اوپر ابھرا ہوا ہوتا تھا[4] ہمایوں نے شہزادگی کے زمانے میں تاج کی شکل اور اس کے نمونے میں چند اصلاحات کیں۔ اس نے اصلاح شدہ نمونے کے تاج بنائے اور اپنے والد مغل شہنشاہ بابر کی خدمت میں پیش کیے[5]

---

[1] کتاب الرحلہ جلد دوم، ص ۹

[2] مناسب ٹھپّہ نہ ہونے کی وجہ سے سلطان غیاث الدین تغلق نے ایک ایسا سکہ جاری کیا تھا جس کی پشت کی طرف متروک مہر تھی۔ یہ سکہ وقتی ضرورت کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی حکمران کے سکّوں سے متعلق اعلان کو کس قدر اہمیت حاصل تھی۔ دیکھیے ای تھامس جلد اول نیز ایضاً ص۔۱۹۰۔ کسی فتح پر سکّوں سے متعلق اعلانات کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۷۳۔

[3] فنِ خطبہ اور سکہ کے ماہرین کے لیے دیکھیے تاریخ شیر شاہی ص ۳ نیز دیلبری ص ۵۳۔

[4] قرآن السعدین ص ۱۴۳

[5] اکبرنامہ جلد اول ص ۲۶۰۔ ۲۶۱۔

تخت لکڑی کا بنایا جاتا تھا اور اس پر سونے کا پتر چڑھا ہوتا تھا۔ اس کی شکل مربع نما ہوتی تھی اور یہ چار پایوں پر کھڑا ہوتا تھا[1] ہندوؤں کا روایتی تخت اونچائی میں ۹ منزلہ ہوتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال شاید سلاطین دہلی کو پسند نہیں آیا۔ اس کی شان وشوکت دوبالا کرنے کے لیے مزید منزلوں کا اضافہ کرنے کے بجائے انھوں نے اس کے چاروں طرف قیمتی چھتر بنا دیے۔ اس سلسلے میں بعد میں بحث کی جائے گی۔

(ب) **چھتر اور دورباش** ، تخت اور تاج کے بعد شاہی چھتر اور شاہی عصا (دورباش) شاہی اقتدار کی دو اہم معلومات تھیں[2] شاہی چھتر کے رنگ اور نمونے کا انحصار حاکم کے ذاتی ذوق پر تھا[3] محمد تغلق نے خلفائے عباسی کی طرح سیاہ چھتر استعمال کیا۔ ایک بڑے

---

[1] قران السعدین ص ۱۴۲۔ ہندو تخت کے لیے پدماوت (ہندی) ص ۶۲۳

[2] مثال کے طور پر دیکھیے راورٹی ص ۶۰۷

[3] جلال الدین خلجی عوام کی باریابی کے لیے سرخ چھتر استعمال کرتا تھا لیکن دبدبہ کی اس علامت کو دوسرے مواقع پر استعمال نہیں کرتا تھا۔ ان مواقع پر وہ سفید چھتر کو ترجیح دیتا تھا دیکھیے دیول رانی خضر خاں ص ۶۷۔ کلیات خسرو ص ۸۸۳۔ تاریخ فرشتہ، جلد اول ص ۱۵۴ اس سے پہلے سلطان معزالدین کیقباد مختلف مواقع پر مختلف رنگوں کے چھتر استعمال کرتا تھا مثلاً سرخ، سیاہ، سفید، سبز اور گلابی۔ اس کے چھتر میں بھی موتی جڑے ہوتے تھے دیکھیے قران السعدین ص ۲۰۔۵۷۔

اس سلسلے میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ چھتر کا جو ترجمہ راورٹی نے Canopy کیا ہے وہ غلط ہے۔ چھتر کی اصل اصطلاح مختلف مقامات پر استعمال ہوئی ہے مثلاً طبقات ناصری (قلمی نسخہ) ص ۱۷۸ اور اس کا ترجمہ Parasol کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ Canopy سائبان کے لیے زیادہ موزوں اصطلاح ہے۔ راولنسن کا خیال ہے کہ چھتر کا استعمال جو ہمیشہ مشرق میں تزک واحتشام کی علامت رہا ہے Assyria کی طرح ایران میں بھی قانون یا روایات کی بنا پر صرف حکمران تک ہی محدود رہا (five etc etc) جلد سوم ص ۲۰۶۔ ہندوؤں میں چوڑی اور چھتر کے استعمال کے لیے دیکھیے للا ص ۲۱۰ پر ٹیپل کی ملے نیز آداب الملوک ص ۷۶ ب۔

"ہما" (ایرانی شہنشاہوں کا محافظ) کی شکل تقریباً ہر چھتر پر سنہری رنگوں میں بنا دی جاتی تھیں۔ شہنشاہ اس کے پروں کے سائے کے نیچے رونق افروز ہوتا تھا اور اسے نیک فال تصور کیا جاتا تھا[1]۔

سلطان کے علاوہ کسی کو بھی چھتر استعمال کرنے کا حق نہ تھا سوائے اس کے کہ خود حاکم وقت نے اسے اجازت دی ہو۔ یہ غیر معمولی رعایت بھی ان چند افراد تک محدود تھی جن کا تعلق شاہی خاندان سے ہوتا تھا۔ خصوصاً تخت کے وارث ہی اس کے حق دار ہوتے تھے[2]۔ ان حالات میں بھی جب اجازتِ خسروی سے ایک سے زیادہ چھتر استعمال ہوتا تھا تو سلطان اور دوسرے افراد کے چھتر میں ایک نمایاں فرق ہوتا تھا تاکہ دونوں چھتروں کے درجے میں کسی طرح کی غلط فہمی نہ ہو[3]۔

---

[1] ہما کے لیے دیکھیے خزائن الفتوح ص ۲۹، قصائدِ بدرِچاچ ص ۹۹ ۔ قران السعدین قلمی نسخہ برٹش میوزیم نمبر ۱۸۸۵ ص ۱۰۲۔ ہما کی تفصیلات کے لیے دیکھیے ہوارٹ ص ۸۸ "ہما ایرانی کرگس کی ایک قسم ہے یعنی (Gypo fulvus) جسے ریش دار کرگس بھی کہا جاتا ہے۔

[2] بلبن نے شہزادے محمد کو تخت کا وارث مقرر کر دیا تھا اور اسے چھتر اور دورباش استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ بغرا خاں کو یہ حق اپنے بڑے بھائی سے اس کی وفات کے بعد ملا لیکن جب اس کا بیٹا کیقباد دہلی کا بادشاہ بنا تو اس کے باپ نے سفید چھتر کے استعمال کرنے کے حق کی بحالی کے لیے درخواست دی۔ وہ بہرحال یہ تسلیم کرتا تھا کہ سفید چھتر کے استعمال کا حق دہلی کا سلطان ہونے کی وجہ سے اس کے بیٹے ہی کو تھا۔ کیقباد نے بغرا خاں کی اس درخواست کو منظور کر لیا جس سے بغرا خاں کو بڑا اطمینانِ قلب حاصل ہوا۔ (دیکھیے قران السعدین ص ۱۴۶ و برنی ص ۱۴۲) علاءالدین خلجی نے اپنے باج گزار کی حیثیت سے چتوڑ کے راجا کو نیلا چھتر استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ خزائن الفتوح ص ۳۳۔ علاؤالدین خلجی نے اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کو کئی شاہی نشانات اس وقت عطا کیے تھے جب اس کا تقرر دہلی کے سلطان کے صوبیدار کی حیثیت سے راجپوتانہ میں ہوا تھا مثلاً چھتر۔ دورباش۔ نیل۔ علم۔ لیکن جب یہی شہزادہ ملک کافور کی سازشوں کی وجہ سے موردِ عتاب ہوا تو اسے ان اعزازات سے محروم کر دیا گیا۔ دیکھیے دیول رانی خضر خاں۔ ص ۲۴۰۔

[3] عفیف کی رائے کے لیے دیکھیے عفیف ص ۱۰۸

ایرانی دورباش کی طرح ہندوستانی دورباش بھی لکڑی کا عصا ہوتا تھا جو اوپر سے خیدہ اور سونے کے پتروں سے مزین ہوتا تھا[1] اس کا استعمال عوام الناس کو شہنشاہ سے دور رکھنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ ہندو اس کی جگہ مورچھل استعمال کرتے تھے جس کی مدد سے راجا کے جسم سے مکھیاں اڑائی جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دورباش ہندوستان میں مورچھل کی جگہ استعمال کیا گیا[2]

(ج) سائبان، نوبت اور علم: سرخ رنگ کا شاہی سائبان، نوبت اور شاہی علم کے استعمال کا خصوصی حق بھی اس طرح شہنشاہ کو ہی ہوتا تھا۔ کسی بھی فرد کو ان چیزوں کے استعمال کا حق نہ تھا سوائے ان کے جنھیں سلطان ازراہِ عنایاتِ خسروی خصوصی رعایت کے ساتھ اجازت دے دیتا تھا[3] یہ عنایت بھی بعد میں ختم کر دی گئی کیوں کہ سور سلاطین کے لطف و کرم سے افغان امراء نے غلط فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ مثلاً شاہ عالم نے ایک واضح اصول متعین کر دیا تھا کہ سُرخ سائبان کسی بھی حالت میں کوئی بھی امیر استعمال نہ کرے گا[4]

اسی طرح نوبت کا استعمال قدیم ہندو اور ایرانی روایت تھی۔ شاہی باجے میں کئی طرح کے مختلف ساز ہوتے تھے جیسے بگل، ڈھول، نفیری اور بانسری وغیرہ۔ یہ چیزیں مقررہ

---

[1] راورٹی کا خیال ہے کہ دورباش ایک طرح کا نیزہ ہوتا تھا جس میں دو سینگ اور شاخیں ہوتی تھیں۔ اس کی لکڑی کا ڈنڈا سونے چاندی اور ہیروں سے مزین ہوتا تھا۔ حکمران کے برآمد ہونے سے پہلے اسے آگے لے جاتے تھے تاکہ عوام یہ سمجھ لیں کہ سلطان آرہا ہے اور راستہ خالی کرکے ایک طرف کھڑے ہو جائیں۔ راورٹی ص ۶۰۷

[2] خسرو نے دورباش کو مکھی اڑانے والا عفریت کہا ہے۔ قران السعدین ص ۶۰

[3] مثلاً سلطان التمش نے ملک ناصرالدین کو بنگال کا گورنر مقرر کرتے وقت سرخ پردہ استعمال کرنے کی اجازت دی تھی (راورٹی ص ۶۳۰) دہلی کے سلطان کے نمائندے کی حیثیت سے ملک کافور کو بھی دکن میں سرخ پردہ استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ (برنی ص ۳۲۴) اور اسی طرح سلطان فیروز شاہ تغلق نے شہزادے فتح خاں کو سرخ پردہ استعمال کرنے کی اجازت دی تھی جب بادشاہ بنگال میں تھا اور شہزادہ دہلی میں اس کے نائب کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ (تاریخ مبارک شاہی ص ۱۴۴)

[4] ایلیٹ ص ۴۴۴

اوقات میں شاہی محل میں بجائی جاتی تھیں[1] غیر معمولی مخصوص حالات میں دوسرے لوگوں کو بھی نوبت کے استعمال کی اجازت تھی۔ یہ بھی صرف ان حالات میں ممکن تھا جب کہ عنایاتِ خسروی کا مستحق وہ شخص ملک میں سفر کر رہا ہو۔ اس کے باوجود وہ یہ چیزیں شہر میں استعمال نہ کر سکتا تھا[2]

شاہی علم شاہی جلوس کے ساتھ اس کے دونوں طرف چلتے تھے۔ ان پر ہلال اور مچھلی کی علامت ہوتی تھی[3] علم کے علاوہ چند دیگر شاہی علامتیں یا نشان بھی چلتے تھے[4]

(د) ہاتھی اور چاندی کے ذخیرے: سلاطین کی دور اندیشی اور دانش مندی اس امر سے ظاہر ہے کہ انھوں نے ہاتھیوں اور سونے چاندی کے ذخیروں کا جمع کرنا غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ صرف ان لوگوں کو ان چیزوں کے محدود استعمال کی اجازت تھی جن پر وہ خصوصی عنایت فرماتے تھے۔ ہاتھی جنگ کے لیے بہت مفید تھے۔ حالاں کہ مسلمانوں نے

---

[1] ایرانی روایات کے لیے دیکھیے ہوارث ص ۱۴۵-۱۴۶۔ ہندوؤں کی روایت تھی کہ محل میں متواتر باجا بجتا رہتا تھا۔ دیکھیے پدماوت (ہندی ص ۱۹۶) کھانا کھانے کے وقت راجپوتوں کو ساز سننے کا بڑا شوق تھا۔ مندرجہ ذیل سازوں کا ذکر ملتا ہے۔ نقارہ، شہنائی، کرنائی، ترئی اور جھانج (دیکھیے پدماوت اردو ایڈیشن ص ۴۲۱)

[2] کتاب الرحلہ میں دیکھیے بغداد کے نقیب کی دل چسپ مثال جو ہندوستان آیا ہوا تھا اور اس روایت سے واقف نہ ہونے کی بنا پر دہلی میں نقارہ بجوایا جس کی وجہ سے محمد تغلق اس پر کافی ناراض ہوا۔ جلد اول ص ۱۰۷

[3] اس نشان کے لیے دیکھیے قران السعدین ص ۶۳۔ منہاج السراج کا بیان ہے کہ سلطان نے اسے ماہی جیسی تحفہ عطا کی تھی (راورٹی ص ۱۲۹۴)۔ مالک الابصار کے مصنف کو موصولہ اطلاع کے مطابق شاہی نشان ایک اژدہا ہے۔ دیکھیے Notices etc ص ۱۸۸۔ مجھے امیر خسرو کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ شاہی نشان مچھلی اور ہلال تھا۔

[4] نشانات کے لیے دیکھیے فیروز شاہ تغلق کے دور میں بہت بڑے بڑے نقارے جو شاہی جلوس کے دونوں طرف چلتے تھے اور بڑی دور سے دکھائی دیتے تھے۔ عفیف ص ۳۶۹-۳۷۰۔ محمد تغلق کے نشانات کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۸۲

تربیت یافتہ گھوڑوں کے استعمال کی طرف مقابلتہً کم توجہ دی لیکن میدانِ جنگ میں ہاتھیوں کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا۔ سونے چاندی کی قادرِ مطلق قوت (جیسے برنی نے بہت موزوں طریقے پر قاضی الحاجات کہا ہے۔ فتاوائے جہانداری ص ۸۰) کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بار اگر کوئی شخص ہاتھیوں کی اچھی خاصی تعداد اور مناسب مقدار میں سونا جمع کر لیتا تھا تو وہ جلد ہی اچھے سپاہی ملازم رکھ لیتا تھا اور عام لوگوں کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کی دعوت دینے لگتا تھا اور اس طرح آخرکار حاکم وقت کے مقابلے میں ڈٹ جاتا تھا۔[1] ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی ہاتھی اور سونے کا ذخیرہ جمع کرنا عموماً بادشاہ کے لیے مخصوص تھا۔ کافی زمانہ گزرنے کے بعد ہی سلاطینِ دہلی نے ہاتھی تحفتہً دینا شروع کیے۔[2] کالپی کا قرب وجوار اور صوبہ اڑلیسہ جنگلی جانوروں کے لیے موزوں ترین مقامات تھے اور رانک پور (یو۔پی) کے آس پاس کے کافی دیہاتی جنگلی جانوروں کو پکڑنے اور انھیں شاہی اصطبل میں پیش کرنے کا کام کرتے تھے۔[3] ہاتھی عموماً روزانہ ہی بادشاہ کے

---

[1] برنی کی رائے کے لیے دیکھیے برنی ص ۸۳

[2] ایضاً ص ۹۲۔ بلبن نے بنگال میں طغرل کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد باغی کی پوری املاک علاوہ ہاتھیوں اور سونے کے ذخیرے کے اپنے بیٹے (جو طغرل کے بعد بنگال کا گورنر بنا) کو عطا کر دی تھی۔ سلطان علاؤالدین خلجی سے پہلے کوئی امیر بھی ہاتھی نہیں رکھتا تھا۔ دیول رانی خضر خاں ص ۴۵۔ بہرام شاہ کے نائب ملک اختیارالدین کو اپنی رہائش گاہ کے صدر دروازے پر ہاتھی رکھنے کا خصوصی حق دیا گیا تھا لیکن امرا کو یہ بات ناگوار گزرتی تھی۔ دیکھیے راورٹی ص ۶۵۰۔ فیروز تغلق نے اپنے بھائی نائب باربک کو خصوصی تحفہ کے طور پر چھ ہاتھی عطا کیے تھے۔ اس عزت افزائی سے وہ اس قدر مسرور تھا کہ جب کبھی وہ شاہی دربار میں حاضری دیتا یہ ہاتھی اس کے آگے جلوس کی شکل میں چلتے تھے۔ دیکھیے عفیف ص ۴۲۹۔ ہندو رسوم کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۰۷۔ نیز جوامع الحکایات ص ۲۴۰۔ سفید ہاتھی نایاب تھا اس لیے اس کے مالک کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی طرح کی ایک متوازی مثال کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد دوم ص ۱۱۵

[3] بابر کے مشاہدے کے لیے دیکھیے بابرنامہ ص ۲۵۰

حضور میں سلامی دینے کے لیے آتے تھے[1]

خزانہ جمع کرنے کی روایت ہندوستان میں بہت قدیم ہے۔ ہر ہندو راجہ وراثت کے طور پر چھوڑے ہوئے اپنے بزرگوں کے خزانے کی حفاظت کرتا تھا، اپنے دورِ حکومت میں اس میں اضافہ کرتا تھا اور اپنے ورثاء کے لیے اس جمع شدہ دولت کو چھوڑ جاتا تھا۔ یہ دولت بڑھتے بڑھتے ناقابلِ اعتبار حد تک پہنچ جاتی تھی اور عموماً کسی نہ کسی غیر ملکی حملہ آور کے ہتھے چڑھ جاتی تھی[2] ان شاہی خزانوں اور مندروں میں جمع شدہ دولت کے ذخیروں نے شمال مغرب کے لالچی اور طاقت ور مسلمان حملہ آوروں کو حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ مسلمانوں کے دور میں بھی اس روایت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور یہ بات حیرت انگیز ہے کہ مسلم سلاطین نے اس روایت پر پوری طرح عمل کیا[3] بہرحال سونا جمع کرنے کی وجوہات واضح نہیں۔ سونے کی سلاخوں کو خطرے کے زمانے میں آسانی سے کسی بھی جگہ منتقل کیا جا سکتا تھا اور یہ قحط اور دوسری عالمی وباؤں کے زمانے میں بھی بہت کارآمد ہوتی تھیں۔ خزانے کی مدد سے ایک بادشاہ نہ صرف اپنی حکومت ہی برقرار رکھ سکتا تھا بلکہ اپنی ملکی مشکلات اور مصائب سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا[4] صرف ایک ہی بدقسمت بادشاہ ایسا تھا جس نے نہ صرف خود دولت جمع کرنے کی طرف توجہ نہ دی اور دوسروں کو دولت جمع کرنے سے نہ روکا بلکہ اپنے بھتیجے کو دکن کے مالِ غنیمت میں سے کچھ حصہ لینے کی اجازت دی۔ اس عام قاعدے اور روایاتِ شاہی کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اپنے تخت و تاج اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔

---

[1] باربوسہ ص ۱۰۹۔

[2] دولت جمع کرنے کی ہندوؤں کی عادت کے لیے دیکھیے یول جلد دوم ص ۲۳۹-۲۴۰
وارتھیما ص ۱۵۶

[3] مسلمانوں کی دولت جمع کرنے کی عادت کے لیے دیکھیے بنگال کے خزانے کے دل چسپ حالات بابرنامہ ص ۲۴۷۔ چپانیر کے خزانے کے لیے تذکرۃ الواقعات ص ۷۔ لودی دور میں آگرہ کے خزانے کے لیے دیکھیے گلبدن بیگم ص ۱۲

[4] بغرا خاں نے سلطان معزالدین کیقباد کو بُرے وقت سے بچنے کے لیے تنبیہ کی تھی اور اسے ہدایت کی تھی کہ وہ سونا جمع کرنے میں غفلت نہ کرے۔ دیکھیے برنی ص ۱۴۷

دربار

دربار (پابار)

منجملہ دیگر روایات کے دربار ایران کی ایک قدیم شاہی رسم ہے۔ اسلامی حکومت کے اوّلین ۳۰ سالوں میں یہ روایت ہندوستان میں رواج پا چکی تھی[۱] سلاطینِ دہلی متعدد سرکاری مواقع پر دربار لگاتے تھے مثلاً کسی سفیر یا خصوصی مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لیے، کسی بادشاہ کی تخت نشینی کا اعلان کرنے کے لیے یا اس کی ہر سال یادگار منانے کے لیے۔ سلطان کے یومِ پیدائش کا جشن منانے کے لیے۔ رعایا سے نذر و نثار (جن کا ذکر ابھی کیا جائے گا) قبول کرنے کے لیے اور دیگر متعدد سماجی اور مذہبی تہواروں کے مواقع پر۔ یہ فہرست کسی بھی طرح مکمل نہیں ہے کیوں کہ ان تقریبات کے مواقع پر غیر معمولی اجتماعات ہوتے تھے مثلاً فتح، شاہی خاندان کے کسی فرد کی شادی یا کسی شہزادے یا شہزادی کی پیدائش پر۔ جب کھلے دربار میں کسی غیر ملکی سفیر کو خوش آمدید کہا جاتا تھا تو سلطنت کی شان و شوکت اور رعب کو نمایاں کرنے میں کسی طرح کا دقیقہ اٹھا نہ رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ یا وزیر اعظم اس کے استقبال کے انتظامات کی بذاتِ خود نگرانی کرتا تھا۔ بادشاہ، کوئی شہزادہ یا کم از کم کوئی خصوصی امیر بذاتِ خود مہمان کو دربار میں لاتے تھے جہاں اس کا استقبال بڑی شان و شوکت سے کیا جاتا تھا[۲] تاجپوشی کے دربار رسمی دربار کے مقابلے میں زیادہ پُرشکوہ ہوتے تھے۔ بعض اوقات تاجپوشی کی عام تقریب سے پیشتر سلطان کے لیے صدر (محکمہ قضا کے افسران) امراء، علماء اور سیدوں سے ایک مخصوص ذاتی اجتماع میں بغیر کسی خاص تقریب کے بیعت لی جاتی تھی۔ ہر شخص خاموشی سے سلطان کے پاس جاتا تھا (جو تخت پر رونق افروز ہوتا

---

[۱] دیکھیے برنی ص ۴۵

[۲] مثلاً ہلاکو کے سفیر کی سلطان ناصرالدین محمود کے دربار میں آمد۔ ہمایوں کے دربار میں سیدی علی رئیس کی پذیرائی کے لیے دیکھیے ص ۴۷۔ نیز اکبر نامہ جلد اول ص ۳۲۵

تھا) اس کے دستِ مبارک کو بوسہ دیتا تھا۔ تخت نشینی کے موقع پر مبارک باد دیتا تھا اور حلف وفاداری لیتا تھا۔ اس کے بعد عام بیعت کے لیے ایک پُرشکوہ دربار لگتا تھا۔ اس موقع پر مناسب عطیات خیرات میں دیے جاتے تھے، قیدی آزاد کیے جاتے تھے اور پورے ملک پر خوشی و خرمی کا ایک عام جذبہ طاری ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہر سال تاجپوشی کی یادگار کے طور پر ایک دربار ہوتا تھا۔ دربار سے پہلے یا اس کے بعد ساز و سامان سے لیس گھوڑوں اور ہاتھیوں، محافظ دستوں اور مصاحبین کے ساتھ جن کے لباس بڑے پُرشوکت اور زرق برق ہوتے تھے اور پوری شان و شوکت کے ساتھ امراء اور افسران کے ہمراہ شاہی جلوس دارالخلافہ کے راستوں سے گزرتا تھا۔ دربار میں پھر حلفِ وفاداری لیا جاتا تھا۔ سلطان کی خدمت میں نذر (خدمتی) پیش کی جاتی تھی۔ سلطان بھی بدلے میں عطیات بخشتا تھا اور عموماً وافر رقم خیرات کی جاتی تھی۔[1] چند سماجی اور مذہبی تہوار منانے کے لیے بھی دربار منعقد ہوتے تھے جو رسمی ہونے کے بجائے بڑے پُرشوکت ہوتے تھے۔ ان درباروں کو جن کی تفصیلات آئندہ صفحات میں بیان کی جائیں گی ان کی شان و شوکت کی وجہ سے جشن دربار کہا جاتا تھا۔[2] خصوصاً نوروز یا ایرانی جشنِ بہاراں بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ مذہبی تقاریب کے موقع پر حکومت مذہبی یا روحانی امور کے بجائے شاہی شان و شوکت کا مظاہرہ زیادہ کرتی تھی۔ مثال کے طور پر عیدین کے مواقع پر زرق برق اور جگمگاتے مرصع زیورات سے آراستہ ہاتھیوں کا ایک جلوس سلطان، علما اور قضات، اہم غیر ملکی مہمانوں اور امراء کو عیدگاہ لے جانے کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ شام کو ایک سرکاری دعوت ہوتی تھی جس میں سرکاری مہمانوں کے لیے جملہ تفریحات اور مسرتیں مہیا کی جاتی تھیں۔ نذر و نثار کی عام رسوم کے ساتھ جب حسبِ معمول دربار ہوتا تھا تو حسبِ معمول درباری شعرا مخصوص قصائد پڑھتے تھے۔[3] ان تہواروں پر تفریحات

---

[1] مثلاً تفصیلات کے لیے دیکھیے راورٹی ص ۶۷۵

[2] عفیف ص ۲۷۸

[3] عید کی شاہی تقریبات کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۳۶-۳۸۔ قران السعدین ص ۵۷۔ برنی ص ۴۳۔ اس موقع پر امیر خسرو کے ایک قصیدے کے لیے دیکھیے کلیاتِ خسرو ص ۲۴۴

کے باب میں مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

درباری آداب

ان جملہ درباری تقریبات اور سرکاری رسوم کے منانے کے سلسلے میں ان سے متعلق اصول وضوابط اور ان کی شکل کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ہر ایک کے رتبے اور اس کی اہمیت، ان کے لباس اور ظاہری ٹیپ ٹاپ، باہمی برتاؤ کے طور طریقوں نیز بادشاہ سے تعارف کرانے کی تقریبات کی اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ باہمی طریقے سے تعمیل ہوتی تھی۔ اصولی طور پر امراء اور عالی رتبہ افراد کو بذاتِ خود حاضر ہونا پڑتا تھا لیکن اگر ناگزیر حالات کی وجہ سے کوئی حاضر ہونے سے معذور ہوتا تو اس کے بجائے اس کے وکیل یا نمائندے کو حاضر ہونے کی اجازت تھی[1] امرا کو ان کے مراتب کے لحاظ سے مخصوص جگہ دی جاتی تھی حتیٰ کہ ان کے خدام کو بھی بیٹھنے کی جگہ دی جاتی تھی۔ دربار میں حاضری کے لیے ایک مخصوص درباری لباس مقرر تھا۔ سلطان شاہی عبا زیب کرتا تھا اور امرا خلعت یا dress of honour خلعتِ فاخرہ جو زربفت کے چوغہ، تاتاری کلاہ، سفید پٹی اور ایک سنہری پٹکے پر منحصر ہوتا تھا جن امرا کو شاہانہ خلعت عطا نہیں کیا گیا تھا وہ سمور کا کوٹ اور سمور کی ٹوپی پہنتے تھے۔ ہر حالت میں روزانہ کے استعمال کے چوغہ اور فرغل کے پہننے سے اجتناب کیا جاتا تھا اور ان کا استعمال ناشائستگی کی دلیل تھی[2] درباری افسران جن کے بارے میں ابھی تفصیلات بتائی جائیں گی دفتری لباس اور سرکاری علامات کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہتے تھے۔ وزیر یا کوئی دوسرا ذمہ دار افسر ان جملہ اصولوں کی پابندی کی بذاتِ خود نگرانی کرتا تھا ایک خصوصی منتظم (جسے شحنۂ بر کہتے تھے) یہ دیکھنے کے لیے مقرر ہوتا تھا کہ برتاؤ کے طور طریقوں اور تعارف کرانے کی ضوابط کی پابندی کی جاتی ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دربارِ عام کا منظر ایسا لگتا تھا جیسے صاف شفاف پورے چاند کی روشن شب میں صاحبانِ فضل وکمال کا اجتماع ہو[3]

---

[1] تاریخ مبارک شاہی ص ۹

[2] عفیف کی رائے کے لیے دیکھیے عفیف ص ۲۷۹

[3] دیکھیے مثال کے طور پر سلطان ناصرالدین محمود کے زمانے میں ہلاکو کے سفیر کا استقبال جب کہ
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تعارف کرانے کی تقریبات شروع ہونے سے پیشتر امرا، افسران اور دوسرے افراد جو سلطان کی مدد کے لیے حاضر ہوتے تھے اپنے ہاتھ سینوں پر باندھ کر دو رویہ قطار میں سلطان کے روبرو کھڑے ہو جاتے تھے[1] مغلوں کے دور میں تعارف کرانے کی مخصوص تقریبات کورنش اور تسلیم پر مشتمل تھیں۔ ان کی وضاحت کرنے کی بہ نسبت انھیں بہتر طریقے سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ جس شخص کا بادشاہ سے تعارف کرانا ہوتا تھا اُسے باربک نامی ایک افسر دیوانِ عام میں پیش کرتا تھا۔ یہ افسر اُسے بادشاہ کے روبرو ایک مقام پر لے جاتا تھا۔ اس جگہ پہلے وہ شخص زمین پر اپنی پیشانی جھکاتا تھا اور پھر تھوڑے وقفے کے بعد تین بار تسلیم بجالاتے ہوئے تختِ شاہی کی طرف قدم بڑھاتا تھا۔ تسلیم بجا لانے کے اوقات کا تعین نقیب اور اس کے عملے کی پُر رعب آواز سے ہوتا تھا جس کا بیان بعد میں کیا جائے گا۔ اسے شرط زمیں بوس کہتے تھے[2] اگر متعلق فرد کو بادشاہ تک رسائی حاصل کرنے کے خصوصی حقوق حاصل ہوتے تھے (یہ حق بہت غیر معمولی حالات میں صرف ان افراد کو حاصل ہوتا تھا جو رتبہ میں سپہ سالار سے بڑے ہوتے تھے) تو دیوانِ عام میں داخل ہونے سے پیشتر اچھی طرح اس کی تلاشی لی جاتی تھی[3] بادشاہ کے پاس پہنچ کر وہ خود کو اس کے قدموں میں گرا دیتا تھا۔ اس کے بعد خواہ آنے والا شخص کسی بھی مرتبہ کا ہو، سر جھکا کر کھڑا رہتا تھا اور انتہائی عاجزی اور وفاداری ظاہر کرتے والے مخصوص الفاظ میں بادشاہ کو مخاطب

(گذشتہ سے پیوستہ) واقعہ نگار کے تمثیلی الفاظ میں سلطان چوتھے آسمان سے چمکتے ہوئے سورج کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ الغ خان بلبن ماہ درخشاں کی طرح، ملک گردش کرتے ہوئے سیاروں کی طرح اور سلطان کے خدام بے شمار ستاروں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ دیکھیے راورٹی ص ۸۵۸

[1] تاریخ شیر شاہی ص ۴۷۔ اکبر نامہ جلد اول ص ۱۵۰

[2] جام سیف الدین کو فیروز تغلق کے حضور میں نذر گزارنے سے پہلے تربیت لینی پڑی تھی۔ دیکھیے عفیف ص ۲۴۸۔ مغل دربار میں اس قسم کے رواج کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول ص ۱۵۶۔

[3] شاہِ قسطنطنیہ کے دربار میں ابنِ بطوطہ کی نذر گزارنے کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد اول ص ۲۱۳۔ نیز ص ۱۸۲

کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی نذر پیش کرتا تھا۔ اگر وہ شخص غیر معمولی رتبہ کا مالک ہوتا تھا تو بادشاہ اس کا ہاتھ پکڑ کر التفات کا اظہار کرتا تھا یا اس سے معانقہ کرتا تھا اور اپنی انگلیوں سے اس کی نذر کو چھوتا تھا جس سے اس کے بے قرار ذہن کو بڑی تسکین حاصل ہوتی تھی۔[1] کوئی بھی فرد سلاطینِ دہلی کے درباروں کے بارے میں یہ ایک عام اور ذاتی تجربہ کر سکتا تھا۔ رسمی طور پر عوام کے نزدیک سلطان دربار کے بلند مرتبہ امرا تک کی رسائی سے باہر اور پوشیدہ رہتا تھا۔[2] بعض حالت میں طرفین کے لیے یہ سب باتیں بڑی پریشان کن اور تکلیف دہ ہوتی تھیں۔ اس کے سلسلے میں دو مثالیں تاریخی دل چسپی کی حامل ہیں۔ جب بغرا خاں کو سلطان وقت اور اس کے اپنے بیٹے سلطان معزالدین کیقباد کے سامنے پیش کیا گیا اور اس سے تعارف کی وہ تمام شاہانہ رسوم باقاعدہ ادا کرائی گئیں جو کسی باپ کے لیے بہت ہی ذلت آمیز تھیں تو آخرکار خود سلطان کو اپنی یہ علیحدگی پسندی ختم کرنی پڑی اور زبردستی اس نے اپنے باپ کو اٹھا کر اپنے قریب تخت پر بٹھا لیا۔ اسی طرح ایک بار جب ہمایوں کے باغی بھائی مرزا کامران کو مغلوب کرنے کے بعد مغل شہنشاہ ہمایوں کے حضور میں پیش کیا گیا اور اس نے جملہ درباری رسوم وروایات کو پورا کیا تو ہمایوں کے صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے کامران کو ایک بار پھر سے بھائی کی طرح سینے سے لگا لینے کی خواہش کی اور اس کی آنکھوں سے برادرانہ

---

[1] کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۲۵

[2] سلطان بلبن بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ وہ اپنی بادشاہت کے دور میں کبھی بھی کسی کم حیثیت آدمی سے بے تکلفی کے ساتھ مخاطب نہیں ہوا۔ اس کے اپنے غلام وخدام کسی بھی حالت میں پورا لباس پہنے بغیر اس کے روبرو جانے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ دیکھیے برنی ص ۳۳۔ نیز اس کے بیٹے محمد کو بلبن کے مشورے کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۷۵۔ نیز دربار کے آداب ورسوم اور اپنے بیٹے کے شاہی رکھ رکھاؤ کی حمایت میں بغرا خاں کی رائے ایضاً ص ۱۴۲۔ نیز برنی ص ۸۰۵ پر دیکھیے ایک شہزادے کے اتالیق کا وہ دل چسپ واقعہ جس میں شاگرد کو انھیں تکلیف دہ اور ناگوار حالات سے گزرنا پڑا تھا جو دوسرے لوگوں کو سلطان کے سامنے پیش ہونے کے سلسلے میں کرنے پڑتے تھے۔

پیار اور خوشی کے آنسو بہنے لگے[1] صوبائی حکومتوں نے بھی اسی قسم کے درباری آداب اپنائے[2] اگرچہ ہندو حکومتوں کے درباروں کی تفصیلات مہیّا نہیں ہیں لیکن یہ بات آسانی سے تصور کی جا سکتی ہے کہ سلطنت کے زمانے کی طرح ان کے درباروں میں بھی راجا کی عظمت کو سختی سے برقرار رکھا گیا تھا اور غالباً ان جملہ تقریبات کو منانے کے اصول و ضوابط بھی انھیں خطوط پر تیار کیے گئے تھے[3] مغل شہنشاہ اکبر نے بھی درباری تقریبات کے موجودہ رسوم و ضوابط میں نہ کوئی خاص تبدیلی کی اور نہ ہی انھیں زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کی[4]

سرسری طور پر یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ سلاطین کے درباروں کا پورا ماحول بڑی حد تک مصنوعی تھا جو کسی خاص مردانہ اور صحت مند ماحول کو ظاہر نہیں کرتا تھا۔ بعض حالات میں شہنشاہ کا وقار اور جاہ و جلال مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک ہی سلطان کی مثال کافی ہے جس نے ایک سوداگر کو اصفہان عنایت فرما دیا تھا اور کسی درباری کو یہ بات سلطان کے گوش گزار کرنے کی جرأت نہ ہوئی کہ اصفہان کا شہر نہ اس کی حکومت کے حدود میں شامل ہے اور نہ سلطان دہلی کے۔ دوسری دل چسپ مثال ہمیں مغل دور میں ملتی ہے جب چوسا کی جنگ سے ذرا پہلے ہمایوں شیر شاہ سے صلح کی گفتگو کرنے کے لیے تیار ہوا تو وہ اس باغی افغان سردار کی قوت اور مضبوط حیثیت سے پوری طرح واقف تھا اس لیے وہ شیر شاہ کو جاگیر میں بنگال عطا کرنے کے لیے اس شرط پر رضامند

---

[1] اکبرنامہ جلد اول ص ۲۸۱

[2] اس سلسلے میں دیکھیے بابر کی رائے، بابرنامہ ص ۶۳۴۔ بنگال سے اس کے دربار میں جو سفیر آیا تھا اس نے نذر گزارنے کی وہی تمام رسوم ادا کی تھیں جو کسی دربار میں نذر گزارنے کا طریقہ تھا۔

[3] ایک رقاصہ کا سبق آموز واقعہ جو دربار ہی میں قتل کر دی گئی تھی۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ راجہ کی تفریح کے لیے رقص کرتے وقت اتفاق سے اس کی پیٹھ راجا کی طرف ہو گئی تھی۔ پدماوت (ہندی) ص ۲۴۱

[4] آئینِ اکبری جلد اول ص ۱۵۵-۱۵۶

ہوگیا کہ وہ جنگی اہمیت کے مقام سے ہٹ جائے ۔ مزید برآں اس نے اس کے لیے بھی رضامندی ظاہر کی کہ شاہی فوج اس کا پیچھا کرے اور وہ شیر شاہ کی اس مصنوعی پسپائی کو شکست کی شکل دے دے[1] شیر شاہ نے ہمایوں کو ہندوستان سے بھگا کر اس پورے منصوبے کو درہم برہم کر دیا اور جیسا کہ ہمایوں نے بعد میں اظہارِ افسوس کیا شیر شاہ نے ہمایوں کو اپنی سلطنت میں پنجاب کا قبضہ بھی نہ دے کر انتہائی ذلیل اور لالچی فطرت کا ثبوت دیا۔

نذر اور نثار کی رسمیں

درباروں کے تفصیلی ذکر اور دوسرے متعدد سرکاری معاملات کے سلسلے میں دو اور رسموں کا مختصر ذکر کر دینا ضروری ہے ۔ نذر (جسے خدمتیں بھی کہا گیا ہے) کسی بھی قیمت کی ایک علامتی پیش کش ہوتی تھی جو بادشاہ کو مناسب شکل میں دی جاتی تھی ۔ اس سے پیش کش کرنے والے فرد کی وفاداری اور فرماں برداری کا مظاہرہ مقصود ہوتا تھا۔ وہ تمام افراد جو پہلی بار سلطان کی خدمت میں پیش ہوتے تھے نذر پیش کرتے تھے اور وہ اس وقت تک مختلف مواقع پر نذر پیش کرتے رہتے تھے جب تک کہ بادشاہ انھیں ملازم نہ رکھ لے یا وہ کسی نہ کسی طرح اس سے وابستہ نہ ہو جائیں۔ وہ پیش کش ایک ناریل کی شکل میں بھی ہو سکتی تھی اور ایک قیمتی ہیرا بھی۔ اس کی قیمت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی[2] سلطان عام طور پر نسبتاً بیش بہا عطیہ اس شخص کو جواباً دیتا تھا حالاں کہ اس کے لیے ایسا کرنا کچھ ضروری نہ تھا۔ نذر پیش کر کے بادشاہ سے عطیہ حاصل کرنے کی روایت سلطان محمد تغلق کے زمانے تک اس حد تک مقبول ہو چکی تھی کہ لوگوں نے اس کو کاروبار بنا لیا اور اس سے نفع کمانے لگے ۔ لوگ ان افراد کو جو بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوتے تھے بڑی بڑی

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ شیر شاہی ص ۴۴ نیز گلبدن بیگم

[2] ہندوؤں کی ناریل چڑھانے کی رسم کے لیے دیکھیے میکالف جلد اول ص ۱۴۶۔ گوالیار کے راجہ بکرماجیت کے خاندان نے ہمایوں کو مشہور کوہِ نور ہیرا پیش کیا تھا۔ تاریخ فرشتہ، جلد اول ص ۲۸۱

رقمیں تحائف خریدنے کے لیے دینے لگے اور سلطان سے بدلے میں ملنے والے عطیے سے جو نفع ہوتا تھا اس میں حصّہ بٹانے لگے۔[1]

نثار کی تقریب کا مفہوم کسی قدر مختلف تھا اور غالباً اس کی ابتدا بدنظری کے باطل عقیدے سے ہوئی تھی اور ہندوؤں کی رسم اتار اور آج کل کی آرتی سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس میں سونے چاندی کے سکوں اور قیمتی جواہرات سے بھرے برتن کو کئی بار بادشاہ کے سر پر وار کر غریبوں اور ناداروں یا اسی قسم کے دوسرے مجمعوں پر بکھیر دیا جاتا تھا بہت سے مواقع پر، مثلاً دربار لگنے کے موقع پر، کسی فتح کے بعد سلطان کے دارالخلافہ میں رونق افروز ہونے کے وقت، نازک موقع کی گفت و شنید کی کامیابی پر اور اسی قسم کے دیگر غیر معمولی مواقع پر اس بات کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور ناپاک روحوں کے بُرے اثرات کو دفع کرنے کے لیے بہت سی ترکیبیں عمل میں لائی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک بادشاہ کے اوپر سے کسی قیمتی چیز کا نثار کرنا بھی شامل تھا۔ اسی طرح خوشی اور عیش و عشرت کے متعدد مواقع پر بھی حفظ ما تقدم کے طور پر نثار کی رسم ادا کی جاتی تھی مثلاً جب بادشاہ کسی بیماری یا معمولی علالت سے اٹھتا تھا یا کسی شہزادے کی پیدائش کے موقع پر یا کسی شہزادے یا شہزادی کی شادی کے موقع پر۔ اگر سلطان کسی امیر کے گھر جاکر اس کی عزت افزائی کرتا تھا تو امیر عام طور پر کوئی قیمتی چیز بادشاہ کو ناپاک روحوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے نثار کرتا تھا۔ اسی طرح معشوقوں کے لیے بھی (جس میں امرد بھی شامل تھے) ان کے حسن اور دیگر جسمانی حسن اور اکتسابات کو برقرار رکھنے کے لیے قیمتی چیزیں نثار کی جاتی تھیں۔[2]

درباری عہدیدار

بادشاہ کے رسمی اور سرکاری فرائض کی انجام دہی میں اس کی مدد کے لیے ایک

---

[1] کتاب الرحلہ جلد دوم

[2] برنی کے بیان کے لیے دیکھیے برنی ص ۱۶۱۔ سلطان معزالدین کیقباد کے اپنے معشوق لڑکے پر نثار کا واقعہ۔

الگ عملہ ہوتا تھا۔ ان افسران میں باربک، حاجب اور وکیل کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ ان سب عہدے داروں کا ایک ایک نائب ہوتا تھا جو خود بھی اہم مرتبہ کا حامل ہوتا تھا۔

باربک کو بڑے دل کش انداز میں سلاطین کی زبان کہا گیا ہے۔ لوگوں کی معروضات کو سلطان کے گوش گزار کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا[1]۔ سونے کی ایک گیند کے ساتھ ملحق ایک سنہری چوگان اس کے عہدے کی علامت ہوتی تھی[2]۔ بہت سی تاریخی شخصیات[3] نے اس عہدے کو زینت بخشی ہے۔ حاجب کا عہدہ رسمی ہوتا تھا اور دربار میں تعارف کی رسم کی نگرانی کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ قدیم ایران کے خرم باش کا جانشین تھا[4]۔ اسے مختلف ناموں سے پکارا جاتا تھا مثلاً ملک الحجاب، ملک خاص حاجب، یا صرف حاجب[5]۔ اصولی طور پر بیرونِ ہند کی مسلم حکومتوں کے سلاطین دو حاجب رکھتے تھے ایک امرا کے تعارف کے لیے اور دوسرا عوام الناس کے تعارف کے لیے۔ اسی طرح سلاطینِ دہلی کے درباروں میں بھی دو حاجبوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن اُن کے فرائض وضاحت کے

۱۔ باربک کے فرائض کے لیے دیکھیے اعجازِ خسروی جلد اول ص ۳۵۔ برنی ص ۵۷۸۔

۲۔ باربک کے عہدے کی علامت کے لیے برنی ص ۱۱۳۔ قران السعدین ص ۱۴۱۔

۳۔ سلطان فیروز تغلق اپنی ابتدائی زندگی میں نائب باربک اور نائب امیر حاجب کے عہدوں پر کام کر چکا تھا۔ اس کے تقرر کے وقت اسے بارہ ہزار افواج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا۔ اس سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان عہدوں کی چند عسکری ذمہ داریاں بھی تھیں۔ دیکھیے عفیف ص ۴۲۔ ملک کافور اس وقت باربک ہی تھا جب اسے دکن پر حملہ کرنے کے لیے فوجی کمان سپرد کی گئی۔ اسی طرح تغلق خاندان کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے محمد تغلق باربک کے عہدے پر کام کر چکا تھا۔

۴۔ حکمران اور اس کے خاندان کے افراد کے درمیان ایک دبیز پردہ حائل ہوتا تھا اور وہ عام نظروں سے بچا رہتا تھا۔ یہ پردہ حکمران سے دس کیوبٹ (مکعب) کے فاصلے پر اور سلطنت کے اعلیٰ ترین افسر سے دس مکعب کے فاصلے پر ہوتا تھا۔ اس پردے کے رکھنے کی ذمہ داری کسی سردار کے لڑکے کے سپرد کی جاتی تھی جس کا خطاب "خرم باشں" ہوتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ دیکھیے ہوارٹ ص ۱۴۵

۵۔ خطابات کے لیے دیکھیے راوٹی ص ۸۲۰۔ برنی ص ۸۲۷

کے ساتھ کہیں بیان نہیں کیے گئے۔ گمان غالب یہ ہے کہ جب سلطان عدالتی نزاعوں کا فیصلہ کرنے، فوجی دستوں کا معائنہ کرنے یا کسی مہمان کی پذیرائی کے لیے بیٹھتا تھا تو ان میں سے ایک سلطان کے قریب کھڑا رہتا اور پردے کو پکڑے رہتا تھا جب کہ دوسرا مہمان کا تعارف کراتا تھا یا کسی دوسرے طریقے سے شاہی فرائض کی انجام دہی میں معاون ہوتا تھا[۱]

وکیل در جو کئی ناموں مثلاً رسول در اور حاجب الارسال سے موسوم کیا جاتا تھا، دربار میں معتمد کے فرائض کی انجام دہی کے لیے مقرر تھا[۲] غالباً سرکاری کاغذات پر گہری نظر اور نتیجہ کے طور پر سرکار کی پالیسی کے معاملات پر اس کی گہری نظر کی وجہ سے اسے خصوصی اہمیت حاصل تھی جس کی توثیق مورخ برنی کی رائے اور سلطان ناصر الدین محمود کے وکیل در ریحان کے اثرات سے ہوتی ہے۔

دربار کے انتظام میں چند دیگر عہدے دار بھی ملتے تھے۔ شحنۂ بارگاہ دربار میں عام نگرانی کے فرائض انجام دیتا تھا[۳] دوات دار پر شاہی قلمدان اور مہر دار پر شاہی مہر رکھنے کی ذمہ داری ہوتی تھی[۴] خوب صورت اور بہترین لباس میں ملبوس خدمت گار لڑکوں (غلمان) کا ایک دستہ عہدے داروں کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں مدد پہنچانے کے لیے دربار میں ادھر اُدھر گھومتا رہتا تھا[۵] نقیب اور اس کے فوجی افسروں کا دستہ مہمان کی دیوانِ عام تک رہنمائی کرتا تھا اور نقیب عصائے شاہی لیے ہوئے شاہی جلوس کے آگے آگے چلتا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے نذر پیش کرنے کی رسم کے دوران تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد[۶] پُر رعب آواز میں وہ بسم اللہ پکارتے رہتے تھے۔

---

[۱] اسپرینگر کی رائے کے لیے دیکھیے ص ۹ نیز دیکھیے اعجاز خسروی جلد اول ص ۱۵۴، ۱۲۵، ۱۲۶۔

[۲] برنی کی رائے کے لیے دیکھیے برنی۔ ص ۵۷۶۔ ریحان کے لیے دیکھیے راورٹی ص ۸۲۷

[۳] برنی ص ۲۶۰، ۲۶۱۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ غیاث الدین تغلق جو بعد میں تخت نشین ہوا علاؤالدین کے دور میں اس عہدے پر مامور تھا۔ دیکھیے برنی ص ۲۶۰-۲۶۱۔

[۴] دیکھیے راورٹی ص ۷۳۶، برنی ص ۳۷۹-۳۸۰

[۵] برنی ص ۳۰

[۶] اس سلسلے میں اس قرآنی آیت کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ حالاں کہ جب کوئی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شاہی دربار کا ایک عام تصور

دیوانِ عام محل کے وسط میں ہوتا تھا اور اس میں داخل ہونے کے لیے کئی دروازے ہوتے تھے جن پر سخت پہرہ رہتا۔ درباری یا نذر پیش کرنے کے وقت مہمان کی آمد کا اعلان پہلے دروازے پر نقارے کی سریلی تان بجا کر کیا جاتا تھا۔ دوسرے دروازے پر پہنچتے ہی جواہرات سے جڑی ہوئی مرصع کلاہ پہنے ہوئے نقیب اسے خوش آمدید کہتا تھا اور اس کا عملہ سونے اور چاندی کے گچھے دار عصا لیے رہتا تھا۔ یہ عملہ اس کی رہنمائی تیسرے دروازے تک کرتا تھا جہاں کاتب اس کا نام اور دیگر تفصیلات درج کرتے تھے یہاں مہمان کو نذر گزارنے کے مقررہ وقت تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ دیوانِ عام کے اندر (جسے محمد تغلق نے ہزار ستون کے نام سے موسوم کیا ہے) سلطان تختِ شاہی پر مشرقی انداز میں آلتی پالتی مارے ہوئے رونق افروز ہوتا۔ بادشاہ کے آگے وزیر اپنے منشیوں اور معتمدین کے عملے کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ حاجب، وکیل در اور باربک اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ سلطان کے دائیں بائیں امراء، علماء، شاہی خاندان کے افراد اور دیگر معزز افراد بیٹھتے تھے۔ نذر پیش کرنے کی اجازت لینے کے بعد حاجب مہمان کو دیوانِ عام میں لاتا تھا اور اسے کورنش بجالانے کے مقام تک پہنچا دیتا تھا۔ یہاں وہ نذر پیش کرنے کی مذکورہ بالا رسومات ادا کرتا تھا اور اگر وہ کسی سرکاری کام سے آتا تو اپنی معروضات باربک کے سامنے پیش کرتا تھا جو اسے سلطان کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ سلطان کے دربار سے چلے جانے کے بعد حاجب جملہ کاغذات وکیل در کے سپرد کرتا تھا جو ان پر سلطان کے احکام کے مطابق کارروائی کرتا تھا[۱]

(بقیہ حاشیہ) غیر مسلم بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوتا تھا تو نقیب ہداک اللہ پکارا کرتا تھا۔ اس کا استعمال صرف رسمی تھا اور یہ آنے والے کے لیے متعدد رسمی کارروائیوں سے گزرنے میں معاون ہوتا تھا۔ کلیات خسروی ص ۱۳۲۔ برنی ص ۱۵۸

[۱] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے ابن بطوطہ کا بیان، کتاب الرحلہ، جلد دوم، ص ۳۳ - ۳۵۔ برنی کی رائے کے لیے دیکھیے برنی ۲۹ - ۳۱ اور Notices etc ص ۲۰۶۔ ان جملہ کتب میں سرکاری عہدوں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) کا ترجمہ غلط دیا ہے ہے۔ اس باب میں جن عہدے داروں کا ذکر آیا ہے ان کے فرائض کے صحیح تعین کے لیے میں ان کے ہم رتبہ انگلینڈ کے دربار کے عہدے داروں کے نام دے رہا ہوں۔

۱۔ امیر آخور
۲۔ شحنۂ آخور
۳۔ حاجب
۴۔ باربک
۵۔ غلمان
۶۔ نقیب اور چاؤشش
۷۔ سرجاندار
۸۔ پہردار
۹۔ تحویل دار
۱۰۔ حاکم حرم
۱۱۔ شحنۂ بارگاہ
۱۲۔ ندیم
۱۳۔ سرجامہ دار
۱۴۔ وکیل در

میں نے یہ اصطلاحات Book of the Court سے لی ہیں لیکن راوندی کی تنبیہہ ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ان عہدوں کا اصل مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک کہ قدیم ترکی زبان کی کوئی اچھی لغت تیار نہ ہو جائے۔

خصوصی حقوق یافتہ اور دیگر سماجی طبقات

ایک عام اظہارِ رائے

متعدد سماجی طبقات کی ترکیب کم و بیش سادہ تھی۔ سلطان چوں کہ عوام کا رہنما اور اس جنگ و جدال اور انتشار کی دنیا میں امن کا ضامن تھا اس لیے سماج کا سربراہ تھا۔ امراء اور دیگر برتر طبقات اس کے ماتحت معاون کی حیثیت رکھتے تھے اور عوام (جو ہندوؤں اور نچلے درجے کے مسلمانوں کے متعدد طبقات پر مشتمل ہیں) ان سے کمتر تھے اور عام حالات میں تقریباً ناقابلِ عبور رکاوٹیں ان کی راہ میں حائل تھیں[1]

مسلم دورِ حکومت کے بالکل آغاز ہی سے یہاں مسلمانوں کے اونچے لوگوں کا ایک مخصوص طبقہ تھا جو عموماً علماء اور مذہبی لوگوں، اہلِ قلم (جسے اہل الرائے کہا جاسکتا ہے) اور اہلِ تیغ یا سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ یہ سب طبقات مختلف طریقوں سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے استحکام جیسے عظیم کام کے لیے خدمات انجام دے رہے تھے۔

---

[1] سلطان کو عوام کے رہبر کی حیثیت سے دیکھیے عفیف ص ۶۸ اور قیامِ امن و امان کے اس کے فرض کی حیثیت سے دیکھیے جوامع الحکایات ص ۲۔ عوام الناس کی صورتِ حال کے لیے دیکھیے مسعودی کی کتاب میں سے ایک اسی طرح کی مثال جس کا حوالہ Sykes نے جلد اول ص ۴۶۵ پر دیا ہے "دربار کے عہدے دار تین بڑے حصوں پر مشتمل تھے۔ فوجی سردار اور شہزادے تخت کے دائیں طرف پردے سے تیس فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے پیچھے اتنے ہی فاصلے پر وہ گورنر اور باج گزار حکمراں کھڑے ہوتے تھے جو مستقل طور پر دربار سے منسلک تھے اور آخر میں تیسرا حصہ مسخروں، موسیقاروں اور سازندوں پر مشتمل ہوتا تھا۔" جب حکمراں رعایا کے کسی فرد کو شرفِ باریابی عطا کرتا تھا تو فردِ مذکورہ اپنے منہ پر رومال باندھ لیتا تھا تاکہ اس کے سانس سے مقدس دیوان خانہ شاہی ناپاک نہ ہو اور پردے سے آگے بڑھ کر سجدہ ریز ہو جاتا تھا اور اس وقت تک نہیں اٹھتا تھا جب تک اسے شاہی حکم نہ ملے۔

اور انھیں خدمات کے مطابق صلہ پاتے تھے[1] مسلم حکومت اور سماج کی روز افزوں تنظیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مختلف طبقات کو خصوصی فرائض سپرد کیے جانے لگے۔ نظریاتی طور پر ان طبقات کو ہمایوں کے الفاظ میں اہلِ دولت یعنی اقتدارِ اعلیٰ کے حامل طبقے ہیں، جو شاہی خاندان کے افراد، امرا اور فوج پر مشتمل تھا، تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اہل سعادت یعنی اہل الرائے طبقہ جو علما، قضات، سادات، مذہبی رہنماؤں، متقی اور پرہیزگار افراد، اہل علم حضرات خصوصاً شاعر اور ادیب، اہل مراد یعنی تفریح اور مسرت مہیا کرنے والے تھے۔ یہ گانے بجانے والی خوب صورت لڑکیوں اور ایسے دیگر افراد پر مشتمل تھا جو راگ رنگ کی محفلوں کو کامیاب بنانے میں معاون ہوتے تھے۔ آخری طبقہ جس کو پہلے دو طبقات کے مساوی اہمیت دینا کچھ عجیب سا لگتا ہے وہ بھی یکساں اہمیت کا حامل تھا کیوں کہ ہر فرد خوب صورت اور تفریح بخش حیناؤں کا شوقین ہوتا تھا۔ اگر ہم ہمایوں کے بنائے ہوئے ان طبقات کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کریں تو ہمارا سابقہ ایسے ہی تقریباً ایک درجن چھوٹے طبقات سے سے پڑتا ہے جو کم و بیش موجودہ دور کے اونچے طبقے کے مسلمانوں کی سماجی تقسیم سے مشابہ تھا۔ رتبے اور درجے کے لحاظ سے انھیں اس طرح رکھا جا سکتا ہے۔ سلطان، خاندان شاہی، خان اور امرا کے مرتبہ کے دیگر افراد، سیّد، علما، عام دولت مند لوگ، عہدے داران، (مغلوں میں منصب داران) ریاست کے حکام اعلیٰ۔ مختلف اقوام کے سربراہ، شاہی افواج کے دستے، شاہی خزانچی، شاہی حفاظتی دستہ کے افراد (جرگہ) سلطان کے گھریلو ملازمین اور دوسرے ادنیٰ درجے کے خانگی خدمت گار۔ مزید برآں وہ اپنے رتبوں کے مطابق اعلیٰ اوسط اور ادنیٰ درجات میں منقسم تھے۔ یہ تقسیم بہت سے حالات میں ایک دوسرے عہدے میں ملی جلی تھی اور قطعی طور پر بے اصولی تقسیم تھی لیکن زیرِ نظر دور کے صاحب اقتدار طبقات پر سرسری روشنی ڈالتی ہے[2] بعد میں قائم ہونے والی چھوٹی چھوٹی مسلم حکومتوں اور ہندو ریاستوں نے سماجی ترقی کے انھیں خطوط پر کام کیا ہے کسی طبقہ کی ترکیب مختلف حالات میں مختلف ہوتی تھی۔ عوام الناس کا حکومت میں کوئی مقام اور سیاسی

---

[1] دیکھیے فتاویٰ جہانداری ص ۳۹۔ تاج المآثر ص ۸۹ ۱۲۸

[2] دیکھیے خواند میر کا ہمایوں نامہ ص ۱۳۰۔ ۱۳۲

اقتدار میں کوئی حصہ نہ تھا[1] ان کے حقوق نہ ہونے کے برابر تھے۔ حکومتوں کو بھاری محصول ادا کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ یہ محصول عموماً گاؤں کا مکھیا اور محکمۂ مال کے افسران کا عملہ وصول کرتا تھا۔ یہ سب عوام کو ستاتے تھے اور وصول شدہ رقم میں سے ایک حصہ اپنے لیے رکھ لیتے تھے اس طرح بہت دولت مند ہو گئے تھے[2] ان حالات کے پیشِ نظر یہ کہنا مشکل ہے کہ سلطنت کو عوام الناس کی حمایت حاصل تھی۔ صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان سماجی انتظامات میں عوام کی ہلکی سی اخلاقی تائید شامل تھی لیکن یہ دعویٰ بھی قطعی نہیں کہا جاسکتا[3] یہ تھی سماج کے مختلف طبقات کی عام حالت۔

ا۔ مسلم سماج

آیئے خصوصی حقوق یافتہ طبقات کی حالت کا مشاہدہ کریں۔ اس طبقے کو دو بڑے حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے[4] امراء اور علماء و دیگر مذہبی طبقات۔

ا۔ طبقۂ امراء

اس کی امتیازی خصوصیت:۔ سلطان کے بعد امراء کا طبقہ آتا ہے جو عام طور پر

---

[1] ہندوستان میں عوام الناس کی حالت کے لیے دیکھیے تاج المآثر جلد چہارم ص ۲۴۳۔ خسرو کی رائے کے لیے دیکھیے مطلع الانوار

[2] خسرو کی رائے کے لیے دیکھیے کلیاتِ خسرو ص ۳۴۲

[3] سندھ میں ایک مقامی حکمران خان دان کے لیے لوگوں کی حمایت دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد اول ص ۲۳۳۔ تفصیل و بحث کے لیے دیکھیے برنی ص ۵۰۵

[4] علماء کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اسلام میں علم کا عہدہ مقرر نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہر دور میں علماء کا وجود رہا اور یہ لوگ عوام کے مذہبی نقطۂ نظر کو متاثر کرتے رہے۔ اس لیے ایک جداگانہ طبقے کی حیثیت سے اس کا جائزہ لینے میں ہم حق بجانب ہیں۔

اقتدار حاصل کرنے میں اس کی مدد کرتے تھے لیکن کبھی کبھی اس کے حقوق بھی غصب کر لیتے تھے اور اگر کوئی حکمران خاندان کمزور اور ناکارہ ہو جاتا تھا تو اس سے اقتدار چھین کر الگ اپنی آزاد حکومت قائم کر لیتے تھے۔ اگر کسی وقت کوئی امیر برطرف بھی کر دیا جاتا تھا یا اسے قوت و رتبہ سے محروم کر دیا جاتا تو بھی اس کے پہلے مرتبہ اور سماجی عزت کی روایات کو یقیناً اس کے ورثا کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ وہ عوام بھی جو اصولِ وراثت کے بڑی سختی سے پابند تھے ان کی منظوری کے ساتھ قوت و اقتدار کی بحالی وقت اور موقع کی بات ہوتی تھی۔

ایک امیر عام طور پر سلطان یا کسی دوسرے امیر کے غلام یا خدمت گار کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کرتا تھا اور درجہ بدرجہ ترقی کرتا تھا۔ یہاں تک کہ کسی مناسب موقع پر اسے اونچے درجے کے افسر یا امیر کا مرتبہ حاصل ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد اسے ہمیشہ کے لیے امرا کی صف میں شامل کر لیا جاتا تھا اور اس کے لواحقین کا سماجی رتبہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا تھا۔ تخت نشینی یا شاہی خاندان سے متعلق کوئی خاص رتبہ حاصل کرنے کے لیے کوئی باضابطہ اصول نہ تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد خلفِ اکبر کے تخت نشین ہونے کا بھی کوئی قانون نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صاحبِ تخت و تاج کسی امیر کے روز افزوں اثر و اقتدار اور اس کے آزادانہ طرزِ عمل سے ہمیشہ مشتبہ رہتا تھا۔ ایک امیر کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ یا تو سلطان کی عام رعایا کی طرح زندگی گزارے یا باغی ہو جائے۔ مغرب کے ہم مرتبہ امرا یا اپنے پڑوسی راجپوت سرداروں کے مقابلے میں دہلی کے امرا کے خصوصی حقوق اس لحاظ سے کم ہوتے تھے۔ چوں کہ حکومت ان کی آزادی کی ہمت افزائی نہیں کرتی تھی اور نہ ان کے خطابات اور تنخواہیں ان کے وارثین کو دی جاتی تھیں، ان کے رتبے کو ان کی زندگی میں بھی چھینا جا سکتا تھا اور وہ ہمیشہ سلطانِ وقت کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ اس سے بہر حال امرا یا ان کے وارثوں کی سماجی اہمیت[1] پر کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

---

[1] اس اصول کی اہمیت اس وقت ختم ہو گئی جب سلطان کا زوال ہوا اور سلطان فیروز تغلق کے بعد امرا نے اپنی آزاد حکومتیں قائم کریں۔

۲۔ **خطابات واعزازات :** اہم ترین امیر کو خان کے خطاب سے نوازا جاتا تھا۔ یہ خطاب امیر کے لیے اعلیٰ ترین مرتبہ کا حامل ہوتا تھا[1]۔ خصوصی اعزاز کی حیثیت سے ان میں سے کچھ کو الغ خان اعظم کا خطاب عطا کیا جاتا تھا[2]۔ اس کے بعد مرتبہ میں ملک اور آخری رتبہ امیر کا تھا۔ سلاطین دہلی کے درباروں میں ادنیٰ درجے کے امرا نہیں ہوتے تھے۔ ان کے جد سپہ سالار اور سر خیل کے مرتبہ کے فوجی حکمران ہوتے تھے جن کے مرتبے حاجی دبیر کی رائے کے مطابق عشری ترتیب کے مطابق ہوتے تھے[3]۔ عام اصطلاحی مفہوم کے مطابق لفظ امیر کو جملہ فوجی اور غیر فوجی افسران کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے اور اسی نام کے مرتبہ اور خطاب کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے[4]۔ اسی طرح لفظ سپہ سالار کا استعمال بھی بلا امتیاز کسی فوجی افسر کے لیے کیا جاتا تھا اور اس میں اس کے مرتبہ اور عہدے کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ کسی امیر کے سرکاری رتبہ کا تعین، شغل، خطاب یا اقطاع یا ان کی تنخواہ بالترتیب ان کے مرتبے کے خطابات اور جاگیر کے مطابق ہوتا تھا۔ دربار میں عہدے متعین کرنے اور خطابات عطا کرنے کا کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ بہرحال ان سب افسران کو اپنے

---

[1] دیکھیے کتاب الرحلہ جلد اوّل ص ۱۰۷۔ اسی طرح کی ایک مثال کے لیے دیکھیے راولنسن فائیو گریٹ مونارکیز (پانچ عظیم بادشاہتیں) جلد سوم ص ۲۲۳۔ رتبہ کے لحاظ سے بادشاہ کے فوراً بعد چند خصوصی حقوق یافتہ طبقہ کے امرا ہوتے تھے یعنی شاہی خاندان کے افراد یا (اخامنشی) Achaenamidae کی نسل کے علاوہ چھ بڑے گھرانے تھے جو رتبہ میں سب امراء سے اعلیٰ تر تھے۔

[2] دیکھیے ہلاکو خاں کی وہ دلچسپ مثال۔ وہ ہندوستان کے ان خصوصی خطابات کے استعمال کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا البتہ بلبن اس سے مستثنیٰ تھا۔ نیز دیکھیے بابر نامہ ص ۲۷۸ افغان ان خطابات کو آپس میں تبدیل کر لیتے تھے اور اعظم، ہمایوں، خان جہان اور خان خاناں قسم کے خطابات دیتے تھے۔

[3] دیکھیے حاجی دبیر کی رائے ظفر الوالہ جلد دوم ص ۷۸۲، نیز برنی ص ۱۴۵۔ امیر کی کمان میں ایک ہزار یا اس سے زیادہ سپاہی ہوتے تھے اور ان سے کم تر رتبہ کے امرا کو یک صد یا دس کی کمان سپرد کی جاتی تھی۔

[4] مثال کے لیے دیکھیے برنی ص ۳۷۶

اخراجات اور وسیع انتظام خانہ داری کو چلانے کے لیے بڑی بڑی جاگیریں دی جاتی تھیں

(۱) **شغل اور خطاب:** جہاں تک شغل اور درباری عہدوں کا تعلق ہے چند امرار کے علاوہ سب کو بلا کام کے تنخواہ مہیا کرنا ممکن نہ تھا۔ سلطان کے قبضے میں دوسرے بڑے عہدے زیادہ نہ تھے۔ ان میں، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، سلطان کے گھریلو ملازمین، کارخانوں کے عہدے داران، چند وزارتیں اور معتمد کے عہدے، چند علاقوں اور صوبوں کی گورنریاں اور دیگر فوجی اور غیر فوجی عہدے اور ان کے خطابات شامل تھے[۱]

جہاں تک خطابات کا تعلق ہے ان کی حدود سلطان کے گمان اور پروازِ خیال کی طرح ہی وسیع تھی۔ لیکن دور اندیشی کا تقاضہ یہی تھا کہ ان میں سے چند کا نمایاں اعزاز برقرار رکھا جائے۔ مخصوص خطابات میں سے چند یہ تھے:

خواجہ جہاں، عمادالملک، قوام الملک، نظام الملک، اعظم الملک، قتلغ خان، الغ خان، صدر جہان، اعلم الملک وغیرہ[۲] بیرونی صوبوں میں ہندو تہذیب و تمدن کے اثرات کی وجہ سے بنگال کے سلاطین نے نایک خان اور ستیہ راج جیسے خطابات بھی عطا کیے[۳]

خطابات کے ساتھ ساتھ امرا کو دوسرے اعزازات بھی عطا ہوتے تھے جنھیں مراتب کہا جاتا تھا۔ یہ مراتب مثال کے طور پر اس وقت ظاہر ہوتے تھے جب شاہی دربار لگتا تھا یا ان کے مخصوص لباس، تلوار اور کٹار جو انھیں سال میں ایک بار سلطان کی طرف سے عطا کیے جاتے تھے اور گھوڑوں اور ہاتھیوں کی تعداد جن کے رکھنے کی انھیں اجازت تھی۔ اسی طرح ان کے خدام کی تعداد۔ ان کے نشان، طبل اور شہنائی وغیرہ[۴] بعض حالات میں تو یہ مراتب بظاہر بالکل شاہانہ ہوتے تھے[۵]

---

[۱] مثال کے لیے دیکھیے راورٹی ص ۶۴۵

[۲] دیکھیے برنی ص ۱۰۔۴۱۴۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۲۸۵

[۳] دیکھیے پرسش پریکیٹا ص ۱۲۰۔

[۴] کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۸۲۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۳۸۹۔ طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۴۲

[۵] شاہی اختیارات کی ان امثال کے علاوہ جو پچھلے باب میں دی گئی ہیں، چند اور مثالیں اس موقع (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(ب) اقطاع:- امرا کو اقطا یا مالیہ کے لیے زمین کی نامزدگی بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ چوں کہ اس کے مادی ذرائع ہی آخر کار اس کی سماجی حیثیت اور سیاسی اثرات کی نشان دہی کرتے تھے۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقطا ہندوستان میں اس شکل میں آیا جو شکل اسے خلیفہ مقتدر نے دی تھی۔ یہ اقطا کا طریقہ دراصل خلیفہ مقتدر نے ان گورنروں سے مستقل روپیہ وصول کرنے کی غرض سے شروع کیا تھا جو اپنے صوبوں میں تقریباً خود مختار ہو چکے تھے) مقطعی علاقے کی پوری رقم وصول کر لیتے تھے اور اس میں سے انتظامی اخراجات اور فوج کی تنخواہ کی رقم نکال کر بقایا میں سے ایک مقررہ رقم خلیفہ کی خدمت میں روانہ کر دیتے تھے۔ اس طرح وصول ہونے والی رقوم کو اقطاعات کہتے تھے[۱] اور رقم ادا کرنے والے کو مقطع۔ ہندوستان کے مالی انتظام میں یہ ضروری خصوصیات ہمیشہ باقی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقطا دار کو اپنی جاگیر کے انتظام میں کم و بیش مکمل آزادی تھی۔ ان جاگیروں کو وہ کبھی کبھی دوسرے افراد کو پٹہ پر زیادہ رقم کے بدلے دے دیتا تھا اور اس اضافہ کی رقم کا بار ہمیشہ غریب کسانوں کو ہی اٹھانا پڑتا تھا۔ دہلی سے محکم مال اپنے سفری ناظر بھیجتے رہتے تھے لیکن ان کی نگرانی کافی مشکل تھی خصوصاً ان علاقوں میں جو دور افتادہ تھے[۲] درحقیقت

(بقیہ حاشیہ) پر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ خصوصی اختیارات عموماً ان امرا تک ہی محدود تھے جنھیں خان کا لقب حاصل تھا۔ مثال کے طور پر جب بختیار خلجی کو بنگال میں مقرر کیا گیا تو سلطان قطب الدین نے اس کو شاہی چھتر شاہی علم و نوبت استعمال کرنے کا مستحق قرار دیا اور اسے شاہی گھوڑے، کمر کی پیٹی اور اپنا شاہی لباس عطا کیا۔ دیکھیے تاج المآثر ص ۵۵۔ اسی طرح اپنے بیٹے کی ولادت پر سلطان مبارک شاہ خلجی نے اپنے دربار کے چند خانوں کو شاہی چھتر عطا کیے اور خسرو خان کو اپنا ذاتی چھتر عطا کیا۔ دیکھیے کلیات خسرو ص ۱۷۱۔ فیروز تغلق کے ایک امیر تاتار خان کے چھتر پر ایک سنہری مور کڑھا ہوا تھا اور یہ وہ نشان تھا جس کے استعمال کا حق ہُما کی طرح صرف سلطان کو تھا۔ دیکھیے برنی ص ۵۷۸۔ عفیف ص ۳۹۱۔ جب شیر خان نے ہیبت خان کو ملتان کا حاکم مقرر کیا تو اسے اعظم ہمایوں کا لقب دیا اور سرخ رنگ کا شاہی شامیانہ عطا کیا۔ دیکھیے تاریخ شیر شاہی، ص ۶۱۔

[۱] کریمر۔ ص ۳۶۳

[۲] ایک اقطا میں متصدی کے دل چسپ تجربہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے اعجازِ خسروی جلد دوم ص ۱۴۱-۵۰۔

جب تک مرکزی حکومت اپنی مرضی منوانے کے لیے کافی طاقت ور ہوتی تھی اس وقت تک کسی امیر کے اقطا اور اس کے خطابات واعزازات بالکل ذاتی نوعیت کے ہوتے تھے۔ حکومت ذاتی ملک اور سرکاری عہدوں اور جاگیروں میں نمایاں فرق رکھتی تھی۔ ذاتی ملک پر وراثت کا قانون لاگو ہوتا تھا لیکن سرکاری عہدوں اور جاگیروں پر کسی قسم کے حقوق نہ تھے۔ محمد تغلق کی وفات کے بعد مرکزی نظم ونسق کے کمزور ہونے کی وجہ سے یہ معاملات کسی حد تک غیر واضح رہے جب افغان امرا نے اپنے اقطاعات کو قابلِ وراثت تصور کرنا شروع کیا تو سلطان سکندر لودی نے اس معاملے کو ایک مشہور افغان امیر کے وارث مسند عالی زین الدین کے سلسلے میں واضح کر دیا۔ اس نے ایک فرمان جاری کیا جس میں تحریر تھا کہ "زین الدین پر یہ واضح ہو کہ اسے یہ جاگیریں قطعی ذاتی حیثیت سے عطا کی گئی ہیں اور ان کا مرحوم مسند عالی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" مرحوم امیر کے بیٹے کے لیے سلطان نے نقد وظیفہ منظور کیا اور اس کی بیوی کو کچھ زمین پٹے پر دی جس کے لیے ہر سال اجازت لینا ضروری تھا۔ نقد وظیفے کی منظوری کے لیے بھی یہی شرائط تھیں[1]

اس طرح عام حالات میں حکومت اقطا کی زمینوں کے دوبارہ حاصل کرنے کے اختیارات کو چھوڑنے کے لیے رضامند نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی مذہبی اور خیراتی اوقاف کے لیے۔ ایک کمزور سلطان بہرحال اپنے پیش رو کے انتظامات میں دخل اندازی نہ کرنا ہی زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ متواتر کئی کمزور سلاطین یا کمزور خاندانوں کے برسراقتدار رہنے کی وجہ سے اقطاعات کسی حد تک ذاتی ملکیت کی حیثیت اختیار کر لیتے تھے۔ کسی اعزاز یا کسی جاگیر کا باپ کے بعد بیٹے کی زندگی میں جاری رہنا سلطنت کی طرف سے ان کے قبضے کے حق کی رضامندی یا ذاتی ملک کی حیثیت سے قبضہ کی دلیل نہ تھا بلکہ یہ سلطنت کی کمزوری کا اظہار تھا[2]

یہ جاگیریں بہت وسیع اور کبھی کبھی حکومت کے پورے ایک صوبے پر مشتمل ہوتی تھیں معمولی جاگیریں بھی کافی منفعت بخش تھیں[3] ان کی وسیع آمدنی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ

---

[1] واقعاتِ مشتاقی ص ۲۸

[2] سر وینزلی ہیگ کی رائے کے لیے دیکھیے ہارمس ورتھ یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ ص ۳۱۷۰

[3] دیکھیے ابن بطوطہ کا وہ واقعہ جب اس نے دیوگیر میں ایک امیر کی غیرموجودگی میں اس کے اقطا کا انتظام کیا تھا اور تقریباً پانچ ہزار تنکے حاصل کیے تھے۔ کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۸۔

جب فیروز تغلق کے زمانے میں ان کی مالیت کے کاغذات تیار کرائے گئے تو ان کی کل مالیت کی میزان ۷۰ء۵ لاکھ چاندی کے سکوں سے بھی زیادہ تھی۔ امرا کے مشاہرات کی تفصیل بعد میں دی جائے گی[1]

جہاں تک مختلف طبقات کے امرا کی نسبتی حیثیت کا تعلق ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے خان کا عہدہ بلند ترین اہمیت کا حامل تھا، ان کے بعد ملک ہوتے تھے جو مخصوص مواقع پر امرا ہی میں سے لیے جاتے تھے مثلاً کسی سلطان کی تخت نشینی پر یا حکومت کی بہت نمایاں خدمات کی انجام دہی کے عوض میں[2] خان اور ملک کے چند خصوصی اختیارات تو یکساں ہی تھے لیکن ان کے مراتب کے فرق کو ہمیشہ نمایاں رکھا جاتا تھا۔ انھیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ ملک کے خطاب یا دیگر اعزازی خطابات سے مخاطب کیے جائیں۔ اس قاعدے کی خلاف ورزی قابلِ سزا تھی[3] کم سے کم رتبہ کے امرا کے لیے بھی یہ قاعدہ یکساں تھا۔ انھیں بھی اسی قسم کے اعزازات و اختیارات حاصل تھے لیکن ان کے درجات میں وہی فرق تھا جو دو بلند مرتبہ والے امرا میں تھا۔ اس بات کو علم کے عام مواقع پر استعمال کی مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ خان کو ۹ علم لے جانے کی اجازت تھی جب کہ امیر صرف ۳ علم سے زیادہ کا مجاز نہ تھا۔ یا اسی طرح جب کہ خان کو اپنے جلوس میں دس گھوڑے رکھنے کی اجازت تھی تو امیر صرف دو گھوڑے ہی رکھ سکتا تھا[4] جب سلطان التمش نے ناصرالدین کو جو ایک ملک تھا ایک گھوڑا عطیہ کے طور پر دیا تو اس نے ہر امیر کو بھی ایک ایک گھوڑا دیا[5]

بہرحال ہر درجے کے امرا کی کافی رقم مقرر تھی جس سے وہ حسبِ حیثیت سپاہ ملازم رکھ سکیں اور بڑے پیمانے پر کارخانے قائم کر سکیں۔ یہ کارخانہ جات بعض اوقات بہت

---

[1] ایک مقطع کی سرسری تفصیلات کے لیے دیکھیے اگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا از مورلینڈ ص ۵۷ برنی ص ۲۱۸ - ۲۲۱

[2] نئے حکمران کی تخت نشینی کے موقع پر ترقی دیے جانے کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۴۲

[3] ابن بطوطہ کی رائے دیکھیے کتاب الرحلہ۔ جلد اول ص ۱۰۷

[4] دیکھیے Notices etc ص ۱۹۰

[5] راورٹی ص ۷۲۸ - ۷۳۱ -

وسیع ہو جاتے تھے[1] مزید برآں ان کے درجات اور عہدوں کا خیال جملہ سرکاری تقریبات اور دیگر سرکاری مواقع پر رکھا جاتا تھا[2]

(ج) کمتر امتیازات : بلند رتبہ امرا کے علاوہ عام افراد بھی زر بفت کی خلعت اور کمر کی پیٹی یا ایک گھوڑے اور ساز یا قطعہ زمین یا نقد اور وظیفے کی شکل میں انعام پاتے رہتے تھے[3] انعام میں دیے جانے والے گھوڑے نسل اور ساز کے لحاظ سے چار قسم کے ہوتے تھے[4] اس دور کے اختتام تک خلعت عطا کرنے کا رواج ہر طبقہ میں اس قدر عام ہو چکا تھا

---

[1] مثلاً مبارک شاہ خلجی کے زمانے میں خسرو خان کے عملے میں چالیس ہزار افراد ملازم تھے بعض افغان امرا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے عملے میں تیس ہزار سے چالیس ہزار تک کی تعداد میں تنخواہ دار افراد ملازم ہوتے تھے (دیکھیے طبقاتِ اکبری، جلد اول ص ۳۴۲) میواڑ کے امرا کے لیے دیکھیے ٹوڈ کی تفصیلات۔ جلد اول ص ۱۶۷ - ۱۶۸۔ میواڑ کے امرا مندرجہ ذیل تین طبقات میں تقسیم تھے۔

پہلا طبقہ :۔ پہلا طبقہ وہ تھا جن کی جاگیر کا سالانہ آمدنی دس ہزار سے پچاس ہزار روپے یا اس سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ یہ لوگ دربار میں صرف اس وقت حاضر ہوتے ہیں جب حکمران خصوصی طور پر اہم تہواروں یا دیگر تقریبات پر انھیں بلاتا ہے۔ یہ لوگ حکمران کے خاندانی مشیر ہیں۔

دوسرا طبقہ : ان کی آمدنی پانچ سے پچاس ہزار روپیہ سالانہ تک ہے انھیں ہمیشہ دربار میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ ان میں سے خصوصاً فوجدار اور فوجی افسران مقرر کیے جاتے ہیں۔

تیسرا طبقہ :۔ ان افراد پر مشتمل ہے جنھیں زمین پٹے پر ملی ہوتی ہے Gol holdaw lands جن کی آمدنی پانچ ہزار سے کم ہوتی ہے۔ اگر چہ حکمران کی عنایت سے یہ اس حد سے آگے بھی بڑھ سکتے ہیں۔

[2] عفیف ص ۲۹۱ - ۲۹۲

[3] علاؤ الملک کو دیے جانے والے عطیات کی فہرست کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۷۱، اور مبارک شاہ خلجی کے دور کی مثالوں کے لیے ایضاً ص ۳۷۷

[4] کتاب الرحلہ۔ جلد دوم ص ۷۸

کہ یہ کہا جاتا ہے کہ گورو انگددیو ہر سال اپنے چیلوں کو دو خلعت عطا کیا کرتے تھے[1] خلعت کے رواج اور دوسرے انعامات کی نوعیت کی ابتدا بلا شبہ ایران سے ہوئی[2]

(۳) طبقہ امرا اور سلاطینِ دہلی

سلطنت کے ابتدائی دور میں امرا کو اس کا واحد سہارا نہیں تو بلاشبہ بہترین سہارا کہا جاسکتا ہے۔ سلطان شمس الدین التمش نے بجا طور پر ان کی اہمیت کا اعتراف کیا تھا جسے اپنے پیش رو سلاطین کے مقبوضات اور اپنی کثیر فتوحات کو مستحکم کرنے والا اولین سلطان کہا جا سکتا ہے[3] صرف انھیں سرداروں کی اعانت اور وفاداری حکومت کے استحکام کا باعث بنی۔ ان کا تعلق اسی طبقے سے تھا جس سے غلام سلاطین تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے لیے حکومت کی عام رعایات کی طرح سلطان کی ہر مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانے سے بہت پہلے امرا کی قوت اور تنظیم زور پکڑنے لگی تھی۔ انھوں نے اپنا ایک منظم گروہ بنا لیا جسے "امیرانِ چہل گانی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے اراکین کا طور طریقہ اور انتظامیہ سے اس کے وقت بے وقت اختلافات کی وجہ سے سلطان غیاث الدین بلبن (جو خود انھیں میں سے ایک تھا) کو یقین ہو گیا کہ ان کا وجود حکومت کے

---

[1] میکالف جلد دوم ص ۴۰۔

[2] ایرانی روایات کے لیے ہوارٹ ص ۱۴۸۔ "بادشاہ کے توشہ خانے میں سے خلعت عطا کرنا بہت قدیم روایت تھی۔ ساپور دوم نے آرمینین سپہ سالار کو ایک لباسِ شاہی، گھری کی ایک سمور، خود پر لگانے کے لیے سہنرے چاندی کا بنا ہوا ایک آویزہ، ایک شاہی کلاہ، گلے کے زیورات، ایک خیمہ، قالین اور سنہری ظروف عطا کیے تھے۔ اردشیر اول نے ایک خوش خبری لانے کے بدلے میں موبد عظیم کا منہ سرخ یاقوت، سونے، موتیوں اور جواہرات سے بھر دیا تھا۔

[3] التمش کے بارے میں برنی کی رائے کے لیے دیکھیے برنی ص ۱۲۷۔ جب امرا اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے تو وہ اس قدر متاثر ہوا کہ تخت سے نیچے اتر آیا، ان کے ہاتھوں اور پیروں کو بوسہ دیا۔

لیے ایک مستقل دردِ سر بے[1]۔ اس نے اس کے بااثر اراکین کا استیصال کیا اور آخر کار پوری تنظیم کو بڑی بے دردی سے ختم کر دیا۔ بہرحال بلبن نے امرا کے خصوصی حقوق کی حفاظت کرنا فراموش نہیں کیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو تنبیہ کی کہ کوئی بھی حکومت امرا کی اعانت کے بغیر سرسبز نہیں رہ سکتی[2]۔ اس طرح سلطنت امرا کے وجود یا ان کی ترقی کے خلاف نہ تھی ہاں انھیں منظم گروہ کی شکل میں پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ بلبن کے دورِ حکومت میں اس عارضی رکاوٹ کے بعد امرا نے اپنے سیاسی اثرات کو دوبارہ منظم کیا اور وہ اتنے طاقت ور ہو گئے کہ سلاطین کو اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے ان کی اعانت کی ضرورت پڑنے لگی[3]۔

سلطان علاؤالدین خلجی نے تخت نشین ہوتے ہی غیر ملکی امرا کے وجود کا خطرہ محسوس کیا۔ اس نے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس میں ہندوستانی عناصر کو شامل کیا اور ان

---

[1] تنظیم کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۸۔ نیز کتاب الرحلہ جلد اول، ص ۱۴۱۔ امرا کے سیاسی اقتدار کے سلسلے میں چند مثالیں بھی ملاحظہ فرمایئے۔ جب ملک عزالدین بلبن نے شاہی اقتدار حاصل کیا اور اس کی تاج پوشی ہوئی ان امرا نے علاؤالدین مسعود شاہ کو اس کی جگہ تخت پر بٹھا دیا اور اول الذکر کو ان کے فیصلے کو تسلیم کرنا پڑا (راورٹی ص ۶۶۲) پھر جب الغ خان بلبن کو ملک ریحان کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اس کے عہدے سے برخاست کیا گیا تو انھیں امرا کی مخالفت اور فوجی مظاہرے کے اثرات کی وجہ سے امرا اور سلطان کے مابین ایک معاہدہ ہو گیا اور سلطان کو اپنا پہلا فیصلہ بدل کر بلبن کے حریف کو اس کے عہدے سے ہٹانا پڑا۔ دیکھیے ایضاً ص ۸۳۰۔ اسی طرح جب امیرانِ چہل گانی میں سے ایک امیر بدرالدین کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سلطان کا تختہ الٹنے کے لیے سازش کر رہا ہے تو سلطان نے محض اس پر اکتفا کیا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آجائے اور اسے اس کے اقطاع میں بدایوں بھیج دیا۔ ایضاً ص ۷۳۵۔ [2] برنی ص ۸۷۔

[3] دیکھیے برنی (قلمی نسخہ) ص ۷۰۔ بغراخان اس وقت قطعی طور پر مطمئن ہو گیا جب اسے معلوم ہوا کہ طبقۂ امرا موسوم بہ "کوتوالیان" (یعنی بلبن کی رہنمائی میں دہلی کے کوتوال فخرالدین کے بیٹے اور ان کے مددگار) نے اس کے بیٹے سلطان کیقباد کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا ہے اور پوری طرح اس کی حمایت کر رہے ہیں اسی طرح جب جلال الدین تخت نشین ہوا تو اسے ترک امرا کی مخالفت کے خوف سے اپنے ہی دارالخلافہ میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ ایضاً ص ۱۸۰-۱۸۱

ہندوستانی امرا کو حکومت کے معاملات میں مراتب اور قوت عطا کی۔ اس کے جانشینوں نے بھی اس کے اس طریقِ کار کو جاری رکھا۔ بدقسمتی سے ہندوستانی امرا درباری معاملات میں حد سے زیادہ دخیل ہوگئے اور خسرو خان اور اس کے رفقا نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے مسلم رائے عامہ کو اپنے خلاف کرلیا۔ ہندوستانی امرا (بلکہ ہندوؤں کے) روز افزوں اثرات کے پیشِ نظر مسلم عوام نے ان کے خلاف محاذ بنالیا۔ ان حالات نے ہم جو غیاث الدین تغلق کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ خسرو خان کو اکھاڑ کر اپنی حکومت قائم کرے۔ محمد تغلق نے تخت نشین ہونے کے بعد ٹھنڈے دل سے پورے حالات کا مطالعہ کیا جن میں سے ایک میں وہ پہلے خود رول ادا کرچکا تھا۔ تجربہ سے اُسے یہ معلوم ہوا کہ غیر ملکی ترکی امرا اور ان کے ہندوستانی جانشین ہی غلطی پر ہیں اس لیے اس نے اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں بیرونِ ہند کے مسلم ممالک سے غیر ملکیوں کو بھرتی کرنا شروع کردیا۔ ہندوستانی امرا اور ترکی نژاد ہندوستانی باشندوں کے مطالبات کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا۔ سلطان نے ہر قیمت پر غیر ملکی امرا کو بلایا، انتہائی ذمہ داری کے حامل اور اہم ترین عہدے انھیں عطا کیے۔ مثال کے طور پر وزیر، دبیر، فوجی کمانڈر، قاضی، دینیات کے عالم یا شیخ الاسلام وغیرہ عہدے معمولی علم کے حامل غیر ملکیوں کو عطا کیے۔ ہندوستان آنے والے والے غیر ملکی لوگ مجموعی طور پر "اعزا" کہلاتے تھے[۱]۔ جو غیر ملکی افراد ان مواقع سے استفادہ نہ کرسکے یہ ان کی اپنی کوتاہی تھی۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ یہ غیر ملکی ہندوستان میں دولت جمع کرنے اور جلد سے جلد اپنے ملک کو واپس لوٹ جانے کے لیے ہی آتے تھے۔ وہ حکومت کا ایسا کوئی پُرمنفعت عہدہ قبول کرنے کی بالکل پرواہ نہ کرتے تھے جس کی بنا پر انھیں ہندوستان میں زیادہ عرصہ رکنا پڑے۔ اگر ان میں سے چند ہندوستان میں قیام کرنے کو ترجیح بھی دیتے تھے تو بھی وہ ہر ممکن طریقے سے دولت جمع کرنے کے زیادہ متمنی رہتے تھے بہ نسبت اس کے کہ وہ زرعی پیداوار بڑھانے یا سرکاری امور میں بہتر کارکردگی دکھانے کے سلطان کی انتظامی معاملات میں اعانت

---

[۱] دیکھیے ابنِ بطوطہ کی تفصیلات۔ کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۳۔ ۸۔ جب محمد تغلق معبر کی مہم پر روانہ ہوا تو اس نے ہندوستانیوں کو چھوڑ کر سبھی غیر ملکیوں کو بھاری عطیات اور انعامات دیے۔ ایضاً ص ۸۵۔

کریں[1] ان غیر ملکیوں کے تھوڑے بہت تجربے کے بعد محمد تغلق بری طرح ان سے ناامید ہوا اور اس نے اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کی[2] اسے اب غیر ملکی افراد یا غیر ملکی نسل کے لوگوں سے کوئی توقع نہ تھی۔ سابقہ سلاطین ترک اور ہندوستانی امرا کی جانچ پرکھ کر چکے تھے۔ خود سلطان غیر ملکی مسلمانوں کا تجربہ کر چکا تھا۔ سلطنت کے لیے یہ سب ناکام ثابت ہوئے۔ اب صرف ایک ہی راستہ باقی تھا اور وہ یہ کہ بلا لحاظ مذہب و نسل ہندوستان کے عام لوگوں کا تجربہ کیا جائے۔ اس لیے اپنے دورِ حکومت کے آخری حصے میں اس نے انتظامی معاملات میں انتہائی جمہوری طرز اختیار کیا۔ اس طرز کے ہم عصر مورخ برنی اور دیگر مسلمان مصنفین کے غصہ کو ہوا دی چوں کہ اس سے ان کے مفاد خطرے میں پڑ گئے۔ بڑے بڑے فوجی اور غیر فوجی عہدے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے ہندوستانیوں کو دیے گئے اور بھرتی کرنے کے لیے معیار قابلیت صرف صلاحیت اور کارکردگی رکھا گیا[3] شاید صرف پست ترین افراد حکومت میں بلند

---

[1] غیر ملکیوں کی بے جا تعظیم حاصل کرنے کی طلب کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۴۱۔ ابن بطوطہ کے خیال کے مطابق شہاب الدین نام کے ایک غیر ملکی کی تباہی اور بدقسمتی کی وجہ بلبن کے نزدیک اس کی ہندوستان سے ظلم و ستم کے ذریعہ حاصل کی ہوئی وہ دولت تھی جس کی وجہ سے اس پر خدا کا قہر نازل ہوا۔

[2] محمد تغلق کی رائے کے لیے دیکھیے برنی ص ۵۰۱۔ "اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ روئے زمین پر کسی غیر ملکی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔"

[3] دیکھیے برنی ص ۵۰۵۔ اس کی ان افراد کی فہرست میں جنہیں اس نے انتظامی عہدوں پر مقرر کرنے کے لیے چنا تھا ہر طبقے کے پست لوگ شامل تھے مثلاً مغنی، شراب کشید کرنے والے، رقاص، نائی، باورچی، سبزی فروش، جولاہے، باغبان، چھوٹے دوکان دار، غلام اور ہر قسم کے دیگر بد اصل لوگ نانک، لودھا، پیرا، کشن وغیرہ ہندو نام بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ چند اہم ہندوستانی افراد مثلاً سلطان بلبن کا سر خیل عماد الملک برنی (قلمی نسخہ ص ۶۱) کڑہ میں محمد تغلق کے گورنر عین الملک، تمام غیر ملکی (خراسانی) موخر الذکر سے بری طرح خوف زدہ تھے چوں کہ وہ باغی ہو گیا تھا اور وہ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے غیر ملکیوں کے اقتدار کو ناپسند کرتا تھا (کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۴۴)

[4] دیکھیے بابر نامہ۔ ص ۲۸ پر بابر نے ایک ہندو کا ذکر کیا ہے جس کا لقب خان جہاں تھا اور وہ گوالیار کے قرب و جوار میں مغلوں کے لیے مشکلات پیدا کر رہا تھا۔

عہدے حاصل کرنے سے مستثنیٰ رہے۔ اس کے جانشین کے دورِ حکومت میں خان جہاں جیسے مشہور اولین ہندوستانی وزیر کا تقرر عمل میں آیا۔ سلطان کے پاس یہ بلند ترین عہدہ تھا مضبوط انتظامیہ کے قیام کے بعد وزیر کا اقتدار واثر صرف سلطان کے بعد دوسرے درجے پر ہوتا تھا۔ وہ حکمران جو تیمور کے حملے اور سید خاندان کے بعد تخت نشین ہوئے لازمی طور پر ہندوستانی ہی تھے۔

اسی زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سماجی اور تہذیبی تعلق اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ فوج سے نبرد آزما ہونا پڑا[۱] افغانوں کی آخری جنگ بھی ایک ہندو امیر اور جنرل کی سرکردگی میں لڑی گئی جس کے بعد ہی اکبر دہلی کے تاج وتخت کا مالک بن سکا[۲]

۴۔ سلطان اور امرا کے ذاتی تعلقات

ایک سلطان اور اس کے امرا کے درمیان ذاتی تعلقات کی نوعیت کو متعین کرنا کسی قدر مشکل امر ہے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں جب کوئی امیر کسی سلطان کا غلام ہوتا تھا تو سلطان کی حیثیت مالک کی ہوتی تھی اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ان کے تعلقات تابعداری اور خدمت پر مبنی ہوتے تھے۔ اس درجے کی سماجی زندگی میں ذاتی حقوق کا کوئی سوال ہی نہ تھا لیکن جب کوئی غلام رہائی پانے کے بعد سماجی ارتقا کی منزلیں طے کر لیتا تو مصلحت اور رواج سلطان کو اس کی ذاتی زندگی میں بہت زیادہ دخل اندازی سے باز رکھتے تھے۔ ان حالات

---

[۲] تاریخ داؤدی کے مصنف کے بیانات سے افغانوں کے ہندو سپہ سالار ہیمو کی قوت واقتدار کے بارے میں کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ تاریخ داؤدی (قلمی نسخہ) ص ۱۲۱ - ۱۲۲۔ جب ہیمو کرانی افغانوں کو شکست دے کر سلطان عدلی کے پاس آیا تو سلطان نے اس پر بڑی نوازشیں کیں اور اسے "وکرما دتیہ" کا خطاب دیا۔ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد سلطان نے اسے جملہ شاہی اختیارات سپرد کر دیے۔ آخر کا معاملات اس حد تک پہنچے کہ سلطان کے دائرۂ اختیار میں خورد ونوش کے ذرائع کے سوا کچھ بھی نہ رہا۔ خزانے اور ہاتھیوں پر پوری طرح ہیمو قابض ہو گیا۔ دیکھیے ہیمو کے بارے میں ابوالفضل کی رائے اکبرنامہ جلد اول ص ۳۳۳۔

میں بھی صورتِ حال زیادہ واضح نہ تھی۔ سلطان اس کی پہلی حالت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بظاہر یہ بات امرا کے لیے قابلِ اعتراض نہ تھی۔ اس طرح ایسی کوئی حدِ فاصل نہ تھی جہاں حکمران کی حدِ اختیار ختم ہوتی ہو اور کسی امیر کی انفرادی زندگی کا آغاز ہوتا ہو۔ بے امنی کے زمانے میں سلطان امرا کی زندگی میں موثر ڈھنگ سے دخل اندازی کرتا تھا[1] بہتر اور زیادہ مستحکم حالات میں دونوں کے درمیان زیادہ ہم آہنگی ہوتی تھی۔ سلطان عام طور پر سرپرست اور دوست کی حیثیت سے برتاؤ کرتا تھا۔ اپنے امرا کے معاملات میں ہمدردانہ دلچسپی لیتا تھا اور ایک دوسرے سے ناچاقی کی صورت میں ان کے جھگڑوں کا فیصلہ بھی کرتا تھا۔ سیدوں اور افغانوں کے دورِ حکومت میں سلطان کی اصل گرفت کچھ کمزور پڑ گئی تھی اور امرا اپنے معاملات میں کم و بیش آزاد تھے۔ حتیٰ کہ سیاسی وجوہ کی بنا پر حکومت کو ان کے معاملات میں دخل اندازی کرنا پڑی[2]

۵۔ طبقۂ امرا کی تشکیل

سلطنت میں مختلف مراتب کے امرا کی صحیح تعداد دینا مشکل ہے[3] طبقۂ امرا مختلف عناصر پر مشتمل تھا اس میں غیر ملکی بھی تھے اور ملکی بھی۔ ان کی کارکردگی اور تعداد ہر حکمران

---

[1] اصولی طور پر امرا کے بچوں کی شادیاں سلطان ہی کرتا تھا۔ درحقیقت سلطان علاؤالدین خلجی نے امرا کے لیے یہ لازم قرار دیا تھا کہ وہ آپس میں کسی قسم کی رشتہ داری قائم کرنے سے پیشتر سلطان کی اجازت حاصل کریں۔ اسی طرح ان پر یہ پابندی بھی عاید کی گئی تھی کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر نہ ایک دوسرے سے ملیں اور نہ ایک دوسرے کو کھانے یا سماجی تقریبات پر مدعو کریں اور اس کے ان احکامات پر پوری دیانتداری سے عمل ہوا (برنی ص ۲۸۶ - ۲۸۷۔ بنیر راورٹی ص ۷۶۷)۔

[2] فیروز شاہ تغلق کے اپنے امرا کے ساتھ برتاؤ اور ان کے جھگڑوں کے فیصلے کے لیے دیکھیے عفیف ص ۱۱۱۔ شیر شاہ نے بنگال کے اس گورنر کے خلاف سخت قدم اٹھایا تھا جس نے بنگال کے سابق سلطان کی بیٹی سے شادی کر کے آزادی کا خواب دیکھا تھا۔ تاریخ شیر شاہی ص ۷۵۔ شیر شاہ نے اسے معمولی سزا دی اور دوسرے تمام لوگوں کو تنبیہ کی کہ اگر انھوں نے اس کی اجازت کے بغیر کسی معزول حکمران سے رشتہ دارانہ تعلقات قائم کیے تو انھیں سزا دی جائے گی۔

[3] دیکھیے عفیف ص ۱۰۹۔ دیگر ہزارہا افراد بنگال کے حملے کے وقت فیروز تغلق کے ہمراہ تھے۔

خاندان کے ساتھ مختلف ہوتی تھی۔ مسلمانوں کی حکومت کے ابتدائی دور میں سب امرا تقریباً ترکی النسل تھے۔ افغان دھیرے دھیرے کافی عرصے بعد اس میں شامل ہوئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ حسن ابدال اور کابل کے وسطی علاقے روہ سے آئے تھے اور سلاطین غور کی نسل سے ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ سلطان فیروز ان پر لطف و کرم کرنے والا اولین حکمران تھا حالاں کہ وہ لوگ بہت پہلے سے ہندوستان میں آکر سکونت پذیر ہو چکے تھے[۱] منگولوں کے حملے کے بعد جن منگول عناصر نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جنھیں ابتدا ہی میں حکومت کی مدد حاصل ہو گئی تھی وہ طبقۂ امرا میں شامل ہو گئے۔ انھیں نومسلم کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔ ان میں سے چند منگولوں کے گجرات میں باغی ہونے کے بعد علاؤ الدین خلجی نے بڑے پیمانے پر ان کا قتلِ عام کرایا[۲] تغلق سلاطین کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اصل میں بلبن کے غلام تھے اور انھوں نے ہندوستان کے جاٹوں میں شادیاں کر لی تھیں اس لیے ان کی نسل مخلوط تھی[۳] بعد میں مغلوں نے ہندوستان فتح کیا اور ان کے ساتھ متعدد ایرانی، منگول اور ترک امرا موجودہ طبقۂ امرا میں شامل ہو گئے۔ ساحلی شہروں خصوصاً ساحلِ گجرات پر جملہ غیر ملکی مسلمان مثلاً عرب، حبشی، ایران، افغان، جاوا کے باشندے، ترک، مصری وغیرہ آباد ہو گئے اور ہندوستان کے اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ کا باعث بنے[۴] ان طبقات میں سے ابتدا میں ترکوں کا وجود بڑی اہمیت کا حامل رہا اور بعد کے زمانے میں افغانوں اور مغلوں کا۔ شروع میں افغانوں اور مغلوں کے تعلقات کچھ زیادہ خوش گوار نہ تھے لیکن آخر کار وقت کے ساتھ ساتھ بعض عناد

---

[۱] دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۲۷ – ۲۸۱۔ پیشتر کے حوالہ جات کے لیے دیکھیے آئینۂ سکندری جس میں امیر خسرو نے ان کی شخصیت پر اپنی رائے دی ہے ص ۲۷۔ ابن بطوطہ نے انھیں عجم کی ایک قوم بتایا ہے ملاحظہ کتاب الرحلہ جلد اول ص ۲۴۱) تیمور نے تحریر کیا ہے کہ وہ لوگ کشمیر کے مغرب کے باشندے تھے۔ (دیکھیے ظفرنامہ ص ۳۰۴)

[۲] تفصیلات کے لیے دیکھیے برنی کا بیان۔ برنی ص ۲۱۹

[۳] تاریخ فرشتہ جلد اول۔ ص ۲۳۰۔ ۲۳۱

[۴] باربوسا جلد اول ص ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ نیز دیکھیے ظفرالوالہ میں مقدمہ جلد دوم ص ۲۱

ختم ہوتے گئے اور وقت نے افغانوں کو مغلوں کی بالادستی قبول کرنے پر رضامند کردیا۔[1]
ان طبقات میں راجپوتانہ کے راجپوت سرداروں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جنھوں نے مسلمانوں کے اقتدارِ اعلیٰ کا بڑی ثابت قدمی سے مقابلہ کیا حتیٰ کہ سلطنت نے ان کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرلیا۔ سلطنت کے ابتدائی دور میں یہ سردار سلاطین کے درباروں میں یا کبھی کبھی اپنے حدودِ مملکت ہی میں سلاطین کے والسراؤں کے درباروں میں ماتحتوں کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اس دور کے آخری ایام میں ان کے تعلقات سلاطین دہلی کے ساتھ اور گجرات اور مالوہ جیسی ریاستی حکومتوں کے ساتھ کافی حد تک خوش گوار ہو چکے تھے۔[2]

علما اور دیگر مذہبی افراد پر مشتمل طبقہ

مذہبی طبقہ بہت سی اہم جماعتوں پر مشتمل تھا جیسے علما، صوفیا، سید، پیر اور ان کے ورثا۔ ان میں اہم ترین حیثیت علما کی تھی جن کے فرائض اور مراتب کے بارے میں ہم گذشتہ صفحات میں بتا چکے ہیں۔ علما جو حکومت کے محکمہ قضات اور مذہبی مناصب پر فائز تھے مجموعی طور پر دستار بندان کے نام سے موسوم کیے جاتے تھے چوں کہ دستار

---

[1] دیکھیے افغان امیر جیسے خان کا دل چسپ واقعہ جس نے اس وقت بیرم خان کی جان بچائی جب افغانوں نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکالا تھا۔ جب بیرم خاں اکبر کے اتالیق کی حیثیت سے برسرِ اقتدار آیا افغان امیر نے اپنی غربت اور افلاس کے باوجود بیرم خاں کے پاس مدد مانگنے کے لیے جانے سے انکار کر دیا کیوں کہ یہ بات ایک افغان کی خودداری کے منافی تھی۔

[2] سلیم شاہ سوری اور گوالیار کے راجہ کے ذاتی تعلقات کی دل چسپ مثال کے لیے دیکھیے تاریخ داؤدی ص ۱۱۰ - ۱۱۱۔ ہندو سرداروں کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۴۷۔ دیوگیر کے راجہ کے ساتھ علاؤالدین کے برتاؤ کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۰۶۔ فیروز شاہ کے لیے دیکھیے برنی ص ۵۸۶ تا ۵۸۸۔

ان کا سرکاری لباس تھا۔ سیّد اپنے سر کے مخصوص لباس کُلاہ کی وجہ سے کلاہ داران کہلاتے تھے۔[۱] یہ دونوں طبقات سر کے مخصوص لباسوں کی وجہ سے حکومت میں ایک خاص مقام رکھتے تھے کیوں کہ وہ تقلید پسند اسلام کے ترجمان تھے۔ یہ دونوں طبقات سُنّی حنفی طریقے پر چلتے تھے۔ سُنّی عقائد سے تعلق رکھنے والے دیگر سُنّی افراد کے معاملات میں مزاحمت تو نہیں کی جاتی تھی تاہم ان کی ہمّت افزائی بھی نہیں ہوتی تھی۔ خلیفۂ چہارم کی حیثیت سے حضرت علیؓ کی اور رسول اکرمؐ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے دیگر جملہ افراد کی عزت و توقیر عام طور پر کی جاتی تھی لیکن شیعہ عقیدے سے تعلق رکھنے والے افراد کو مذہبی آزاد خیالی اور لاادریت کے متعدد الزامات کی بنا پر مستقل طور پر ستایا جاتا تھا۔ اس دور کے آخری ایام میں خصوصاً ایرانی اثرات اور مغلوں کی آمد کی وجہ سے یہ تہذیب ختم ہوئی۔ حالاں کہ اس وقت بھی سنی اسلام کو سرکاری حیثیت کی بالادستی حاصل تھی۔ دیگر مذہبی طبقات کو علما اور سیّدوں کی طرح نمایاں حیثیت حاصل نہ تھی۔ ان طبقات کی تفصیل مندرجہ ذیل طریقے سے کی جاسکتی ہے:

۱۔ علما

جیسا کہ باب اوّل میں بیان کیا جاچکا ہے سلطنت کے خصوصی مقربین اور شریکِ کار علما تھے۔ اصولی طور پر انھوں نے اسلامی قانون، منطق، عربی زبان اور مروجہ اسلامی ادب جیسے تفسیر، حدیث اور کلام وغیرہ نصاب کی تربیت پائی تھی۔[۲] حالاں کہ قرآن میں ان کی اہمیت مسلمانوں کے ایک عام مخصوص طبقے کی حیثیت سے نمایاں کی گئی ہے اور ان پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلائیں لیکن کلامِ پاک میں ان کے لیے کوئی خاص مقام نہیں ہے۔[۳] لوگوں میں جلد ہی جعلی احادیث مشہور ہوگئیں کہ رسول اللہ

---

[۱] ماوردی ص ۲۰۵
[۲] انھیں عمامہ پوشش غالباً اس لیے کہا جاتا تھا کہ ایک مقررہ تعلیمی کورس پورا کرنے پر انھیں عمامہ دیا جاتا تھا۔ یہ عمامہ آج کل کی یونیورسٹی کی ڈگری کے مساوی ہے۔
[۳] قرآن شریف ۳-۱۰۳

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "علما کی عزت کرو کیوں کہ وہ پیغمبروں کے جانشین ہیں۔ جو ان کی عزت کرتا ہے وہ پیغمبر اسلام اور اللہ کی عزت کرتا ہے" اسی طرح مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی اہمیت کو بھی نمایاں کیا گیا ہے[1]

ہندوستان میں مسلم سماج کا ارتقا جن خصوصی حالات میں ہوا ان کے پیش نظر قدرتی طور پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ علما کو سماج میں ایک غیر ضروری امتیاز حاصل ہو جائے گا۔ حالاں کہ بعض اوقات علما نے سلاطین کے مفاد[2] کے خلاف کام کیا باوجود اس کے سلطان علاؤالدین خلجی سے پہلے کوئی سلطان بھی ان کے روز افزوں اثرات کو روکنے کی جرأت نہ کر سکا۔ سلطان علاؤالدین نے علما کے فرائض کو متعین کرنے کی ضرورت محسوس کی اور انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنا دائرہ عمل سختی سے ان مقررہ حدود تک محدود رکھیں۔ یہ حدود محکمہ قضا کے فرائض انجام دینا اور خالص مذہبی معاملات میں رائے دینے تک محدود تھے[3] طاقت کا اصل سرچشمہ سلطان ہی تھا اور اگرچہ وہ کبھی کبھی صوفیا کی دل جوئی کرتا رہتا تھا لیکن وہ حکومت سختی کے ساتھ حالات کے تقاضے کے مطابق کرتا تھا اور مذہبی امور اس کے نزدیک قابلِ لحاظ

---

[1] دیکھیے تاج المآثر جلد دوم ص ۸۲-۸۳۔ مذہبی تعلیم اور خصوصاً اسلامی فقہ کے بارے میں پیغمبر اسلام سے یہ حدیث مروی ہے: "مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ تین طبقوں میں سے کسی ایک سے ضرور متعلق ہو۔ وہ فقہ کا استاد ہو یا فقہ کا طالب علم ہو یا کم از کم فقہ کی تفسیر کو توجہ سے سنتا ہو کیوں کہ جو ان تینوں میں سے کسی ایک سے بھی تعلق نہیں رکھتا وہ یقیناً عذاب کا مستحق ہے"

[2] محمد بن سام غوری اور قطب الدین ایبک کے طرز عمل کے لیے دیکھیے تاج المآثر از حسن نظامی، جلد اول ص ۵۶۔ جلد دوم ص ۱۱۸، جلد چہارم ص ۱۱۲-۲۰۳۔ بنگال کی تسخیر کے فوراً بعد ناصرالدین کے عطیات کے لیے دیکھیے راورٹی ص ۶۲۹۔ دہلی کے علما نے قتلغ خاں اور اعزالدین کی رہنمائی میں امرا کے ایک طبقے کو سلطان ناصرالدین نے زمانے میں تخت دہلی پر قبضہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ دیکھیے راورٹی ص ۷۰۹۔ سلطان بلبن ذاتی طور پر علما کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور اگر کسی عالم کا انتقال ہوتا تو اس کے جنازے میں شریک ہوتا تھا۔ اسی طرح وہ مرحوم علما کے خاندانوں کی مدد کرتا تھا۔

[3] تاریخ فرشتہ، جلد اول ص ۱۹۲

نہ تھے۔ محمد تغلق حکومت کو غیر مذہبی شکل دینے کے لیے ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے علما کو اسی سطح پر رکھا جس سطح پر دیگر سرکاری عہدے دار تھے اور ان کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ روا رکھا[1]۔ فیروز تغلق کی تخت نشینی کے بعد حالات کافی حد تک علما کے حق میں سازگار ہو گئے اور سرکاری معاملات میں مذہب کی اہمیت بڑھ گئی۔ علما نے محمد تغلق کے کئی ناکام منصوبوں کا فائدہ اٹھایا اور فیروز تغلق کو اس پر رضامند کر لیا کہ وہ سرکاری معاملات میں ان کی رائے کو اہمیت دے[2]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں۔ مذہبی مدارس اور دیگر مذہبی اداروں کو نئی زندگی ملی اور جب تیمور کا حملہ ہوا تو علما اپنا پرانا مقام اور اثر و رسوخ قائم کر چکے تھے۔ اسی دوران میں حکومت کا انتظام اس حد تک بہتر ہوا کہ علما کے اثر و رسوخ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی علاوہ چند مقابلتہً غیر اہم معاملات کے افغانوں نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد علما کے ساتھ بڑا خصوصی برتاؤ کیا لیکن انھیں انتظامِ حکومت میں موثر دخل اندازی کا موقع نہ دیا۔ اس کے برعکس انھوں نے علما کے اثر و رسوخ کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا[3]۔

اس سے پیشتر ہم کسی باب میں مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر سلطنت کے قیام کے ردِ عمل اور علما کی ان مفید خدمات کو جو انھوں نے سلطنت سے قریبی تعلق پیدا کر کے کیں،

---

[1] کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۹۴ پر دیکھیے وہ دلچسپ واقعہ جب سندھ میں چند علما پر غبن کا الزام لگایا گیا تھا اور انھیں بڑی سخت سزا دی گئی تھی۔

[2] دیکھیے برنی ص ۵۸۰۔ دیکھیے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، جلد ۱۹۔ ص ۲۸۰ فیروز تغلق نے بنگال کے علما سے کہا تھا کہ اگر وہ بنگال کے حکمران کے مقابلے میں فتح یاب ہو گیا تو وہ اپنی موجودہ تنخواہ میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

[3] دیکھیے شیر شاہ کی سبق آموز مثال جب اس نے پورن مل اور اس کے زیر کمان رائے سین کے چار ہزار جنگ جو سپاہیوں کا قتلِ عام کیا تھا حالاں کہ وہ انھیں حفاظت کے وعدے پر ان کے قلعے سے باہر لانے میں کامیاب ہوا تھا اور اس نے اس سلسلے میں قرآن کی قسم بھی کھائی تھی لیکن علما نے اس فعل کے جواز کا فتویٰ صادر کر دیا حالاں کہ یہ عمل تاریخِ ہند کا مکروہ ترین اور انتہائی قابلِ نفرت واقعہ تھا۔

بیان کرچکے ہیں ۔ان صفحات میں ہم اس تعلق کے نتیجہ میں ہونے والے اس ردِعمل کا مطالعہ کریں گے جو علما کی اخلاقی اور روحانی زندگیوں پر پڑا۔ علما کو ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور روحانی قیادت سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔اسلام اپنے ماننے والوں کے لیے ایک جامع نظامِ حیات مہیا کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس طرح اسلام میں قیادت کا مسئلہ امتِ مسلمہ میں وسیع تر اخلاقی مسئلہ سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے اور اسی لیے خاص توجہ کا مستحق ہے۔ علما مسلمانوں کو پرہیزگاری اور بھلائی کی راہ کی طرف رہنمائی کرنے سے دست بردار ہو چکے تھے۔ سلطان بلبن نے طبقۂ علما میں مجموعی طور پر راستی اور جرأت کے فقدان کی شکایت کی ہے[1] بغرا خاں کو یہ حقیقت معلوم کرکے بڑی تکلیف پہنچی کہ بے دین اور بد اعمال علما نے صرف قابلِ نفرت سونے کے لالچ میں قرآنی آیات کی غلط تاویل پیش کی۔ اور اس کے لڑکے معزالدین کیقباد کو رمضان کے فرض روزے رکھنے سے باز رکھا۔ اس نے بڑی سختی سے اپنے بیٹے کو متنبہ کیا کہ وہ ان بے دین علما پر بھروسہ نہ کرے اور ان سے دور رہے۔ ان علما کو وہ لالچی شیطان کہا کرتا تھا جن کا سب سے بڑا خدا آخرت نہیں بلکہ یہ دنیا تھی۔ اس کے برخلاف بغرا خاں نے اپنے بیٹے کو ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کی ہدایت کی جو ترکِ دنیا کر چکے ہوں[2]۔ محمد تغلق کے خیالات بھی علما کے سلسلے میں تقریباً ایسے ہی تھے۔ علما کے بارے میں سلاطین کی ان آرا کے بعد امیر خسرو کی رائے بھی ملاحظہ فرمالیں جو خود ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور بڑا کٹر اہلِ نظر تھا۔ اس کی پختہ رائے ہے کہ قاضی اسلامی قانون سے بالکل نابلد تھے اور کسی بھی ذمہ دار سرکاری عہدے پر کام کرنے کے اہل نہ تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ان لوگوں

---

[1] برنی ص ۹۴۔

[2] برنی ص ۱۵۴-۱۵۵۔ سلطان کی معقول رائے کے لیے دیکھیے سلطان محمد تغلق کی سوانح ص ۳۱۷۔ اس کی رائے میں اس کے دور کے علما قطعی طور پر مذہب سے دور تھے۔ وہ حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے بڑے بدنام تھے اور دولت کے لالچ نے انھیں بد طینت بنا دیا تھا۔ وہ خدا سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ وہ معمولی طمع پرست افراد کی حد تک گر چکے تھے۔ مختصر یہ کہ اسلام کا وقار اور مذہبی یک جہتی روئے زمین سے ختم ہو چکی تھی۔

میں نہ علم ہے اور نہ کسی طرح کی صلاحیت۔ جب کوئی ظالم سلطان برسر اقتدار ہوتا ہے تو یہ اس کی مدد کرتے ہیں۔ اپنی انفرادی زندگیوں میں یہ لوگ مذہبی احکام کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں اور بلا تامل گناہوں میں آلودہ ہونے اور اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ امیر خسرو کے خیال کے مطابق مجموعی طور پر طبقۂ علما کی امتیازی خصوصیت ریاکاری خود بینی اور خود دائی تھی۔ وہ ایک ہی جملے میں پورے حالات کی وضاحت کرتے ہوئے بلا خوف تردید اعلان کرتا ہے کہ سماج میں علما کی عزت قطعاً رسمی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ اگر سماجی وقار کا انحصار محض انسان کی ذاتی صفات پر ہے تو یہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے میں طبقۂ علما کے مقابلے میں عوام الناس ہزار درجہ بہتر تھے[۱] ملاں کا امیر خسرو کی یہ رائے جامع اور بہت سخت ہے لیکن چوں کہ یہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جس کے مفاد علما کے مفاد سے کسی طرح بھی مختلف نہ تھے اس لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

سیّد

مسلم سماج میں سیّدوں سے ایک خاص تقدس ہمیشہ وابستہ رہا ہے اور یہ تقدس شاید رسولِ کریم کے ساتھ ان کے نسلی تعلق کی وجہ سے ہے۔ مسلمان رسولِ خدا اور آپؐ کی صاحبزادی فاطمہؓ کی نسل سے تعلق رکھنے والوں کی بے حد عزت کرتے ہیں[۲] عباسیوں کے عروج

---

[۱] تفصیلی واقعات کے لیے دیکھیے مطلع الانوار ص ۵۵ - ۶۰ - ۶۹ - اس سلسلے میں دیکھیے برنی، ص ۲۹۶۔ مورخ برنی جو مذہبی علما کے اسی طبقہ سے متعلق تھا ذاتی طور پر اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے خود دوسرے علما کے ساتھ مل کر سلطان کی خواہشات کی تکمیل کے لیے قرآنی آیات کی جان بوجھ کر اپنی مرضی کے مطابق تاویل کی اور اس طرح اسلامی شعائر کی واضح خلاف ورزی کرنے میں اس کے مددگار ہوئے۔ برنی پچھتاتا ہے اور کہتا ہے "میں نہیں جانتا دوسروں کے ساتھ کیسی گزرے گی لیکن میری موجودہ تکالیف و مصائب بڑی حد تک میرے اعمال و افعال کا نتیجہ ہیں۔"

[۲] تاج المآثر از حسن نظامی۔ جلد دوم۔ سید کے لیے عوام کے احساسات۔ "اس کے آباو اجداد فخرِ یثرب و بطحیٰ (عرب کے مقدس مقامات) تھے اور یہ لوگ آرائشِ منبر اور نماز کے امام تھے۔"

اور شیعہ تحریک کی اشاعت نے سیّدوں کی اخلاقی حیثیت کو بہت بلند مقام عطا کیا ہے۔ حالاں کہ ان کی تعداد عہدِ وسطیٰ میں زیادہ نہ تھی لیکن سلطنت کی ابتدا ہی سے سیدوں کے لیے عزت کے جذبات عوام کے دلوں میں موجزن تھے۔ اپنے ملک میں منگولوں کے ہاتھوں تباہی اور غارت گری سے بچنے کے لیے بڑی تعداد میں سید ہندوستان میں آئے اور سلطان بلبن نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا[1] دوسرے سید بھی برادرانِ یوسف کی طرح دہلی کی حکومت کے ان مواقع سے استفادہ حاصل کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ ان معزز مہمانوں کو ایک ایسی سرزمین میں جہاں برہمن مذہبی پیشواؤں کو خصوصی حقوق حاصل رہے تھے اس قدر مبالغہ آمیز عزت و توقیر کا حاصل ہونا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ چوں کہ سید رسولِ خدا کی نسل سے متعلق ہوتے تھے اس لیے انھیں بہادر، سچا، متقی اور دیگر اعلیٰ صفات سے متصف سمجھا جاتا تھا۔ کسی سید کو معمولی عہدے پر فائز کرنا گناہ نہیں تو کم از کم انتہائی ناشائستگی تصور کیا جاتا تھا[2] اسی طرح یہ یقین کیا جاتا تھا کہ وہ علمِ غیب اور ما فوق الفطرت اسرار و رموز سے واقفیت رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ مغرور سلاطین ان کے روبرو عجز و انکسار میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے[3]

---

[1] برنی ص ۱۱۱

[2] دیکھیے تاریخ مبارک شاہی برائے مثال ص ۱۲-۲۱۳۔ امیر خسرو نے ایک سید سے معذرت کی۔ سادات کے لیے اس کے احساسات دیکھیے کلیاتِ خسرو ص ۴۶۳۔ برنی کی رائے ص ۲۳۹۔

[3] محمد تغلق نے خلیفہ کے جانشین یعنی مخدوم زادے کی انتہائی خوشامدانہ طریقہ سے عزت افزائی کی تھی جب وہ ہندوستان آیا تھا (برنی کی دی ہوئی تفصیلات اور تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۷۱-۲۷۲)۔ سیدوں کے لیے تیمور کی رائے بعض لحاظ سے بڑی دل چسپ ہے۔ ہندوستان پر ہونے والے حملوں کی جملہ تفصیلات کے مطابق اس نے پورے راستے میں یکساں طور پر سیدوں اور مذہبی طبقہ سے تعلق رکھنے والے دیگر جملہ افراد کی جان بخشی کی جبکہ دوسرے سب لوگوں کو بلا امتیاز اور بڑے وحشیانہ ڈھنگ سے قتل کیا۔ درحقیقت یہ بات بڑے سنجیدہ طریقے سے بیان کی گئی ہے (دیکھیے ملفوظات تیموری ص ۵) کہ جب ماوراالنہر کے ایک حاکم عبداللہ کو تیمور کی روح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے نمازِ جنازہ ادا کرنے میں تامل ہوا کیوں کہ وہ اسے بے دین وحشی تصور کرتا تھا جس کے ہاتھ انسانی خون سے رنگے ہوئے تھے تو رسولِ خدا نے بذاتِ خود خواب میں اسے بشارت دی اور اسے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تیمور کے حملے کے بعد ۱۳۹۸ء میں سید ایک قلیل عرصے کے لیے حکومت دہلی پر حکمرانی کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ بدقسمتی سے وہ اہل نہ تھے اس لیے کامیاب ثابت نہ ہوئے اور ان کا آخری حکمران خاموشی کے ساتھ حکومت سے دست بردار ہوگیا اور بڑے توہین آمیز طریقے سے بدایوں کے اقطاع پر صابر و شاکر ہوکر بیٹھ رہا لیکن سیاسی اقتدار ختم ہو جانے سے سیدوں کی سماجی توقیر پر بحیثیت مجموعی کوئی بُرا اثر نہ پڑا اور افغان جانشینوں نے حد سے زیادہ بلکہ اپنی ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے سیدوں کے خصوصی حقوق اور رعایات کو بحال رکھا[1]

دیگر مذہبی طبقات

ہم مختصر طور پر بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح بُغرا خاں نے اپنے بیٹے کو ان علما کی صحبت اختیار کرنے کی ہدایت کی جو دنیا کو ترک کر چکے ہیں۔ اسی طرح ہم سطور بالا میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارا کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اسلام کے اصل اصولوں پر زندگی گزارنا چاہتا تھا اور عموماً انھیں تصوف اور روزِ آخرت سے

(گذشتہ سے پیوستہ) بتایا کہ اس کے شبہات بے بنیاد ہیں کیوں کہ جہاں ایک طرف اس نے اللہ کی خدمت کے لیے انسانوں کا خون کیا ہے، دوسری طرف اس نے سیدوں کی زندگیوں کی حفاظت بھی کی ہے۔ مذہبی طبقہ کے لیے تیمور کے دل میں بڑی محبت تھی اور وہ عموماً روحانی زندگی کا قائل تھا۔ اسی سے متاثر ہوکر اس کے واقعہ نگار نے چند بڑی دل چسپ نقلیں کہی ہیں جو ایک عام مسلمان سلطان کے مذہبی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہیں۔ وہ گوشہ نشین اور تارک الدنیا بزرگوں کی روحانی طاقت اور ماہرین کے مذہبی مراقبے میں پورا اعتقاد رکھتا تھا اور اسی طرح سیدوں کی دعاؤں پر بھی یقین رکھتا تھا۔

[1] دیکھیے کوئل کے سید کا وہ دل چسپ واقعہ جس پر سرکاری رقم کے غبن کا الزام تھا اور اس کے خلاف بڑی مضبوط شہادتیں تھیں۔ اسے سلطان سکندر لودی کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان نے نہ صرف اسے الزام سے بری کیا بلکہ وہ رقم بھی رکھنے کی اجازت دے دی۔ واقعاتِ مشتاقی ص ۲۶۔ نیز دیکھیے سلیم شاہ سوری کے احساسات۔ اس نے ایک سید کے جوتے اٹھانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جو اس کی انتہائی عاجزی کی دلیل تھی۔ منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۹۱ - ۳۹۲

متعلق معاملات کی زیادہ فکر تھی۔ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے وہ لوگ مسلمانوں کے دلوں میں ایک مخصوص عزت و احترام پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان مسلمانوں کے لیے جملہ مادی و دنیاوی آلائشوں کے ساتھ ساتھ اصل اسلام کی طرف لوٹ جانے کی دعوت خاص دل کشی رکھتی تھی۔ ہندوستان میں ہندوؤں کے گرو کا تصور پہلے سے موجود تھا۔ یہی تصور مسلم سماج میں شیخ یا پیر کی شکل میں رائج ہوا۔ اگر کوئی تارک الدنیا اس دنیا کو حقیر سمجھ کر ترک کر دیتا تھا تو اس کی موت کے بعد اس کے لواحقین کو منفعت بخش پیشہ ہاتھ آجاتا تھا۔ علما میں روز افزوں اخلاقی انحطاط کی وجہ سے پیرزادے اور مخدوم زادے عوام کے روحانی پیشوا بن گئے۔ وہ علما کا مقام حاصل کرنے لگے اور دھیرے دھیرے اسلام میں برہمن کی سی حیثیت اختیار کرلی[۱]۔ ہندو یوگیوں اور تارک الدنیا افراد کی اہمیت بھی کم نہ تھی۔ ایک طرف مسلمان پراسرار اور غیبی طاقتوں پر اعتقاد رکھتے تھے تو دوسری طرف یوگیوں کا یہ علم قدیم روایات اور بہتر کاروباری سازوسامان سے لیس تھا۔ مسلمان صوفیا رہنمائی اور روحانی فیضان حاصل کرنے کے لیے ہندو یوگیوں، سنیاسیوں اور سادھوؤں سے میل جول رکھتے تھے لیکن عوام کے روبرو اس بات کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے تھے[۲]۔ مسلم سلاطین بھی اہم ترین خواہشات کی تکمیل کے لیے مسلم صوفیا کے ساتھ ساتھ ہندو یوگیوں کی طرف بھی رجوع کرتے تھے[۳]۔ چوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں

---

[۱] تاریخ داؤدی ص ۵۷۔ ایک افغان امیر نے ایک ہندو امیر کو بتایا کہ مسلمانوں میں شیخ زادے کو وہی رتبہ حاصل ہے جو ایک برہمن کو ہندو سماج میں حاصل ہے۔ دیکھیے واقعاتِ مشتاقی ص ۴۵۔ بہلول لودی کے چندارانے اپنے پیر کے بیٹے (پیرزادے) سے عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے اپنے سر پیش کیے اگر وہ ان پر بیٹھنا چاہے۔

[۲] دوسری کتابوں کے ساتھ ساتھ دیکھیے شیخ صدرالدین کے صحائف اور شیخ بہاؤالدین کی صحائف الطریقہ میں کچھ دل چسپ حوالہ جات۔ ہندوستان میں تصوف پر کوئی سنجیدہ تصنیف وجود میں نہیں آئی۔ مسلمان مصنفین جن کا ذہن پہلے سے ہی تصوف کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر کا حامل ہے، عموماً اس رائے سے متفق نہیں ہیں۔ (تصوفِ اسلام از عبدالماجد۔ اردو۔ اعظم گڑھ)

[۳] دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۹۹۔ جوگیوں کے بارے میں دل چسپ معلومات اور محمد تغلق کی موجودگی میں ان کے پراسرار مظاہرے۔ نیز دیکھیے میکالیف میں بابر کی گورو نانک سے ملاقات۔

کے اس باہمی تعلق کا تفصیلی ذکر یہاں بے موقع ہے اس لیے ہم اس سے گریز کرتے ہیں۔

III خدمت گار اور غلام

مسلمانوں کے سماجی طبقات کا ذکر کرتے ہوئے یہاں خدمت گاروں اور غلاموں کے اس مخصوص طبقہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ اس دور کے ہر با عزت اور شریف مسلمان گھرانے کا ضروری جز تھا اور جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے اس طبقے نے ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی میں معتدبہ اضافہ کیا۔[1] ایک مسلمان امیر کی زندگی رزم و بزم میں اس قدر تقسیم تھی کہ اسے اپنے ذاتی اور گھریلو معاملات کے لیے سوچنے کا بمشکل ہی وقت ملتا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، سماجی ضوابط کے مطابق گھریلو کام شرفا کے عزت و وقار کے منافی قرار پانے لگا۔

ان گھریلو خدمت گاروں میں اہم ترین طبقہ زنانہ اور مردانہ غلاموں پر مشتمل تھا ہندوستان میں غلام متعدد ممالک سے درآمد کیے جاتے تھے اور ان میں ترکستان اور ہندوستان کے غلام جملہ مشرقی ممالک میں ایک نمایاں شہرت رکھتے تھے۔[2] ہندوستانی نسل کے غلاموں میں آسام کے غلام زیادہ قیمتی تصور کیے جاتے تھے کیوں کہ جسمانی طور پر مضبوط اور زیادہ قوتِ برداشت کے حامل ہوتے تھے۔ اس لیے ان کی قیمت دوسری اقوام کے غلاموں کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ ہوتی تھی۔[3] ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے غلام اتنے مہنگے نہ تھے حالاں کہ بہت سے معاملات میں ان کی ہنرمندی مشہور تھی لیکن ان میں ایک بنیادی کمی یہ تھی کہ وہ اپنے قدیم معتقدات اور تہذیب سے قلبی تعلق رکھتے تھے۔[4] بیگمات حرم کی

---

[1] امرا کے مقبوضات کے سلسلے میں جلال الدین کی رائے کے لیے دیکھیے برنی ص ۱۹۲۔ دورِ علائی میں امرا دیکھیے ایضاً ص ۲۳۶۔ سپاہی فاحشہ عورتوں کے کوٹھوں پر جانے کے کتنے شوقین تھے۔ دیکھیے تاریخ داؤدی ص ۸۲

[2] کتاب الرحلہ جلد اول ص ۲۴۰

[3] ایضاً جلد دوم ص ۱۴۴

[4] ہندوستانی غلاموں کی کارکردگی کے لیے دیکھیے Notices etc ص ۲۰۰۔ ان کی خامیوں کے لیے دیکھیے امیر خسرو کی رائے۔ اعجاز خسروی جلد اول ص ۱۶۹

نگہداشت کے لیے غلاموں کا ایک مخصوص طبقہ ملازم رکھا جاتا تھا۔ ان غلاموں کو بچپن میں ہی خصّی کر دیا جاتا تھا۔ ۱۳ ویں صدی میں خواجہ سراؤں کی تجارت زوروں پر تھی۔ کبھی کبھی انھیں ملایا کے دور دراز جزائر سے بھی درآمد کیا جاتا تھا[۱]

غلام عورتیں دو طرح کی ہوتی تھیں۔ ایک وہ جنھیں گھریلو اور دیگر ذاتی خدمات کے لیے ملازم رکھا جاتا تھا، دوسرے وہ جو عیش پرستی اور رفاقت کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ اول الذکر تعلیم و تربیت سے محروم ہوتی تھیں اور بالخصوص معمولی گھریلو کاموں کے لیے خریدی جاتی تھیں اکثر ان عورتوں کے ساتھ ہر قسم کا ہتک آمیز سلوک کیا جاتا تھا[۲] دیگر غلام عورتوں کو شاہی گھرانے میں زیادہ باعزت اور بعض اوقات نمایاں حیثیت حاصل ہو جاتی تھی۔ کنیزیں ہندوستان کے علاوہ چین اور ترکستان سے بھی درآمد کی جاتی تھیں[۳]۔ مجموعی طور پر کنیزوں کا انتخاب ان خطوط پر کیا جاتا تھا جنھیں ایک مغل امیر نے بڑی خوش طبعی سے تجویز کیا تھا یعنی ایک خراسانی عورت کو اس کی قوتِ کارکردگی کے لیے خریدا جائے، ایک ہندو عورت کو بچوں کی پرورش کے لیے، ایک ایرانی عورت کو اس کی محبت سے لطف اندوز ہونے کے لیے اور ماوراالنہر کی کسی عورت کو کوڑے لگانے کے لیے خریدا جائے تاکہ بقیہ تینوں قسم کی عورتیں اس سے عبرت حاصل کریں[۴]

کچھ زمانہ گزرنے کے بعد عام لوگ غلام رکھنے لگے اور یہ رسم صرف مسلمانوں تک محدود نہ رہی۔ ہندو امرا اور سردار فوجی اور گھریلو ضروریات کے لیے غلام رکھنے لگے[۵] حتیٰ کہ دکن میں طوائفیں تک خدمت اور حاضر باشی کے لیے غلام رکھنے لگیں[۶] گذشتہ صدی

---

[۱] یول جلد دوم ص ۱۱۵ - باربوسہ جلد دوم ص ۱۴۷

[۲] امیر خسرو کی رائے کے لیے دیکھیے اعجازِ خسروی جلد چہارم ص ۳۴۴، ۱۶۹، ۱۷۰۔ فقر فیروز شاہی (قلمی نسخہ) ص ۲۷ ب

[۳] ایضاً جلد اول ص ۱۶۶-۱۶۷

[۴] بلاک مین جلد اول ص ۳۲۷

[۵] تاریخ مبارک شاہی ص ۴۵۹ - سرکار ص ۱۱۳

[۶] میجر ص ۲۹

کے اختتام تک راجپوتانہ کی دیسی ریاستوں میں غلامی کا رواج اسی طرح زوروں پر تھا جس طرح غالباً اس سے پیشتر کے ادوار میں[1]

غلاموں کی حیثیت

یہ امر عموماً تسلیم شدہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں غلاموں کے لیے کوئی واضح رتبہ یا حقوق نہ تھے لیکن یہ رائے حقائق کے خلاف معلوم ہوتی ہے نظری طور پر چوں کہ ایک غلام عموماً مذہب تبدیل کرکے اسلام قبول کر لیتا تھا اس لیے اسے وہی حق حاصل ہو جاتے تھے جو مسلم معاشرے میں کسی بھی دوسرے فرد کو حاصل تھے اس لیے کہ آج کل بھی کسی حد تک بھائی چارے اور مساوی حقوق کا احساس مسلم معاشرے میں موجود ہے۔ اس طرح ان کے ان اخلاقی حقوق کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکا[2] ہاں یہ ممکن تھا

---

[1] میواڑ میں غلاموں کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد اول ص ۲۰۷-۲۱۰۔ زرعی غلامی کے علاوہ (جسے لسائی بھی کہتے تھے اور جو کسی نہ کسی صورت سے قابلِ نجات تھی)، غلام عام طور پر گولا کے نام سے پکارے جاتے تھے (جو غالباً غلام کا مخفف تھا) اور غلاموں کو داس بھی کہتے تھے۔ گولا غلاموں کی وہ عام قسم تھی جو اپنی آزادی ختم کر چکے تھے اور داس (بہ معنی غلام حکرانِ وقت کی ناجائز اولاد ہوتی تھی جن کا حکومت میں نہ کوئی رتبہ تھا اور نہ قانونی حیثیت حالاں کہ ان کا خرچ راجہ بڑی فراخ دلی سے برداشت کرتا تھا۔ ان غلاموں کی شادیاں (دونوں گولا اور داسوں کی)، ان کے اپنے طبقے ہی میں ہوتی تھیں۔ ان کی اولاد بھی غلام ہی کہلاتی تھی اور ان کا سماجی وقار ماں کی خوبیوں پر منحصر ہوتا تھا یعنی آیا وہ راجپوتنی تھی یا مسلمان یا پست اقوام کی کوئی عورت۔ ذاتوں کے نفع یا نقصان کے باوجود غلاموں کی بھی اپنی ایک ذات ہوتی تھی اور اس سماجی کلنک میں وہ بھی حصہ دار ہوتی تھی۔ ٹوڈ کا بیان ہے کہ میواڑ میں نہ صرف ان کے ساتھ اچھا برتاؤ ہوتا تھا بلکہ اپنے آقا سرداروں کے یہاں وہ ذمہ دار عہدوں پر بھی مامور تھے۔ ان کی واضح پہچان ان کا چاندی کا وہ کڑا تھا جو وہ بائیں ٹخنے میں پہنتے تھے۔

[2] مثال کے طور پر دیکھیے یوسف گدا (تحفۂ نصائح قلمی نسخہ) ص ۱۴ب اور ذخیرۃ الملوک از شیخ ہمدانی ص ۷۷۔ دونوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ اسلام کی ابتدائی روایات کے مطابق غلاموں کے آقا کو اپنے غلاموں کے لیے کم و بیش وہی آسائش مہیا کرنی چاہیے جو وہ اپنے لیے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ ان کے یہ حقوق انھیں مکمل طور پر نہ ملے ہوں۔ اگر کوئی نسلاً ہندو اور کسی پست قوم سے متعلق ہوتا تو مذہب تبدیل کرنے کے بعد بلاشبہ اس کی سماجی عزت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اگر وہ کسی اعلیٰ قوم کا فرد ہوتا تو ہندو سماج میں اس کا رتبہ ختم ہو جاتا اور وہ اس قوم میں شرمناک ذلتیں برداشت کر کے ہی دوبارہ شامل ہو سکتا تھا۔

عملی طور پر غلام کی حیثیت بہت مختلف تھی۔ عموماً فوجی قیدی غلام بنا لیے جاتے تھے اور اس زمانے کے فوجی اصول کے مطابق اس کی زندگی اس کے گرفتار کرنے والے کے رحم و کرم پر ہوتی تھی۔ اسے پورا اختیار تھا کہ وہ اسے قتل کر دے یا اس کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے۔ کسی بھی فوجی تصادم سے پہلے یہ ضوابط دونوں فریقوں کے ذہنوں میں واضح ہوتے تھے اس لیے جب کوئی فاتح (کسی غلام کا مالک) کسی غلام کی جاں بخشی کرنے اور اسے کسی گھریلو کام پر لگانے کا فیصلہ کر لیتا تھا تو یہ اس کی خصوصی کریم النفسی اور عنایت ہوتی تھی۔ اسی طرح جب کسی فوجی قیدی کو بازار سے خرید لیا جاتا تھا تو دیگر اشیا کی طرح غلام بھی خریدنے والے کی جائداد تصور کیا جاتا تھا۔ آقا کو پورا اختیار تھا کہ وہ غلام کو تحفہ کے طور پر پیش کر دے یا اس کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے[۱]۔ کوئی بھی سمجھدار مالک یا خریدار اپنے مال کی اچھی دیکھ بھال کرنے میں لاپرواہی نہ برتتا تھا چوں کہ اس مال پر مناسب توجہ دینے کے بعد نفع کے ساتھ روپیہ وصول کیا جا سکتا تھا۔ غلام متفقہ طور پر جائداد کی حیثیت رکھتے تھے اور ایک فرمان میں اس امر کا اظہار کیا گیا

(گذشتہ سے پیوستہ) مہیا کرتا ہے۔ ہمدانی نے خصوصاً سات حقوق پر زور دیا ہے جو ایک غلام کے اپنے آقا پر واجب ہیں۔ مذہبی تعلیم پانے کا حق، مقررہ اوقات تک کام کرنے کا حق، اوقاتِ نماز میں چھٹی کا حق، باعزت برتاؤ کا حق آخر میں اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ ایسے کام کو کرنے سے منع کر دے جو خلافِ شریعت ہوں۔

[۱] جوامع الحکایات میں ص ۲۱۸ پر ایک خاص مثال دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے آقا کے گھر میں ایک غلام کی کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جسے وہ اپنا کہہ سکتا حتیٰ کہ اس کا نام یا اس کی اپنی شخصیت بھی۔ ہر چیز کا انحصار قطعی طور پر اس کے آقا پر تھا۔ تاریخ فیروز شاہی میں برنی نے محمد تغلق کے سابق غلام طرغی کے اس وقت کے احساسات بیان کیے ہیں جس وقت اس نے بغاوت کی تھی۔

ہے کہ اگر کوئی سلطان کسی غلام کو آزاد کرانا چاہتا تو اسے معقول معاوضہ ادا کرنا پڑتا تھا[١]
دیگر معاملات میں غلام کو صرف اس کے مالک ہی کی موجودگی میں سزا دی جا سکتی تھی۔ اس
کے ساتھ کوئی بھی شخص من مانا برتاؤ کرنے کا مجاز نہ تھا[٢]

ان حالات میں موجودہ دور میں صنعتی غلامی کی تعریف کو اس زمانے کے دستور سے
تعبیر کرنا مشکل ہے[٣] مثال کے طور پر اس دور کے غلام کا معیار آج کل کے عوام سے کم تر
نہ تھا۔ جیسا کہ اس سے پیش تر بیان کیا جا چکا ہے کہ اگر وہ نسلی لحاظ سے کسی ہندو پست قوم
سے متعلق رہ چکا ہوتا تو وہ قطعی طور پر ایک بہتر سماجی عزت حاصل کر لیتا تھا۔ مزید یہ کہ اگر
کوئی غلام کسی سلطان کی گھریلو زندگی میں داخل ہو جاتا تھا (جیسا کہ غلاموں کی بڑی تعداد
کے ساتھ ضروری تھا) تو وہ برائے نام ہی غلام رہتا تھا اور دیگر متعدد شاہی ملازمین
اور درباری بھی وہی خدمات انجام دیتے تھے جو اسے غلام کی حیثیت سے کرنی پڑتی تھیں۔
درحقیقت اس دور میں جب کہ آزاد انسان بھوکوں مر سکتے تھے ایک غلام کو محفوظ اور بڑی
حد تک آرام دہ زندگی میسر تھی۔ سلطان کی خدمت میں کچھ زمانہ گزارنے کے بعد عام طور پر
غلاموں کو خصی کرا دیا جاتا تھا اور انھیں باعزت مقام عطا کیا جاتا تھا اور ان کے سماجی رتبے
میں اضافہ کر دیا جاتا تھا[٤] اس دور کے سیاسی حالات اور زندگی کے عدم استحکام کی بنا
پر کبھی کبھی ذہین اور باصلاحیت غلام نہایت بلند سماجی مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو
جاتے تھے جو عام طور پر سماج کے بلند ترین اور باعزت ترین افراد کی دسترس سے باہر ہوتے تھے[٥]

---

١ جوامع الحکایات ص ١٠٥

٢ فتوحات فیروز شاہی ص ١٨٦

٣ مثال کے طور پر Nieboer نے غلام کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "غلام وہ شخص ہے جو سماجی اور سیاسی حیثیت سے دوسرے کی ملکیت ہو اور جس کا معیار عام لوگوں کے مقابلے میں کم ہو اور جسے لازمی طور پر محنت کرنی پڑتی ہو۔ دیکھیے Slavery as an Indushial System ص ٥

٤ مثال کے لیے دیکھیے فیروز تغلق کے غلام عفیف ص ٢٤٤

٥ گزشتہ صفحات میں مثالیں دی جا چکی ہیں۔ لین پول کے اندازے کے لیے دیکھیے ص ٦٤۔ گب۔ ص ٣٠

غلامی کی رسم کا رد عمل اس دور کے طور طریقوں اور نظریات پر مختلف اور دور رس اہمیت کا حامل تھا۔ نیبوئر کے خیال کے مطابق ایک ایسے سماج میں جہاں غلامی کی رسم عام ہو حکمراں طبقہ جمہوری طرز زندگی کا عادی ہو جاتا تھا۔ چونکہ وہ اپنے غلاموں پر حکم چلاتا اور جبر کرتا رہتا تھا۔ یہ حالت کسی بھی سماج کی فلاح و بہبود کے لیے مضرت رساں تھی مجموعی طور پر یہ حالات ایک طرف ایک جارح اور ظالم (ہوس پرست) اعلیٰ طبقہ کو جنم دیتے ہیں تو دوسری طرف ایک ناگوار اور انتقامی جذبہ لیے ہوئے کم تر طبقہ کو۔ اسی طرح غلامی کی ایک طویل رعایت ایک ایسے طبقے کو جنم دیتی ہے جن کی زندگی کا مقصد صرف ایسے کام ہیں جو دوسرے افراد کی شان کے خلاف ہوں اور دوسرا ایک ایسا طبقہ وجود میں آتا ہے جو وہ باتیں سوچتا ہے جن کے سوچنے کا حق دوسروں کو نہیں ہوتا۔ اس غلط طبقہ واری تقسیم کا دوسرا غلط نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسمانی محنت صرف غلاموں کے فرائض میں شامل سمجھی جاتی ہے اور اس لیے اس طرح کے کام توہین آمیز تصور کیے جاتے ہیں۔ نیبوئر نے غلامی کی رسم کے دیگر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے ظلم یا کم سے کم سختی وجود میں آتی ہے بناسب تعلیم اور صحیح تعلقات تعلقات کی کمی کی وجہ سے غلام بداخلاقی کے مرتکب ہوتے ہیں اور غلامی انسانیت کے وقار کے احساس کے نشو و نما میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے جو اخلاقی زندگی کی بنیاد ہے[1] ایک ایسے سماج کو یہ جملہ امور غیر ترقی یافتہ نقوش اور سماجی صحت مندی عطا کرتے ہیں۔ ان سماجی نتائج کا اگرچہ اس دور کی تصنیفات میں اظہار نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی سماجی نشو و نما میں نمایاں ہیں۔

IV مسلم عوام

ہندو عوام اور مسلمانوں کے پست طبقات میں فرق محسوس کرنا کسی قدر مشکل تھا ان میں زیادہ تر تعداد ان افراد کی تھی جو نسلاً ہندو تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی سماجی

---

[1] دیکھیے Nieboer کے مشاہدات اور نتائج ص ۴۳۶ فتاوائے جہاں داری از برنی ص ۴۲۔

حیثیت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ حالاں کہ اسلام قبول کرنے سے بعض حالات میں ان کی حیثیت بہتر ہو سکتی تھی۔ یہ ممکن تھا کہ سلطان مسلم عوام پر اس حد تک مہربان ہو جائے لیکن یہ ضروری نہ تھا[۱] اسلام قبول کرنے کے بعد اوسط درجے کے مسلمان کے قدیم ماحول میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی اس لیے کہ اس کے ذہن پر ذات پات کے فرق اور عام سماجی علیحدگی پسندی کے اثرات بہت گہرے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام میں دھیرے دھیرے ہندو مذہب کے وسیع تر خیالات جذب ہونے لگے۔ وہ مختلف طبقات جن سے مسلم قوم وجود میں آئی ایک ہی شہر کے مختلف حصوں میں ایک دوسرے سے بالکل غیر متعلق ہو کر رہنے لگی[۲] اس کے برخلاف غیر ملکی حکمران اور اعلیٰ طبقات کو جو عزت و وقار ملا اس کی وجہ سے غیر ملکی یا غیر ہندوستانی نسل کے مسلمانوں کو سماج میں بلند ترین مقام حاصل ہوا اور لوگ اپنا تعلق کسی غیر ملکی نسل سے انکشاف کرنے کی تلاش میں رہنے لگے[۳]

---

[۱] مثلاً تیمور نے بلا لحاظ خونریزی کی اور اسلامی عقیدہ رکھنے والے افراد کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔ سلاطین عام طور پر عوام کی مذہبی تقسیم کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ مثال کے لیے دیکھیے کلیاتِ خسرو ص ۸۸۱۔ علاؤالدین نے مسلمان قیدیوں کی جان بخشی کر دی تھی جب کہ دیگر قیدیوں کو ہاتھیوں کے پیروں تلے روندوا کر مروا دیا تھا۔

[۲] مثلاً کمندرام میں ایک نئی بستی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے گپتا ص ۹۱-۹۲۔

[۳] ہندوستان کے مسلم سماج میں موجودہ حالات کے لیے دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا، جلد دوم ص ۳۲۹۔ اسلامی تعلیمات کے جمہوری طرز کو بیان کرنے کے بعد مصنف رقمطراز ہے "ہندوستان میں بہر حال ذات پات کا رواج پوری طرح پھیل چکا ہے۔ اس کا متعدی اثر مسلمانوں میں بھی سرایت کر چکا ہے اور اس کا ارتقا بھی ہندو ذاتوں کے خطوط پر ہوا ہے۔ دونوں قوموں میں غیر ملک سے آکر بسنے والے لوگ بلند ترین سماجی رتبے کے دعوے دار ہیں۔ دونوں اقوام کے بزرگ مغربی ممالک سے آئے ہیں۔ جو مرتبہ ہندوؤں کے آرین نسل کے فرد کو حاصل ہے وہی مرتبہ مسلم عوام میں عربی، ایرانی، افغان اور مغل نسل کے مسلمانوں کو حاصل ہے اور جس طرح اعلیٰ ذاتوں کے ہندو ادنیٰ ذاتوں کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں لیکن اس کے برخلاف شادی نہیں ہو سکتی اسی طرح مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں میں ایک سید شیخ کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے لیکن اپنی لڑکی کی شادی کسی شیخ سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہندو سماج

آج کل کی طرح ہندو سماج کی نمایاں خصوصیت اس کا ذات اور ذات در ذات کا رواج تھا۔ مسلم حکومت کے قیام میں ذات پات کی رسم بڑی حد تک معاون ثابت ہوئی

دگزشتہ سے پیوستہ) نہیں کرے گا۔ اعلیٰ طبقے کے غیر ملکی Soi-disant مسلمانوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے مابین شادی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ البتہ یہ بات صرف ان علاقوں میں ممکن ہے جہاں دولت مند طبقہ کو اپنی تعداد کم ہونے کی وجہ سے شادی کا مسئلہ بہتر سے بہتر طریقہ پر حل کرنا پڑتا ہے۔ ادنیٰ طبقہ کی پیشہ ور اقوام مستقل ذاتوں کی حیثیت سے منظم ہیں۔ ان کی اپنی پنچایتیں اور عہدے دار ہیں جو حقہ پانی بند کرنے کے قدیم رواج کے ذریعہ ذاتوں کے قواعد کی پابندی کراتے ہیں دیکھیے سینارٹ کی رائے ص ۲۱۹۔ ہسٹری آف آرین رول از ہاویل ص ۱۶۲-۱۶۳۔

لہ ذات کی تعریف کے لیے دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد اول ص ۳۱۱ " ذات چند خاندانوں کے مجموعے یا خاندانوں کے گروہوں کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ ان سب کا ایک نام ہوتا ہے جو ایک خاص پیشے کی نشان دہی کرتا ہے یا اس سے متعلق ہوتا ہے۔ ایک ذات کے لوگ کسی قدیم خیالی بزرگ سے اپنا خاندانی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ وہ ایک انسان ہو یا مافوق الفطرت مخلوق۔ وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے بزرگ کا بھی یہی پیشہ تھا جو اس ذات کے لوگوں کا پیشہ ہے۔ اس ذات کے معتقد لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کی یہ ذات ہم جنس افراد پر مشتمل ہے۔ ایک ذات کے لوگ شادی بیاہ کے معاملات کو ہمیشہ اپنی ذات تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ یعنی ایک ذات کے افراد جو ایک مشترک نام سے پکارے جاتے ہیں، اس ذات سے باہر شادی نہیں کر سکتے بلکہ صرف اپنے اس دائرے تک محدود رکھتے ہیں۔ ہر ذات عام طور پر متعدد چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوتی ہے اور ہر حصہ گوت و شادی سے متعلق معاملات اپنے ہی دائرے میں محدود رکھتا ہے۔ نیز دیکھیے ایضاً جلد دوم ص ۳۰۷۔ ذات پات کے ارتقا کو بیان کرتے ہوئے مصنف کہتا ہے " اس طریقہ کار کو جس کی مدد سے مختلف ذاتوں میں منقسم افراد میں مزید تقسیم ہوئی آج بھی ان کے پورے اثرات کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں کے اعلیٰ طبقات نے اعلیٰ ہندو تہذیب کے زیر اثر اور سیلانی برہمنوں اور تارک الدنیا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کا ذکر اس سے پیشتر کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اثرات کی وجہ سے بہت سے سماجی اور قانونی پہلو ذاتوں کے اصول و ضوابط کے دائرہ عمل سے باہر نکل گئے۔ ہندوؤں میں قدیم چھتریوں یعنی حکمران طبقے کے انحطاط کے بعد برہمن کی حیثیت اور قانونی و ظاہری اختیارات میں کافی اضافہ ہوا۔ اس کے برخلاف چھتریوں کے اثرات کے کم ہو جانے کے بعد برہمن کا اقتدار اور ذاتی اثرات عوام میں بہت زیادہ بڑھ گئے۔ اس سے ذاتوں کی پابندیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اور ذاتوں کے اختیارات کے حدود کی خلیج شادی، کھانا پینا اور اسی قسم کے دیگر معاملات میں اور زیادہ وسیع ہو گئی۔

مسلمانوں کی آمد کے ابتدائی دور میں ذاتوں کی کل تعداد معین کرنا قدرے مشکل امر ہے نکولو کونٹی نے ایسے طبقات کی تعداد جو ایک دوسرے کے ساتھ خور و نوش اور شادی وغیرہ سے تعلقات نہیں رکھتے چوراسی بتائی ہے[1] ہندوستان میں ذاتوں کی تعداد کے سلسلے میں مشہور اور مروجہ روایت ۳۶ کی ہے جن میں برہمن، چھتری اور ویش کے علاوہ دوسری جداگانہ پیشہ ور ذاتیں شامل ہیں مثلاً شراب بنانے والے، سُنار، جولاہا، پان فروش، لوہار گڈریا، شیر فروش، بڑھئی، دھات کے کام کرنے والے، بھاٹ، اہیر، کائستھ، رنگریز گل فروش، چھیپی، نائی، تیلی، بازی گر، سفری دوا فروش، گویّے وغیرہ[2] یہ فہرست کسی بھی طرح مکمل نہیں کیوں کہ بعض حالات میں ایک خاص طبقہ کے افراد کے ایک خاص علاقہ

(گزشتہ سے پیوستہ) سادھوؤں کی تعلیم سے متاثر ہو کر خود کو ادنیٰ درجے کے افراد سے بالکل الگ تھلگ کر لیا۔ ہندوؤں کے رہن سہن کے طریقے کو اپنایا۔ ایک ذات کی حیثیت سے منظم ہو گئے۔ برہمنوں نے انھیں ایک خیالی نسب نامہ دے دیا اور اس طرح وہ ذات پوری ہندو قوم کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی۔ یہ سلسلہ دھیرے دھیرے صدیوں تک چلتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ادنیٰ ذاتوں کے لوگ باقی بچے جن کی حیثیت رعیت سے زیادہ نہ رہی۔

[1] میجر ص ۱۲

[2] پدماوت از ملک محمد جائسی ص ۱۵۴ - ۴۱۳

[3] بنگال کے کلینوں کے لیے دیکھیے گپتا ص ۱۲۴ - ۱۲۵

میں رہنے سے وہ ذات کی شکل اختیار کر لیتے تھے[۱] ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کی وجہ سے بالکل جداگانہ اور نئی ذاتیں وجود میں آگئیں[۲] بڑی ذاتوں میں تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں نئی ذاتیں اپنی نمایاں خصوصیات کے ساتھ وجود میں آنے لگیں۔ صرف راجپوتوں میں ہی بیس ذات در ذات موجود تھیں[۳]

ان ذاتوں کو ہندوؤں کی نسبتاً اعلیٰ ذاتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان سے کم تر درجے کے اچھوتوں کی تعداد لاکھوں تھی جو اپنی متعدد چھوٹی چھوٹی ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ حالاں کہ جنوبی ہند میں شمالی ہند کی بہ نسبت چھوت چھات کا نظریہ زیادہ شدید تھا لیکن اس نظریہ اور اعلیٰ طبقے میں اچھوتوں کے لیے احساس کا وجود شک وشبہ سے بالاتر ہے[۴] موجودہ دور کے سماجی حالات کے زیر اثر ہندوستان کی سماجی زندگی کا یہ پہلو اب قصۂ پارینہ ہو چکا ہے[۵]

---

۱ بنگال کے کلینوں کے لیے دیکھیے گپتا ص ۱۷۴-۱۷۵

۲ بنگال کے برہمنوں کی ذات در ذات تقسیم یعنی شیر خانی، پیرالی اور سری منت خانی برہمنوں کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۱۷۱-۱۷۲

۳ آئینِ اکبری جلد دوم ص ۵۶ - ۵۷

۴ راما نند کا شاگرد ہونے کے لیے کبیر کی ابتائی ہوئی ترکیب اور کبیر بیجک میں "ناپاکی" کے دیگر حوالجات کے لیے دیکھیے شاہ ص ۷۰ - ۱۱۴ - ۱۱۵۔ چیتنیہ کی ملاقات جب مراری نام کے ایک اچھوت سے ہوئی جو اپنی عاجزی کے اظہار کے لیے اپنے دانتوں میں گھاس کے دو تنکے دبائے ہوئے تھا۔ جب چیتنیہ نے اس سے ملنے کے لیے اس کی طرف قدم بڑھایا تو اس نے چلا کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا" دیو، مجھے نہ چھونا میں بڑا گنہگار ہوں اور میرا جسم چھونے کے قابل نہیں ہے۔" دیکھیے سرکار ص ۱۲۶۔ ملک محمد جائسی کے احساسات کے لیے دیکھیے پدماوت ص ۳۶۲۔ دکن میں چھوت چھات کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد دوم ص ۶۰ - ۷۰۔ وارتھیما ص ۱۴۲۔ جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۸۹۶ء میں ماہران کی دی ہوئی تفصیلات ص ۲۴۳

۵ انڈین راونڈ ٹیبل کانفرنس کے پورے اجلاس میں ادنیٰ طبقے کے نمائندے کی رائے دیکھیے ٹائمز لندن یکم دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء "ادنیٰ طبقہ کے لوگ باقی ہندوؤں سے بالکل الگ تھلگ زندگی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ذات پات کی اس رسم کی سختی کی شدت کو کم کرنے اور ہندوؤں کی قدیم اعلیٰ ذاتوں کے متعلقہ خیالات اور خصوصی حقوق میں تبدیلی لانے کے لیے متعدد سماجی اور معاشی عناصر کام کر رہے تھے۔ ان عناصر میں ایک ہندوستان میں اسلام کا تعارف بھی تھا۔ اسلامی عقیدے کی تبلیغی فطرت اور سماجی مساوات اور بھائی چارہ میں عقیدہ کی وجہ سے ہندو سماج کے ادنیٰ طبقہ کے افراد اس مذہب کو قبول کرنے لگے۔ ان طبقوں کے افراد کے اسلام قبول کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ لوگ جو اس دعوت کو پیش کر رہے تھے ہندوستان کے حکمران اور لامحدود ذرائع پر قادر تھے۔ ادنیٰ طبقے کے کچھ نومسلموں کی ایسی نمایاں مثالوں سے ہندوؤں پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ایک نومسلم کس حد تک سماجی ترقی کے منازل طے کر سکتا ہے۔ اس طرح ہندوؤں کے سامنے ایک مسئلہ یہ تھا کہ بہت سے ہندو اسلام کے روز افزوں بڑھتے ہوئے حلقے میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ ہوا کے اس بڑھتے ہوئے رخ کو روکنے کے لیے انھوں نے اونچی ذات کے نومسلموں کو ہندو مذہب میں واپس لینے کے لیے اور ان کے خصوصی اختیارات میں کچھ رعایات ملحوظ رکھیں۔[1] لیکن کافی عرصہ تک وہ لوگ اونچی ذاتوں کو کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہ ہوئے اور ادنیٰ ذاتوں کے افراد

(گزشتہ سے پیوستہ)

گزارتے ہیں۔ ہندو پجاری نہ ان کے گھر میں مذہبی رسومات ادا کرتا ہے اور نہ ہی انھیں اپنے مندر میں داخل ہونے دیتا ہے۔ ہندو نائی اس کے بال نہیں بناتا نہ ہندو دھوبی اس کے کپڑے دھوتا ہے۔ ہندو اس کے ساتھ کھانا نہیں کھاتا اور ان کے ساتھ باہمی شادی ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اچھوتوں اور غیر اچھوت ہندوؤں کے درمیان جو سماجی تقسیم ہے ایسی تقسیم دیگر کسی بھی دو اقوام میں ملنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

[1] بنگال میں نئے اصلاحی رجحان کے لیے دیکھیے Aspects of Bengal Society by Gupta جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز ص ۱۷۰۔ اصول یہ تھا کہ اگر کسی برہمن کو زبردستی اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور کیا گیا تو اسے ہندو سماج میں صرف اسی حالت میں واپس لیا جا سکتا ہے جب کہ وہ مناسب رسوم ادا کر کے کفارہ کرے کیوں کہ مصلح کا خیال تھا کہ "برہمن کا روحانی اثر ایک برہمن میں سات پشتوں تک رہتا ہے۔"

نے اپنے لیے ایک نیا فلسفۂ حیات مرتب کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان میں ایک مقبول عام غیر متعصب اور عالم گیر مذہب کی اشاعت ہونے لگی جس نے زیادہ غیر جمہوری ملکی عقائد سے روحانی فیضان حاصل کیا۔ اس نئے عقیدے کا انحصار گیان اور کرم کے قدیم عقائد کے برخلاف بھگتی یا خدا کی پرستش پر تھا۔ اس نے ذات اور آشرم کے گرد گھومنے والے زندگی کے پورے نظریے کو باطل قرار دیا[1] اس موقع پر ہمیں مذہبی ارتقا کی تاریخ سے کوئی سروکار نہیں، لیکن ذات پات کی رسم اور سماجی طور طریقوں پر بھگتی کے اس نئے عقیدے کے ردِ عمل کا اندازہ لگا لینا ضروری ہے۔ اس عقیدے کے ایک ابتدائی علم بردار نے اس عقیدے کے ماننے والوں کو نجات یافتہ یا اودیصت کے نام سے موسوم کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ کافی حد تک قدیم تعصبات کی پابندیوں سے آزاد ہو چکے تھے[2] مزید برآں مختلف طبقات کے معاشی حالات میں رد و بدل کی وجہ سے بھی سابقہ اعلیٰ اور صاحبِ اقتدار طبقات کی سماجی حیثیت میں کافی فرق پڑ چکا تھا۔ ان نئے حالات میں برہمنوں کے سابقہ خصوصی حقوق انھیں سماجی نقطۂ نظر سے کوئی خاص مفید شغل مہیا نہ کر سکے اور ان کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی[3] ان میں سے

---

[1] چیتنیہ کی رائے کے لیے دیکھیے سرکار ص ۹۸

[2] دیکھیے کار پینٹر ص ۴۲۸۔ چیتنیہ کے ایک شاگرد کی مثال کے لیے جو ذات پات کے اصولوں کے خلاف دوسروں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ دیکھیے سرکار ص ۲۱۲۔ سید می رائے کا وہ واقعہ جب بنگال کے حکمران سلطان نے اس کے منھ میں اپنے لوٹے سے پانی ڈال کر اس کی ذات خراب کر دی تھی اور بنارس کے قدامت پرست برہمنوں نے پگھلے ہوئے گھی کی آزمائشوں سے گزرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن جب سید می چیتنیہ کے پاس آیا تو انھوں نے اس سے صرف کرشن کا نام جپنے کے لیے کہا چوں کہ اس کا خیال تھا کہ کرشن کا نام ایک بار جپنے سے اس کے سارے گناہ دھل جائیں گے۔

[3] برہمن باورچی کی حیثیت سے ملازم رکھے جاتے تھے دیکھیے سرکار ص ۲۱۷۔ برہمن کی ملازمت بحیثیت نامہ بر کے دیکھیے باربوسہ جلد دوم ص ۲۷۔ برہمن کو باورچی اس لیے مقرر نہیں کیا جاتا تھا کہ کھانا پکانے کے فن میں ماہر تھے بلکہ وہ اس لیے رکھے جاتے تھے کیوں کہ قدامت پرست ہندو ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہی کھانے کے قابل سمجھتے تھے۔ دیکھیے سرکار، ص ۲۱۷

چند نے طبابت اور علم نجوم کو اپنا ذریعہ معاش بنایا لیکن مجموعی طور پر ان کی حالت خاصی خراب تھی۔ البتہ جو لوگ کسی ہندو راج کی حکومت میں منتقل ہو گئے جہاں یہ قدیم طریقہ کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا وہ کسی حد تک بہتر حالت میں رہے لیکن ہندوؤں کے پست طبقات کے وہ افراد جو سلطنت کی رعایا رہے اور جنھوں نے اسلام بھی قبول نہیں کیا بغیر کسی رکاوٹ کے رہتے تھے۔ بعض حالات میں انھوں نے کافی مادی ترقی کی جس کی وجہ سے ہندو سماج میں ان کا رتبہ بہت بلند ہو گیا[۱] بہر حال جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہندوستان میں اسلام کی آمد یہاں کی زندگی کے بنیادی حالات کے لیے کوئی حقیقی انقلاب برپا نہ کر سکی۔ اس سے یہاں کے طبقات اور ان کے متعلقہ مسائل میں ایک تبدیلی ضرور آئی لیکن ذات پات کا رواج قطعی طور پر ختم نہ ہو سکا۔ درحقیقت اسلام خود ہندوستان میں طبقہ واری تقسیم کے اس نظریہ کا شکار ہو گیا اور قرآن کے پیغام کو فراموش کر بیٹھا۔

---

[۱] دیکھیے کارپینٹر ص ۴۱۷۔ رامانند ے جو نسلاً ادنیٰ ذات سے تعلق رکھتا تھا ایک پر تکلف پالکی میں بیٹھ کر چیتنیہ سے گوداوری پر ملنے آیا۔ اس کے ہمراہ موسیقار اور سازندے بھی تھے اور ویدک برہمن بھی۔

حصہ دوم

معاشی حالات

حصہ دوم

معاشی حالات

دیہی زندگی

عمومی جائزہ: ہندوستان درحقیقت آج بھی ایک زراعتی ملک ہے۔ اس کا معاشی نظام ایک صنعتی ملک کے معاشی نظام سے بہت مختلف ہے۔[1] ہندوستان میں پیداوار کا ذریعہ زمین ہے اور زمین کی طاقت ہل کھینچنے والے جانوروں اور لکڑی کے ہل۔ دندانے دار سرادن، ہموار کرنے والے پٹڑے، ہل کی ہرس، بیج بونے کی ڈول اور کدال اور بیلچہ، آبپاشی کرنے کے متعدد حالات چند کدالوں اور پھاوڑوں اور جھیلوں پر مشتمل ہے۔ ابھی تک نہروں سے آبپاشی والی زمین کا تناسب زیادہ نہیں اس لیے فصل کا انحصار عموماً بروقت مناسب مانسونی بارش پر ہے۔[2] ہندوستان کی معاشی زندگی عام طور پر یکساں تھی علاوہ کبھی کبھی پڑنے والے

---

[1] پیشوں کی موجودہ تقسیم کے لیے دیکھیے انڈین ایر بک ۱۹۳۱ء - ص ۲۹

"اگر ہم خانہ بدوشی اور شکار کو بھی پیشوں میں شمار کریں تو زراعتی آبادی کی فی صد آبادی ۷۳ ہو جاتی ہے جب کہ مبہم اور ناقابل تقسیم پیشوں کی فہرست میں بدقسمتی سے لوگوں کی بڑی تعداد کا ایک قابل لحاظ حصہ ان محنت کش مزدوروں پر مشتمل ہے جو زراعت کے کام سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔"

[2] ۱۹۳۱ء میں پوری زراعتی زمین کے کل ۱۲.۱ فی صد حصے کی آبپاشی ہوتی تھی۔ دیکھیے ایضاً ۱۹۳۱ء

قحط، ٹڈیوں کی آفت یا جیسا کہ اس زمانے میں ہوتا رہتا تھا حملہ آوروں کے کسی دستے کے خلفشار کے علاوہ ہندوستان کی معاشی زندگی عام طور پر پرسکون ہوتی ہے۔ ان وباؤں کے بعد دیہات کی زندگی پھر ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ زندگی غیر متبدل اور غیر ترقی پذیر ہے لیکن ہے انتہائی سادہ اور مستقل۔ عام طور پر ایک نسل سے تعلق رکھنے والے اور مشترک سماجی اور مذہبی روایات کے ماننے والے افراد کا ایک پورا طبقہ چند دیہاتوں میں سکونت رکھتا ہے۔ دیہاتوں میں ایسی ایسی کئی برادریاں رہتی ہیں۔ اگر وقت پر بارش ہو جائے اور حکومت کے کارندے زیادہ سخت گیر نہ ہوں تو ہندوستانی کسان عموماً اپنی قسمت پر بالکل شاکر رہتا ہے وہ اپنی روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی کو بڑی خوش دلی سے پورا کرتا ہے اور اپنے کام میں آسودہ حالی اور قناعت کے ساتھ مصروف رہتا ہے۔ ان حالات میں مناسب موقع ملتے ہی وہ اپنی کثیر اولاد میں سے کسی ایک بچّے کی شادی کرتا ہے اور اگر اس کے ذرائع اجازت دیں تو اس تقریب میں تقریباً پوری برادری اور سب احباب کو مدعو کرتا ہے۔ اپنے خالی اوقات میں وہ گاؤں کی چوپال میں ہر دل عزیز اور عوامی گیت گا گا کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ نوجوان لوگ چوپال کے کسی ایک کونے میں جمع ہو کر اپنی پسندیدہ بھوت پریت کی اور دیگر کہانیاں کہتے ہیں۔ ناسازگار حالات میں کسان مرد اور خصوصاً عورتیں دیوتاؤں، خداؤں، اپنے آباؤ اجداد کی روحوں اور مشہور بزرگوں کی طرف بہ کثرت رجوع کرتی ہیں اور اپنی دعاؤں اور چڑھاوے کے ردّعمل کے طور پر باچشمِ نم بارش کا انتظار کرتی ہیں۔ بدترین اور ناگفتہ بہ حالات میں وہ قسمت کی زبردست ناقابلِ مزاحمت قوت پر شاکر ہو جاتے ہیں اور بدقسمتی اور مصائب کو انتہائی صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ جہاں تک ان کی خواہشات کے پورا ہونے کا تعلق ہے زندگی ان کے لیے کوئی خاص کشش نہیں رکھتی۔ ہندوستان کے کسان کی زندگی انھیں خطوط پر نامعلوم صدیوں سے گزرتی چلی آرہی ہے۔

ان حالات کے زیرِ اثر جو طرزِ فکر اور ذہنی کیفیت پیدا ہوئی اس نے ہندوستان کی دیہی برادری کی زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا۔ اس کے سیاسی پہلو پر ہم گذشتہ باب میں بحث کر چکے ہیں۔ معاشی لحاظ سے دیہات ایک خود کفیل اکائی ہوتا ہے اور اس کا معاشی نظام بہت مکمل اور ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ منظم بایں معنی کہ اپنے افراد کی خواہشات پوری کرنے اور ضروریات مہیا کرنے میں وہ لوگ پوری برادری کے ساتھ متحد ہو کر کام کرتے ہیں۔

درحقیقت اگر ہندوستان کی کسی دیہاتی برادری کو باقی دنیا سے بالکل علیحدہ کردیا جائے (جیسا کہ اکثر حالات میں نفسیاتی طور پر ہوتا ہے) تو اس کا معاشی نظام کم وبیش اس علیحدگی سے متاثر نہیں ہوگا۔ دیہی برادری کی ایک نمایاں خصوصیت اس کے مختلف طبقات کے کارکنوں کے خصوصی کاموں کا باہمی ربط ہے۔ ہر فرد کے ذمّہ ایک مخصوص کام ہوتا ہے اور وہ درحقیقت پیدا ہوتے ہی اس کام کو دیکھتا ہے اور اس کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دیہات کے متعدد سماجی طبقات میں کسان زمین پر کاشت کرکے فصل پیدا کرتا ہے جس سے وہ گاؤں کی پوری آبادی کے لیے خوراک مہیا کرسکے۔ باقی افراد ثانوی حیثیت سے اس کے کام میں معاون ہوتے ہیں۔ عورتیں کھیت پر مختلف کاموں میں کسان کی مدد کرتی ہیں اور جانوروں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ بڑھئی ہل اور لکڑی کا دیگر سامان تیار کرتا ہے اور اس کی مرمت کرتا ہے۔ لکڑی خود کسان مہیا کرتا ہے اور لوہار کھیتی کی ضرورت کے لوہے کے مختلف اوزار مہیا کرتا ہے اور ضرورت پڑنے پر ان کی مرمت کرتا ہے۔ کمہار گھریلو ضرورت کے برتن بناتا ہے۔ ہل کی جوت اور جوتے بنانا اور ان کی مرمت موچی کے فرائض میں شامل ہے۔ درحقیقت اس تعمیری کام میں ہر ایک کا اپنا ایک حصّہ ہوتا ہے یعنی دھوبی، نائی، گوالہ، شیر فروش، سقہ، خاکروب حتیٰ کہ فقیر، پجاری، منجم اور مقبول عام ڈاکٹر اور جادوگر۔ مزید براں کھیت کی پیداوار سے ہی دیہاتی صنعتوں کو کچا مال مہیا کیا جاتا ہے مثلاً رسّی اور ٹوکری بنانا اور چھپی، خوشبو اور تیل کی صنعت۔ کھیتی کی پیداوار بہت سے دست کاروں کو روزگار مہیا کرتی ہے جیسے جولاہے، موچی رنگریز، لکڑی کا کام کرنے والے اور چھیپی۔ ایک طبقہ دیہی پیداوار کو خرید کر اس کے بدلے میں ضروریاتِ زندگی کی مختلف اشیا مہیا کرتا ہے۔ گاؤں کے کسی ایک حصّے میں ایک چھوٹا سا دیہی بازار ہوتا ہے جہاں چھوٹے چھوٹے دکاندار اناج، کپڑا، مٹھائی اور دیگر ضروریات زندگی فروخت کرتے ہیں۔ کہیں کہیں دیہی بازار میں صراف ہوتا ہے جو تانبے اور کوڑیوں کے بدلے میں چاندی دیتا ہے اور اس تبادلے میں کچھ نہ کچھ کما لیتا ہے۔ کبھی کبھی صراف کسی سکے کی دھات کو پرکھنے کے لیے دیہاتی سنار کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ زیادہ مقدار میں سونا خریدنے کے لیے ایسی چیزوں کے لیے جنھیں اشیائے تعیش کہا جا سکتا ہے مثلاً تانبے اور ملی جلی دھات کے برتن، شیشے کے اور مصنوعی چمک دمک کے زیورات اور بچوں کے کھلونوں وغیرہ کے لیے بھی کسان ایک طویل اور مقررہ وقفہ کے بعد لگنے والے میلوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔

ہندوستانی دیہاتوں کے اپنے سیاست داں اور حتیٰ کہ مدبر بھی ہوتے ہیں۔ چوپال میں انفرادی جھگڑے اور برادری کے معاملات طے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ بڑی سنجیدگی سے دیہاتی دکان دار کے مالِ تجارت کے خطرات پر غور کرتے ہیں اور یونانی خطیب ڈیموس تھینیس کی طرح بڑے دعوے سے اپنے سیاسی نظریات بیان کرتے ہیں[۱] لیکن اپنے دیہات یا آس پاس کے مخصوص دیہاتوں کے علاوہ بیرونی دنیا ان کے لیے ایک بڑے راز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہے ہندوستانی دیہاتوں کا ایک ڈھانچہ جو نئی اقتصادی قوتوں کے مقابلے میں تیزی کے ساتھ کمزور ہوتا جا رہا ہے[۲]

زیرِ مطالعہ دور میں کسی دیہات کی آبادی اپنی مکمل کارکردگی کے ساتھ ایک ادارے کی حیثیت رکھتی تھی اور ہندوستان کی وسیع آبادی کے اقتصادی نظریات کے تعین کا دار و مدار اسی پر تھا۔ اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہ مقامی ضروریات پوری کرنے کے لیے اشیاء پیدا کرتا تھا۔ بڑے پیمانے کی صنعتیں چند خاص ایسے مقامات تک محدود تھیں جو کشتی رانی کے قابل دریاؤں کے کنارے واقع تھے اور جن کے ذریعہ کچے مال کو آسانی کے ساتھ درآمد کیا جا سکتا تھا یا ایسے مقامات پر تھیں جہاں ان صنعتوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی مقدار میں کچا مال مل سکے۔ دوسرے صوبوں کے چند اندرونِ ملک مرکزوں کے علاوہ جہازوں کی آمد و رفت کی سہولت کے پیشِ نظر بنگال اور گجرات خاص صنعتی صوبے تھے۔ ان صوبوں میں چند صنعتیں بھی تھیں اور یہیں سے اندرونِ ملک کے دوسرے حصوں کا بچا ہوا تیار مال اکٹھا کر کے غیر ممالک کو برآمد کیا جاتا تھا۔ اس طرح آبادی کی اکثریت کاشت کاری میں مصروف تھی۔ بہت تھوڑی تعداد میں لوگ تجارت اور صنعت کی طرف راغب تھے اور چند ہی دولت مند افراد غیر ممالک سے تجارت کرتے تھے[۳] اس سے چند ایسے بڑے

---

[۱] اعجازِ خسروی جلد سوم ص ۴۹۔ دیہاتی دکان داروں کی دولت مندی کے سلسلے میں ایک قدیم بنگالی شاعر اور مصنف کی رائے "وہ خرید و فروخت کرتے رہتے ہیں اور اسی میں عوام کی دولت اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں" ص ۱۵۸۔

[۲] دیہات کی تنظیم کی تفصیلات دیکھیے انڈین ایریک جلد چہارم ص ۲۸۰-۲۸۱۔ نیز گپتا ص ۱۶۳

[۳] ماہران کے بنگال میں شاہدات۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۸۹۵ء ص ۵۳۰۔

قصبات میں شہری زندگی کی بنیاد پڑی جو مقامی یا صوبائی انتظامی مرکز بن گئے۔ قصبات عموماً چاروں طرف دیواروں سے محصور اور محفوظ تھے اور عدم تحفظ اور خطرے کے مواقع پر قریبی آبادی کے لیے پناہ گاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ امن کے زمانے میں یہ قصبات کاشت کی پیداوار اور صنعتی سامان کی تقسیم کے مرکز تھے۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ قصبات ذہنی اور سماجی ترقی کے مرکز تھے لیکن عام طور پر لوگوں کے مادی نظریہ کو بدلنے کے لیے ان کی معاشی اہمیت زیادہ نہ تھی[1]۔

ملک کی انتظامیہ بھی لوگوں کی معاشی زندگی میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ کسان کی خون پسینے کی کمائی میں بھی حصہ دار تھی اور چھوٹے پیمانے پر صنعتی کاروبار بھی کرتی تھی۔ اس کے بدلے میں انتظامیہ کاشتکاروں کی حفاظت کرتی تھی اور ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں مال پہنچانے کے لیے کچھ سہولتیں بھی فراہم کرتی تھی۔ مجموعی طور پر کھیتی کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے کوئی خاص اصلاح کرنے، دولت کی مساوی تقسیم کے لیے کوئی اہم قدم اٹھانے یا مختلف سماجی طبقات کی معاشی حالت میں بہتر ہم آہنگی پیدا کرنے کے مسائل حکومت کی پالیسی میں شامل نہ تھے۔ اس کے برخلاف جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے حکومت عوام کے پست معیارِ زندگی کو برقرار رکھنے ہی میں زیادہ خوش تھی۔ سماج کے معاشی ڈھانچے کی حدود کا انحصار اس کی قوتِ پیداوار پر منحصر تھا۔ اس سماجی ڈھانچہ میں طبقہ واری تقسیم تھی، آمدنی کی تقسیم غیر مساوی تھی۔ کھیتوں میں کام کرتے والے طبقہ کا سماجی مرتبہ عام طور پر بلند نہ تھا۔ لیکن ان جملہ سماجی عناصر کو اس معاشی ڈھانچے میں ترتیب دے لیا گیا تھا۔ اسی معاشی ڈھانچے میں کلچر اور فن کی نشوونما ہوئی جسے سیاسی فلاسفہ اور سماجی مفکرین اب بھی پسند کرتے ہیں۔ نہ کوئی معاشی انقلاب آیا اور نہ کوئی اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ زمین لا محدود تھی۔ اس میں بے شمار خزانے اور ذرائع پوشیدہ تھے۔ مجموعی طور پر

---

[1] ہندوستان کی شہری اور دیہی آبادی میں تناسب ۶۹ ۸۹۰۰ ۲ ۶ ۱۰ کے لیے دیکھیے انڈین ایربک ۱۹۳۱ء "پچھلے تیس سال میں ہندوستان میں شہروں کے سلسلے میں بہت کم ترقی ہوئی ہے۔ یہ تمام ترقی ایک فی صدی سے بھی کم رہی ہے۔" انڈین ایربک ص ۲۱ - ایضاً۔

حکمران طبقے کی بالادستی منوانے اور زائد وصولیابی میں حکومت کے ارکان کو خاصی زحمت اٹھانی پڑتی تھی۔ دلچسپی کا کوئی مقررہ معیار نہ تھا جس کی وجہ سے حکمران طبقے کے لیے حالات زیادہ سازگار تھے۔

(۱) زرعی پیداوار : تقریباً کل زراعت زمین پر ہوتی تھی جس سے انسانوں کے لیے خوراک اور جانوروں کے لیے چارہ مہیا ہوتا تھا[۱] یہ بتانا مشکل ہے کہ اوسط درجے کے کھیتوں کی وسعت کیا ہوتی تھی اور آبادی کا کتنا حصہ زراعت میں لگا ہوا تھا۔ اندازاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ گھریلو کام اور دستکاری میں مصروف افراد کے علاوہ پوری آبادی زراعت میں لگی رہتی تھی۔ اس زمانے کے زراعت کے طریقے کے سلسلے میں تفصیلات تو نہیں ملتیں لیکن غالباً اس دور میں زراعت کے زراعتی طریقوں سے کچھ مختلف نہ تھی[۲] تمباکو، چائے قہوہ، سن وغیرہ کی فصلوں کے علاوہ جو نئے دور کی فصلیں ہیں مجموعی طور پر اس زمانے کی زرعی پیداوار کچھ مختلف نہ رہی ہوگی۔ بہرحال اندازہ یہ ہے کہ ادویاتی جڑی بوٹیاں، گرم مسالے

---

[۱] سنگھاڑے سالک۔ کمس اور کسیرو کی فصل پانی کی سطح پر اگائی جاتی ہیں اور غالباً ان کا وجود اکبر سے پہلے بھی تھا اور اس کے زمانے میں بھی۔ زمینی فصلوں کے مقابلے میں ان کا تناسب برائے نام تھا۔ دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول ص ۷۹۔ ۸۰۔ جلد دوم ص ۶

[۲] دیکھیے کلیاتِ خسرو ص ۷۰۹۔ جہاں وہ سرسری طور پر ہندوستانی کسانوں کی مہارت اور سادگی کا ذکر کرتا ہے لیکن تفصیلات وحالات نہیں بتاتا۔ بنگال میں میگنا دریا پر ایرانی رہٹ کے استعمال کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۴۵۔ ۱۳ ویں صدی میں سمرقند میں ایرانی رہٹ کے استعمال کی ایسی ہی مثال دیکھیے Bretschneider جلد اول ص ۷۶۔ اودھ میں ان کا استعمال رہٹ کے نام سے جس کا ذکر ملک محمد جائسی نے کیا ہے۔ پدماوت ص ۵۲۔ مفصل جائزے کے لیے دیکھیے بابر کی دی ہوئی تفصیلات بابرنامہ ص ۴۸۹۔ ۴۸۶۔ ۴۵۰۔ اس نے لاہور، دیپالپور اور سرہند اور اس کے قرب وجوار میں رہٹ کے استعمال کا ذکر کیا ہے جسے بیل کھینچتے تھے اور پانی کی مستقل فراہمی کے لیے ایک اور چیز کا ذکر ہے جسے آج کل ڈھینکلی کہتے ہیں۔ ڈھینکلی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے امپیریل گزیٹیر آف انڈیا۔ جلد XXI ص ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ہندوستان کے دیگر حصوں میں اسی قسم کے انتظامات کے لیے دیکھیے میکاعت جلد اول ص ۲۲۔

اور خوشبودار لکڑی بڑی مقدار میں پیدا کی جاتی تھی اور ملک اور بیرونِ ملک میں فروخت ہوتی تھی۔ دالیں، گندم، باجرہ، جو، مٹر، چاول، تلی اور تیل کے بیج، گنّا اور کپاس مخصوص فصلیں تھیں[۱] کڑا اور مانک پور (الہ آباد کے قریب) کے قرب و جوار کا علاقہ غیر معمولی زرخیز تصور کیا جاتا تھا اور اس علاقے میں عمدہ قسم کا چاول، گنّا اور گیہوں پیدا ہوتا تھا جو بڑی مقدار میں دہلی کو برآمد کیا جاتا تھا[۲] فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں نہروں سے آبپاشی کی ابتدا ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حصار اور فیروز آباد کے گردو نواح کے علاقے میں دالوں اور تیل کی کاشت میں اضافہ ہوا اور گندم اور گنّے کی پیداوار بڑھ گئی[۳] دیگر عمدہ فصلوں میں سرسوتی کا چاول اپنی اعلیٰ خوبیوں کے لیے مشہور اور دہلی کے بازار میں بڑا مقبول تھا[۴] عام طور پر اناج کا ذخیرہ کھتیوں میں جمع کر لیا جاتا تھا جہاں وہ طویل عرصہ تک محفوظ رہ سکتا تھا[۵]

---

[۱] روئی کی پیداوار کے سلسلے میں دیکھیے ایک بہت بڑے کپاس کے پودے کی کیفیت (دیوکپاس) جو لمبائی میں پورے چھ قدم کے برابر ہوتا تھا اور جس کی عمر بیس سال ہوتی تھی۔ بارہ سال تک درخت سے اچھی روئی حاصل ہوتی تھی۔ دیکھیے یول جلد دوم ص ۳۹۲ اور حوالہ۔ اکبر کے زمانے میں تمباکو نوشی کی ابتدا کے لیے دیکھیے وقائع اسد خاں جو جہانگیر کے دور میں لکھے گئے۔

[۲] کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۴

[۳] برنی ص ۵۶۸

[۴] کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۴

[۵] کھتی کے بیان کے لیے دیکھیے اعجاز خسروی جلد پنجم ص ۶۶ نیز دیکھیے ٹوڈ جلد سوم ص ۱۶۱۳ "یہ گڑھے بلند خشک چبوتروں پر واقع ہیں۔ ان کی وسعت مٹی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ انھیں تیار کرنے کے لیے پہلے وہاں چند سبزیوں کے مغز جلا کر راکھ کرتے ہیں اور اس کے کناروں پر نیز نیچے فرش پر گیہوں یا جَو کی جڑیں بچھاتے ہیں۔ اس کے بعد اناج کو گڑھے میں رکھ دیتے ہیں۔ اس کے اوپر بھوسا ڈال دیتے ہیں اور ایک مٹی کا چبوترا جس کی لمبائی تقریباً ۱۸ انچ ہوتی ہے اس کے دروازے کے سامنے بنتا ہے لیکن وہ گڑھے کے منھ سے کچھ اوپر بنتا ہے۔ اس کے اوپر مٹی میں گائے کا گوبر ملا کر لیپتے ہیں جو بارش سے بھی حفاظت کرتا ہے اور بارش گزرنے کے بعد پھر لیپا جاتا ہے۔ اس طرح بغیر کسی خرابی کے اناج اس کھتی میں کئی کئی سال رہ سکتا ہے۔ حدت جو تحلیل ہوتی رہتی ہے اس میں جراثیم نہیں پیدا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

گنگا کے میدانی علاقہ کے پھلوں میں آم خصوصاً مقبول تھا اور اولین اہمیت کا حامل تھا۔ اسے اسلامی ممالک کے خربوزوں پر بھی ترجیح دی جاتی تھی[۱] باوجود اس کے بابر ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ملک کے خربوزوں کی بڑی تعریف کرتا ہے جنھیں وہ کبھی فراموش نہ کرسکا۔ اس نے کابل کے بہترین خربوزوں کے چند پودے ہندوستان لاکر اپنے آگرے کے باغ میں لگوائے تھے[۲] لیکن ان خربوزوں کی زیادہ کاشت نہ ہوسکی اس لیے کہ بابر کے چند سال کے بعد ان کی کاشت کچھ بڑے پیمانے پر نہ تھی[۳] دوسرے پھلوں کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے انگور، کھجور، انار، کیلا، دیسی خربوزے، آڑو، سیب، سنترے، انجیر، لیموں کرنا، جھونک، کھرنی، جامن، کٹھل اور دیگر متعدد پھلوں کی اچھی کاشت ہوتی تھی[۴] ناریل ساحلی علاقوں میں کافی تعداد میں پیدا ہوتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے سلاطین دہلی اور دیگر حکمرانوں نے ہندوستانی پھلوں کی اقسام اور ان کی کاشت کے طریقوں کو مجموعی طور پر بہتر بنانے کی کوشش کی۔ فیروز تغلق نے بڑے پیمانے پر باغات لگانے کا منصوبہ بنایا جن میں مندرجہ بالا پھلوں کی بہتر اقسام پیدا کی گئیں[۵] اس کے واقعہ نگار کے بیان کے مطابق اس نے دہلی کے قرب وجوار میں ۱۲۰۰ باغ لگائے

(گذشتہ سے پیوستہ) ہونے دیتی اور اناج کو چوہوں اور دیمک سے بچاتی ہے۔ مسالک الابصار کے مصنف کا بیان ہے کہ طویل عرصے تک اناج کھتی میں پڑے رہنے سے اس کے رنگ میں تبدیلی آگئی تھی۔

[۱] دیکھیے امیر خسرو کی رائے قران السعدین ص ۱۶۶ - ۱۶۷ - آم کی فوقیت کی تصدیق میں پیغمبر کی ایک حدیث کی دلچسپ دریافت کے لیے دیکھیے واقعات مشتاقی ص ۴۷۔

[۲] بابرنامہ ص ۳۵۷

[۳] حاجی دبیر کا بیان ہے کہ اسے دہلی میں کچھ خربوزے مہیا کیے گئے تھے لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ دیسی نہ تھے۔ ظفرالوالہ جلد دوم ص ۷۷۰

[۴] دیکھیے برنی اور عفیف کا بیان۔ برنی ص ۵۶۹، ۵۷۰ - عفیف ص ۱۲۸۔ نیز خسرو کے بیان کے لیے قران السعدین ص ۱۶۶ - ۱۶۷

[۵] نیز ان بہتر اقسام خصوصاً انگوروں کی سات بہتر اقسام کے لیے دیکھیے عفیف ص ۲۹۵ - ۲۹۶۔

۸۰ سالورا بند پر اور ۴۴ چتوڑ میں[1] باغات لگانے کی اس روایت کو راجپوتانہ میں نہ صرف برقرار ہی رکھا گیا بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوا۔ چتوڑ، دھولپور، گوالیار اور جودھپور کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی باغبانی کے بہتر اور ترقی یافتہ طریقوں کو اپنایا گیا۔ خصوصاً دھولپور میں شہر کے راستے پر، گروہ (تقریباً ۱۴ میل تک) سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے[2] جودھپور میں اناج کی پیداوار پر خاص توجہ دی گئی اور لودی سلطان سکندر نے بڑے یقین سے دعویٰ کیا کہ ایران میں ایسا انار نہیں پیدا کیا جا سکا جو ذائقہ میں جودھپور کے انار کا مقابلہ کر سکے[3]

پھولوں کی پرداخت ہندوستان میں بہت قدیم زمانے سے ہوئی ہے۔ ہندوستان کے پھول اپنی خوب صورتی، خوشبو اور مختلف اقسام میں ممتاز رہے ہیں۔ ان میں تلسی اور گیندا کسی حد تک مقدس تصور کیے جاتے ہیں چوں کہ ان کا تعلق مختلف مذہبی عبادات اور نذر قربانی سے ہے۔ ہندوؤں میں پھولوں کو تحفہ کے طور پر پیش کرنے کا عام رواج تھا۔ مخصوص سماجی مواقع پر گھریلو تقریبات پر پھول یا پھلوں کا ہار پیش کرنے کا عام رواج تھا مثال کے طور پر نئے شادی شدہ جوڑے کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ خود جوڑا یا ان کا بستر پھولوں کے ہاروں سے خالی ہوگا۔ سرزمینِ ہند کے پھولوں کا ذکر امیر خسرو اور ملک محمد جائسی کی تصنیفات میں پورے ابواب پر مشتمل ہے۔ ہم پھولوں کا ذکر اپنے اس مقالہ کے آخر میں کریں گے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بابر نے علاوہ ایک گلاب کے جو اس نے اپنے آگرے کے باغ میں لگایا تھا ہندوستان کے پھولوں کی اقسام کو بہتر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی[4]

---

[1] عفیف

[2] ملک محمد جائسی کے زمانے میں چتوڑ کے پھلوں کے لیے دیکھیے پدماوت ص ۴۱۹-۴۲۰ سکندر لودی کے سپاہیوں کے ہاتھوں جودھپور کے باغات کی تباہی کے لیے دیکھیے طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۶۴

[3] تاریخ داؤدی کے لیے دیکھیے قلمی نسخہ ص ۴۵۔ امیر خسرو نے ایک مسکراتے ہوئے انار کا ذکر کیا ہے دیکھیے اعجازِ خسروی جلد چہارم ص ۳۳۰

[4] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۹۱

اس سلسلے میں ہندوستان میں پیدا کی جانے والی صندل اور عود کی خوشبودار لکڑی کا ذکر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ عود کی مخصوص قسم کی لکڑی کے لیے آسام خاص طور پر مشہور تھا جو نذر چڑھانے کے لیے ملک کے چند مشہور ترین مناور میں بھیجی جاتی تھی۔ بغرا خاں نے جب اپنے بیٹے سلطان معزالدین کیقباد کو کچھ تحائف روانہ کیے تو ان میں عود کی لکڑی بھی شامل تھی[1]۔ اسی طرح چند ایسی ادویاتی جڑی بوٹیوں کی کاشت بھی ہندوستان میں کی جاتی تھی جو زہر کے تریاق اور سانپ کے کاٹنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں[2]۔ گرم مسالوں میں کالی مرچ اور ادرک وغیرہ کی کاشت گجرات کے کچھ حصّوں میں بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی[3]۔

گھریلو جانوروں، درندوں اور پرندوں کا شمار مشکل ہے اس لیے کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس زمانے میں نہ آج کل کی طرح ذرائع آمد و رفت بہت اچھے تھے اور نہ راستے محفوظ تھے۔ ایسی حالت میں گھریلو اور جنگل کے جانوروں کی زندگی کے مناظر کا تصور سہل ہے۔ البتہ آج کل محفوظ اور بہتر ذرائع آمد و رفت کی وجہ سے ان کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے۔ افریقہ اور آسٹریلیا کے بعد ہندوستان اب بھی ان چند ممالک میں سے ایک ہے جہاں مختلف قسم کے جنگلی جانور بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ان جانوروں میں جو اب نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں گینڈا، شکاری باز اور شیر قابلِ ذکر ہیں۔

(۲) **دیہی اور گھریلو صنعتیں:** زرعی پیداوار کی بنیاد پر دیہاتوں میں متعدد صنعتیں اور دست کاریاں چھوٹے پیمانے پر چل رہی تھیں۔ ان صنعتوں کے چلانے والے کاریگر پشت در پشت اس کام کو کرتے آئے تھے۔ ان میں استعمال ہونے والے اوزار اور طریقہ دونوں بھدّے تھے۔ پیداوار کم ہوتی تھی لیکن متعدد پشتوں کی اس مخصوص مصروفیت، قابلیت اور مہارت کی موروثی روایات کی وجہ سے اعلیٰ درجے کی اشیا تیار کی جاتی تھیں اور ان کی نفی قدر و قیمت بھی زیادہ ہوتی تھی۔ دیہاتی کاریگر اپنے سماجی مرتبے اور محدود ذرائع کی وجہ

---

[1] قران السعدین ص ۱۰۱

[2] مثال کے طور پر دیکھیے مخلص۔ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد دوم ص ۲۳۹

[3] دیکھیے یول۔ جلد دوم ص ۳۹۲

سے ایک خاص حد سے آگے ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ عمالِ حکومت کے ظلم وستم سے انھیں کوئی بچانے والا نہ تھا[۱] یہ ممکن ہے کہ مسلمان کاریگروں کے آنے سے مجموعی طور پر اس طبقہ کی سماجی معذوریاں کسی حد تک دور ہو گئی ہوں لیکن دھیرے دھیرے مسلمانوں کے اثرات ان قدیم روایات سے شکست کھا گئے۔ بابر کے ہندوستان آنے سے پہلے ان کاریگروں کے سماجی رتبے میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہ ہوئی تھی اس لیے کہ اس وقت تمام کاری گر بڑی کٹر اور جداگانہ ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے[۲]

کاشت کی پیداوار پر مشتمل مصنوعات گڑ، خوشبو اور شراب تھے۔ گڑ کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ خوشبوؤں اور خوشبودار عرق کی صنعتیں ایسے مقامات پر تھیں جہاں اس صنعت کی ترقی کے لیے آسانیاں فراہم تھیں۔ مثال کے طور پر عطر فروشوں کی بڑی تعداد بنگال میں تھی اور انھیں گندھ بانک کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا[۳] احباب کی محفلوں اور سماجی تقریبات کے مواقع پر خنکی اور تازگی پیدا کرنے کے لیے عرقِ گلاب چھڑکا جاتا تھا۔ دیگر خوشبوؤں کے علاوہ ملک محمد جائسی خاص طور پر دو قسم کی تیز خوشبوؤں یا عطریات یعنی میدہ اور چوائی کا ذکر کرتا ہے لیکن ان کی اقسام کے بارے میں کوئی خاص بات واضح نہیں ہوتی[۴]

ہندوستان میں شراب اور اسپرٹ کی صنعت بہت قدیم ہے۔ قدیم زمانے ہی سے کچی شکر، مہوا، جو اور چاول سے Bear (جَو کی شراب) کشید کی جاتی تھی[۵] امیر خسرو

---

[۱] دہلی کے تیلیوں (تیل نکالنے والوں) سے متعلق جابرانہ قوانین کے لیے دیکھیے اعجازِ خسروی جلد دوم ص ۱۹-۲۰۔ نیز بنگال کی بیر نام کی نوآبادی میں پان فروشوں کی حالت کے لیے جو ظلم برداشت کرتے رہے اور مزاحمت نہ کر سکے بلکہ صرف دہائی دیتے رہے دیکھیے گپتا ص ۱۵۸

[۲] نیز دیکھیے پدماوت ص ۱۹۔ میکالف جلد اول ص ۲۸۴۔ کلیاتِ خسرو ص ۴۴۰

[۳] گپتا ص ۱۶۳

[۴] پدماوت (ہندی) ص ۱۴۳۔ تاج المآثر (دوم) ص ۱۲۴ قطب الدین ایبک نے محمد بن سام غوری کو ایک ہاتھی پر لاد کر مختلف قسم کے سرخ اور سفید پھول اور کئی قسم کے عطر تحفۃً پیش کیے تھے جن کی خوشبو جنت کے باغات سے بھی زیادہ اچھی تھی۔"

[۵] جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۹۰۶ء میں بے۔ سی۔ رے کا مضمون Hindu Method of Manufacturing Spirit

کے خیال کے مطابق گنّے سے بھی بہت سی مشروبات تیار کی جاتی تھیں[1] مشروبات کی دیگر اقسام کھجور اور ناریل کے عرق سے تیار ہوتی تھیں[2] بنگال میں جہاں تیز مشروبات کی تقریباً تمام اقسام تیار کی جاتی تھیں شراب کھلے بازار میں فروخت ہوتی تھی[3]

دیگر اہم مصنوعات میں کئی طرح کے تیلوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو گھان (یعنی تیل کا کولھو) کے عام طریقے سے نکالے جاتے تھے۔ یہی طریقہ آج کل بھی رائج ہے[4]

گھریلو صنعتوں میں بننے اور کاتنے کی صنعت کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ کاتنے اور بننے کے متعدد طریقے تقریباً وہی تھے جو ہندوستان کے دیہات میں آج کل بھی رائج ہیں[5] تیار تھان ناپ اور تول کر دونوں طرح سے فروخت کیا جاتا تھا۔ اسے قیمتاً بھی فروخت کیا جا سکتا تھا اور دیگر اشیا کے تبادلے میں بھی۔ دوسری چھوٹی صنعتوں میں ٹوپی بنانا، جوتا بنانا، ہر قسم کے ہتھیار بنانا خصوصاً تیر اور کمان شامل تھے۔ اچھے قسم کے کمان بنانے والے ریشم کی ڈوری تانت کی جگہ استعمال کرتے تھے۔ تیروں کے بید اور تیر کی نوک کے لیے لوہا استعمال ہوتا تھا۔ لوہاروں کی زندگی بڑی مصروف تھی۔ یہ لوگ بڑی تعداد میں کچی دھاتوں کو گلانے کے فن سے واقف تھے۔ متعدد زراعتی آلہ جات اور لوہے کے ہتھیاروں کے علاوہ

---

[1] کلیاتِ خسرو ص ۴۰، و ۷۷۲ ۔ نیز برنی ص ۲۸۵

[2] ماہوان ۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۵ء ص ۵۴۱ نیز ویبری ص ۲۹۔ مہوے سے بنی ہوئی شراب کے لیے ۔ ابنِ بطوطہ کا خیال ہے کہ اس کا ذائقہ ایسا ہوتا تھا جیسے دھوپ میں سکھائے ہوئے کھجوروں کا ۔ بابر کو یہ مشروب بدذائقہ لگا ۔ بابر نامہ ص ۲۶۔ اس کے شدید ذائقہ اور اثرات کے لیے دیکھیے پدماوت ص ۴۲۹ بابر کا خیال ہے کہ مجموعی طور سے کھجور سے بنا ہوا شروب اچھا ہوتا ہے اور دوسرا مشروب جو ناریل سے تیار ہوتا ہے کافی تیز اور عمدہ ہوتا ہے ۔ بابر نامہ ص ۲۶۲ ۔ نکولو کونٹی نے ایک ایسی سستی شراب کا ذکر کیا ہے جو چاول سے تیار ہوتی تھی اور پانی ، سرخ رنگ اور طویل درخت کے رس میں ملا کر بنتی تھی۔ فریمپٹن ص ۱۳۷۔

[3] دیکھیے ماہوان کا مضمون جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ۱۸۹۵ء ص ۵۳۱ [4] گپتا بنگال وغیرہ ص ۱۵۸

[5] کبیر نے جو ایک جولاہے کا بیٹا تھا وہ بہت دل چسپ طریقوں کا ذکر کیا ہے (دیکھیے شاہ ص ۱۰۲ و ۱۲۵، ۱۵۹) اور کشمیر کے قلم (دیکھیے تیمل ص ۲۲۵)

تالے، کنجیاں اور تلواریں ہندوستان کے گھروں میں عام استعمال کی چیزیں تھیں[۱]
سنار اور چاندی کا کام کرنے والے اپنے فن میں ماہر تھے۔ ان کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔
زیورات پر جڑاؤ کام بہت پسند کیا جاتا تھا اور غریب ہو یا امیر ہر طبقے کی عورتیں جڑاؤ
زیورات استعمال کرنے کی شوقین تھیں[۲] بنگال میں بہت سے کاری گر گھونگھے کے
زیورات بناتے تھے۔ اسی طرح پیتل کا کام کرنے والے جگ (قرابہ) پیالے، پیتل کی
بڑی پلیٹیں، کھانا پکانے کے برتن، گھنٹیاں، بت، شمع دان اور پاندان وغیرہ بناتے تھے[۳]
حتیٰ کہ ڈھول اور دیگر آلات موسیقی بنانے والوں کا بھی ایک الگ طبقہ تھا[۴] دیگر معمولی
صنعتوں میں رسی بٹنا، ٹوکری، مٹی کے برتن اور چمڑے کے ڈول بنانا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(۳) **معاشی زندگی کا معیار:** دیہاتوں کی معاشی زندگی کے معیار کا تفصیلی ذکر کیے
بغیر وہاں کی زندگی کا حال تشنہ رہے گا۔ زرعی پیداوار کا ایک معتدبہ حصہ لگان یا دیگر متعدد
طریقوں سے حکومت کی نذر ہو جاتا تھا۔ بقایا میں سے گھریلو مزدوروں اور دیگر کام کرنے
والوں کا روایتی حصہ مقرر ہوتا تھا۔ ان کے بعد جو کچھ باقی بچتا وہ کسان اور اس کے خاندان
کے ذاتی استعمال کے لیے ہوتا تھا۔ اسی آمدنی میں اسے پورا سال گزارنا پڑتا تھا۔ اسی
آمدنی کو گھریلو زندگی کے اہم مواقع جیسے شادی، بچے کی پیدائش یا موت سے متعلق تقریبات
پر صرف کرتا تھا۔ اسی آمدنی کا ایک حصہ اسے پجاری اور مندر کی نذر کرنا ہوتا تھا اور باقی
کسان اور اس کے گھریلو جانوروں کے استعمال میں آتا تھا۔ یقینی طور پر بڑھئی، لوہار
دھوبی اور بھنگی وغیرہ جیسے خانگی اور ادنیٰ درجے کے خدمت گار کسان سے کافی بہتر
زندگی گزارتے تھے اس لیے کہ ان پر نہ جانوروں کے خرچ کا بار تھا اور نہ ہی معزز پجاری
انھیں زیر بار کرتے تھے۔ ان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک اور سماج سے ان کی علیحدگی انھیں

۱۔ اعجاز خسروی جلد چہارم ص ۴۷-۴۹۔ برنی ص ۳۶۵ - کلیات خسرو ص ۷۷۸-۷۷۹
۲۔ جڑاؤ زیورات کے لیے غریب عورتوں کا شوق دیکھیے اکرامٹ ص ۲۵-۲۶۔ دیکھیے گلبدن بیگم
اے۔ ایس۔ بیورج نے جڑاؤ کو جواہر لکھا ہے۔ یہ اصطلاح آج کل بھی اپنے اسی معنی میں مستعمل ہے۔
۳۔ گپتا۔ بنگال وغیرہ ۱۶۲-۱۶۳
۴۔ ایضاً ص ۱۵۸

بیرونی دخل اندازی سے کافی حد تک محفوظ رکھتی تھی۔ کسان کی طرح یہ لوگ بھی اپنے محدود ذرائع کو گھریلو تقریبات اور خاندانی روایات کو قائم رکھنے میں صرف کرتے تھے اور انسس معمولی آمدنی پر گزارا کرتے تھے۔ دیگر جملہ زراعت پیشہ اقوام کی طرح وہ بھی مقامی ساہوکار کے قرض دار ہوتے تھے[1] کسان یا گاؤں کے دوسرے مزدوروں کے خرچ سے اگر کچھ اناج بچ جاتا تھا تو اسے فروخت کر کے نقد روپیہ حاصل کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اس کی وجہ دوسرے کچھ لوگ ہوتے تھے جن کے ذریعۂ آمدنی کے باب میں بحث کی جائے گی۔ ان لوگوں کے مقابلے میں کسان کو متواتر سخت محنت کرنی پڑتی تھی اور سال کے بعض موسموں میں تو اسے دن رات کام کرنا ہوتا تھا۔ اس کی اس سخت محنت میں اس کی بیوی اور خاندان کے دیگر افراد بھی شریک رہتے تھے[2] اس ساری محنت کے بدلے اگر اسے روزانہ دو وقت روٹی بھی میسر آجاتی تو وہ بڑا خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔ کسانوں کی زندگی کے بارے میں تواریخ میں بڑے مبہم اور بہت کم اشارات ملتے ہیں۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کی زندگی بہت پر صعوبت تھی اور وہ مستقل نیم فاقہ کشی کی زندگی گزارتے تھے[3] لباس کا ذکر کرنا فضول ہے اس لیے کہ لوگ عام طور پر تقریباً ننگے ہی رہتے تھے۔ فرنیچر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ ایک خاندان کی کل کائنات دو چارپائی اور چند کھانا پکانے کے برتن ہوتے تھے[4] ہم اس موضوع کی طرف کسی دوسری جگہ رجوع کریں گے۔

---

[1] ساہوکاروں کے حوالے کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۱۸۹

[2] دیہات میں مشقت کے کاموں میں عورتوں کا حصہ دیکھیے شاہ ص ۸۷ و ۱۷۰۔

[3] سکندر رام نے ایک انتہائی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایک چرمی مار کی بیوی چاول کی یخنی اور باسی شوربا کھاتی ہے اور پیال کے بستر پر سوتی ہے۔ دیکھیے جرنل آف ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز ۱۹۲۹ء ص ۲۳۳

[4] انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر از مورلینڈ ص ۲۵۵۔ امیر خسرو نے بلا جھجک بیان کیا ہے کہ "شاہی تاج کا ہر موتی غریب کسان کی آنسو بھری آنکھوں سے گرا ہوا خون کا بلوریں قطرہ ہے۔" کلیات خسرو ص ۲۰۴ - ۲۰۵۔

صنعتیں اور تجارت

(۱) صنعتیں

اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ اس دور میں متعدد اہم صنعتیں کافی ترقی یافتہ تھیں ان میں اہم ترین کپڑے، لوہے، پتھر کا کام، شکر، تیل اور کاغذ کی صنعتیں تھیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لیے اشیائے تعیش بیرونی ممالک سے مہیا کی جاتی تھیں۔ موجودہ اصطلاح میں کارخانے یا بڑے پیمانے پر صنعتی ادارے اس دور میں نہ تھے۔ عموماً چھوٹے قصبات کے صنعتکار بڑے شہروں کے تاجروں کے ہاتھ ان اشیا کو فروخت کرتے تھے جو ان اشیا کو ہندوستان یا بیرونی ممالک میں فروخت کرتے تھے۔ کبھی کبھی خود صنعت کار اپنا مال میلوں میں فروخت کرتے تھے۔ اشیا کو بڑے پیمانے پر برآمد کرنے کے لیے تاجر جو عموماً ساحلی علاقوں کے باشندے تھے خود صنعت کار یا اس کے کسی نمائندے سے معاملہ کر لیتے تھے۔ چند مقامات پر باہمت تاجر خود اپنے کاری گر لگا کر مال تیار کراتے تھے۔ بہترین ساز و سامان اور اعلیٰ پیمانے کے تربیت یافتہ کاری گروں سے لیس ایسے ادارے یا کارخانے سلاطینِ دہلی کے تھے یا بعد کے زمانے میں چھوٹے چھوٹے ریاستی حکمرانوں کے ان اداروں کو جن کا ذکر پہلے آچکا ہے کارخانے کہا جاتا تھا۔ علاوہ دیگر مصنوعات کے جو شاہی خاندان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تیار کی جاتی تھیں دہلی کے ان شاہی کارخانوں میں کبھی کبھی ۴۰۰۰ تک صرف ریشم بننے والے کاریگر کام کرتے تھے۔

ان کارخانوں کی مصنوعات کی شاہی مانگ کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ محمد تغلق ایک سال میں دو بار موسم خزاں اور موسم بہار میں دو لاکھ مکمل خلعتیں تقسیم کرتا تھا۔ جو خلعتیں موسم بہار میں تقسیم کی جاتی تھیں اس مال پر مشتمل ہوتی تھیں جو اسکندریہ میں بنتا تھا اور خزاں میں تقسیم کی جانے والی خلعتوں کا کچھ سامان دہلی میں بنتا تھا اور کچھ چین اور عراق سے درآمد کیا جاتا تھا۔ اسی طرح محمد تغلق نے شاہی حرم کی بیگمات کے ذاتی استعمال اور امرا اور ان کی بیگمات کے لیے تحفہ کے طور پر دی جانے والی زربفت

کے دھاگے کو تیار کرنے کے لیے تقریباً ۴۰۰۰ صنعت کار ملازم رکھے تھے۔ شاہی استعمال کی تقریباً ہر چیز جیسے ٹوپیاں، جوتے، پردے، منجنیق کی پیٹی، پٹکا، زر دوزی اور زین وغیرہ انھیں کارخانوں میں تیار کی جاتی تھی [۱]۔ اسی طرح ان کارخانہ جات میں عمدہ قسم کی تہذیب اور دیگر ایسے سامان کافی مقدار میں تیار کیے جاتے تھے جو دوسرے بادشاہوں کو ان کے تحفے کے بدلے میں تحفتاً پیش کیے جاتے تھے [۲]۔ اکبر کے زمانے سے قبل تک ان کارخانوں میں کام کرنے والے کاری گروں کی روزانہ اجرت کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ مجموعی طور پر ان اشیا کی تیاری اور تقسیم کے سلسلے میں حکومت کو کوئی سروکار نہ تھا۔ سلاطین دہلی میں صرف علاؤالدین خلجی ہی ایسا سلطان تھا جس نے دہلی کے بازار کو کنٹرول کرنے کی جرأت مندانہ کوشش کی لیکن اس کی وجوہات سیاسی اور انتظامی تھیں نہ معاشی لیکن اس سے ملک کے صنعتی حالات کے مختلف پہلوؤں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

(۱) پارچہ بافی

پارچہ بافی کی صنعت ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت تھی۔ سوتی، اونی اور ریشمی تینوں طرح کے کپڑے بنے جاتے تھے۔ ملک میں کپاس کی پیداوار کثیر تھی۔ اون ہمیشہ پہاڑی علاقوں سے حاصل ہوتی تھی۔ حالاں کہ میدانی علاقوں میں بھی بھیڑیں پائی جاتی تھیں۔ اچھے قسم کی اون اور فر زیادہ تر بیرونی ممالک سے درآمد کی جاتی تھی اور صرف امیر طبقہ ہی انھیں استعمال کرتا تھا۔ ریشم کے کیڑے صرف بنگال [۳] میں پائے جاتے تھے حالاں کہ یہ یقین کے ساتھ نہیں

---

[۱] مسالک الابصار کے بیان کے لیے دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاوسن جلد سوم ص ۵۷۸ اور Notices ص ۷۰ میں فرانسیسی ترجمہ کے اعداد استعمال کیے ہیں۔

[۲] شال کے لیے دیکھیے مانڈو کے ذخائر کے لیے تجزیۃ الامصار ص ۲۴۷ اور نفیس کپڑے کے لیے دیکھیے ابن بطوطہ کی چین کی سفارت کا حال۔

[۳] ہندوستان میں ریشم سازی کی صنعت کے لیے دیکھیے مہاواں کا بیان۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک موسائٹی سنہ ۱۸۹۵ء ص ۵۳۲ وامپیریل گزیٹر آف انڈیا چہارم ص ۲۰۶۔ ۲۰۷ "یہ بات غالباً صحیح ہے سنسکرت مصنفین کے ریشم کے بارے میں قدیم ترین حوالوں میں کسی نہ کسی طرح کے غیر پالتو کیڑوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہا جا سکتا کہ وہ اصلی ریشم کے کیڑے تھے یعنی (شہتوت کھانے والے) کیڑے۔ جو بھی صورتِ حال ہو، ریشم کا دھاگا بڑی مقدار میں بیرونی ممالک سے درآمد کیا جاتا تھا کارچوبی، سونے کے دھاگے بننے اور رنگائی کا کام ہندوستان کے متعدد بڑے بڑے شہروں میں چل رہے تھے۔ مجموعی طور پر ہندوستان میں بہترین قسم کا کپڑا تیار کیا جاتا تھا جو اندرونِ ملک لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ بنگال اور گجرات سے غیر ممالک کو سوتی مال اور دیگر بہت سی اشیا برآمد کی جاتی تھیں۔ اعلیٰ جنس کی اشیا صرف دولت مند طبقے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تیار کی جاتی تھیں۔ غریب طبقہ، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے گاؤں ہی کے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتا تھا۔ بڑھیا اور نفیس کپڑا صرف تیوہاروں، شادی اور دیگر سماجی تقریبات کے موقع پر ہی خریدا جاتا تھا۔

دولت مند طبقے کے استعمال میں آنے والے کپڑے عام طور پر مختلف قسم کے ریشم، بہترین تن زیب، بہترین سوتی کپڑا، زربفت، اطلس اور مختلف طرح کے فر جیسے سنجاب، نیولے کی فر، مارٹن، ارمائن[۱] وغیرہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ موسمِ سرما میں امرا فر اور بہترین اونی کپڑے استعمال کرتے تھے اور غربا معمولی گاڑھا اور معمولی قسم کے کمبل۔ اچھے کپڑے کے صنعت کاروں کو غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ اس حقیقت کا ثبوت ہمیں

(بقیہ حاشیہ) موجودہ دور کے اصلی ریشم کے کیڑے نہیں ہیں۔ ابتدائی ہند و ادب کے ان جملہ حوالہ جات میں جہاں شہتوت کے کیڑوں کا ذکر ہے درآمد شدہ ریشم کی تفصیلات ملتی ہیں نہ کہ مقامی طور پر تیار کی ہوئی ریشم کی۔ ہندوستان میں نہ یہ کیڑا اور نہ وہ پودا جس پر اس کی پرورش ہوتی ہے اصل حالت میں نہیں پایا گیا۔ قطعی طور پر یہ چیزیں ان علاقوں میں نہ تھیں جہاں آج کل ریشم بنانے کی صنعت ہے۔ چینی کاغذ کی طرح جس کی تفصیلات بعد میں بیان کی جائیں گی، بنگال میں ریشم کے کیڑوں کی ابتدا بھی چینی اثرات کا نتیجہ تھی۔

[۱] دیکھیے خسرو کی بیان کردہ تفصیلات قرآن السعدین ص ۲۲-۲۳۔ نیز سلطان علاؤالدین خلجی کی عائد کردہ پابندیاں جن کا مقصد یہ تھا کہ امرا کی ضروریات کو کم کر دیا جائے اور زربفت، سنہری کپڑے دہلی اور کھمبایت کی عمدہ ریشم، شوستری، بھیرائی اور دیوگری اور کپڑے کی دیگر اقسام کی فروخت کو ترقی دی جائے۔

امیر خسرو کی شاعرانہ اور دل چسپ تحریروں سے ملتا ہے۔ تحریر میں اگرچہ کافی حد تک مبالغہ آرائی ہوتی ہے لیکن اس سے ہمیں اس دور کے کاری گروں کی فنکارانہ صلاحیتوں اور نفاست کا پتہ چلتا ہے[1] دیوگیر اور بہادیونگری صنعت پارچہ بافی کے مشہور مرکز تھے۔ وہاں کا بُنا ہوا کپڑا ان مقامات کے نام پر ہی مشہور ہو گیا تھا اور اپنی غیر معمولی عمدگی اور مضبوطی کے لیے مشہور تھا۔[2] اچھے کپڑے کی دیگر مشہور اقسام میں چند بیرمیہ، صلاحیہ، شیریں، کتان، روحی، سراج، قباب قابلِ ذکر ہیں۔ حالاں کہ ان کی خصوصیت واضح طور پر پیش نہیں کی گئی غالباً ان کے یہ نام ان مقامات سے تعلق کی بنا پر پڑے ہوں گے جن کا آج کل صحیح صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ شمالی ہند میں دہلی صنعتِ پارچہ بافی کا ایک بڑا مرکز تھا۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شہرت دہلی کے صنعتی مرکز ہونے کی وجہ سے تھی یا عمدہ مصنوعات کا ایک اچھا بازار ہونے کی وجہ سے۔ غیر معمولی شاندار اور عمدہ تن زیب کے ایک پورے تھان کی قیمت ۱۰۰ اتنکے تک تھی۔[3] دہلی میں عمدہ تن زیب، ریشم اور زربفت کا ایک بڑا ذخیرہ تھا اور شاید دوسرے بڑے بڑے شہروں میں بھی ایسا ہی ہو۔[4]

---

[1] مثلاً ایک جگہ وہ بنگال کی ململ کا ذکر کرتا ہے۔ "یہ اس قدر عمدہ اور ہلکی ہے کہ اس ململ کے سو گز کے تھان کو سر کے گرد لپیٹنے کے بعد بھی سر کے بال دکھائی دیتے رہیں گے۔" دیکھیے قران السعدین ص ۳۱-۳۲۔ دوسرے مقام پر اس نے دیوگیر کے "بہترین رنگین کپڑے کو پہاڑوں کے لالہ اور باغ کے گلاب سے تشبیہ دی ہے۔" ہر ایک مقام پر اس دیوگری کپڑے کا مقابلہ عمدگی اور شفافی میں پانی کے ایک قطرے سے کیا ہے۔ اس کپڑے کا سو گز کا تھان سوئی کے ناکے میں سے نکل سکتا تھا لیکن اس کے باوجود کپڑا اس قدر مضبوط تھا کہ اس میں سوئی آر پار نہیں ہو سکتی۔ خسرو کا خیال ہے کہ اس کپڑے کا لباس پہنے ہوئے آدمی ننگا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اس نے صرف جسم پر پانی مل رکھا ہو۔ مصنف کا خیال ہے کہ دیوگری کپڑا اتنا عمدہ تھا کہ پریاں بھی اسے لالچ کی نظروں سے دیکھتی تھیں اور عمدگی میں ریشم اور زربفت سے اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا (خزائن الفتوح، جلد دوم ص ۱۱، کلیاتِ خسرو ص ۸۶۷ اور ۲۵۸۰۷ ص ۴۵۹)

[2] ایضاً اور خزائن الفتوح ص ۱۱

[3] کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۹۰-۹۱

[4] مثال کے طور پر دیکھیے ملفوظات ص ۲۸۹ جس میں تیمور نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کپڑے کی صنعت اور برآمد میں بنگال اور گجرات کو ہندوستان بھر میں اولیت حاصل تھی۔ ان صوبوں کی بحری سہولتوں اور بیرونی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کی وجہ سے یہاں بڑے پیمانے پر صنعتِ پارچہ بافی کی ترقی ہوئی تھی۔

امیر خسرو، مہوان، وارتھیما اور باربوسہ سب کی تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ بنگال کی مصنوعات بڑی اعلیٰ درجے کی تھیں۔ خسرو ان سب چیزوں کی بڑی تعریف کرتا ہے جو بنگال کے گورنر بغرا خاں نے اپنے بیٹے سلطان معز الدین کیقباد کو پیش کی تھیں[1]۔ مہوان اپنے سفرِ بنگال کے دوران اعلیٰ درجے کی تن زیب، ستھری کشیدہ کاری کی لوٹیوں اور ریشم کے رومالوں کی پانچ یا چھ مختلف اقسام کا ذکر کرتا ہے[2]۔ وارتھیما اور باربوسہ کے بیانات بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ البتہ اول الذکر کا بیان ہے کہ بنگال میں ساری دنیا سے زیادہ سوتی کپڑا ملتا ہے۔ وہ اچھے کپڑے کی مختلف اقسام بیان کرتا ہے مثلاً بیرم، ناموتی، لزاتی، کینتا ر، دوزر، سنابات جن کی نوعیت واضح نہیں ہوتی۔ باربوسہ کا بیان ہے کہ بنگال میں سربند نام کا ایک پٹکا بھی بنتا تھا جو یورپ میں خواتین کے سر کے لباس کے لیے بہت مقبول تھا اور ایرانی و عرب اسے پگڑی کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح عرب تاجر بنگال کے سنابات کی قمیصیں بڑے شوق سے پہنتے تھے[3] اندرونِ ملک میں استعمال ہونے والی اشیا میں ریشمی اور سوتی دھوتیاں اور ساڑیاں کافی مقدار میں تیار کی جاتی تھیں[4]۔

(گزشتہ سے پیوستہ) ہے کہ اس نے دہلی کی لوٹ مار کے وقت دوسرے سامان کے علاوہ اتنا ریشم اور زربفت جمع کر لیا تھا جو پچھلے تمام اندازے، تعداد اور حدِ قیاس سے بہت زیادہ تھا۔

[1] خسرو نے قران السعدین ص ۱۰۰، ۱۰۱ پر کپڑے کے ایک تھان کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اس کی بناوٹ اتنی عمدہ تھی کہ اس میں سے پورا جسم دکھائی دیتا تھا۔ اس کپڑے کے پورے تھان کو تہہ کر کے ناخن کے اندر رکھا جا سکتا تھا لیکن پھر بھی یہ اتنا بڑا ہوتا تھا کہ اسے اگر کھول دیا جائے تو دنیا کو ڈھک سکتا تھا۔

[2] جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۵ء ص ۵۳۱ - ۵۳۲۔

[3] وارتھیما کے بیان کے لیے دیکھیے ص ۲۱۲ اور باربوسہ جلد دوم ص ۱۴۵

[4] مسٹر گپتا نے بنگال میں دھوتی اور ساڑی کے صنعت کاروں کی دل چسپ تفصیلات دی ہیں۔ جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز سنہ ۱۹۲۹ء ص ۲۲۴ - ۲۳۱۔ مثلاً اس کا بیان ہے کہ ریشمی ساڑی خصوصاً چلا نام (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اسی طرح گجرات بھی صنعتِ پارچہ بافی میں کافی مشہور تھا۔ کھمبایت کی ریشم کا شمار ان قیمتی اشیا میں کیا جاتا تھا جن کی قیمتیں سلطان علاؤ الدین خلجی نے دہلی کے بازار میں مقرر کی تھیں۔ ان اشیا کو صرف امرا ہی استعمال کرتے تھے[1] باربوسہ کا بیان ہے کہ کھمبایت جملہ اقسام کے اعلیٰ اور معمولی قسم کے چھینٹ کے سوتی کپڑوں کا مرکز تھا۔ ان کے علاوہ وہاں سستی قسم کی مخمل، اطلس، تافتہ اور بھاری قالین بھی تیار کیے جاتے تھے۔ گجرات کے دوسرے حصوں میں چھینٹ اور ریشمی تن زیب کی مختلف قسمیں بھی تیار کی جاتی تھیں[2]

کپڑے کے علاوہ دیگر مختلف اشیا مثلاً قالین، گدے، چادریں، دریاں، جانماز پلنگ کی ڈوریاں اور دیگر متعدد اشیا بھی تیار کی جاتی تھیں۔

اس موقع پر ہندوستان کی کپڑا رنگنے کی صنعت کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ یہاں نیل وافر مقدار میں پیدا ہوتا تھا اور لوگ صنف اور عمر سے قطع نظر بھڑکیلے کپڑوں کے شوقین تھے رنگین حاشیہ دار ساڑیوں اور رنگین پٹی دار ریشم اور تن زیب کا متعدد کتب میں حوالہ ملتا ہے اس طرح کپڑا رنگنے اور چھپائی کی صنعت اور پارچہ بافی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ باربوسہ

(گزشتہ سے پیوستہ) کی تیار کی جاتی تھیں۔ کلاپت ساڑی، اگن پت ساڑی، پیتر بھوی اور کاپچی پت ساڑی۔ ریشم کی دیگر اقسام کے علاوہ اس نے پیتا۔ لڑ اور پیتر پھدا کا ذکر کیا ہے اور ساڑیوں کے ڈیزائن اور بناوٹ کی متعدد تفصیلات دی ہیں۔ اسی طرح اس نے سوتی اور ریشمی دھوتیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ بنگال میں ابتدائی دور میں ملی سوت اور ریشم کو ملا کر بنائی جاتی تھی اور اس پر بڑی خوش ذوقی سے پھول پتے بنائے جاتے تھے۔ ان کے توصیفی ناموں اور ان کی متعدد اقسام سے معلوم ہوتا ہے کہ عمدگی کے لحاظ سے یہ صنعت بہت آگے تھی۔ اس کے بیان سے اصل زمانے کا تعین کرنا تو مشکل ہے لیکن گپتا نے اپنی تصنیف Bengal in the Sixteenth Century میں بیان کیا ہے کہ بنگال کی مختصر نو آبادی میں سیکڑوں دھوتیاں تیار کی جاتی تھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کپڑے کی صنعت وسیع پیمانے پر تھی۔

[1] برنی ص ۳۱۱۔ نیز وارتھیما کی رائے بھی دیکھیے۔ اس کے اندازے کے مطابق ہندوستان سے جتنا کپڑا برآمد کیا جاتا تھا اس کا آدھا کھمبایت ہی سے مہیا ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں غیر ملکی تجارت کے تحت بیان کریں گے۔

[2] باربوسہ جلد اول ص ۱۴۱ و ۱۵۴۔ ۱۵۵۔

اور وارتھیما دونوں چھپے ہوئے کپڑے کا ذکر کرتے ہیں۔ اول الذکر لحافوں اور چھپے ہوئے اور بہترین کشیدہ کاری کیے ہوئے گدّوں اور روئی بھرے ہوئے لباس کا بھی ذکر کرتا ہے[1]

(۲) دھات کا کام

کپڑے کے بعد اہم ترین صنعتیں مختلف دھاتوں کی تھیں۔ دھات کے کام کی ہندوستان میں بڑی پرانی تاریخ ہے جس کا ثبوت یہاں کی متعدد قدیم مورتیاں اور دہلی کی لوہے کی لاٹ ہے۔ دھات کا کام کرنے والوں کی زندگی میں مکمل تبدیلی صرف پچھلی صدی میں آئی ہے[2] لوہے پارے اور سیسے کی کانیں ہندوستان میں تھیں اور ان دھاتوں کو کسی حد تک استعمال بھی کیا جاتا تھا اگرچہ ان سے بنائی جانے والی اشیا کی تعداد زیادہ معلوم نہیں ہوتی[3] ابوالفضل بڑے یقین کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ہندوستان کے کاریگران دھاتوں کے استعمال کے مختلف طریقے اچھی طرح جانتے تھے مثلاً لوہا، پیتل، کانسی، ہشت دھات اور کول پتو[4] ہندوستان کے قدیم ترین زمانے میں بھی شمشیر سازی کی صنعت اس حد تک ترقی پذیر تھی کہ

---

[1] ایضاً ص ۱۴۲

[2] کیمیائی صنعتوں کے انحطاط کے لیے دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد چہارم ص ۱۲۸۔ "اس معاملے میں آج کا ہندوستان ایک صدی پہلے کے ہندوستان سے بالکل مختلف ہے۔ اعلیٰ درجے کا دیسی ساخت کا لوہا اور اس طریقہ کی ابتدائی ساخت میں پیش بینی کی وجہ سے آج کل یورپ میں اعلیٰ درجے کے اسٹیل اور تانبے اور پیتل کی دیگر عمدہ اشیا بنانے کے لیے کام میں لایا گیا قدیم دور میں کچی دھات صاف کرنے کی صنعت کے فن میں ملک کو بلند مرتبہ عطا کیا۔ دوسری طرف شورے کی پیداوار زیادہ ہونے کی بنا پر ہندوستان کو خصوصی سیاسی اہمیت حاصل ہوئی۔ حتیٰ کہ چالیس سال سے کم ہی گزرے ہوں گے کہ یورپ کے کیمیائی صنعت کاروں کو اس کی Byproducts میں اسقدر سستے اور عمدہ مرکبات بھک سے اڑ جانے والے مادے کی صنعت کے لیے ملے۔

[3] دیکھیے مسالک الابصار کے مصنف کی رائے etc Notices ص ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ٹن کی دریافت کو (غالباً یہ سیسے اور جست کی کانیں تھیں جن کا ذکر امپیریل گزیٹر آف انڈیا راجپوتانہ میں کیا گیا ہے) اور ۱۴ ویں صدی کے اختتام پر جاورا (میواڑ) میں چاندی کی کانوں کی دریافت کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد اول ص ۳۳۔ [4] آئین اکبری جلد اول ص ۳۵۔۳۶۔

ہندوستانی شمشیر و خنجر عربی و فارسی کی مستند اصطلاح بن چکے ہیں۔ سلاطین دہلی کے زمانے میں عمدہ فولاد تیار کرنے کا فن کسی طرح بھی کم تر نہ تھا بلکہ اس دور میں اس صنعت نے کچھ زیادہ ہی ترقی کی[1]۔ ہم عام استعمال کی چند چیزوں کا ذکر اس سے پیشتر کر چکے ہیں۔ ان اشیا میں چلمچی، پیالوں، فولاد کی بندوقوں، چاقوؤں اور قینچیوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ان اشیا کا ذکر چینی سفیر ماہوان نے اپنے بنگال کے سفر میں کیا ہے[2]۔

مرصّع کام کا ذکر ہم اس سے پیشتر کر چکے ہیں۔ یہاں مزید یہ کہا جا سکتا ہے کہ فولاد کے زیادہ نفیس کام نے عام طور پر اور سونے چاندی کے کام نے خاص طور پر سلاطین دہلی کی سرپرستی میں زیادہ ترقی کی[3]۔ تیمور کے زمانے تک سونے اور چاندی کے برتن، مرصّع زیورات،

---

[1] فخر الدین مبارک شاہ کا بیان ہے (دیکھیے آداب الملوک ص ۷۷) کہ تلواروں کی جملہ اقسام میں ہندوستانی تلوار بہترین اور پختگی اور لچک میں سب سے عمدہ ہوتی تھی۔ تلواروں کی دیگر ہندوستانی اقسام میں اس نے ایک بہت نایاب قسم کی مخصوص تلوار کا ذکر کیا ہے جس کا نام مان گوہر تھا۔ عموماً اسلم خانوں اور حکمرانوں نے ذخیروں میں اس قسم کی تلوار ایک سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے بنانے کے لیے بڑے وقت، محنت، لاگت اور خصوصی مہارت درکار تھی۔ اس دور کے مشہور تلوار سازوں میں اس نے دریائے سندھ کے قریب کورج کے تلوار سازوں کا ذکر کیا ہے۔

[2] جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۸۵۹ء ص ۵۳۲۔

[3] مسلمان واقعہ نگاروں کی تحریروں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ اس دور کی ابتدا میں رائے پتھورا کے بیٹے اجمیر کے گورنر نے قطب الدین کو دیگر تحائف کے علاوہ سونے کے بنے ہوئے چار خربوزے بھی بھیجے تھے جن پر سونے کا کام بڑی نزاکت سے کیا گیا تھا اور جو بالکل ہو بہو اصل خربوزے معلوم ہوتے تھے۔ قطب الدین نے انھیں فن کے نایاب نمونے کی حیثیت سے سلطان محمد بن سام غوری کے لیے بھیج دیا۔ (دیکھیے تاریخ فخر الدین مبارک ص ۲۲-۲۳۔ نیز طبقاتِ ناصری قلمی نسخہ ص ۹۱) نیز ہمایوں کے زمانے میں سونے کے خربوزوں کے لیے دیکھیے مندرجہ ذیل صفحات۔ دھات کے کام کا دیگر پسندیدہ نمونہ وہ مصنوعی باغ تھا جس میں قیمتی دھاتیں اور جواہرات استعمال کیے گئے تھے۔ سلطان مبارک شاہ خلجی نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کی ولادت پر جو تقریب منائی تھی اس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے کلیاتِ خسرو ص ۷۷۲۔ اس نے ایک مصنوعی باغ تیار کرایا تھا جس کے تمام پھل دار درخت سونے کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

منقش اور سونے چاندی پر پچی کاری کا کام، بداری آمیزش کے قرابے، تاج، منقش پٹیاں گلے کے ہار، قابیں اور ان کے ڈھکنے اور دیگر اشیا بہت سے بڑے بڑے شہروں میں عام طور پر استعمال ہوتے تھے[1] باربوسہ گجرات کے بہترین زرگروں کے بہترین فنکارانہ کام کی تصدیق کرتا ہے[2] ہندوستان کے کاریگروں کی اعلیٰ فن کارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے تیمور نے ہندوستان کے لوگوں کے بلا امتیاز قتل عام کے دوران عام طور پر کاری گروں کی جان بخشی کردی۔ اپنی دارالسلطنت سمرقند کو وہ ان کاری گروں کی ایک معتدبہ تعداد کو اپنے ہمراہ لے گیا تھا[3] اکبر کے دورِ حکومت میں دھاتوں کی صنعت میں زیادہ نفاست پیدا ہوئی۔ اکبر کے معتمد ابوالفضل نے ان زرگروں کی اعلیٰ کارکردگی کی بڑی تعریف کی ہے جو زیورات بناتے تھے اور بعض اوقات اپنے کام کی اجرت کا دس گنا پاتے تھے۔ وہ زرگروں کو کئی طبقات میں تقسیم کرتا ہے جو مختلف زیورات بنانے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ وہ بعض اوقات دس من یا اس سے زیادہ وزنی شیشے کے جھاڑ مختلف نمونوں کے بناتے تھے۔ اسی طرح وہ مینا کاری، مرصع کاری، دھات پر سونے چاندی کی پچی کاری، آرائش اور دیگر نازک فنوں کا ذکر بھی کرتا ہے[4]

(گذشتہ سے پیوستہ) کے تھے اور پتیاں زمرد کی۔ سرو کے درخت یاقوت کے بنائے گئے تھے۔ فرش پر بڑی مقدار میں زمرد بکھیر کر گھاس کا تاثر دیا گیا تھا۔ ایک سنہری ہما کو جس کی چونچ میں ایک موتی تھا درخت پر بٹھایا گیا تھا۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ مجموعی طور پر سونے کے کام کے سلسلے میں جو انتہائی شاندار نتائج حاصل ہوئے وہ موم کے کام میں بمشکل تصور کیے جا سکتے تھے۔

[1] بیداری A99 (دھاتوں کا مرکب) اور چاندی پر پچی کاری کے کام کے لیے دیکھیے کیٹلاگ آف دی انڈین میوزیم لندن ص ۱۹۔ ایک ساغر کے لیے جس پر ایک کاری گر کے دستخط تھے جو تیمور کے دربار میں ملازم تھا اور جس پر سنہ ۸۰۳ھ (۱۴۰۰ عیسوی) کندہ تھا دیکھیے ختن کی فتح کے بعد پیر محمد کے تحائف کی فہرست جو اس نے تیمور کو پیش کیے تھے۔ کارکنوں نے دو دن میں یہ فہرست تیار کی تھی۔

[2] باربوسہ جلد اول ص ۱۴۲

[3] مثال کے لیے دیکھیے ملفوظاتِ تیموری ص ۲۸۹

[4] آئینِ اکبری جلد اول ص ۱۸۵ - ۱۸۷۔ ایضاً جلد اول ص ۴۴

(۳) پتھر اور اینٹوں کا عمارتی کام

کاری گروں کی اس سے بھی بڑی تعداد پتھر، اینٹوں اور دیگر عمارات و مکانات کی تعمیر کے کاموں میں مصروف تھی۔ ہندوستانی معماروں کی اعلیٰ تعمیری صلاحیتوں کا ثبوت صرف ہندوستان کی عمارتیں ہی نہیں بلکہ کابل، غزنی اور سمرقند کی عمارتیں بھی پیش کرتی ہیں[۱] امیر خسرو بڑے فخر سے دعویٰ کرتا ہے کہ دہلی کے معمار اور سنگ تراش پورے عالمِ اسلام میں اپنا ثانی نہیں رکھتے[۲] ان بہترین صلاحیتوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھیں حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ سلطان علاؤالدین خلجی نے سرکاری عمارات کی تعمیر کے لیے ۷۰ ہزار کاری گر لگائے تھے۔ ہم یہ بھی ذکر کر چکے ہیں کہ تربیت یافتہ کاریگروں کی موجودہ تعداد کے علاوہ فیروز تغلق نے اپنے ۴ ہزار غلاموں کو ان فنون میں تربیت دلانے کا انتظام کیا تھا۔ اسی طرح بابر بھی ہندوستانی کاری گروں کی فنکارانہ صلاحیتوں پر بڑا فخر کرتا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اس نے ۶۸۰ سنگ تراشوں کو آگرہ میں ذاتی عمارتیں بنانے کے لیے رکھا تھا اور ۱۴۹۱ مزدور دوسرے مقامات پر عمارات کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے[۳] یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہندو حکمرانوں نے ان معماروں اور دیگر کاری گروں کی سرپرستی مسلمان حکمرانوں سے زیادہ کی۔ ماؤنٹ آبو کے دلواڑہ مندر اور گوالیار اور چتوڑ کی عمارات سب اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ اس دور میں قدیم عمارتی روایات برقرار رہیں اور بعض معاملات میں ان میں ترقی ہوئی۔ اس سلسلے میں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ مینا کاری کے مزین ٹائلیں

---

[۱] محمود غزنوی نے متھرا پر قبضے اور تباہی کے بعد ہندوستان کے معماروں کو جبراً بھرتی کیا جنھوں نے غزنی کی مشہور مسجد "جنت کی دلہن" تعمیر کی۔ اسی طرح جب تیمور نے محمد تغلق کی تعمیر کرائی ہوئی دہلی کی جامع مسجد کا عمدہ کام دیکھا تو اس نے اسی طرح کی ایک مسجد سمرقند میں تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا اور اپنے ساتھ دہلی کے سنگ تراشوں کو سمرقند لے گیا۔ (دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۸۷)

[۲] خزائن الفتوح ص ۱۳

[۳] بابرنامہ ص ۲۷۶، ۲۸۹

اور اینٹیں بھی اس دور میں ہندوستان میں استعمال ہونے لگیں اور بنگال اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں ان کا استعمال کامیابی کے ساتھ کیا جانے لگا۔[1]

دیگر چھوٹی صنعتیں

اس سلسلے میں کچھ چھوٹی صنعتوں مثلاً مونگے کا کام، ہاتھی دانت کا کام اور نقلی جواہرات کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مونگے کا کام گجرات اور بنگال میں ہوتا تھا۔ گجرات کے عقیق بڑے اعلیٰ درجے کے ہوتے تھے اور ہندوستان سے باہر بھی برآمد کیے جاتے تھے۔[2] چند مقامات پر ہاتھی دانت کا تھوڑا سا کام ہوتا تھا۔ ہاتھی دانت کا کام کرنے والے مرصّع اور دیگر سادہ اشیا مثلاً کنگن، چوڑیاں، تلواروں کے دستے، شطرنج کے مہرے شطرنج کی بساطیں، سیاہ، پیلے، سرخ، نیلے اور دیگر متعدد رنگوں کی مسہریاں وغیرہ بنانے میں اعلیٰ درجے کی مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہ اشیا ہندوستان کے بہت سے شہروں میں بھیجی جاتی تھیں۔[3] نقلی موتی بنانے کا فن بھی بڑا ہر دل عزیز تھا اور باربوسہ گجرات کے ان فن کاروں سے بڑا متاثر ہوا تھا۔[4] اسی طرح بنگالی ادب میں مصنوعی پرندوں، پودوں اور پھولوں کی صنعت کے بہت سے حوالے ہیں۔[5] اعلیٰ درجے کا لکڑی کا کام پورے ہندوستان میں ہوتا تھا۔ گھریلو ضرورت کی متعدد اشیا مثلاً دروازے، میخیں، تخت، کھلونے، مسہریاں اور دیگر متعدد آلات اور ظروف کے لیے یہ فن بڑا ضروری تھا۔

---

[1] انڈین میوزیم کلکتہ میں دیکھیے گوڑ (بنگال) کے ۱۵ویں صدی کے نمونے۔

[2] باربوسہ جلد اول ص ۱۵۵۔

[3] ایضاً ص ۱۴۲۔

[4] ایضاً دیکھیے مسلمان واقعہ نگاروں کی تصانیف میں دیگر حوالہ جات۔ میاں بھوا ایک افغان امیر اس قدر عمدہ کاریگر اور ہوشیار فن کار تھا کہ اس نے متعدد عمدہ زیورات ایجاد کیے اور انتہائی شاندار مصنوعی موتی بنائے۔

[5] جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز سنہ ۱۹۲۹ء ص ۲۴

(۴) کاغذ

عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ کاغذ کے موجد چینی تھے اور اس صنعت کو مسلمانوں نے چینیوں سے سیکھا تھا۔ حال کی تحقیقات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بلا شبہ چینی کاغذ سازی کے فن سے واقف تھے۔ یہ کاغذ شہتوت کے درخت سے بنایا جاتا تھا جس کا نام کاغذیا Kokdz تھا۔ (عام طور پر گھاس اور پودوں سے بنا ہوا) لیکن چیتھڑوں سے کاغذ سازی کا سہرا اہل عرب یا بالفاظ دیگر سمرقند کے کاغذ سازوں کے سر ہے[1] ابتدائی چینی کاغذ سے مشابہ بنگال کا سفید کاغذ ہوتا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک درخت کی سفید چھال سے بنتا تھا اور ہرن کی کھال کی طرح موٹا اور چمک دار ہوتا تھا[2]۔ نکولو کونٹی گجرات میں کاغذ کے استعمال کا ذکر کرتا ہے لیکن اس کی خوبیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ غالباً گجرات کا کاغذ اصلاح شدہ طریقے سے ہی بنایا جاتا تھا[3]۔ امیر خسرو دہلی

---

[1] چیتھڑوں سے بنے کاغذ کی دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے R. Hoernle's Summary of the researches of Professors Wiesnar and Karabacek of the Vienna University in J.R.A.S. 1903 ص ۶۶۳ - ۶۸۴۔ چیتھڑوں سے بنے کاغذ کا موجد کون تھا یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ جب مسلمانوں کا سابقہ چینیوں سے پہلے پہل پڑا تو موخر الذکر گھاس اور پودوں کے علاوہ کم و بیش بلائم کیے ہوئے چیتھڑوں اور رسیوں (سوتی ٹکڑوں اور سنی کے ریشے) سے کاغذ بناتے تھے۔ عربوں نے دھیرے دھیرے سوتی دھاگوں کا نعم البدل معلوم کر لیا اور آخر کار یہ لوگ بٹے ہوئے یا بٹے چلے دھاگے استعمال کرنے لگے جو چیتھڑوں، رسیوں اور جالوں وغیرہ سے مہیا ہو جاتے تھے۔ اس اصلاحی اقدام کا اثر کاغذ کی سطح پر پڑا۔ اس کاغذ کو بنانے میں ایک مشینی طریقے سے دبا کر مانڈی سے اسے چکنا کر لیا جاتا تھا۔ اس ترقی یافتہ طریقے سے یہ کاغذ تیار ہوتا تھا جس کی ایجاد کا سہرا عربوں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سمرقند کے کاغذ سازوں کے سر ہے۔ اسی طرح عربوں نے چینیوں سے کاغذ میں کورا پن پیدا کرنے اور وزن بڑھانے کے طریقے سیکھے۔ آٹھویں صدی کے اختتام تک کاغذ سازی کا فن جو کاغذ بنانے کی مشینوں کی ایجاد تک استعمال ہوتا تھا مکمل ہو چکا تھا۔ دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد چہارم ص ۲۰۶ پر قدیم نظریات۔

[2] جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۸۹۵ء ص ۵۳۲ [3] فریپٹن ص ۱۴۳۔

میں عراق کے کاغذ کے استعمال کا ذکر کرتا ہے۔ اس کاغذ کی (جو بہتر تھا اور غالباً جس کا نام دمشق کے نام پر ہی پڑا تھا) وہ دو اقسام بیان کرتا ہے۔ سادہ اور ریشمی۔ موخرالذکر غالباً سندے کی قسم کا ہوتا تھا حالاں کہ اس سلسلے میں وضاحت کے ساتھ کچھ نہیں لکھا ہے[۱] متعدد سادہ اور نقشین مخطوطات و دیگر دستاویزات جو ہم تک نہیں پہنچی ہیں بلاشبہ صنعتِ کاغذسازی کے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ دہلی میں کتب فروشوں کے ایک مستقل بازار کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی کاغذ تیار نہیں ہوتا تھا اور لوگ کاغذ کے استعمال میں بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے تھے[۲]

(۵) شکر

ہندوستان میں گنّے کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ شکر عام طور پر گنّے سے تیار کی جاتی تھی۔ اس کے تیار کرنے کا طریقہ عام طور پر مندرجہ ذیل تھا گنّے کے ٹکڑے کرکے انھیں کولھو میں پیلا جاتا تھا۔ اس کے بعد گنّے کے رس کو بڑے بڑے لوہے کے کڑھاؤں میں ابالا جاتا تھا حتیٰ کہ اس کی شکل بلوریں ہو جاتی تھی۔ تب یا تو اس کی گڑ کی بھیلیاں یا تھوڑا اور صاف کرکے اس کی کھانڈ بنالی جاتی تھی۔ اس کی زیادہ نفیس اور بہترین شکل سفید قند[۳] ہوتی تھی۔ ہندوستان میں شکرسازی کا کام بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔ بنگال میں اتنی شکر تیار کی جاتی تھی جو مقامی استعمال کے بعد بھی کافی مقدار میں غیر ممالک کو برآمد کی جاتی تھی۔ تاجر لوگ اس شکر کو کچے چمڑے کے سلے ہوئے تھیلوں میں بند کرکے مختلف ممالک کو لے جاتے تھے۔ شکر کی ان مختلف اقسام کے علاوہ بنگال میں دانے دار شکر بھی تیار کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کی قند اور پھلوں کے مربّے

---

[۱] قران السعدین ص ۱۷۳، جس میں بنانے کا طریقہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

[۲] دیکھیے ایک دل چسپ مثال جس میں بتایا گیا ہے کہ بلبن کے زمانے میں شاہی فرمانوں کو حقیقی معنوں میں دھو کر صاف کر دیا جاتا تھا۔ برنی ص ۶۴۔ امیر خسرو نے اعجازِ خسروی اور برنی نے اپنی تصانیف میں دہلی کے کتب فروشوں کا ذکر کیا ہے۔

[۳] امیر خسرو کی تفصیلات۔ دیکھیے کلیاتِ خسرو ص ۴۰،

بھی بنائے جاتے تھے۔[1] ہم عصر کتابوں میں اس امر کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ شکر پورے ملک میں کثرت سے استعمال کی جاتی تھی۔ اُس کی مٹھائیاں اور میٹھے کھانے تیار ہوتے تھے اور بازار میں شکر اور شیریں مشروبات تیار ہوتے تھے۔ شہد بھی پورے ملک میں جمع کیا جاتا تھا لیکن نہ تو اُس کا استعمال ہی عام تھا نہ اسے برآمد کیا جاتا تھا۔

(۶) چمڑے کا کام

ایک خاصا بڑا طبقہ چمڑے کے کام پر گزر بسر کرتا تھا جو آج کل بھی ایک الگ ذات چمار (چرم ساز) کے نام سے موجود ہے۔[2] چمڑے کے سامان کی مانگ بہت زیادہ نہ تھی لیکن عام لوگ چمڑے سے بنی اشیا استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر دہلی کا سلطان ہر سال تقریباً دس ہزار سے زاید گھوڑے اپنے امرا کو بطور عطیہ دیتا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر چمڑے کی لگام اور زین سے لیس ہوتے تھے۔[3] تلواروں کی نیام، کتابوں کی جلدیں اور جوتے اعلیٰ طبقہ میں عام استعمال کی چیزیں تھیں اور یہ سب چیزیں عام طور پر چمڑے کی ہوتی تھیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے بنگال سے شکر برآمد کرنے کے لیے چمڑے کے تھیلوں میں بند کیا جاتا تھا۔ اسی طرح ایک عام کسان اپنے چمڑے کے بنے ہوئے پانی کے ڈول، سرد موسم میں استعمال کرنے کے لیے جوتوں اور متعدد چھوٹی چھوٹی روزانہ زراعتی استعمال کی چیزوں کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتا تھا اور یہ سب چیزیں چمڑے کی بنی ہوتی تھیں۔ ان اشیا کے علاوہ چند اور اہم ترین اشیا بھی چمڑے کی بنی ہوتی تھیں۔ گجرات میں سرخ اور نیلے رنگ کی چمڑے کی چٹائیاں بنتی تھیں جو پرندوں اور درندوں کی تصاویر سے مزین ہوتی تھیں اور بڑی مہارت کے ساتھ ان پر سونے اور چاندی

---

[1] دیکھیے ماہوان۔ جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۵ء ص ۵۳۱ جو چینی کی برآمدی تجارت کو بہت نفع بخش سمجھتا ہے۔

[2] متعدد مقامات پر چمڑے کا کام کرنے والوں کی انجمن کے لیے دیکھیے اعجازِ خسروی

[3] مسالک الابصار کی دی ہوئی تفصیلات دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد سوم ص ۵۷۸۔

کے تاروں سے گل کاری کی جاتی تھی۔ وسیع پیمانے پر جانوروں کی کھالوں کو آراستہ کیا جاتا تھا۔ مثلاً بکری اور بیل کی کھال، بھینس اور جنگلی بھینسے کی کھال اور گینڈے وغیرہ کی کھال۔ درحقیقت گجرات میں ہی بہت زیادہ کھالیں تیار کی جاتی تھیں اور جہازوں میں بھر کر عرب اور دیگر ممالک کو بھیجی جاتی تھیں[۱]

صنعتی مزدوروں کی حیثیت

ہندوستان کی ان اہم صنعتوں کے تفصیلی ذکر کے بعد ان کے صنعتی مزدوروں کی حیثیت کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ اپنے خصوصی معاملات میں صنعتی مزدور دیہی کاریگروں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے اور جملہ بہتر و بدتر حالات میں ان ہی کی طرح تھے صنعتی برادریاں ذاتوں پر مشتمل اور آبائی تھیں۔ ان کے اوزار اور کام کے طریقے بھدے تھے اور اگرچہ ان کا تیار کیا ہوا مال بہترین قسم کا ہوتا لیکن مجموعی پیداوار بہت کم ہوتی۔ علاوہ ان لوگوں کے جو سرکاری کارخانوں میں کام کرتے تھے یا سرکاری ملازم تھے۔ حکومت ان کے حقوق کی مناسب حفاظت نہیں کرتی تھی۔ صنعتی اشیا کی سپلائی اعلیٰ طبقے کے گنے چنے افراد تک محدود تھی اور یہ طبقہ کپڑے کی چند اقسام، دھات یا لکڑی کی چند اشیا، تعمیری فن کی چند مقررہ صورتوں اور دیگر اشیا کی بڑی محدود تعداد استعمال کرتا تھا۔ کاریگر پوری قوم کی وسیع تر ضرورت کے بارے میں نہیں سوچتا تھا۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان اشیا کی صنعت کارانہ قیمت بہت زیادہ تھی اور ہندوستانی کاری گر کے کام کے طویل دور میں اس کی ہنرمندی میں غیر معمولی اضافہ ہوا[۲]۔ یہ بدقسمتی کی بات تھی کہ پیشہ ور

---

[۱] مارکو پولو کی رائے جو ان چٹائیوں کو انتہائی خوب صورت سمجھتا تھا۔ یول جلد دوم۔ ص۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔

[۲] باربوسہ کا خیال ہے کہ کھمبایت میں ہر فن کے بہترین کاری گر تھے۔ جلد اول۔ ص ۱۴۲۔ وارتھیما کی رائے میں ہندوستانی دنیا بھر میں عظیم ترین اور انتہائی باصلاحیت کاری گر ہیں ص ۲۸۶۔

برادریوں اور صنعت کے میدان کے اساتذہ میں علیحدگی پسندانہ رجحان بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوا اور بعض حالات میں صنعتی ہنرمندی کے رازہائے سربستہ ان کے ساتھ ہی دفن ہو گئے اور آنے والی نسلیں ان سے استفادہ نہ کر سکیں[۱]۔

کاروبار اور تجارت

اگر کئی سال تک اچھی فصل ہو جاتی تھی تو ہمیشہ کسانوں کے پاس اتنا اناج ضرور بچ جاتا تھا جسے وہ کسی قریبی قصبہ یا منڈی میں لے جاکر فروخت کر دیتے تھے صنعتی اشیا عموماً بازار میں مناسب قیمت پر فروخت کرنے کے لیے بنائی جاتی تھیں دولت مند طبقہ ہمیشہ غیر ممالک سے درآمد کی ہوئی اشیا کی تلاش میں رہتا تھا۔ سلطان ہمیشہ اپنے اصطبل میں گھوڑوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے غیر ممالک سے گھوڑے منگاتا رہتا۔ اس قسم کی ضروریات نے مال کے اندرون و بیرون ملک بھیجنے اور مال کے غیر ممالک سے تبادلے کے زیادہ مواقع فراہم کیے۔ درحقیقت ہندوستان کی اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک میں تجارتی روایات بہت قدیم تھیں۔ سامان ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے والوں اور تاجروں کے لیے مال پہنچانے اور لانے کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو چکا تھا۔ اندرونِ ملک خبر رسانی کے لیے پورے ملک میں سڑکوں اور پیدل راستوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان راستوں کو حکومتِ وقت اپنی انتظامی ضروریات کے پیشِ نظر اچھی حالت میں رکھتی تھی۔ اس کی وجہ خصوصاً یہ بھی تھی کہ بھاری سازوسامان کے ساتھ بڑی افواج کی نقل و حرکت کے لیے یہ راستے ناگزیر تھے اور تاجروں کو اندرونِ ملک ان سہولیات سے استفادہ کرنے کی اجازت تھی۔

چوں کہ اس دور میں موجودہ ترقی یافتہ بحری ذرائع مہیا نہ تھے اور دخانی جہاز استعمال نہ ہوتے تھے اس لیے بحری سفر میں بظاہر بڑے خطرات تھے۔ بحری قزاقوں کا

---

[۱] باربوسہ جلد دوم ص ۱۴۶۔ بنگال میں عورتیں کاتنے اور عمدہ کپڑا بننے کے کام سے بالکل مستثنیٰ تھیں۔ وارتھیما۔ ص ۲۱۴۔

خطرہ بھی کچھ کم نہ تھا لیکن ان خطرات کے باوجود عرب اور ہندوستان کے ساحلی باشندے بحری تجارت کرتے تھے اور دوسرے غیر ملکی تاجر بھی بہت سے ممالک سے تجارت کرتے تھے۔ ایک کامیاب بحری سفر سے جس قدر نفع حاصل ہونے کے امکانات ہوتے تھے اس سے کہیں زیادہ نقصان یا تباہی کا خوف تھا۔ چند غیر ملکی تاجروں کے دوسرے ممالک میں مستقل ادارے اور ایجنسیں بھی تھیں۔ اندرونِ ملک سامان ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے کی سہولیات زیادہ تھیں۔ ان جملہ حالات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان میں غیر ملکی اور داخلی تجارت کے اچھے اور بہتر مواقع تھے۔

(الف) داخلی تجارت

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ہندوستان بڑی قدیم تجارتی روایات کا حامل رہا ہے سماج کے ذاتوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے ایک ذات ویش وجود میں آئی جس کا ذریعۂ معاش ہی تجارت تھا۔ شمالی ہند کے گجراتیوں (یا مارواڑیوں) کا قدیم تجارت پیشہ طبقہ اور جنوبی ہند کے چیتی اس دور میں بھی اپنا قدیم اور باعزت مقام رکھتے اور تجارت کرتے ہیں۔ گزشتہ صدی تک اناج کا بیوپار کرنے والے راجپوتانہ کے بنجارے ہزاروں بیلوں کے ذریعہ تجارت کرتے تھے۔ ان کے بعض کارواں میں چالیس ہزار تک بیل ہوتے تھے[1]

چھوٹے چھوٹے دیہی بازاروں کا ذکر اس سے پیشتر ہو چکا ہے۔ شہر کے بازاروں کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ بازار کی مستقل دوکانوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے دکاندار اور تاجر بھی گھوم گھوم کر یا بیل پر سامان لاد کر مال فروخت کرنے والے عام تھے[2] منڈیوں اور بڑے قصبوں میں بڑے پیمانے پر مال فروخت ہوتا تھا ان منڈیوں میں گرد و نواح کے علاقوں سے بیچا ہوا اناج یا دیگر اشیا فروخت ہونے کے لیے لائی جاتی تھیں۔ لاہور اور ملتان جیسے انتظامی مرکز یا دہلی جیسے مرکزی شہر بعض اوقات پورے صوبے کے مال کو سمیٹ لیتے تھے۔ قرب وجوار کے قصبات میں سالانہ یا مقررہ اوقات پر لگنے والے میلوں

---

[1] ٹوڈ۔ جلد دوم ص ۲۱۲۔

[2] انگلینڈ میں وسطی دور میں تجارتی حالات کے لیے دیکھیے سالز مین ص ۳۴۴

میں گرد و نواح کے پرچون کے بیوپاری اور چھوٹے دکان دار اپنے مال کا نیا ذخیرہ خرید لیتے تھے یا پرانے مال کو دوبارہ بھر لیتے تھے۔

مختلف قسم کے جانوروں مثلاً گھوڑے، بیل، اونٹ، گائیں، بھینسیں فروخت کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر مشہور مقامات پر مویشیوں کے میلے لگتے تھے اور لوگ مویشی خریدنے یا فروخت کرنے کے لیے دور دور سے آتے تھے[1]

بڑے پیمانے کا تجارتی کاروبار ایک مخصوص طبقہ یا چند ذاتوں تک ہی محدود تھا قصبوں کے چھوٹے چھوٹے کاروبار پیشہ ور تاجروں کے ہاتھوں میں تھے۔ کاریگروں کے چند خصوصی طبقات اپنے تیار شدہ مال کو براہ راست گاہک یا بیوپاری کے ہاتھ فروخت کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ سب لوگ بڑے قدیم رسوم و رواج کے پابند تھے۔ ان کی تجارت کی رہنمائی کے لیے کوئی اخلاقی اصول و ضابطہ نہ تھا سوائے اس کے کہ جو قواعد و ضوابط حکومت مقرر کر دے[2] ہندوستان کی اہم ترین تجارتی اقوام شمالی ہند میں ملتانی اور مغربی ساحل پر گجراتی بنیے تھے۔ موخر الذکر ہندوستان اور غیر ممالک کے مال کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ یہ لوگ مالابار اور کوچین تک پھیل چکے تھے جہاں وہ بیرونی ممالک کے کثیر مال کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ غیر ملکی مسلمان تاجروں کو عام طور پر خراسانی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ پورے ملک میں تجارت کرتے تھے اور دیگر متعدد مسلمان طبقات ساحلی علاقوں میں مال تجارت کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ چند کاروانی یا بنجارے بھی اپنے طور پر تجارت کرتے تھے۔ دکن کی ساحلی حکومتوں کے والیان

---

[1] اسی طرح کی واردات کی ایک مثال کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۱۲

[2] دیکھیے تحفۂ نصائح (قلمی نسخہ) ص ۱۳ ب۔ مسلمان علما غلاموں کی تجارت اور اناج کا ذخیرہ کرنے کو ناجائز قرار دیتے تھے لیکن تجارت پیشہ لوگ ہمیشہ اسے نظر انداز کرتے رہے۔

[3] گجراتی بنیوں کے لیے دیکھیے باربوسہ، جلد دوم ص ۷۲۔
خراسانیوں کے لیے دیکھیے متعدد حوالہ جات اعجاز خسروی اور ابن بطوطہ میں۔ ملتانی اور بنجاروں کے لیے دیکھیے برنی ص ۳۸۵۔ نیز لی بون (اردو ترجمہ ص ۹۱-۹۲) نے ملتانی اور بنجاروں کو جاٹوں کے وہ طبقے بتایا ہے جن کی اکثریت آج کل کاشتکاری کرتی ہے۔

نے غیر ملکی تاجروں کو غیر محدود حقوق اور خصوصی مراعات دے رکھی تھیں۔ یہ تاجر اس کے بدلے میں انھیں معقول رقم محصول کی صورت میں ادا کرتے تھے۔ جنوبی ہند میں تجارت کرنے والے ہندوستانی تاجر بھی ان جملہ حفاظتی اقدامات و مراعات سے مستفید ہوتے تھے۔

وہ تمام طبقات جو عملی طور پر داخلی اور غیر ملکی تجارت میں حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ جن کا یہ صرف ذریعہ معاش تھا سامان لے جانے والوں اور دلالوں پر مشتمل تھا بنجارے، جن کا ذکر ہم اس سے پیشتر کر چکے ہیں زرعی پیداوار اور دیگر سامان کو بڑے پیمانے پر ملک کے مختلف حصوں میں پہنچاتے تھے۔ اپنی خانہ بدوشی کی عادت اپنے متعدد بیلوں، بیل گاڑیوں، چھکڑوں اور متعدد اسباب سے لدے ہوئے گھوڑوں اور ملک کی مختلف شاہراہوں سے ان کی اچھی واقفیت کی وجہ سے وہ اس کام کے لیے خاص طور پر موزوں تھے[1] گجرات اور راجپوتانہ کے خطرناک اور غیر محفوظ دیہی راستوں پر سفر کرنے والے قافلوں کی رہنمائی راجپوتانے کے بھاٹ کرتے تھے[2]

ساحلی علاقوں اور اندرونِ ملک میں عام طور پر تجارتی کاروبار دلالوں کے ایک منظم طبقے کے ذریعہ ہوتا تھا۔ یہ بڑی چالاکی سے اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے تھے اور دونوں فریقوں سے اپنا کمیشن وصول کرتے تھے۔ جب علاؤالدین خلجی نے اپنی سلطنت اور خصوصاً دہلی کی طلب و رسد کو اپنے اختیار میں لینے کا فیصلہ کیا تو اسے دلالوں کے طبقے کو اپنے سخت طریقہ سے دبانا پڑا[3] لیکن جیسے ہی تجارتی معاملات پر حکومت کا دباؤ کچھ ڈھیلا ہوا دلال معمول کے مطابق پھر میدان میں آگئے۔ فیروز تغلق کے زمانے تک دلالوں کے اصولِ تجارت اور معمولات اس حد تک اہمیت اختیار کر چکے تھے کہ ان کا ذکر اس دور کے قانونی خلاصہ جات میں ملتا ہے[4] آڑھت کا رواج تھا اور

---

[1] ملک محمد جائسی کی رائے کے لیے دیکھیے پدماوت ص ۴۸۴

[2] دیکھیے حوالہ کے لیے ٹوڈ نیز سیدی علی رئیس

[3] برنی (قلمی نسخہ) ص ۱۵۵

[4] فقہ فیروز شاہی ص ۲۴۰۔ب۔ کہ اگر کسی دلال نے کسی شئے کو فروخت کرنے کے لیے دونوں فریقوں
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آڑھتی کے ذریعہ مال کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ بڑے بڑے تاجر وکیل ملازم رکھ لیتے تھے جو ان کی طرف سے مال کی خرید و فروخت کرتے تھے[1] مقامی ساہوکار آجکل کے بینکوں کی طرح فرائض انجام دیتے تھے۔ وہ سود پر روپیہ دیتے تھے اور ہنڈی کے ذریعہ رقم وصول کرتے تھے[2] دیگر تجارتی سہولتوں کے ساتھ ساتھ سود پر روپیہ دینے کا عام رواج تھا۔ رقم لیتے وقت اقرار نامہ تمسک لکھے جاتے تھے۔ طے شدہ سود کی شرح مقرر کرنے اور رقم واپس نہ ہونے کی صورت میں رقم لینے والے کے خلاف عدالتی کارروائی کرنے کے لیے واضح قوانین مقرر تھے اور یہ سب قوانین حکومت کی عدلیہ نافذ کرتی تھی[3]

تجارت کے دیگر دستور و معاملات سے قطع نظر ہم ساہوکاروں کے مسئلے پر روشنی ڈالیں گے۔ ہندو اور مسلمان اقوام دونوں کا ایک معتدبہ طبقہ سود کے کاروبار کے ذریعہ

(گزشتہ سے پیوستہ) سے بات کرلی ہو اور بعد میں سودا ناکام ہوجائے اس حالت میں جب کہ دلال کی کوئی غلطی نہ ہو اور سودے کے جملہ مراحل طے ہو چکے ہوں تو دلال کو اپنا کمیشن واپس کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا چوں کہ اس رقم کو وہ اپنا صلہ محنت تصور کرتا ہے۔

[1] دیکھیے لیک مثال واقعات مشتاق ص ۲۱۔

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا۔ ایڈیشن ۱۹۲۹ء جلد سوم ص ۴۴۔ دیگر فرائض کے علاوہ بینک مندرجہ ذیل سہولتیں مہیا کرتا تھا (۱) عوام کے روپیہ کو حفاظت سے رکھنا (۲) کسی کاروبار میں لگانا اور معاہدے کے مطابق اصل رقم کو ضرورت پر واپس کرنا (۳) ادائگی کے ذرائع کا انتظام کرنا مثلاً کھاتے، بنک نوٹ اور چک وغیرہ۔ نیز ہندوستان میں دیسی بینکوں کی تعریف کے لیے دیکھیے جین ص ۱۰۔ "کوئی انفرادی یا عوامی ادارہ جو سود پر روپیہ قرض دینے کے علاوہ یا تو روپیہ جمع کرتا ہے یا ہنڈی کا یا دونوں کا کاروبار کرتا ہے۔" نیز مثال کے لیے دیکھیے لودیوں کے زمانے میں ایک مثال۔ واقعات مشتاق ص ۳۱ ب۔ دیکھیے برنی کی رائے کہ کبھی کبھی مقروض امرا روپیہ کے معاوضہ میں یا نقد روپیے کر ان دیسی ساہوکاروں کے نام اقطاع سے روپیہ وصول کرنے کے حقوق سپرد کر دیتے تھے (دیکھیے برنی ص ۶۳) اسی طرح دیکھیے کھلاق یا نقد نامہ کا طریقہ جس نے فیروز تغلق کے دور میں رواج پایا۔ بیرونی علاقوں میں سپاہیوں کو یہ نقد نامے حکومت کی طرف سے دیے جاتے تھے اور دہلی کے ساہوکار کمیشن کی ایک مقررہ رقم لے کر ان نقد ناموں کے بدلے روپیہ ادا کر دیتے تھے۔ دیکھیے جین ص ۱۰۔

[3] تاریخ فیروز شاہی جلد اول ص ۱۹۶ برائے مثال

دولت مند ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ لوگ تجارت کو فروغ دینے کے لیے سود پر روپیہ قرض دیتے تھے لیکن ان کا خاص کاروبار زیادہ شرح سود پر روپیہ قرض دینا تھا۔ یہ ساہوکار اور مہاجن لوگ اعلیٰ طبقے میں بڑے مقبول تھے جن کی فضول خرچی اور روپیہ کی مستقل طلب ضرب المثل بن چکی تھی۔ سود کی شرح کے بارے میں یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن امیر خسرو کے بیانات کے تقابلی مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ شرح بڑی رقوم پر ۱۰ فی صدی سالانہ اور چھوٹی رقوم پر ۲۰ فی صدی سالانہ تھی[۱] بہت زیادہ شرح سود اور سود مرکب کی شرح کی وجہ سے غریب طبقہ بری طرح قرض کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی رقوم سود پر لیتے تھے لیکن واپسی مشکل ہی سے کر پاتے تھے۔ اس کے برخلاف امرا کے ذرائع غیر محدود تھے اور آخری حربہ کے طور پر ان کا اثر و اقتدار ان کے بہت کام آتا تھا[۲] اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ لوگ اپنی رقم یا قیمتی اشیا کو ہمیانی اور سخت کپڑے کی خالی تھیلیوں میں رکھتے تھے سفر کے دوران اسے عام طور پر اپنی کمر کے گرد باندھ لیتے تھے[۳]

جہاں تک تجارتی اخلاق کے معیار کا تعلق ہے یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ زمانۂ وسطیٰ کے تاجروں کے اخلاقی معیار ہر ملک میں عموماً بلند نہ تھے اور چوں کہ اس زمانہ میں موجودہ دور کی تجارتی انجمنوں کی طرح کوئی نظام نہ تھا اس لیے یہ اخلاقی پستی غیر اخلاقی نہ تھی۔ یہ لوگ بے ایمانی سے روپیہ کمانے کا کوئی ذریعہ نہ چھوڑتے تھے۔

---

[۱] مسلمان ساہوکاروں کے لیے دیکھیے مطلع الانوار ص ۱۵۰۔ سود کی شرح کے لیے دیکھیے کلیاتِ خسرو ص ۲۱۲۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ ایک تنکہ پر ایک ماہ میں تقریباً ایک جیتل سود ہوتا تھا یعنی تقریباً ۲۰ فی صدی سالانہ۔ اعجازِ خسروی میں دس فی صدی کا بھی خاص طور پر ذکر ہے جس کا اطلاق غالباً بڑی رقموں پر ہوتا ہے۔ اسی طرح مطلع الانوار ص ۱۵۰ پر اس نے ذکر کیا ہے کہ سود کی ادائیگی ماہانہ ہوتی رہتی تھی۔

[۲] قو کی پاس آمیز آہ و بکا۔ اس نے ایک گاؤں میں جاکر دیکھا کہ نہ وہاں ادھار کا طریقہ ہے اور نہ کوئی سود پر روپیہ قرض دیتا ہے۔ دیکھیے ٹمپل ص ۱۸۵۔ نیز تحفۂ نصائح ص ۱۵ پر قرض لینے کی خامیاں بیان کی گئی ہیں۔

[۳] دیکھیے برنی ص ۱۳۰ - ۱۳۱

اشیاء میں ملاوٹ اور کم تولنے کی وبا عام تھی اور کسی قسم کی پند و نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی۔[۱] سلطان علاؤالدین خلجی نے ان کے معمولات پر بڑی سختی سے نگاہ رکھی اور مجرموں کو بڑی عبرت ناک سزائیں دیں۔ ان کی نگرانی کے لیے خصوصی اور خفیہ افسران مقرر کیے گئے کبھی کبھی سلطان بذاتِ خود ان کی بداعمالیوں کی گرفت کرنے کے لیے چھوٹے بچوں بھیس تبدیل کرا کے بازار میں اشیا خریدنے کے لیے بھیجتا تھا۔ جب سلطان آخر کار تجارتی بے ایمانی اور کاروباری دھوکے بازی کو دبانے یا عارضی طور پر ختم کرنے میں کامیاب ہوگیا تو ملک بھر میں اس کے اس اقدام کے لیے تحسین و آفرین کی صدائیں سنی جانے لگیں اور وقتی طور پر لوگ اس کے ظلم اور عدم اعتمادی کو بھول گئے۔[۲] بہرحال یہ امر باعثِ تسکین ہے کہ بحری تجارت کے غیر محفوظ ہونے اور حکومت کی نگرانی سے آزاد ہونے کے باوجود ساحلی قصبات میں ایک بالکل مختلف اخلاقی ماحول موجود تھا۔ ان قصبات میں ہندوستانی تاجروں کو غیر ملکی تاجروں سے واسطہ پڑتا تھا۔ غیر ملکی سفیروں کی تحریریں یکسانیت کے ساتھ شاہد ہیں کہ ہندوستانی تاجر دیانت دار اور سچے تھے۔ ان کے کاروباری معمولات ایمان داری پر مبنی تھے۔ ان کی ذکاوت قابلِ اعتماد تھی اور ناپ تول میں معمولی سا فرق بھی نہ تھا۔[۳]

---

[۱] انگلینڈ کے بارے میں دیکھیے سالزمین ص ۷۵، نیز دوکان داروں کے بے ایمانی کے طریقوں پر Berthold of Ratisbon. کی نصیحت کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۲۷۱ نیز اعجازِ خسروی جلد اول ص ۱۷۴۔ کبیر کے لیے دیکھیے شاہ ص ۱۹۲۔ خصوصاً دیکھیے برنی کی رائے اور اس کے مشاہدات جس نے علاؤالدین خلجی کے سخت قوانین کی گرم جوشی سے حمایت کی ہے اور تجارت پیشہ لوگوں کو اس نے انتہائی دروغ گو اور بہتر فرقوں میں کمین ترین افراد قرار دیا ہے۔ برنی ص ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۴۳۔

[۲] شمس الدین نام کے ایک مشہور عالم ہندوستان اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں آئے تھے لیکن سلطان کے ذاتی افعال کے حال کو دیکھ کر بددل ہوکر واپس چلے گئے۔ چوں کر سلطان شریعت کے اصولوں کی طرف سے قطعی بے حس تھا۔ عالم کے خیال کے مطابق تجارتی دھوکا دہی کو ختم کرنے میں علاؤالدین کی کامیابی آدم علیہ السلام کے زمانے سے اب تک ایک مثالی کارنامہ تھا۔ (برنی ص ۲۹۸)

[۳] وار تھیما ص ۱۶۸

ہندوستان کی داخلی تجارت کے سلسلے میں صحیح اندازہ لگانا ناممکن ہے عام حالات میں دیہاتوں اور ان کی منڈیوں میں نسبتاً بڑے پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی تھی۔ یہ بات ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دہلی اور دیگر صوبوں کے دارالخلافہ اپنے اپنے صوبوں کی داخلی تجارت کے مرکز تھے اور ان شہروں میں خاصی تجارتی چہل پہل نظر آتی تھی۔ علاوہ ان حالات کے جب کہ تجارت پر حکومت کی اجارہ داری ہو یا حکومت کا انتظام سخت ہو، مجموعی طور پر ہندوستان کی داخلی تجارت بڑے پیمانے پر تھی[1] ہم عصر مورخین کے یہاں ایسے متعدد حوالے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر بہت سے تاجروں نے تجارت کے ذریعہ کثیر دولت جمع کر لی تھی۔ یہ حوالے اس دور کی داخلی تجارت اور اس کی مقدار پر کس حد تک روشنی ڈالتے ہیں یہ کہنا مشکل ہے[2]

(ب) غیر ملکی تجارت

بیرونی دنیا کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات ہمیشہ بہت اچھے رہے ہیں

---

[1] راجپوتانے میں داخلی تجارت پر اجارہ داری کے اثرات کی مثال کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۱۱۱۰ "تجارت پچھلے بیس سال میں تقریباً برباد ہو چکی ہے اور یہ بات بظاہر مہمل لیکن دراصل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس سفاکانہ جنگ کے زمانے میں دس گنی زیادہ حرکت اور مستعدی دکھائی دی۔ اس جنگ نے آج کل کے عالمی امن و امان کے مقابلے میں ہندوستان کو ایک وسیع میدانِ کارزار میں تبدیل کر دیا تھا۔ اجارہ داری کے زیادہ تباہ کن اثرات kitars (قافلوں کی قطاروں) پر صحرائے ریگستان کے نیزوں سے زیادہ پڑا ہے۔

[2] مثلاً دیکھیے فریمپٹن ص ۱۲۵ اور میجر ص ۲۲ جس میں نکولو کونٹی کا بیان ہے کہ اگرچہ دریائے سندھ اور گنگا کے مابین تاجر لوگ اس قدر دولت مند تھے کہ ان میں سے ایک کے پاس چالیس جہاز تھے جنھیں وہ صرف اپنے مال کے لانے لے جانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ ان جہازوں میں ہر ایک کی قیمت ․․․․ ۵ ڈوکیٹ (سونے کے سکے) تھی۔ نیز دیکھیے جین ص ۱۰ جس میں جین برادری کے دو ساہوکاروں کا ذکر ہے جنھوں نے ۱۲ویں صدی میں اپنے خرچ سے ماؤنٹ آبو پر دلواڑے کا عمدہ ترین جین مندر تعمیر کرایا تھا۔ جین کا خیال ہے کہ اس کام میں ان کا بہت روپیہ خرچ ہوا ہوگا۔

حتی کہ بہت قدیم دور میں بھی اس کے تعلقات اتنے ہی اچھے تھے۔ وسطی دور میں اسلام کی ترقی اور سمندر پر عربوں کی بالادستی کی وجہ سے یورپ کے ساتھ ہندوستان کے بالواسطہ تجارتی روابط ختم ہوگئے تھے لیکن اس کی وجہ سے ہندوستان کی تجارت پر کوئی برا اثر نہ پڑا اور ہندوستان کا مال مغربی ممالک میں فروخت ہوتا رہا۔ یہ مال عرب تاجر بحر احمر تک لے جاتے تھے، وہاں سے یہ دمشق اور اسکندریہ جاتا تھا جہاں سے یہ مال بحر روم کے ساحل پر واقع ممالک میں اور آگے تک جاتا تھا۔ ہندوستانی مصنوعات کو موری تاجروں کے گماشتے مشرقی افریقہ کے ساحل جزائر ملایا اور مشرق بعید میں چین اور بحر الکاہل کے دیگر ممالک میں لے جاکر فروخت کرتے تھے۔ اسی طرح خشکی کے راستے سے ہندوستان کی تجارت وسط ایشیا، افغانستان اور ایران کے ساتھ براہِ ملتان اور کوئٹہ، درہ خیبر اور کشمیر سے ہوتی تھی۔ تاجروں کے قافلے انھیں قدیم راستوں سے ہندوستان اور بخارا۔ عراق اور حتی کہ دمشق تک اکثر آتے جاتے تھے۔

بحری تجارت

سولھویں صدی کے تقریباً وسط میں پرتگالیوں کی آمد سے پیشتر ساحلی علاقے نسبتاً محفوظ تھے۔ اس کے برخلاف خشکی کی سرحدیں ہر وقت منگول حملہ آوروں کی وجہ سے غیر محفوظ تھیں۔ بحری راستے موری تاجروں کے قبضے میں تھے۔ ہندوستان کی بحری تجارت خاصے بڑے پیمانے کی تھی اور کم وبیش مکمل طور پر انھیں تاجروں کے قبضے میں تھی۔ اعلیٰ طبقے کے استعمال کے لیے عیش وعشرت کا سامان خاص طور پر غیر ممالک سے درآمد کیا جاتا تھا اور ہر قسم کے گھوڑے اور خچروں کی تجارت بھی اس میں شامل تھی۔

عیش وعشرت کے سامان میں ریشم، مخمل، نقشین پردوں اور دیگر سامان آرائش کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں زربفت اور دیگر ریشمی ملبوسات جزوی طور پر اسکندریہ، عراق اور چین سے درآمد کیے جاتے تھے۔ اسی طرح ہم عصر مورخین کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یورپ کا بنا ہوا عیش وعشرت کا سامان گجرات کے شاہی خاندان کے لیے منگایا جاتا تھا[1] ہمایوں کے دور تک

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۱۹۸ (لکھنؤ ایڈیشن)

یہ غیر ملکی مصنوعات ہندوستان کے امرا اور شاہی خاندانوں میں بڑی مقبول تھیں[۱]۔ بندوق بارود اور دیگر مشینی ہتھیاروں کی صنعت کی وجہ سے ہندوستان کی درآمدی تجارت کو ایک نئی زندگی ملی۔ سونا، چاندی، تانبہ اور توتیہ (گندھک کا نیلا تیزاب) بھی کم مقدار میں ہندوستان میں درآمد کیے جاتے تھے[۲]۔

ہندوستان میں گھوڑوں کی بڑی مانگ تھی۔ گھوڑوں کی عسکری مقاصد کے لیے بڑی تعداد میں ضرورت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی یہ جانور عموماً آمد و رفت، گھڑسواری اور دوڑ میں استعمال ہوتے تھے۔ چنیدہ گھوڑے ہندوستان کے بازاروں میں بڑے مقبول تھے۔ گھوڑوں کے شوقین صرف مسلمان نہ تھے بلکہ ہندوؤں کے بھی قدیم عسکری طرزِ فکر میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی اور دھیرے دھیرے وہ ہاتھیوں کے بجائے گھوڑے رکھنے لگے تھے۔ دکن اور راجپوتانہ کی ہندو ریاستوں میں گھوڑوں کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ دکن میں ان کی مانگ خصوصاً زیادہ تھی کیوں کہ وہاں آب و ہوا اور دیگر حالات کی وجہ سے گھوڑوں کی پرورش ممکن نہ تھی اس لیے وقتاً فوقتاً گھوڑے غیر ممالک سے منگائے جاتے تھے۔ سلطان کے سالانہ تحفوں کے لیے ہر ملک سے بہترین گھوڑے منگائے جاتے تھے۔ سلطان ان کی معقول قیمت ادا کرتا تھا[۳]۔ اس کے علاوہ گھوڑے شاہی اصطبل کے لیے بھی مستقل خریدے جاتے تھے۔ خشکی کے راستے سے گھوڑوں کی درآمد کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔ یہاں یہ بیان کرنا کافی ہے کہ کچھ اصیل گھوڑے دھوفر (یمن کی آخری حدود پر) کس، ہورمز اور عدن سے منگائے جاتے تھے جب کہ دیگر گھوڑے اور خچر ایران سے درآمد کیے جاتے تھے[۴]۔

۱۔ ہمایوں کے دور میں شاہی دعوتوں میں آرائش کے لیے اٹلی اور پرتگال کا سامان استعمال ہوتا تھا، جس کا ذکر آگے کسی باب میں کیا جائے گا۔ سلطان ابراہیم سور انتہائی شاندار چھتر جس پر یورپین مخمل اور پرتگال کا زرجابا کام تھا استعمال کرتا تھا۔ ایضاً ص ۴۲۳

۲۔ دیکھیے یول جلد دوم ص ۳۹۸

۳۔ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد سوم ص ۵۷۸

۴۔ مارکو پولو کی دی ہوئی تفصیلات کے لیے دیکھیے (جو خچروں کو گدھے لکھتا ہے) یول جلد اول ص ۸۳-۸۴۔ ایضاً جلد دوم ص ۳۴۰۔ ابن بطوطہ کا بیان کتاب الرحلہ میں جلد اول ص ۱۵۶۔ دیکھیے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہندوستان سے مختلف اشیا درآمد کی جاتی تھیں۔ان میں مختلف دیسی ساخت کی اشیا خصوصاً اناج اور سوتی کپڑا قابلِ ذکر ہیں۔ خلیج فارس کے گردونواح کے چند ممالک اشیائے خوردنی صرف ہندوستان سے خریدتے تھے[1] بحرالکاہل کے جزائر، جزائر ملایا اور افریقہ کے مشرقی ساحل پر جملہ ممالک میں ہندوستان کے سامان کے لیے اچھا بازار تھا۔ ہندوستان کی برآمدی تجارت خصوصاً بنگال اور گجرات کے بندرگاہوں سے ہوتی تھی۔قیمتی پتھر، تیل، کپاس، چمڑا اور دیگر ایسی متعدد اشیاء تجارت جن کا بیان میں لانا مشکل ہے، گجرات کی خصوصی برآمدی تجارت میں شامل تھیں۔ برآمدی اشیا میں سوتی کپڑا اور دیگر قسم کے کپڑے خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ دیگر گھٹیا برآمدی اشیا عقیق gin gelly۔تیل، خوشبودار لکڑی، خوشبودار تیل، جست اور تانبہ ملی ہوئی دھاتیں[2] افیون اور نیل تھیں اور دیگر چند ادویات بھی جن کا یورپ والوں کو علم نہ تھا لیکن ملکا اور چین کے لوگ ان کی بڑی قدر کرتے تھے[3] زرعی پیداوار میں کافی مقدار میں گیہوں باجرہ، چاول، دالیں، تیل کے بیج، خوشبوئیں اور اسی قسم کی اشیا شامل ہیں۔ اسی

(گزشتہ سے پیوستہ) سلطان علاؤالدین خلجی کی موت کی تفصیلات جو چتوڑ پر حملہ آور ہوئی تھی جس کا ذکر ملک محمد جائسی نے کیا ہے۔ ملک محمد جائسی نے متعدد ممالک کے گھوڑوں کا ذکر کیا ہے مثلاً عراق، ترکستان بلخ اور بھوٹان وغیرہ۔ پدماوت (ہندی) ص ۲۲۷

[1] ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ قلہت کے باشندے تقریباً کل سامان، اناج کپڑا وغیرہ ہندوستان کا استعمال کرتے تھے۔کتاب الرحلہ جلد اول ص ۱۵۰۔ چاول اور یمن کا کچا کھانا ہندوستان سے درآمد کیا جاتا تھا۔ایضاً ص ۱۵۶

[2] دیکھیے یول جلد دوم ص ۳۹۸۔ میجر ص ۹۔ فریبیٹن ص ۱۲۷۔ باربوسہ کا بیان ہے کہ "پردوں کے لیے بڑی کثرت سے سوتی ململ اور دوسرے اسی قسم کے سفید اور معمولی کپڑے خلیج فارس کے متعدد ملکوں اور جزائر ملایا میں بذریعہ جہاز بھیجے جاتے تھے۔ گجرات میں برآمد کی جانے والی اشیا میں اس نے متعدد چھپے ہوئے کپڑوں، ریشم اور ململ کا ذکر کیا ہے (دیکھیے ذیل کے صفحات میں) نکیتن نے گجرات سے برآمد کی جانے والی اشیا میں کمبلوں کا بھی ذکر کیا ہے۔(دیکھیے میجر ص ۱۹)

[3] دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۵۴-۱۵۶

فہرست کو کسی بھی طرح طویل نہیں کہا جا سکتا۔ وارتھیما کا خیال ہے کہ بنگال کپاس، ادرک، شکر، اناج اور ہر قسم کے گوشت کے لیے دنیا بھر میں دولت مند ترین ملک تھا۔ باربوسہ شکر کو بنگال کی خاص برآمدی شے شمار کرتا ہے اور دوسری اشیا کے لیے بھی کسی حد تک وارتھیما سے متفق ہے[1] باروس کا خیال ہے کہ شیر شاہ کے برسر اقتدار آنے سے پہلے بنگال کی دولت وجے نگر اور گجرات کی مشترکہ دولت کے برابر تصور کی جاتی تھی[2] یہ امر واضح نہیں ہے کہ بنگال کی دولت مندی کا انحصار کس حد تک اس کی برآمدی تجارت پر تھا۔

چوں کہ اس زمانے میں درآمد و برآمد کے اعداد و شمار نہیں رکھے جاتے تھے اس لیے ہندوستان کی غیر ملکی تجارت کی صحیح مقدار کا تعین مشکل ہے۔ موجودہ دور کے وسیع اور روز افزوں اعداد و شمار کے مقابلے میں اس دور میں غیر ملکی تجارت بہت کم تھی غیر ممالک کو مال روانہ کرنے کے لیے گجرات میں کھنبایت میں اور بنگال میں بنگالہ شمالی ہند کی دو اہم بندرگاہیں تھیں[3] وارتھیما کا خیال ہے کہ انھیں دونوں بندرگاہوں سے ریشمی اور سوتی کپڑا، ایران تاتاری، ترکی، شام، بربر یعنی افریقہ، یمن کا زرخیز علاقہ، حبش، ہندوستان اور متعدد دیگر آباد جزائر کو بھیجا جاتا تھا۔ وہ مختلف ممالک کے تقریباً ۳۰۰ جہازوں کا ذکر کرتا ہے جو ہر سال کھنبایت آتے تھے اس کے اندازے کے مطابق بنگال میں ریشمی اور سوتی کپڑا اتنا تیار ہوتا تھا جس سے پچاس جہاز بھر کر غیر ملکوں کو روانہ کیے جاتے تھے[4] جہازوں میں اوسطاً بار برداری کی کتنی گنجائش ہوتی تھی یہ کہنا بہر حال مشکل ہے۔ اس سلسلے میں اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے ویسے جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں وہ بہت غیر واضح ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خلیج فارس کے ارد گرد کے ممالک اور ان ممالک میں جن کی حدود بحر احمر اور بحر ہند سے متصل تھیں، ہندوستان کی مصنوعات کی کافی کھپت تھی لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ

---

[1] ایضاً جلد دوم ص ۱۴۵-۱۴۷

[2] باربوسہ جلد دوم ضمیمہ ص ۲۴۶

[3] بنگالہ کے لیے دیکھیے ضمیمہ اور انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر از مورلینڈ۔

[4] وارتھیما جلد سوم ص ۲۱۲

ان ممالک میں ہندوستان کے مال کی کتنی مانگ تھی۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی تجارت، اس کی امکانی دولت اس کی ترقی کے مواقع اور آخر کار خود ہندوستانی مال کی کھپت ہی کی وجہ سے شاہِ پرتگال کی توجہ ہندوستان کی طرف مبذول ہوئی جو ہندوستان فتح کرنے کے بعد خود کو بڑی آسانی سے دنیا کا دولت مند ترین بادشاہ کہلانے کی آس لگائے بیٹھا تھا۔[1]

بحری تجارت میں ہندوستان کا کوئی قابلِ ذکر حصہ نہ تھا۔ بحری تجارت اور ہندوستان کے سمندر پر غیر ملکی خصوصاً عرب قابض تھے۔ گجرات کے بنیوں، جنوبی ہند کے چیتیوں اور چند موروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا طبقہ جس نے ہندوستان میں رہائش اختیار کرلی تھی غیر ملکی تجارت اور جہازوں کے ذریعہ سمندری راستوں سے مال بھیجنے میں قدرے حصہ لیتا تھا۔ کبھی کبھی دیگر ہندوستانی بھی اس نفع بخش مہمات کی طرف متوجہ ہوتے تھے[2] لیکن مجموعی طور پر اہلِ ہند بحری سیاحت اور بحری تجارت میں بڑے پیمانے پر کبھی حصہ نہیں لیتے تھے۔ ان کے رسم و رواج اور مجموعی طور پر ان کا نقطۂ نظر انھیں ایسے پُرخطر کاموں میں حصہ لینے سے باز رکھتا تھا۔

(۲) خشکی کے راستے سے تجارت

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ہندوستان کی خشکی کے راستے کی تجارت بڑی قدیم ہے۔ اس دور میں منگولوں کی دہشت کے باوجود تاجروں کے کارواں برابر ہندوستان آتے رہے۔ درحقیقت خود منگولوں اور ہندوستان کو جب بھی اپنے پڑوسی ممالک پر

---

[1] دیکھیے وارتھیما کا اختتامی بیان جو اس نے پرتگال کے حکمران کو مخاطب کرکے لکھا تھا۔ ص ۲۹۶

[2] مثلاً دیکھیے بنگال کے ایک دولت مند طبقے کے لوگوں کے بارے میں ماہوان کی رائے بنگال کے دولت مندوں کے بارے میں جو جہاز بناتے تھے اور غیر ممالک سے تجارت کرتے تھے۔ اس کا بیان ہے کہ بنگال کا ایک سلطان بھی جہاز تیار کرکے غیر ملکی تجارت کے لیے باہر بھیجتا تھا (دیکھیے J. R. A. S. ۱۸۹۵ء ص ۵۳۲) بمبئی پریزیڈنسی کے تھانہ، رتناگری اور سورت وغیرہ ضلعوں کے سلسلے میں امپیریل گزیٹر آف انڈیا کے بیانات۔

حملوں سے زیادہ نفع بخش کام سے فرصت ملتی وہ بڑے پیمانے پر مشک، سمور، ہتھیار، باز وں، اونٹوں اور گھوڑوں کی تجارت کرنے لگتے[۱] خراسان کے تاجروں، ترک اور چینی غلاموں اور شوستر کے کپڑے شوستری کا ذکر ہم اس سے پیشتر کر چکے ہیں۔ منگولوں کی دہشت کے ختم ہونے کے بعد غالباً خشکی کے راستے سے تجارت میں فروغ ہوا۔ بابر اور ہمایوں کے زمانے میں جہاں تک خشکی کے ان راستوں کا تعلق ہے تجارت کے لیے حالات معمول پر اور مستحکم نہ تھے لیکن اس دور میں بھی غیر ممالک کے کاروانوں کی آمد اور دوسری طرح کے تعلقات کا ذکر ملتا ہے۔ اکبر[۲] اور اس کے بعد کے طویل دور میں پر امن حالات کی وجہ سے ہندوستان کے اس حصے میں تجارت کے لیے حالات بہت سازگار رہے ہوں گے۔

عیش و عشرت کے دیگر سامان کے علاوہ خصوصاً سمور اور ہتھیاروں کی مانگ بھی تھی لیکن درآمدی تجارت میں گھوڑوں کو اولیت حاصل تھی[۳] منگولوں کی دہشت کے زمانے میں بھی گھوڑے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر درآمد کیے جاتے تھے اور قیمتیں کم ہونے کی وجہ سے دہلی میں ان کی بڑی مانگ تھی۔ ازاق (ترکستان) کے لوگ خاص طور پر ہندوستان کو درآمد کرنے کے لیے گھوڑے پالتے تھے۔ حفاظت کے ساتھ ہندوستان تک پہنچانے اور ان کی راستہ کی دیکھ بھال کے لیے بڑے وسیع انتظامات تھے[۴] ہندوستان کی حدود

---

[۱] فخرالدین مبارک شاہ کی دی ہوئی تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ فخرالدین مبارک شاہ، ص ۳۸

[۲] بابر کے لیے دیکھیے میکافٹ جلد اوّل ص ۱۵۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب میں دہلی، ملتان اور کابل کے باہمی تجارتی تعلقات کاروباری زندگی کا عام جز معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھیے آئین اکبری جلد اول ص ۴۷۔ دیکھیے ابوالفضل نے شاہی نوشیحات کی نذروں اور ایران میں ہمایوں کی دعوتوں کی فہرست طعام اور کھانے کی فراہمی کی تفصیل دی ہے جس میں متعدد ہندوستانی کھانے اور مٹھائیاں شامل ہیں۔ قافلوں کی عام طور پر آمد و رفت کے لیے دیکھیے ایضاً۔

[۳] نیشاپور سے جو خراسان کے چار دارالخلافوں میں سے ایک تھا ریشمی اور مخملی کپڑوں کی برآمد کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد اول ص ۲۳۹۔ نیز کرمان میں ہندوستانی تلواروں کے لیے فولاد سازی کی صنعت کے لیے دیکھیے مارکوپولو۔ یول جلد اول ص ۹۰

[۴] ابن بطوطہ کے بیان کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد اول ص ۱۹۹-۲۰۰۔ ازاق کے لوگ ۶۰۰۰ یا اس

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں داخل ہونے کے بعد ان جانوروں پر عموماً ان کی قیمت کا ایک چوتھائی حصہ محصول کی صورت میں وصول کر لیا جاتا تھا۔ محمد تغلق کے زمانے میں یہ درآمدی محصول کم کر دیا گیا اور گھوڑوں کے تاجر سندھ کی حدود میں داخل ہونے کے بعد سات تنکے فی گھوڑا اور کچھ محصول ملتان میں[1] ادا کرتے تھے اس طرح کہ یہ کل ادائیگی بھی پہلے محصول سے کچھ کم ہی ہوتی تھی۔ خشکی کے راستے سے کی جانے والی تجارت کی مقدار کا مبہم اندازہ بھی لگانا مشکل ہے

ہندوستان میں غیر ملکی تاجر

ہم عصر مورخین نے اپنی تحریروں میں شکایت کی ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے غیر ملکی تاجروں میں ناجائز نفع خوری کا رجحان تھا اور انھیں ہندوستان یا یہاں کے باشندوں کے ساتھ قطعاً ہمدردی نہ تھی۔ محمد تغلق کے دور میں غیر ملکی باشندوں کی مثال ہم پہلے پیش کر چکے ہیں[2] اس الزام کی صحت کو ثابت کرنے کے لیے اس تعداد میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر لوگ عموماً فراموش کر دیتے ہیں کہ غیر ملکی تاجر جو ہندوستان میں آتے تھے کسی بھی ملک سے انھیں کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور جہاں زیادہ نفع کے امکانات ہوتے وہ وہیں چلے جاتے تھے۔ ممکن ہے ان میں سے چند اسلام کی تبلیغ کرنے میں بھی دلچسپی رکھتے ہوں[3]

(گزشتہ سے پیوستہ) کے قریب تعداد میں گھوڑے ہندوستان کو برآمد کرتے تھے۔ ان غولوں میں متعدد تاجروں کے ۲۰۰ گھوڑوں کے حصے ہوتے تھے۔ ہر پچاس گھوڑوں پر ایک نگران مقرر ہوتا تھا جسے قاشی کہتے تھے اور جو راستے میں ان کی اور ان کی خوراک کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

[1] ایضاً جلد اول ص ۲۴۴ - ۲۹۹

[2] دیکھیے ایک عرضداشت جس کا حوالہ امیر خسرو نے دیا ہے (اعجازِ خسروی جلد دوم ص ۳۱۹) یہ عرضداشت ایک افسر انتظام کے نام دہلی کے ایک شہری نے لکھی ہے اور ایک غیر ملکی تاجر کے خلاف دخل اندازی کرنے کی گزارش کی گئی ہے۔ داد خواہ نے اپنے دعوے کو ایک ہی جملے میں کہنے پر اکتفا کیا ہے جسے امیر خسرو بڑی بے باکی کے ساتھ تحریر کرتے ہیں "چوں کہ سونا بڑی تعداد میں ہمارے شاہی شہر دہلی میں ہے اس لیے غیر ملکی تاجر ہمارے ساتھ بظاہر خوشگوار ترین تعلقات بنائے رکھتے ہیں۔ ان کا مقصد دراصل صرف یہ ہے کہ وہ دھیرے دھیرے ہماری خوشحالی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔"

[3] ایضاً

اس کے علاوہ بہت سے لوگ شادی کر کے کسی ملک میں سکونت اختیار کر لیتے ہوں اور اس طرح اس ملک کے لیے ان کے دل میں کچھ ہمدردی پیدا ہو گئی ہو[1] لیکن مجموعی طور پر تاجروں کے پورے طبقے کو تجارت کے فروغ دینے اور زیادہ نفع کمانے ہی سے دلچسپی تھی۔ بہر حال اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ غیر ملکی تاجروں سے سابقہ پڑنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ چند غیر صحت مندانہ سماجی روایات میں بہتری ہوئی اور بعض علاقوں کے باشندوں کے معیارِ زندگی میں ترقی ہوئی۔ ہندوستان کے ساحلی قصبات اور داخلی مرکزی شہر مثلاً ملتان لاہور، دہلی اور گوڑ میں غیر ملکی تاجروں کی زیادہ آمد و رفت تھی اور یہ شہر کئی لحاظ سے ہندوستان کے انتہائی ترقی یافتہ مرکز بن گئے تھے

معیارِ زندگی

(۱) مختلف سماجی طبقات کا معیارِ زندگی

مندرجہ بالا مختلف سماجی طبقات کی آمدنی، خرچ اور کمائی کی مختلف مدوں کا مطالعہ ہمیں اس موضوع کو بہتر طور سے سمجھنے میں مدد و معاون ہوگا۔

(الف) سلطان

سلاطینِ دہلی کے مختلف اداروں کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس موقع پر ان کی مستقل اور غیر مستقل مدات کا مطالعہ مفید ہوگا۔ مثال کے طور پر محمد تغلق ہر سال موسم سرما اور موسم گرما میں اپنے امرا کو ایک ایک خلعت عطا کرتا تھا[2] مسالک الابصار کے مطابق (جس کا حوالہ ہم اس سے پہلے بھی دے چکے ہیں) خلعتوں کی تعداد دو لاکھ تک

---

[1] دیکھیے سکونت قبول کرنے والے ایک تاجر کی دلچسپ مثال جو تجارت اور گرونانک کی تعلیمات کی تبلیغ کے لیے نکلا جاتا ہے۔ مور لوگ بہت سے مسلمانوں کی طرح لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کے رجحانات کے لیے مشہور تھے۔ جلد اوّل۔ میکالف جلد اول ص ۱۴۶ - ۱۴۷

[2] تصدیق کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۶۹ - ۷۰۔

پہنچتی تھی۔ اس حالت میں جب کہ ان خلعتوں میں زربفت، مخمل اور دیگر قیمتی سامان استعمال ہوتا تھا۔ معمولی سے اندازے کے مطابق بھی ان پر بہت زیادہ رقم صرف ہوتی ہوگی۔ اس سلسلہ میں شاہی ذخیروں یا شاہی خزانوں سے تیار شدہ مال کی مدات کی مثال بھی دی جاسکتی ہے۔ سلطان فیروز تغلق کے زمانے میں چیدہ اور نایاب اشیاء سے بھرے ہوئے ۳۶ ذخیرے تھے۔ ان ذخائر کے حکام کو یہ ہدایت تھی کہ وہ نایاب اشیاء اور صناعی کے بہترین نمونوں کو جہاں بھی اور جس قیمت پر بھی ملیں خرید لیں[۱] مثال کے طور پر ایک بار جوتوں کے ایک جوڑے کی قیمت خزانے سے ....، تنکے ادا کی گئی[۲] شاہی استعمال کی اکثر چیزوں پر سونے چاندی، قیمتی زردوزی اور جواہرات کا کام ہوتا تھا۔ کارخانوں میں مختلف شعبہ جات کے سالانہ اخراجات کے تخمینے کا ایک بار پھر تصور کیجیے۔ شاہی اصطبل کے چارے اور دیگر اشیاء خوردنی کا خرچ ۶۰ ہزار سے ایک لاکھ تنکے تک تھا۔ اس میں وہ رقم شامل نہیں ہے جو اصطبل کے ملازمین کی تنخواہ اور دیگر اشیا پر صرف ہوتی تھی۔ وقتاً فوقتاً ان ذخائر کو دوبارہ معمور کرنے میں بھی اسی قدر رقم خرچ ہوتی تھی۔ صرف موسم سرما کا شاہی توشہ خانے کا خرچ چھ لاکھ تنکے ہوتا تھا۔ اس طرح شاہی علم اور نشان پر ۸۰ ہزار تنکے اور فرش اور آرائش پر دو لاکھ تنکے سالانہ خرچ تھا۔ مستقل خرچ کی یہ چند اور بھی مدات تھیں[۳] شاہی غلاموں، حفاظتی دستہ گھریلو ضرورت کے اور ہنرمند کاریگروں کے اداروں، محلوں کی تعمیر، قیمتی ہیرول اور بیش بہا جواہرات پر ہونے والے خرچ کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم ایک بہت ہی ناقابلِ لحاظ لیکن دلچسپ مد گھریلو خرچ کو بھی شامل کر سکتے ہیں جس کی تفصیلات ہمیں آخری سور سلطان عدلی کی دستاویزات سے ملتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملک معظم لو کے سلسلے میں بڑے نازک مزاج اور حساس تھے۔ اس لیے خاکروب روزانہ شاہی بیت الخلا میں سے ۲ یا ۳ بوجھ کافور کے اٹھاتے تھے[۴]

---

۱ دیکھیے عفیف ص ۹۹

۲ ایضاً ص ۱۰۱

۳ عفیف ص ۳۳۷ ۔ ۳۳۸

۴ منتخب التواریخ جلد اول ص ۴۲۵

اب غیر معمولی اخراجات کی چند مدات کو لیجیے جن کی نوعیت سلطنت کے زمانے میں مستقل خرچ کی تھی۔ مثال کے طور پر وہ رقم جو ہر سال شاہی عطیات پر خرچ ہوتی تھی۔ ہر سلطان کسی نہ کسی بہانے سے ہر روز کوئی نہ کوئی چیز لوگوں کو دیتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہی عطیہ اپنی اعلیٰ قسم اور بیش قیمت ہونے کی وجہ سے خاص خصوصیت کا حامل ہوتا تھا۔ کسی دوسرے مقام پر ہم ان شاہی عطیات کی افادیت اور قیمت کا ذکر کریں گے۔ یہاں چند نمایاں واقعات کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ سلطان علاؤالدین خلجی جو خاص اپنی زیادہ سخاوت کی وجہ سے زیادہ مشہور نہیں ہے لیکن جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے بہت زیادہ عطیات سے لوگوں کو نوازا۔ دیگر مواقع پر بھی وہ کچھ زیادہ محتاط اور کفایت شعار نہ تھا۔[1] بے دریغ روپیہ لٹانے کے سلسلے میں محمد تغلق کی سی مثال ملنا مشکل ہے۔ ہم عصر مورخین کے اعداد و شمار کی رو سے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ہی وقت میں ایک طرف مشرقی Korah یعنی قارون کا خزانہ لٹانے کے لیے تیار تھا اور دوسری طرف ایرانی شہنشاہ کیانیوں کے ذخائر۔ اس کی امتیاز نہ کرنے والی سخی طبیعت مستحق اور غیر مستحق، واقف کار اور اجنبی، نئے اور قدیم، دوست ملکی اور غیر ملکی اور امیر و غریب کے درمیان فرق کرنے کی ضرورت تک محسوس نہ کرتی تھی۔ اس کی نظروں میں سب یکساں تھے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ یہ کہ بادشاہ مانگنے والے کو مانگنے سے پہلے دے دیتا تھا اور اس کی عطیے کی رقم یا اس کی قیمت مانگنے والے کی بڑی سے بڑی امیدوں سے بھی اس حد تک زیادہ ہوتی تھی کہ لینے والا صحیح معنوں میں حیران رہ جاتا تھا۔ شاہی عطیات سے نوازے جانے والوں کی تعداد ہزاروں ہی ہوتی تھی اور ان میں بہت سے غیر ممالک کے افراد شامل تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بخشش کرتے وقت ایک لاکھ یا ایک کروڑ تنکے سے کم اکائی یا ایک من سونا چاندی یا دیگر قیمتی اشیا سے کم مقدار سے وہ بے پرواہ تھا۔ ہم عصر واقعہ نگار مزید بیان کرتا ہے کہ

---

[1] مثال کے طور پر علاؤالدین خلجی نے معمولی فہم و فراست کے ایک مشورے کے بدلے اپنے کوتوال کو ایک زر دوزی کے کام کی خلعت، دس ہزار تنکے نقد، دو گھوڑے مع ساز اور دو معافی کے گاؤں بطور انعام عطا کیے۔ برنی ص ۲۷۱

یہ بلند فطرت اعلیٰ دماغی صلاحیتیں رکھنے والا سونے چاندی، موتی اور زمرد کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور انھیں ٹھیکریوں اور کنکر پتھر سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا[1] سلطان کے زیادہ تر انتظامی اقدامات کی قدر ان رجحانات کی روشنی میں بہتر طور پر کی جا سکتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک عظیم سلطان کے کسی بدقسمت جانشین کو وقت کی ضرورت کے تحت کفایت شعاری پر قانع ہونا پڑتا لیکن یہ بات اسی وقت تک رہتی جب تک کہ ضروری رقم فراہم نہ ہو جاتی۔ ان مثالوں نے جانشینوں کی رہنمائی کے لیے شان دار نظیریں قائم کر دیں لیکن اگر وہ اپنے محدود ذرائع کی بنا پر اس فراخ دلی کا ثبوت نہ دے سکے تو یہ ان کا اپنا قصور نہ تھا[2]

وقتاً فوقتاً دیے جانے والے ان عطیات کے علاوہ بہت فراخ دلی سے خرچ کرنے کے اور بھی مواقع تھے۔ سلطان کی تخت نشینی بھی خاص طور پر ایک ایسا ہی موقع تھا۔ سلطان علاؤالدین خلجی کی تخت نشینی کے وقت جمع ہونے والی بھیڑ پر منجنیق کے ذریعہ روپوں اور اشرفیوں کی بارش کی گئی۔ امرا کو سونا تول کر عطیہ میں دیا گیا اور یہ ضروری نہ تھا کہ جو شخص ایک بار لے چکا ہو وہ دوبارہ نہ لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس کے انسانی قتل کے جرم کو بالکل بھول گئے اور بے اطمینانی اور ناپسندیدگی کے بجائے پورے ملک میں عموماً خوشی منائی گئی[3] اگرچہ علاؤالدین خلجی کے ان عطیات کو بیان کرنے میں بڑے مبالغے سے کام لیا

---

[1] برنی کے اندازے کے لیے دیکھیے برنی ص ۴۶۰

[2] دیکھیے آخری سور حکمران عدلی کی ایک بہت دل چسپ مثال جو تاریخ میں محمد تغلق دوم کی طرح مشہور ہونا چاہتا تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد شاہی عطیات عطا کر کے مشہور ہونے کا ایک عجیب خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے اپنے مخصوص قسم کے تیر بنوائے جنھیں وہ ہر طرف بلا امتیاز پھینکتا رہتا تھا۔ جس خوش نصیب کو بھی یہ تیر مل جاتا وہ شاہی خزانے سے ۵۰۰ تنکے لینے کا حق دار ہوتا تھا۔ بدقسمتی سے اس کی سلطنت کے محدود ذرائع اس معمولی رقم کے متحمل نہ ہو سکے اور اسے یہ طریقہ ختم کرنا پڑا۔ بلاشبہ حکمران اور اس کے مداحوں کو اس کا بڑا قلق ہوا ہوگا۔ منتخب التواریخ جلد اول ص ۴۱۸

[3] برنی کے ص ۲۴۸ پر ان منجنیقوں کی تفصیلات دی ہیں جنھیں علاؤالدین دہلی کی طرف سفر کرتے ہوئے ہر منزل پر استعمال کرتا تھا۔ اس نے پانچ من سونے کے سکے ٹوکریاں (یا جتوا) بھر بھر کر بکھیرے اور

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

گیا ہے۔ تاہم اس دور کے رواج کے مطابق یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ سلطان محمد تغلق اور سلطان فیروز تغلق نے باوجود خزانہ خالی ہونے کے اور شاہانِ مغلیہ نے اپنے اپنے طریقوں سے تخت نشینی کے مواقع پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا تھا[1]۔

گاہے بگاہے ان اخراجات کے علاوہ غیر اہم مواقع پر بھی شاہی خزانے سے اچھا خاصا روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر سلطان اگر کسی جگہ پہلی بار جاتا تھا تو اس کے رونق افروز ہونے کے مبارک موقع پر مناسب عطیے دیے جاتے اور مختلف قسم کی تفریحات مہیا کی جاتیں[2]۔ ملک میں سلطان اور اس کے جانشین عوام کے روپے کو پانی کی طرح بہاتے تھے[3]۔ بدقسمتی سے اس

(گزشتہ سے پیوستہ) دہلی میں داخل ہونے سے پہلے راستہ میں ۵۰۰۰ سے ۶۰۰۰ حامی افراد اس کے ساتھی ہوگئے۔ ہر امیر کو جو اس سے آکر مل گیا ۲۰ سے ۳۰ من بلکہ بعض حالات میں ۵۰ من تک سونا دیا گیا۔ ہر سپاہی کو جو اس سے آملا ۳۰۰ تنکے ملے (ایضاً ص ۲۴۳-۲۴۴) برنی کی طرح امیر خسرو نے بھی لفظ جیتل استعمال کیا ہے۔ (خزائن الفتوح ۶-۸) جو اختر کے ساتھ غلط بحث ہولی ہے اور جس کا ترجمہ بری لوکریوں کی بجائے سنہری ستارے کیا ہے (ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد سوم ص ۱۵۸) یہ اصطلاح اپنے اصل معنی میں آج کل بھی یو۔پی میں استعمال ہوتی ہے۔

[1] محمد تغلق کے تخت نشینی پر برنی کا بیان "جب شاہی جلوس دہلی کی سڑکوں سے گزرا تو پورے راستے بھر کے اوپر مٹھیاں بھر بھر کر سونے اور چاندی کے سکے بکھیرے گئے۔ یہ سکے سنسان گلیوں، مکانوں کی چھتوں اور گزرنے والوں کے جسم پر پڑے۔ جس وقت جلوس محل میں داخل ہوا تو امرا اور اعلیٰ افسران نے سلطان کی صحت کے لیے اس پر روپے اور اشرفی کے تھال بھر بھر کر نثار کیے۔ مختصر یہ کہ واقعہ نویسوں کی رائے میں شہر دہلی ایک ایسا باغ معلوم ہوتا تھا جس میں سفید اور سرخ پھول بکھرے ہوں۔ یہ اس کی شان کو دوبالا کر رہے تھے (برنی ص ۴۵۶-۴۵۷) اسی طرح جب فیروز تغلق تخت نشین ہوا تو اسے دارالخلافہ میں خوش آمدید کہنے کے لیے چھ بڑے چبوترے تعمیر کیے گئے۔ ہر چبوترے پر تقریباً ایک لاکھ تنکے خرچ ہوئے تھے (عفیف ص ۸۸) ہمایوں کی تخت نشینی کے موقع پر شاہی دعوت پر صرف امرا کو عمدہ گھوڑوں اور خلعتوں کے علاوہ ۱۰۰۰۰ گھوڑے عطا کیے گئے (طبقات اکبری جلد اول ص ۱۹۴ لکھنؤ ایڈیشن)

[2] سلیم سور کی کالپی میں آمد منتخب التواریخ جلد اول ص ۴۰۹-۴۱۰ اپنی آمد کی خوشی کی تقریب میں اس نے رنتھمبور کے عوام میں ۲ لاکھ روپے کے بیانہ کے آم اور مٹھائیاں تقسیم کرائیں۔

[3] مثلاً جب سلطان کیقباد نے اپنی فوج کے ساتھ جے پور میں قیام کیا تو زمین پر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی یہ ضروریات اس کی زندگی تک محدود نہ تھیں۔ بلکہ اس کی موت کے بعد بھی حکومت کا کافی روپیہ اس پر خرچ ہوتا تھا۔ اس کی موت کے بعد دوسری دنیا میں اسے روحانی ثواب پہنچانے کے لیے ایک بڑا عملہ مقرر کیا جاتا۔ اس کی قبر پر کثیر دولت خرچ کرکے ایک مقبرہ تعمیر کرایا جاتا۔ مقبرے کے قریب ہی مختلف خیرات خانے کھولے جاتے تھے اور سلطان کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچانے کے لیے مخصوص قاری قرآن کے لیے مقرر کیے جاتے تھے جو مستقل قرآن خوانی میں مصروف رہتے تھے۔ خیرات خانوں میں غربا کو بڑے پیمانے پر کھانا کھلایا جاتا تھا جس کی وجہ سے پیشہ ور بھکاریوں کی ایک غیر معمولی بڑی تعداد دارالخلافہ میں جمع ہوجاتی تھی۔[۱]

سلطان کے ذرائع آمدنی اور سونے چاندی کے شاہی ذخائر کے سلسلے میں ہم اس سے پیشتر بھی بیان کر چکے ہیں۔ یہاں یہ اضافہ کردینا ضروری ہے کہ بھاری زرعی محصولات کے علاوہ ابواب اور خصوصی محصولات، درآمدی محصولات اور چنگی پوری حکومت اور اس کے جملہ ذرائع آمدنی سلطان کے اختیار میں ہوتے تھے۔ اسے دوسرے لوگوں کی جائداد کو ضبط کرنے اور اپنے تصرف میں لانے کے پورے پورے اختیارات حاصل تھے[۲] اگر اس کی

(گزشتہ سے پیوستہ) گھاس نہ رہی اور دریاؤں کا پانی سوکھ گیا اور شاہی پارٹی کے لازمی رسد کے حصول کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ انسانوں کے کھانے کے لیے کھانا رہا اور نہ جانوروں کے لیے گھاس یا چارہ" قران السعدین ص ۷۷

[۱] دہلی کے فقیروں کے لیے دیکھیے کلیاتِ خسرو ص ۸۶۴۔ سلطان قطب الدین کے مقبرے کے نظم و نسق کے لیے دیکھیے ابن بطوطہ کا بیان۔ محمد تغلق نے اس کے لیے ایک لاکھ من گیہوں اور چاول مقرر کیا تھا۔ غریبوں اور محتاجوں کے لیے سامانِ خورد و نوش میں ۱۲ من آٹا اور اتنی ہی مقدار میں اناج روزانہ خرچ ہوتا تھا۔ قحط کے زمانے میں ابن بطوطہ (جو انتظام کا نگران تھا) نے گیہوں اور آٹے کی مقدار ۳۵ من بڑھادی اور شکر، گھی اور پانوں کی مقدار میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوا (دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۸۵) نیز گلبدن بیگم ص ۲۵-۲۶۔ گرو نانک نے اپنے مشہور گر پے مروانہ کو پیش کش کی تھی کہ وہ اس کی موت کے بعد اس کی قبر پر مقبرہ تعمیر کرادیں گے۔ میکالف جلد اول ص ۱۸۱

[۲] سلطان علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت کی ایک مثال کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۵۰-۲۵۱۔

حکومت کے ذرائع اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی ہوتے تھے تو کوئی ایسا بین الاقوامی قانون اور اخلاقی بندش نہ تھی جو اسے کسی ہمسایہ ملک پر حملہ کرنے اور اسے فتح کرکے اس کے وسائل اپنے ذاتی استعمال میں لانے سے باز رکھ سکے۔

(ب) عمال اور سرکاری ملازمین

درباری امرا بھی شاہی روایات پر عمل کرتے تھے۔ دونوں میں فرق صرف درجہ کا تھا۔ خاندانی میزانیہ یا گھریلو کفایت شعاری کے تصور سے سلطان کی طرح امرا بھی ناواقف تھے۔ جیسا کہ اس سے پیشتر بیان کیا جا چکا ہے اس مخصوص طرز فکر کے فروغ پانے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ان کے ذاتی اعزازات اور مشاہرے ذاتی ہوتے تھے اس لیے بچت یا کفایت شعاری کے لیے کوئی محرک نہ تھا اور ان سماجی اقدار کا بھی تصور نہ تھا جو اس خیال کی پرورش کا باعث ہوتے ہیں[1] امرا سلطان (ہندو ریاستوں میں راجہ) ہی کا پرتو ہوتے تھے۔ وہ سلطان کی طرح بڑے بڑے ادارے قائم کرتے تھے۔ ان کے اپنے موسیقار اور شعرا تھے جنھیں وہ انعام کے طور پر ہزاروں تنکے، خوب صورت گھوڑے اور لباس عطا فرماتے تھے۔ شہزادوں اور شہزادیوں کی طرح ان کے بچوں کی بھی شادیاں نمایاں شان و شوکت سے ہوتی تھیں۔ وہ اپنی زندگی میں ہی مناسب خیراتی ادارے قائم کرکے اور قرآن خوانی کے لیے قاریوں کو مقرر کرکے ثواب حاصل کرتے تھے تاکہ یہ نیک اعمال ان کی موت کے بعد انھیں روحانی فیض پہنچا سکیں۔ ان کاموں پر خرچ ہونے والی رقم موجودہ دور میں ہمیں بدحواس کر دینے کے لیے کافی ہے[2]

---

[1] شیر خاں کی وضاحت کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۱۶

[2] راجپوتوں کے جاگیرداروں کے لیے دیکھیے ٹوڈ کا بیان " ایک بڑے امیر کا دربار اور گھریلو نظم و نسق ایک حکمران کی چھوٹے پیمانے پر ہو بہو نقل ہوتا ہے۔ وہی افسران پردھان یا وزیر سے لے کر بنیادی تک اور اسی طرح کے گھریلو انتظامات راجہ کی طرح۔ اس کے لیے شیش محل اور مندر ناگزیر ہیں۔ جب وہ دربی شالہ میں داخل ہوتا ہے تو بھاٹ اس کے خاندان کی شان میں تعریف گاتا ہوا گاتا ہوا اس کے آگے آگے چلتا ہے۔ وہ اپنے تخت پر رونق افروز ہوتا ہے اور دربار میں موجود ملازمین دائیں بائیں قطاروں میں کھڑے ہوئے سردار کی صحت کے لیے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امرا کے اخراجات اور عام فضول خرچی کو بہتر ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے ان کی تنخواہوں اور مالی بانت سے متعلق چند حقائق کا جاننا ضروری ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم ان کی مقررہ مالی حیثیت کے بارے میں بتا چکے ہیں۔ چند خاص افسروں کے مشاہرے کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔ افسروں کی تنخواہیں اور دیگر مالی منفعت ان کے عہدوں پر منحصر نہیں تھی بلکہ ان کی حیثیت بالکل ذاتی تھی اس لیے کسی یکساں اصول کے تحت ان کی آمدنی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ چند حقائق جو ہم جمع کر سکتے ہیں ان سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے اپنے ایک دیرینہ دوست کو اپنا وکیل در مقرر کیا اور اس کے لیے ایک لاکھ

(گزشتہ سے پیوستہ) دعا کرتے ہیں (ٹوڈ جلد اول ص ۹۹-۲۰۰) امرا کے انتظامات کے لیے دیکھیے باب سوم بلبن کے ایک امیر کشلی خاں نے شعرا اور مغنیوں کو اپنے تمام گھوڑوں اور دس ہزار تنکے عطیہ کے طور پر دے دیے تھے۔ برنی ص ۱۱۳۔ سلطان جلال الدین جب محض عارض لشکر تھا تو متعدد شعرا کی کفالت کرتا تھا۔ دیکھیے ایضاً ص ۱۹۷۔ (قلمی نسخہ ص ۲۴۰) وہ امیر خسرو کے والد کو ہر سال ۱۲۰۰ تنکہ تنخواہ دیتا تھا۔ محمد تغلق کا ایک امیر میر قبولہ متبول اپنے ذاتی اخراجات پر ساڑھے تین لاکھ ملین خرچ کرتا تھا (دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۳۶۔ بلبن کا ایک امیر ملک علی کسی کو بھی روپوں کی ہمیانی کے بغیر اپنا گھوڑا نہیں دیتا تھا اور فقیر کو ہمیشہ سونے یا چاندی کا سکہ دیتا تھا۔ برنی ص ۱۱۸۔ جلال الدین خلجی کے ایک امیر ملک قطب الدین علوی نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کی شادی پر قحط کے زمانے میں دو لاکھ تنکے خرچ کیے تھے۔ ایک سو گھوڑے مع ساز اور ایک ہزار خلعتیں اس تقریب کی خوشی میں تقسیم کی گئی تھیں۔ اسی طرح جلال الدین احمد چپ نے ایک بار شاہی مغنیوں کو ایک بار اپنے گھر میں گانے کے لیے بلایا اور انھیں ایک لاکھ تنکے ۱۰۰ گھوڑے اور ۳۲۰ خلعتیں عطا کیے۔ ایضاً ص ۲۰۲-۲۰۳۔ نیز بلبن کے ایک امیر فخرالدین کوتوال کے یہاں ۱۲۰۰ قرآن خواں تھے اور وہ ایک ہزار جہیز ہر سال غریب لڑکیوں کے لیے دیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی بھی ایک بستر پر دوبارہ نہیں سویا اور نہ ایک لباس کو دوسری بار پہنا (دیکھیے برنی ص ۱۱۷-۱۱۸) عمادالملک بلبن کا سرخیل یا عارض لشکر ہر سال اپنے عمال کی دعوت کرتا تھا اور ان سب کو مجموعی طور پر بیس ہزار تنکے اور ہر ایک کو ایک خلعت عطا کرتا تھا۔ روزانہ اپنے عملے کو دوپہر اپنے خرچے پر کھلاتا تھا اور اس وقت عمدہ قسم کے کھانوں کی کم از کم پچاس کشتیاں خرچ ہوتی تھیں (برنی ص ۱۱۵-۱۱۷)

جیتل رقم مقرر کی[۱] محمد تغلق کے زمانے میں سلطان کے نائب کو عراق کے برابر ایک صوبے کی آمدنی ملتی تھی۔ وزیر کی بھی تقریباً اتنی ہی تنخواہ تھی۔ چاروں وزرا میں سے ہر ایک کو ہر سال بیس ہزار سے چالیس ہزار تنکے سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ تقریباً ۲۰۰ افراد پر مشتمل سکریٹریٹ کے عملے کو کم از کم دس ہزار تنکے سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ ان میں سے چند ایسے بھی تھے جن کی تنخواہ پچاس ہزار تنکے تھی۔ صدر جہاں اور شیخ الاسلام کو سالانہ ساٹھ ہزار تنکے ملتے تھے حتیٰ کہ محتسب کو بھی ایک پورا گاؤں عطا کر دیا گیا تھا[۲] اب سلطان فیروز تغلق کے دور کے چند اعداد و شمار کا اندازہ بھی کر لیجیے۔ سلطان کے مشہور وزیر خاں جہاں کو ۱۵ لاکھ تنکے اپنی مقررہ جاگیر Revenue Assignment میں ملتے تھے اس کے علاوہ ذاتی وظیفہ اس سے الگ تھا۔ چند ہزار خواتین اس کے حرم میں تھیں اور بچوں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ حکومت کی طرف سے اس کے سب بیٹوں اور دامادوں کو جن کی مقدار غیر معمولی طور پر بڑی تھی الگ الگ وظیفے ملتے تھے[۳]

چند امرا کی ذاتی دولت کا بھی اندازہ کر لیجیے۔ فیروز تغلق کے امرا میں ملک شاہین نے پچاس ہزار تنکے ترکہ چھوڑے تھے۔ قیمتی اشیا سیرے جواہرات اور جائیداد اس کے علاوہ تھی[۴] فیروز کے ایک اور دوسرے امیر نے جس کا نام بشیر تھا ایک کروڑ ساٹھ لاکھ تنکے کی کثیر رقم جمع کر لی تھی[۵] اس کے کچھ عرصے بعد میاں محمد کالا پہاڑ نامی افغان امیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس ۳۰۰ من سونا تھا[۶] بنگال کے سلطان کے ہندو امرا اس سلسلے میں دوسروں سے پیچھے نہ تھے۔ ہیرانیا اور گووردھن داس کے پاس سات گاؤں تھے اور دس لاکھ تنکے سے زیادہ نقد رقم تھی[۷] مالوہ کے ایک وزیر اور آخری افغان تاج دار کے ہندو امیر ہیمو

---

۱ برنی ص ۱۹۵

۲ مسالک الابصار کی تفصیلات کے لیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد سوم ص ۵۷۸-۵۷۹

۳ عفیف ص ۲۹۷-۴۰۰

۴ ایضاً ص ۲۹۷

۵ ایضاً ص ۴۴۰

۶ تاریخ شیر شاہی ص ۴۴۶

۷ سرکار ص ۱۹۶

کے بارے میں ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔ اسی طرح حکومت کے دیگر افسرانِ اعلیٰ اور امرا کی آمدنی کو تصور کیا جا سکتا ہے۔[۱] کم درجے کے امرا اور ملازمت سے سبک دوش شدہ افسران کے لیے ایک اصول بن گیا تھا۔ حکومت ان کی عزت اور مرتبہ برقرار رکھنے کے لیے انھیں کافی رقم دیتی تھی۔[۲] حکومت کے دیگر ملازمین میں ادنیٰ فوجی افسروں، سپاہیوں اور مقدموں کو اہم مقام حاصل تھا۔

فوج کے عہدے داروں کے مختلف درجات کی تنخواہ کے بارے میں ہمیں صحیح معلومات نہیں ہیں۔ ایک اہم مثال سے ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جب سلطان بلبن کسی عمر رسیدہ فوجی افسر کو ملازمت سے برطرف کرتا تھا تو وہ اس کے لیے ۴۰ سے ۵۰ تنکے ماہانہ کا الاؤنس یا پنشن مقرر کر دیتا تھا۔[۳] سلطان علاؤالدین خلجی نے ایک سپاہی کی تنخواہ ۲۳۴ تنکے سالانہ یا ساڑھے انیس تنکے ماہانہ مقرر کی تھی۔ دو اسپہ سپاہیوں کو دوسرے گھوڑے کا خرچ پورا کرنے کے لیے ۷۸ تنکے مزید ادا کیے جاتے تھے۔[۴] سپاہی کو ہمیشہ سالانہ یا بالاقساط نقد رقم ادا کی جاتی تھی۔[۵] مقدم گاؤں کے مکھیا یا عامل کو نیم سرکاری حیثیت حاصل تھی۔ وہ حکومت کے لیے اپنے گاؤں سے زمین کا لگان وصول کرتا تھا اور حکومت اسے وصول شدہ رقم پر ایک مقررہ کمیشن ادا کرتی تھی۔ اس کی ذاتی کاشت پر اسے چند دیگر مراعات بھی حاصل تھیں۔ حکومت کی انتظامیہ مقدم کی آمدنی پر پابندی نہیں لگا سکتی تھی۔ حکومت کی انتظامی کمزوری کے مواقع پر وصول شدہ رقم کا خفیہ طریقے سے یا کھلے عام مالک بن بیٹھنا غیر واجب اور زیادہ محصول اور بالائی آمدنی وصول کرنا اور انتظامی ابتری کے ہر دور میں اس کے مالی منافع سے اسے خاصا قابلِ عزت مقام حاصل ہو گیا تھا۔[۶] سلطان علاؤالدین

---

[۱] برنی ص ۲۹۴
[۲] ایضاً ص ۲۹۲
[۳] ایضاً ص ۶۲-۶۳
[۴] ایضاً ص ۳۰۳
[۵] ایضاً ص ۳۱۹
[۶] برنی کی رائے کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۲۹۱

کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی تھی کہ دوسرے بڑے امرا کی طرح سے گاؤں کے مکھیا بھی خوب صورت لباس زیب تن کرنے، ایرانی تبر اور کمان استعمال کرنے اور خوب صورت گھوڑوں پر سوار ہو کر شکار کے لیے جانے کا شوقین ہو گیا تھا۔ ایک مضبوط اور مستحکم نظام حکومت اس حالت میں قائم رہ سکتا تھا جب کہ اس طبقے کے بے ایمانی اور ظلم کے رجحانات کو ختم نہ کر دیا جاتا۔ لیکن اس کے باوجود علاؤالدین کا رویہ ان کے ساتھ مربیانہ اور مہربانی آمیز تھا۔ (ان کا معیارِ زندگی مقرر کرتے وقت اس نے ان کے معیارِ زندگی کو بہت ہی خوش حال کسان سے کہیں زیادہ بلند مقرر کیا تھا۔ اس نے انھیں کاشت کے لیے چار بیل، دو بھینسوں، دو دودھ دینے والی گایوں اور بارہ بکریوں کے رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔[1]

اس موقع پر گھریلو نوکر یا غلام کی زندگی کے بارے میں بتانا مناسب ہوگا کیوں کہ ان میں سے زیادہ تر سرکاری حکام کے پاس ملازمت کرتے تھے۔ ہم اس سے بیشتر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ذاتی خدمت میں خرچ ہونے والی محنت کی مقدار اس دور کی ایک اہم معاشی حقیقت تھی۔ اعلیٰ ترین افسران کی زندگی کو واضح کرنے کے لیے سلطان بلبن کے عارض لشکر کی مثال دینا کافی ہوگا جس کے یہاں صرف پان کی خدمت پر ۵۰ یا ۶۰ افراد ملازم تھے۔[2] امیر خسرو کا بیان ہے کہ ایک انا کو بچے کو دودھ پلانے کے لیے دس تنکے ملتے تھے۔[3] گھریلو غلاموں کی زندگیوں سے متعلق ہمیں بہتر معلومات ہیں۔ ایک عام آدمی کے غلام کو اس کی خدمات کے بدلے میں کوئی اجرت یا رقم نہیں ملتی تھی، جیسا کہ پہلے بیان شدہ غلاموں کے مراتب سے ظاہر ہے۔ صرف سلطان اپنے غلاموں کو ایک تسلیم شدہ مرتبہ عطا کرتا تھا اور ان کی اجرت مقرر کرتا تھا۔ سلطان محمد تغلق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو مع دیگر ضروری لوازمات کے ۳ سیر گوشت روزانہ اور ۲ من گیہوں اور چاول ماہانہ دیتا تھا۔ ان بھتوں کے علاوہ انھیں دس تنکے ماہانہ اور کپڑوں کے چار جوڑے سالانہ ملتے تھے۔[4] فیروز تغلق جو اپنے غلاموں کی

---

[1] فرشتہ ص ۱۹۱

[2] دیکھیے برنی ص ۱۱۰ جس کا ذکر پچھلے کسی پیراگراف میں کیا ہے۔ اکبر کے زمانے کے حالات کے سلسلے میں دیکھیے انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر از مور لینڈ ص ۸۷

[3] اعجاز خسروی جلد دوم ص ۱۵۲

[4] مسالک الابصار کے مفہوم کے لیے دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد سوم ص ۵۷۷

فلاح کے لیے زیادہ متفکر رہتا تھا اپنے انتظام کے مطابق شاہی خزانے سے ۱۰ سے ۱۰۰ تنکے ماہانہ ادا کرتا تھا[1]

(ج) تجارت اور ماہرانہ پیشے

گزشتہ صفحات میں ہم تاجروں کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف یہ دیکھنا ہے کہ حکومت ایک خاص حد تک تاجروں کے حقوق اور ان کی جائداد کی حفاظت کرنے کی طرف توجہ دیتی تھی۔ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ امرا کی ذاتی املاک کو حالاں کہ شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن تاجروں کی املاک کو پوری دیانت داری سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ سلطان ان جھوٹے اطلاع دہندگان کی بڑی سختی سے سرزنش کرتے تھے جو عداوت کی وجہ سے سلطان کی توجہ تاجروں یا ساہوکاروں کی روزافزوں دولت کی طرف اس خیال سے منعطف کراتے تھے کہ سلطان اس پر جزوی یا کلی طور پر تصرف حاصل کرے[2] ان حالات میں یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ مجموعی طور پر تاجروں کا یہ طبقہ (ویش) خواندہ اور خوش حال تھا اور ان کے پاس ایسی کافی زمین تھی جس پر انھیں لگان نہیں ادا کرنا پڑتا تھا[3]

---

[1] عفیف کا بیان۔ دیکھیے عفیف ص ۲۷۰

[2] اس سلسلے میں فیروز شاہ کے اپنے اعلان کے لیے دیکھیے فتوحات فیروز شاہی ص ۱۵۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے ضبطی کے قوانین کے تحت ہندو ساہوکاروں اور ملتانیوں کی دولت اور جائداد کو اس دائرے سے قطعاً محفوظ رکھا برنی ص ۲۸۳۔ دیکھیے سلطان محمد تغلق کا واقعہ جو دہلی کی پوری آبادی کو دیوگری لے گیا اور جن لوگوں نے اپنے مکانات اور جائداد فروخت کی تھی انھیں مناسب معاوضہ ادا کیا۔ افسران کو کوئی معاوضہ نہیں تو۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ اقدامات کسی حد تک آزاد تجارت اور پیشوں کے نقصانات کے معاوضے کے طور پر اٹھائے گئے تھے نیز ایک اسلحہ ساز کا واقعہ جس نے اپنا غلام سلطان التتمش کے سامنے فروخت کرنے کے لیے (نہ کہ بطور تحفہ) پیش کیا تھا۔ راوٹی ص ۲۹۔ ایک پیشہ چننے کے سلسلے میں امیر خسرو کے اپنے بیٹے کو مشورے کے لیے دیکھیے اعجاز خسروی ص ۲۷۲۔ تجارت میں نفع کے امکانات کے لیے پدماوت ص ۱۲۳ - ۱۲۶۔ گرونانک کے والد کالو نے اپنے بیٹے سے اصرار کیا تھا کہ وہ کوئی تجارت کرنے لگے۔ میکالف جلد اول ص ۲۳-۳۰

[3] گپتا ص ۱۸۷ جس میں اس دعا کا ذکر ہے جو ویش لوگ خوش حال کی دیوی سرسوتی سے کرتے تھے "دیا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہنرمند پیشوں میں طبیب کا پیشہ ہندوستان کے جملہ قصبات اور بڑے بڑے مرکزی شہروں میں مستحکم بنیادوں پر قائم تھا[1] ان میں سے چند کا ذکر جو شاہی گھرانے میں ملازم تھے ہم اس سے پیشتر کر چکے ہیں۔ علاج سے متعلق کسی نئی ایجاد، کسی بہتر طریقۂ علاج کا اجرا منفرد طبیب کے لیے خاص شہرت اور خوش حالی کا باعث ہوتا تھا۔ پچھلے باب میں ہم ہنرمند کاریگروں کے بارے میں ذکر کر چکے ہیں اور یہ حقیقت بھی بیان کر چکے ہیں کہ ان کی اجرت اور ان کے معیارِ زندگی سے متعلق معلومات بہم نہیں پہنچتیں۔

کم درجے کے کام کرنے والوں میں ہمیں چند ایسے لوگوں کی اجرت کے بارے میں معلومات ہیں جو لوگوں کو دہلی اور فیروز آباد سے لانے لے جانے کا کام کرتے تھے (فاصلہ ۵ کروہ یا تقریباً دس میل) گاڑی پر سفر کرنے کا کرایہ ۴ جیتل، ٹٹو پر سفر کرنے کا ۶ جیتل، گھوڑے پر سفر کرنے کا ۱۲ جیتل اور ایک پالکی میں سفر کرنے کا کرایہ ۲۵ جیتل ہوتا تھا[3] یہ امر واضح نہیں ہے کہ کسی جانور کے رکھنے پر کتنا روپیہ خرچ ہوتا تھا اور اوسطاً کتنے آدمی ہر ملہ انھیں کرائے پر چلاتے تھے۔ بنگال کے مسلمانوں کی مذہبی تقریبات سے متعلق ہمیں بہت معمولی اعداد و شمار ملے ہیں جو بالکل ناقابلِ یقین ہیں جیسے پرندوں اور بکری کے ذبیحہ یا نکاح پڑھانے کی تقریب[4]

(ب) اشیا کی قیمتیں

دولت حاصل کرنے کے معیاروں کے اعداد و شمار کا اندازہ لگانے کے بعد اشیاء

(گزشتہ سے پیوستہ) کی وانی ہم سب پر بڑی فیاض ہے۔ ہم سب لکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ ہم ایک قصبے کے زیریات ہیں۔ اے دیوی ہمیں بہترین زمین اور مکانات دلوا اور ان کا لگان معاف کرا دے۔

[1] دہلی کے ایک مسلمان طبیب کے دلچسپ اور مفصل حال کے لیے بساطین الانس قلمی نسخہ برٹش میوزیم۔ گرو نانک کی بیماری کے وقت ایک طبیب کے ذریعہ دیکھ بھال کے لیے میکالف جلد اول ص ۲۶

[2] ایک ہندو طبیب نے تنتروں کی تجویز کردہ ایک پارہ آمیز دوا کے ذریعہ طریقۂ علاج کی ابتدا کی تھی۔ دیکھیے سرکار ص ۱۵۷۔ [3] عفیف ص ۱۳۵-۱۳۶۔ نیز ایمان داری کی روزی کمانے کے سلسلے میں امیر خسرو کی رائے۔ دیکھیے مطلع الانوار ص ۱۲۸۔ [4] گپتا ص ۹۱۔ مصنف کی دی ہوئی تفصیلات کے مطابق موجودہ روپیہ کی ہم قیمت رقم سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مزدوری کی قیمتوں سے متعلق حقائق پر غور کرنا اس موقع پر مناسب ہے۔ ہم عصر واقعہ نگاروں اور دیگر مصنفین کی تحریروں میں ہمیں اشیا کی قیمتوں سے متعلق متعدد حوالہ جات ملتے ہیں۔ ان میں قحط اور کمی کے زمانے کی قیمتوں نیز زیادہ پیداوار اور بے حد سستے زمانے کی قیمتوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ہم ایسے بادشاہوں کے زمانوں کی قیمتوں کا مقابلہ کر کے اوسط قیمت کے بارے میں رائے قائم کرنے کی کوشش کریں گے جن کے زمانے میں کسی قسم کا شدید معاشی اتار چڑھاؤ نہیں ہوا۔ لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان نتائج کی درستی کو یقینی نہ خیال کریں اور نہ ان حوالوں پر انحصار رکھیں۔ اچھی اور بری فصلوں والے سالوں میں قیمتوں کا فرق بہت حد تک آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ذرائع پر منحصر تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ بعض اضلاع طبعی طور پر بالکل علیحدہ تھے اور اچھی فصل کے زمانے میں انھیں زیادہ پیداوار کو بازار میں بھیجنے کا موقع نہ ملتا تھا یا کسی اور قحط کے دنوں میں اناج منگانے کی سہولتیں مہیا نہ تھیں۔ اس کی وجہ سے قیمتوں پر نمایاں اثر پڑتا تھا جو اچھی فصل کے زمانے میں بہت کم اور (کمی اور قحط کے دنوں میں) بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اس کے برعکس موجودہ دور میں حالات بالکل مختلف ہیں۔ ایک دوسرا نقطہ بھی کافی اہمیت کا حامل ہے جب تنکہ یا جیتل کے بدلے میں حاصل ہونے والے سیروں کی تعداد میں قیمت ظاہر کی جاتی ہے جیسا کہ ہندوستان میں رواج ہے تو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جب روپیہ میں ظاہر کی جانے والی قیمتوں میں ظاہر کی جانے والی قیمتوں کے برعکس اتار چڑھاؤ ہوتا تھا تو قیمتوں کے بڑھنے یا گھٹنے کا فی صد حساب اعداد کو علامات سے ظاہر کرنے (ترمیم اعداد) کے دونوں طریقوں کے مطابق مختلف تھا۔ اس طرح امپیریل گزیٹر آف انڈیا (جلد سوم، ۴۵۷) کے مطابق اگر ایک روپیہ (یا تنکہ) کے بدلے میں حاصل ہونے والے سیروں کی تعداد آدھی کردی جائے یعنی ۵۰ فی صدی کم کردی جائے تو قیمت دوگنی ہوجاتی ہے یعنی ۱۰۰ فی صدی اضافہ ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر اس مقدار کی قیمت ۵۰ فی صدی ہوجاتی ہے جو بہت ہی سستی ہے تو اس کے مطابق حاصل ہونے والی رقم کی قیمت ۳۳ فی صدی گھٹ جاتی ہے۔ ملاں مثلاً کے بعد ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ نتائج صرف دہلی اور اس کے صرف قرب و جوار کے چھوٹے

(گزشتہ سے پیوستہ) اس زمانے کی روزانہ مزدوری کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

سے علاقہ کے لیے صحیح ہیں لیکن ان حدود میں رہ کر بھی قیمتوں کا اندازہ افادیت سے خالی نہیں ہے۔

آئیے پہلے قحط کے زمانے کی قیمتوں کو لے لیں۔ جلال الدین خلجی کے زمانے میں جب قحط پڑا تو اناج کا بھاؤ ایک جیتل فی سیر تھا[۱] محمد تغلق کے زمانے میں انتہائی خراب حالات میں اناج کی قیمت ۱۶ سے ۱۷ جیتل فی سیر ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بھوک سے مرنے لگے[۲] اسی طرح فیروز تغلق نے جب سندھ پر حملہ کیا اور نتیجۃً قحط پڑ گیا تو اناج کی قیمت ۲ اور ۳ تنکے فی من ہو گئی (۳۲ء۲ اور ۶۸ء۴ جیتل فی سیر[۳]) اس صوبے پر اس کے ایک بعد کے حملے کے زمانے میں اناج کی قیمت ۸ سے ۱۰ جیتل فی پانچ سیر ہو گئی اور واپسی ۴ اور ۵ تنکے فی من (یعنی ۶ء۴ اور ۸ جیتل فی سیر[۴])

آئیے اب انتہائی کم قیمتوں سے متعلق اندراجات پر بھی غور کریں۔ اس سلسلے میں ابراہیم لودی کا دور ایک انتہائی لیکن انوکھی مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں ایک بہلولی میں ۱۰ من اناج ۵ سیر تیل اور ۱۰ گز موٹا کپڑا خریدا جا سکتا تھا۔ اسی ایک بہلولی میں (جو قیمت میں ۱۲۶ جیتل کے برابر تھی) ایک آدمی ایک گھوڑے اور نوکر کے ساتھ دہلی سے آگرے جا سکتا تھا اور راستے کا خرچ بھی پورا کر سکتا تھا۔ اسی واقعہ نگار کا خیال ہے کہ اس زمانے میں ۵ تنکے ایک پورے خاندان اور اس کے ملازمین (جو اس دور میں بہت کم ہوتے تھے) کے ایک ماہ کے خرچ کے لیے کافی تھے۔ اس حالت میں بھی ایک سپاہی کی تنخواہ ۲۰ سے ۳۰ تنکے تک تھی۔ اناج کی قیمتیں گرنے کا سونے اور چاندی پر بہت بڑا اثر پڑتا تھا جو بڑی مشکل سے دستیاب ہوتے تھے[۵] اسی طرح گپتا بنگال کی انتہائی کم قیمتوں کی مثال دیتا ہے لیکن وہ بہر حال یہ ظاہر نہیں کرتا کہ قیمتوں میں یہ کمی

---

[۱] برنی ص ۲۱۲

[۲] ایضاً ص ۲۸۲

[۳] عفیف ص ۲۰۰

[۴] ایضاً ص ۲۳۲ - ۲۳۳

[۵] ایلیٹ ص ۴۹۲ تاریخ داؤدی (مطبوعہ) ص ۹۴

زیادہ پیداوار کی وجہ سے تھی یا اناج کی بیرونی مانگ کی کمی کی وجہ سے۔ بہر حال یہ قیمتیں وہاں کی اوسط قیمتیں نہ تھیں۔ مثال کے طور پر چیتنیہ کی شادی کی جملہ تقریبات چند کوڑیوں میں پوری ہو گئی تھیں اور اس شادی کو وہاں کے شعرا نے انتہائی مہنگی شادی بتایا تھا۔[1]

قیمتوں کے کم و بیش ہونے کے ان خلاف معمول واقعات سے الگ ـــــ ہم علاؤالدین خلجی کے دور کی قیمتوں کا اندازہ لگائیں جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس دور کی معیاری قیمتیں تھیں۔[2] علاؤالدین، محمد تغلق اور فیروز تغلق کے زمانوں کی قیمتوں کا مقابلہ کرنے سے اندازہ ہوگا کہ ان اشیاء میں مجموعی طور پر زیادہ تر اشیاء کی قیمتیں اور مقابلتاً دیگر جملہ اشیا کی قیمتیں محمد تغلق کے زمانے میں بڑھ گئیں لیکن اس کے جانشینوں کے زمانے میں پھر علاؤالدین کے زمانے کے سابقہ معیار پر پہنچ گئیں۔ چند خاص وجوہ کی بنا پر شکر پر قیمتوں کے اس اتار چڑھاؤ کا اثر نہیں پڑا۔[3]

اشیاء	علاؤالدین	محمد تغلق	فیروز تغلق
	(جیتل میں فی من قیمتیں)		
۱۔ گیہوں	۷ ½	۱۲	۸
۲۔ جو	۴	۸	۴
۳۔ دھان	۵	۱۴	-
۴۔ دالیں	۵	-	۴.
۵۔ مسور	۳	۴	۴
۶۔ شکر (سفید)	۱۰۰	۸۰	-
۷۔ شکر (نرم)	۶۰	۶۴	۱۲۰-۱۴۰
۸۔ بھیڑ کا گوشت	۱۰	۶۴	-
۹۔ گھی (صاف کیا ہوا مکھن)	۱۶	-	۱۰۰

[1] جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز میں تفصیلات ۱۹۲۹ء ص ۲۷۴ - ۲۷۸

[2] تھامسن کی رائے کے لیے دیکھیے ص ۱۵۹

[3] اعداد و شمار کے لیے دیکھیے تھامسن ص ۱۴۰- ۲۶۰- ۲۸۳- نیز برنی اور عفیف۔

آیئے اب علاؤالدین کے زمانے کی قیمتوں کا اندازہ کرلیں جنھیں ہم اندازاً اوسطاً قیمتیں تصور کرتے ہیں۔ انھیں تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ اناج اور عام استعمال کی اشیاء۔ کپڑا اور گھریلو غلام۔

(الف) اناج وغیرہ

(قیمیں فی من کے حساب سے دی گئی ہیں) گیہوں ۱/۲ ۷ جیتلی۔ باجرہ ۴ جیتلی۔ دھان ۵ جیتلی Vetch ۵ جیتلی۔ دالیں ۵ جیتلی۔ مسور ۳ جیتلی۔ شکر سفید ۱۰۰ جیتلی اور نرم ۶۰ جیتلی۔ کچی شکر ۲۰ جیتلی۔ دیگر اشیا کی قیمتیں اس طرح ہیں۔ بھیڑ کا گوشت ۱۰ سے ۱۲ جیتلی فی من۔ گھی (صاف کیا ہوا مکھن) ۱۶ سے ۲۴/۳ جیتلی۔ تیل تقریباً ۱۴ جیتل۔ نمک ۲ جیتل جانوروں میں دونسلوں کے اونٹ ترتیب وار ۱۲ اور ۲۴ تنکے کے خریدے جاسکتے تھے سانڈ ۳ تنکے۔ گائے برائے گوشت ۱/۲ ۱ سے ۱۲ تنکے۔ بھینس برائے گوشت ۵ سے ۶ تنکے اسی طرح دوسری اشیا کی قیمتوں کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے[1]

(ب) کپڑا

(۱) تن زیب دہلی کی تیار شدہ ۱۷ تنکے فی پارچہ اور کول (علی گڑھ) کی تیار شدہ ۶ تنکے۔ تن زیب کی بہترین قسم کی قیمت فی گز ۲ تنکے تھی[2] مشروع نام کی ایک اور قسم کی قیمت فی ٹکڑا ۳ تنکے تھی۔

(۲) اونی کپڑے۔ معمولی قسم کے کمبل (عام طور پر سرخ حاشیہ والے) کی قیمت ۶ جیتل اور بہتر قسم کے کمبل کی قیمت ۳۶ جیتل تھی۔ (ملاحظہ ہو برنی قلمی نسخہ ۱۵۳)

(۳) دیگر قیمتی سامان جو شیریں بازار میں ۳ قسم کا فروخت ہوتا تھا جن کی قیمتیں فی ٹکڑا ترتیب وار ۳ اور ۲ تنکے تھی۔ اسی طرح صلاحیہ کی قیمتیں بھی ۶۔۴ اور ۲ تنکے تھی۔

(۴) سوتی کپڑا۔ عام قسم کا کپڑا ۲۰ تنکے فی گز اور معمولی قسم کا کپڑا ۴۰ گز فی تنکے

---

[1] تعاسن ص ۱۵۹

[2] امیر خسرو کی رائے کے لیے دیکھیے اعجاز خسروی جلد چہارم ص۱۴۱۔

فروخت ہوتا تھا۔ ایک چادر ۱۰ جیتل میں فروخت ہوتی تھی۔

(ج) گھریلو سامان اور غلام

غلاموں اور خادموں کی قیمتیں غیر یقینی تھیں اور جنگ اور قحط کے حالات کے مطابق کم و بیش ہوتی رہتی تھیں۔ ایک تربیت یافتہ غلام کی قیمت کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ اس سلسلے میں کوئی اصول نہ تھا۔ علاؤالدین کے زمانہ میں نادرہ فن غلام ۱۲۰ تنکے تک مل جاتا تھا۔ شاعر بدر چاچ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے گل چہرہ نام کا ایک غلام ۹۰۰ تنکے میں خریدا تھا (ملاحظہ قصائد بدر چاچ ۳۹) مسالک الابصار کے مصنف کا بیان ہے کہ غیر معمولی حالات میں غلام ۲۰۰۰۰ تنکے یا اس سے بھی بڑی رقم میں فروخت ہوتے تھے (ملاحظہ ہو ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن ص ۵۸۰) علاؤالدین کے زمانے میں گھریلو کام کاج کے لیے ایک عورت ۵ سے ۱۲ تنکے تک، ایک خواص ۱۰ سے ۱۵ تنکے تک اور ایک موزوں غلام ۲۰ سے ۴۰ تنکے تک مل سکتا تھا[1] محمد تغلق کے دور میں ایک گھریلو ملازمہ ۸ تنکے میں اور ایک خواص ۱۵ تنکے میں مل سکتی تھی[2]

بیرونی صوبوں کی اوسط قیمتوں کے سلسلے میں ہمیں بہت کم حوالہ جات ملتے ہیں ان مقامات کی قیمتوں کا انحصار مقامی حالات پر تھا اور اصولی طور پر دوآبہ کے علاقے یا دہلی کے قرب و جوار کے حالات ان پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اس لیے دہلی کے بازار اور صوبوں کی قیمتوں کے بارے میں کوئی تعلق قائم کرنا بڑا مشکل ہے۔ ابن بطوطہ جو دہلی سے بنگال گیا تھا وہاں کی قیمتیں اس طرح بیان کرتا ہے

ایک چوزے کی قیمت	ایک جیتل
پندرہ کبوتروں کی قیمت	۸ جیتل
ایک مینڈھے کی قیمت	۱۶ جیتل
بہترین کپڑا طول ۳۰ گز	۲ تنکے

---

[1] برنی ص ۳۱۴

[2] ایلیٹ اینڈ ڈاوسن جلد سوم ص ۵۸۰

چاول ۸ جیتل فی من
بکری ۳ تنکے فی راس
شکر صاف شدہ ا تنکہ فی من
شکر ۳۲ جیتل فی من
غلام ۸ تنکہ فی نفر

غیر ملکی مسلمان تاجروں (خراسانیوں) میں ایک ضرب المثل مشہور تھی کہ "بنگال ایک ایسی دوزخ ہے جس میں عمدہ اشیاء کی کثرت ہے"۔ یہ ضرب المثل انتہائی سستی معیارِ زندگی اور اس صوبے کی غیر صحت بخش آب و ہوا کی طرف اشارہ کرتی ہے[1]
گلبدن بیگم کا خیال ہے کہ امرکوٹ راجپوتانہ میں زندگی بہت سستی تھی چوں کہ وہاں ایک روپیہ میں چار بکریاں خریدی جا سکتی تھیں۔[2]

روزانہ گھریلو اخراجات

اوسط درجے کی زندگی گزارنے کے لیے کس قدر روپیہ کافی ہوتا تھا اس کے بارے میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مختلف طبقات کے معیارِ زندگی میں اتنا بعد تھا کہ کسی ایک اوسط کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ ہم اس سے پیشتر کسانوں اور اعلیٰ طبقے کی زندگی کے فرق کا مشاہدہ کر چکے ہیں جو ایک دوسرے کی تقریباً ضد ہیں۔ بایں ہمہ کم از کم ایک مبہم اور تجرباتی اندازہ ہمارے لیے مفید ثابت ہوگا۔

مسالک الابصار کا مصنف اپنے اطلاع دہندگان کی بنیاد پر خوجندی نام کے ایک شخص کی مثال پیش کرتا ہے۔ خوجندی نے اپنے تین دیگر احباب کے ساتھ کھانا کھایا جو گائے کے بھنے ہوئے گوشت، روٹی اور گھی پر مشتمل تھا اور اس کی کل قیمت ایک جیتل ہوئی[3]

---

1. کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۴۲-۱۴۳
2. گلبدن بیگم ص ۵۸
3. دیکھیے Nohicas etc ص ۲۱۰-۲۱۱

اگر ہم اس بنیاد پر حساب لگائیں اور ایک اوسط درجے کے شخص کی طرح دن میں دو بار کھانا کھائیں تو ایک ماہ کا خرچ ۱۵ جیتل ہوگا۔ صبح کے ناشتے کے لیے ۵ جیتل مزید خرچ کرنے سے ایک آدمی کے اوسط درجے کی خوراک کا خرچ ۲۰ جیتل ماہانہ ہوگا۔ اگر اسی طرح کپڑے اور دیگر اخراجات کا حساب بھی لگایا جائے تو زیادہ سے زیادہ خرچ ایک تنکہ ہوگا ہوگا۔ اس طرح ایک مرد، اس کی بیوی، ایک نوکر اور ایک یا دو بچوں پر مشتمل ایک پورے خاندان کا ایک ماہ کا خرچ ۵ جیتل ہوگا۔ اس اندازے سے سماجی اور معاشی تغیر پذیری کا قیاس نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ بہر حال یہ ایک ناتمام سا اندازہ ہے[1]

---

[1] تنکہ کی قوتِ خرید کے لیے دیکھیے ضمیمہ الف

حصّہ سوم

سماجی حالات

حصّہ سوم

سماجی حالات

گھریلو زندگی

مشترکہ خاندان

دیہی ممالک میں کنبہ گھریلو زندگی کا ایک اہم جز ہے۔ اس کی اہمیت مذہب اور حکومت دونوں سے زیادہ ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستانی اب بھی ایک ایسی قوم پر مشتمل ہیں جس میں متعدد کنبے شامل ہیں۔ ہندوستانی کسان کے لیے اس کا کنبہ ایک خاص معاشی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس کی بیوی اس کے متعدد بچوں، اس کے بوڑھے ماں باپ اور اس کے دیگر عزیزوں کا گھر بھی ہے اور زرعی معاشیات میں انتہائی اہمیت کا حامل بھی۔ کنبہ کا ہر فرد کسی نہ کسی حد تک زرعی پیداوار کے عمل میں اپنا رول ادا کرتا ہے۔ اس موضوع پر ہم گزشتہ کسی باب میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ تقریباً تاریخ کے ابتدائی دور سے ایک منظم سماجی زندگی کو برقرار رکھنے میں کنبہ کی روایات بنیادی اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کنبے کی یہ روایت مشترکہ ہندو کنبہ میں تبدیل ہوگئی۔[1]

---

[1] دیکھیے ہندو لا۔ از ملا ص ۱۵۔ " ہندو سماج کا عام رواج ہے کہ کنبے مشترک اور غیر منقسم ہوتے ہیں ایک غیر منقسم ہندو کنبے کی ہر چیز عام طور پر مشترک ہوتی ہے۔ نہ صرف ان کی جائداد ہی بلکہ ان کا کھانا اور مذہبی رسوم بھی مشترک طور پر ادا کی جاتی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے مشترکہ خاندان کے رواج کی ابتدا پہلے ہوئی اور قانونِ وراثت بعد میں شروع ہوا۔"

اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ خاندان میں کوئی جائداد وغیرہ کسی ایک فرد کی ملکیت نہیں ہے بلکہ گھر کے جملہ افراد مردوں، ان کی بیویوں اور ان کے بچوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سب اس مشترکہ جائداد سے استفادہ کریں[1] شادی کے بعد لڑکی اپنے شوہر کے کنبہ کی فرد تصور کی جاتی ہے۔ اگر کوئی کنبہ کسی دوسرے کے لڑکے کو گود لے لیتا ہے جس کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کی ہمت افزائی بھی کی جاتی ہے تو اس کا تعلق اپنے قدرتی خاندان سے منقطع ہو جاتا ہے اور وہ نئے خاندان کا فرد تصور کیا جاتا ہے ایک طرف وہ نئے خاندان میں بیٹے کے جملہ حقوق حاصل کر لیتا ہے تو دوسری طرف وہ اپنے قدرتی خاندان میں وہ جملہ حقوق سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ اس میں اس کے قدرتی باپ یا دیگر قدرتی اعزا کی ملکیتوں میں اس کے حقوق بھی شامل ہیں اور اس کے قدرتی خاندان کی مشترکہ وراثت کی جائداد بھی[2] اس سے نہ صرف موجودہ دور کے ہندوستان کے ہندو خاندان کے بارے میں کافی حد تک صحیح اندازہ ہو جاتا ہے بلکہ ماضی کا بھی۔ مشترکہ کنبے کا ارتقا قدرتی طور پر ہندوستان کے دیہات کی پیداوار اور وہاں کی زندگی کے حالات کا لازمی نتیجہ ہے[3] مسلمان ہندوستان میں وراثت اور طلاق کے اپنے جداگانہ اور مختلف قوانین اور نظریہ حیات لے کر آئے۔

ایک لحاظ سے ہندو اور مسلم سماج یکساں ہیں اور وہ ہے مردوں کو عورتوں پر خاص طور پر ترجیح دینا۔ بیٹی کے مقابلے میں بیٹے کو ہمیشہ ترجیح دی جاتی ہے اور بیٹوں میں بھی سب سے بڑے بیٹے کو[4] ان دونوں سماجی طبقوں میں والدین کے لیے پیار اور تعظیم دوسری

---

[1] ایضاً ص ۴۲۸

[2] ایضاً ص ۳۹۸

[3] مشترک کنبے کی روسی متوازی مثال verv mir ہے "... ایک verv (وَرْو) جس کی اپنی ذاتی املاک ہو بالکل ایک ایسے کنبے کی طرح ہے جس میں متعدد افراد ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوں۔ جن کی زمین مشترک ہو اور جو اپنی املاک کی حدود میں ہونے والے جرائم اور دیگر مجرمانہ افعال کے مجموعی طور پر جوابدہ ہوں۔ دیکھیے Kovalevsky ص ۵۱۔

[4] ہندو کنبوں میں زندگی کا عظیم ترین مقصد ایک لڑکے کو جنم دینا ہے۔ وہی لڑکا اپنے باپ کو روحانی طور پر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قدر مشترک ہے۔ یہ محبت اور تعظیم دو طرفہ ہے اس لیے کہ والدین بھی اپنی اولاد کے لیے بہت فکر مند رہتے ہیں اور غیر ضروری حد تک شفقت کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر[1] ہندوستان کے کنبوں کی روایات مغربی ممالک کے چھوٹے چھوٹے کنبوں کی بہ نسبت بڑی حد تک باہمی انحصار اور مشترک رشتہ دارانہ تعلقات کو فروغ دیتی ہیں۔ ان کی ملکیت مشترک ہوتی ہے اور مادی آسائشوں میں جملہ افراد کو مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ایک مشترکہ خاندان کے افراد معاشی مقابلہ بازی کے ہمت شکن اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ لازمی طور پر ان میں ایک دوسرے کی ذمہ داری کو سمجھنے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ خیال ان کے ذہن میں پختہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندگی کے خطرات اور مشکلات پر قابو نہیں پا سکتے[2]۔ لیکن اس کے برخلاف مشترک کنبہ افراد میں انفرادیت کو فروغ نہیں پانے دیتا۔ ان میں ہمت اور ذاتی بھروسہ جیسی صفات کو ختم کر دیتا ہے جو موجودہ زمانے کے کسی بھی ملک کی صنعتی ترقی کے لیے بہت ضروری ہیں[3]۔

(گزشتہ سے پیوستہ) دوسری دنیا میں دیکھ بھال کر سکتا ہے اور اسے نرک سے بچا سکتا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے "الرجال قوّامون علی النساء" ۴ : ۳۴ مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس لیے کہ اللہ نے بزرگی دی ان میں سے بعض کو بعض پر۔ سورت نساء آیت ۳۴ قرآن شریف (الرجال قوّامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہم علی بعض (روڈویل قرآن ۴۱۵)

ہندو کنبہ کا سب سے بڑا فرد مشترک املاک کا کرتا یا منتظم ہوتا ہے۔ کنور یارا جپوت سردار کے سب سے بڑے بیٹے کو ہی عموماً خاندانی مراتب وراثت میں ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ شیر خاں کے والد میاں حسن کی وفات پر اس کے ایک سوتیلے بھائی سلیمان نے مرحوم کی دستار اپنے سر پر رکھ لی لیکن اس کے ایک چچیرے بھائی نے اس کی دستار کو اس کے سر سے اتار دیا۔ اسے تنبیہ کی اور بتایا کہ اس کے رشتہ دار خاندان کے بڑے بیٹے کے حقوق پر دست اندازی کو پسند نہیں کریں گے۔

[1] ماں باپ کے پیار کے لیے دیکھیے مطلع الانوار ص ۱۱۹-۱۲۰۔ گرو نانک کے جذبات کے لیے دیکھیے میکالف جلد اول ص ۸۷- ۸۸

[2] روس میں مشترکہ کنبے کے لیے دیکھیے Kovalevsky ص ۶۰

[3] اس رواج کے بارے میں موجودہ دور کے مفکرین کی ناقدانہ رائے دیکھیے "جوائنٹ فیملی اینڈ سوشل
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۲۔ عورتوں کی حالت

عورتوں کی حالت اور ان کے فرائضِ منصبی واضح طور پر کم تر سمجھے جاتے تھے۔ ان کا کام مردوں کی خدمت کرنا تھا اور زندگی کے میدانِ عمل میں انھیں مردوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ بیٹی کی حیثیت سے عورت باپ کی سرپرستی میں رہتی تھی، بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کی نگرانی میں اور ایک بیوہ کی حیثیت سے (اگر وہ اپنے شوہر کی موت کے بعد بھی زندہ رہتی) سب سے بڑا بیٹا اس کی دیکھ بھال کرتا تھا[۱]۔ مختصر یہ کہ اس کی پوری زندگی کسی نہ کسی کی نگرانی میں گزرتی تھی اور سماج کے ضوابط اور طور طریق نے اس پر ذہنی کم مائگی کی مہر ثبت کردی تھی۔ پیدائش کے وقت اسے ناخواندہ مہمان تصور کیا جاتا تھا کیوں کہ ہندوؤں کے مذہبی عقائد کی رو سے بدنصیب بیٹی باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کرسکتی[۲]۔ ایسی وجہ سے بعض اقوام میں اسے بچپن ہی میں قتل کردیا جاتا تھا[۳]۔ اگر وہ زندہ رہ گئی تو اسے کبھی نہ ٹوٹنے والے رشتے میں منسلک کرکے ایک عدد شوہر کے سپرد کردیا جاتا تھا۔ اگر اس کی موت دورانِ حمل ہوجاتی تو وہ بہت خوفناک بدروح کی شکل اختیار کرلیتی تھی جسے چڑیل کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور جو پڑوس میں منڈلاتی رہتی تھی۔ اس کا اختتام موت یا ستی کی حالت میں ہی ممکن تھا۔ اس طرح پیدائش سے موت تک عورت کی زندگی انتہائی ناخوش گوار ہوتی تھی۔ مذہب اور دیگر اصلاحی روحانی تحریکات اسے اپنی قسمت پر شاکر رہنے کے لیے ڈھارس بندھاتی تھیں لیکن یہاں بھی انھیں

(گزشتہ سے پیوستہ) پروگریس از کے۔ ایم۔ پانیکر۔ وشوا بھارتی اپریل ۱۹۲۵ء نیز دیکھیے کبیر کی مخالفت کی مختلف وجوہات ص ۸۹۔ ۹۰۔

[۱] دیکھیے ہندو ازدواجی تعلقات میں بیوی کی حیثیت۔ عموماً ہندوؤں کے ازدواجی قانون میں طلاق کو کوئی نہیں جانتا کیوں کہ ہندوؤں میں شادی شوہر اور بیوی کے درمیان ایک ایسا تعلق ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ہندو لا۔ از ملّا

[۲] دیکھیے ٹلاٹمپل ص ۲۳۰۔ راجپوتوں میں لڑکیوں کو قتل کرنے کی رسم کے لیے دیکھیے ٹوڈ۔ جلد دوم ص ۳۹،۔ ۴۰،

[۳] پاپولر ریلیجن از کروک ص ۱۹۴

قوت و اقتدار کے ہر موقع سے محروم رکھا جاتا تھا حتیٰ کہ وہ مذہبی میدان میں بھی کسی باوقار مقام سے محروم رہتی تھیں۔[1]

ہندوؤں کے عقائد کے مطابق ایک لڑکے کو جنم دینا عورت کا اہم ترین فرض تھا اور اگر اس کے بیٹا ہو جاتا تھا تو لوگ اس کی عزت کرنے لگتے تھے اور اس کی اچھی دیکھ بھال بھی ہوتی تھی۔ والدین کے لیے بچوں کی محبت کا ذکر ہم اس سے پیشتر کر چکے ہیں۔ اس پیار میں بڑی حقیقت ہوتی تھی اور ہندوستانی ماں کی اس سے ڈھارس بندھی رہتی تھی۔ دیگر معاملات میں ہندوستانی عورت گھر اور گھریلو امور تک ہی محدود رہتی تھی۔ وہ زندگی بھر خود کو اپنے شوہر کی وفادار بیوی ثابت کرنے اور اسے خوش رکھنے میں مصروف رہتی تھی۔[2] اس کے برخلاف عورت کو ایک کمزور دماغ کا فرد اور اہم معاملات میں اسے بالکل ناقابلِ بھروسہ تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن چند غیر معمولی عورتیں بھی گزری ہیں لیکن مجموعی طور پر عورتوں کی حالت کے بارے میں مندرجہ بالا تجزیہ جہاں تک اس دور کے ہندو سماج کا تعلق ہے صحیح ہے۔[3]

عورتوں سے متعلق مسلمانوں کی روایات ہر ملک میں جداگانہ تھیں۔ ترک عموماً اپنی عورتوں کو اچھی خاصی آزادی دیتے تھے۔[4] ایرانی عورت ہندوستانی عورت کے معاملے

---

[1] دیکھیے میرا بائی کا وہ دل چسپ واقعہ جسے بندرابن کے گوسائیں نے اپنے سامنے آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میکالف جلد چہارم ص ۳۵۳ - دیگر حوالہ جات ستی کے سلسلے میں تحریر کیے گئے ہیں۔

[2] بچہ کو جنم دینا عورت کا اہم فرض تھا۔ اس کے احترام کے لیے دیکھیے مطلع الانوار ص ۱۱۷-۱۹۲۔

[3] عورت کے بارے میں پدماوت کے مصنف کے اندازے کے لیے دیکھیے پدماوت ص ۲۵۶ - اپنی جنس کے بارے میں رادھا نے خصوصی طور پر ان الفاظ میں اعتراف کیا تھا " میں ایک کم عقل کمزور لڑکی ہوں"۔ دیکھیے پدوالی بنگیا۔ ص ۲۵۶

[4] راجپوت خواتین کے بارے میں ٹوڈ کا اندازہ دیکھیے جلد دوم ص ۷۴۴ ۔ راجپوتنی کی زندگی دیگر ممالک کی خواتین کی نظروں میں خوف زدہ کر دینے کی حد تک سخت ہے۔ زندگی کی ہر منزل پر موت اس کی منتظر رہتی تھی۔ زندگی کے ابتدائی دور میں افیون سے، جوانی میں آگ کے شعلوں سے اور درمیانی عمر میں بھی اس کی زندگی جنگ کی غیر یقینی حالت میں گزرتی تھی۔ اس کی زندگی کسی حال میں بھی ایک سال کے لیے بھی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں نسبتاً بہتر تھی۔[1] ہندوستان میں مسلمانوں نے قدیم ایران روایات پر عمل کیا جس کی وجہ سے عورت کو کم تر تصور کیا جانے لگا۔[2] عام شہوت پرستی اور جنسی بے راہ روی کی

دگزشتہ سے پیوستہ) قابلِ وثوق نہیں تھی۔" نیز دیکھیے ایضاً جلد ۱۔ ص ۵۴۰۔ کرشنا کنواری کا حادثہ جہاں شہزادی صنفِ نازک کی حیثیت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ "ہم پیدائش کے بعد ہی سے قربانی کا نشانہ بنتی ہیں۔ ہم دنیا میں قدم رکھنے بھی نہیں پاتیں کہ ہمیں پھر وہیں واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ مجھے اپنے والد کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس نے مجھے اتنے عرصے تک زندہ رہنے کا موقع دیا۔" ایضاً جلداول ص ۵۴۰۔ ہیروٹیغور کی رائے اور ایک مثال کے لیے دیکھیے پیروٹیغور ص ۹۰۔ ترکوں میں عورتوں کے بارے میں ابن بطوطہ کے مشاہدات کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ ص ۲۰۰ - ۲۰۱۔

[1] شیراز کی خواتین ہفتہ میں ۳ بار واعظ کی تقریر سننے کے لیے مسجد میں جمع ہوتی تھیں۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اس نے اس سے بڑا خواتین کا کوئی اجتماع اس سے پیشتر نہیں دیکھا۔ دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۲۱۔ ہرات کی خواتین پردے کی پابند تھیں لیکن انھیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ دیکھیے Bretschneider جلد دوم ص ۲۸۷ - ۲۸۸۔ مدینہ اور دیگر مقامات کی خواتین کے بارے میں ابن بطوطہ کی رائے بھی ایسی ہی ہے۔

[2] قدیم ایران کے بارے میں دیکھیے فائیو گریٹ مونارکیز از راولنسن جلد سوم ص ۲۲۲۔ "ایرانی سنگ تراشی اور کتبات میں یہ امر خاص توجہ کا مستحق ہے کہ عورتوں کے سلسلے میں احتیاط مستشرقین نے روا رکھی ہے لیکن ایرانی فنون اس سلسلے میں انتہا پسندی کو پہنچے ہوئے ہیں۔ کتبات میں صنفِ نازک کا قطعاً ذکر نہیں ہے اور فنِ سنگ تراشی میں خواتین کو کوئی نمائندگی نہیں دی گئی۔" عفیف نے مستند فارسی شاعر فردوسی کی ایک قدیم ایرانی روایت کا حوالہ دیا ہے کہ "عورت اور اژدھا خطرناک مخلوق ہے جسے ختم کر دینا ضروری ہے لیکن اگر کوئی عورت پھر بھی زندہ رہتی ہے تو اسے گھر کی چار دیواری میں سختی سے مقید کر دینا چاہیے۔" عفیف ص ۳۵۲۔ دیکھیے جوامع الحکایات ص ۲۲۱۔ صنفِ نازک کے عیوب پر مشتمل پورا ایک باب ہے عورت نہ صرف ذہنی طور پر کمزور ہی ہے بلکہ فطرتاً شر پسند بھی ہے (دیکھیے برنی ص ۲۴۵ عفیف ص ۲۵۴) حکمتِ عملی کے لیے دیکھیے آداب الحرب ص ۶۷۔ اہم معاملات میں بیوی کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر اس کا مشورہ ناگزیر ہو تو بہترین صورت یہ ہے کہ اس کے مشورے کے خلاف کام کیا جائے۔ تاریخ شیر شاہی ص ۱۵۔ بر فاری کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنی جائداد اور اپنی دیگر قیمتی اشیا کا علم نہ ہونے دے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بنا پر غیر صحت مندانہ طرزِ فکر کو فروغ ملا۔ عورت کی پاکدامنی کو مبالغہ آمیز حد تک اہمیت دی گئی اور تقریباً اسی حد تک مردوں کے پاکدامن نہ ہونے کی ہمت افزائی کی گئی۔[1]

(گزشتہ سے پیوستہ) دیول رانی ص ۱۲۱ کے مطابق عورت کی واحد خوبی یہ ہے کہ وہ جنسی تسکین کا ذریعہ ہے۔ بہرحال یہ ناخوشگوار انسانی کوتاہی صوفیا کو بھی خوش نہ کر سکی جو اس بات پر مصر تھے کہ عورت کی پیدائش کا مقصد ہی جہنم میں جانا ہے۔ صرف مرد جنت کے مستحق ہیں (دیکھیے تحفۂ نصائح ص ۲۶ ب جس میں جنت اور دوزخ میں جانے والی آبادی کی نسبتی تعداد بھی دی گئی ہے)۔ صوفیا نے اس سے بھی آگے ایک قدم اور بڑھایا اور خیر اور شر کی قوتوں کا بھی تعین کر دیا جو بلاشبہ مرد اور عورت ہی تھی۔ (دیکھیے صحائف شیخ صدرالدین ص ۸۷-۸۸)

[1] شہوت پرستی کے لیے دیکھیے 'اخلاق و رسوم'۔ یہاں ایک خاص مثال دینا ہی کافی ہوگا۔ ایک بار شیر شاہ کے سپاہیوں نے ایک انتہائی حسین لڑکی کو گرفتار کرکے اس کے سامنے پیش کیا۔ اسے دیکھ کر شیر شاہ غصے سے چلایا " اس مجسم معصیت کو یہاں سے لے جاؤ۔ اسے دشمن کے کیمپ میں لے جانے کا حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ اس کے بعد شیر شاہ نے اپنے سپاہیوں کو بتایا کہ اگر وہ اس حسین دوشیزہ کو اپنے پاس رکھ لیتا تو وہ عیاشی کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس طرح اس کا سیاسی اقتدار تباہ ہو جاتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ لڑکی ہمایوں کے پاس پہنچ گئی تو وہ عیاشیوں میں بری طرح مبتلا ہو گیا اور فوجی نقل و حرکت سے اس حد تک لاپرواہ ہو گیا کہ چالاک شیر شاہ نے اسے شکست دی اور اس طرح اسے اپنی عیاشیوں کی قیمت میں تخت سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ (دیکھیے تاریخ داؤدی ص ۷۵) عورت کی پاک بازی کے سلسلے میں دیکھیے امیر خسرو کے مشاہدات جنھیں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ ایک لڑکی سے جس کی پاک بازی پر معمولی سے بھی شبہات ہوں کوئی بھی معزز آدمی شادی نہ کرے گا چاہے وہ الزامات بعد میں بے بنیاد ثابت ہو جائیں۔ شاعر نے اس لیے ہر ایمان دار لڑکی کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی کی پیار بھری باتوں میں آنے کے بجائے اپنی جان دے دے (مطلع الانوار ص ۱۹۸) اس کے برخلاف دیکھیے دکن کی خواتین۔ باربوسہ جلد دوم ص ۵۴۔ ایضاً ص ۲۱۶۔ برائے دیوداسی۔

ان چند حقائق سے ہندوستان کی عورتوں کی معاشرت اور ان کی روایات کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مجموعی طور پر مردوں کے ساتھ عورتوں کا ربط و ضبط کم تھا۔ بیٹی کی حیثیت سے ایک لڑکی کی ہم صحبت اس کی ساتھ کھیلنے والی لڑکیاں اور لڑکوں میں اس کے بھائی ہی ہو سکتے تھے[1] شادی کے بعد وہ بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کی رفاقت میں رہتی تھی لیکن مشترک خاندان کے دیگر افراد اور غالباً چند دیگر بیویوں کی موجودگی کی وجہ سے شادی شدہ جوڑے میں ایک صحت مند محبت اور رفاقت کے احساسات کم ہی ہو پاتے تھے۔ عورت کی شخصیت کو کچل دینے کے بعد دونوں فریقوں میں نااتفاقی کے امکانات تقریباً ختم ہو جاتے تھے۔ گھریلو زندگی خوش و خرم اور خوش گوار ہو جاتی تھی، اور بچوں کی پرورش توجہ، احتیاط اور پیار کے ماحول میں ہوتی تھی۔ عورت کی بے چارگی اور مرد پر اس کے انحصار کی وجہ سے لوگ عورت کے ساتھ ہر حالت میں شائستہ اور بااخلاق برتاؤ کرتے تھے[2] یہ امر بہر حال مشتبہ ہے کہ آیا یہی خوش خلقی کا سلوک گھریلو خواتین اور غلاموں کے ساتھ بھی کیا جاتا تھا[3] ہر حالت میں عورتوں کی خوں ریزی بہت ہی قابلِ نفرت جرم تصور کی جاتی تھی[4]

عورتوں کی ذہنی ترقی مختلف طبقات میں مختلف ہوتی تھی۔ دیہاتوں میں جہاں عورت دیہی وسائل دولت کا ایک جز ہوتی تھی عام اصطلاح میں وہاں اس کی معاشرتی ترقی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ گزشتہ صفحات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ بنگال میں بنائی کے

---

[1] لڑکے مخصوص الفاظ میں "میں نے کہا بھائی کی طرح کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا"۔ ٹیمپل ص ۲۳۲

[2] راجپوتوں میں عورت کی تعظیم اور قدر کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۷۱۱۔ چوسہ مقام پر ہمایوں کی شکست کے بعد مغل حرم کی خواتین کے لیے شیر شاہ کے جذبات کے لیے دیکھیے تاریخ شیر شاہی ص ۳۷

[3] گھریلو خادماؤں کے ساتھ برے برتاؤ کی مثالوں کے لیے دیکھیے فتح فیروز شاہی ص ۱۷۰

[4] دیکھیے فیروز تغلق کا وہ دل چسپ واقعہ جب اس نے بنگال کے سلطان الیاس شاہ کی سلطنت پر حملہ کرنے کا جواز تلاش کیا تھا۔ اس کی رائے میں دیگر جرائم کے علاوہ موخرالذکر پر خواتین کے قتل کرنے کا جرم بھی عائد تھا۔ فیروز تغلق بڑے عقیدت مندانہ جذبات کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے کہ "کسی بھی عقیدے اور رسم میں عورت کا قتل جائز نہیں ہے خواہ وہ عورت کافر ہی کیوں نہ ہو" دیکھیے J. A. S. B. ۱۹۲۳ء ص ۲۷۹

کام کے بعض طریقوں میں حصہ لینے کی عورتوں کو اجازت نہ تھی حالاں کہ اس قسم کی پابندیاں گھریلو کاموں پر لاگو نہیں تھیں۔ اس کے برخلاف غریب طبقہ کی کسان عورتیں گھریلو کھیتی باڑی کے کاموں اور بچوں میں اس قدر مصروف رہتی تھیں کہ انھیں ذہنی مشغلے یا تفریح کا موقع کم ہی میسر آتا تھا۔ ان کا ذہنی نشوونما ایک بہت ہی پست معیار سے آگے نہ بڑھتا تھا اس سے روایات و عقائد کے طالب علم اچھی طرح واقف ہیں۔

اعلیٰ طبقے کی خواتین ایک بہم جبریانہ اور غیر محفوظ زندگی بسر کرتی تھیں اس کی وجہ سے وہ بہت سے علوم و فنون سیکھنے پر مجبور تھیں[1] دیول رانی، روپ متی اور میرا بائی ہندو تہذیب کی اچھی مثالیں ہیں۔ حاجی دبیر کا بیان ہے کہ قراجل کی پہاڑیوں (کمایوں) پر تغلق کے حملے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ ان علاقوں کی عورتیں حاصل کرنا چاہتا تھا جو اپنی شائستگی کے لیے مشہور تھیں[2] سلطان رضیہ کے دہلی میں تخت نشین ہونے سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان امرا اور شاہی خاندان کے افراد اپنی خواتین کو بہترین تعلیم و تربیت سے بے بہرہ نہیں رکھتے تھے۔ مغلوں کے دور میں ہندوستانی امرا میں ایک زیادہ صحت مند روایت شروع ہوئی۔ گلبدن بیگم کا بیان ہے کہ ہمایوں کے شاہی حرم کی خواتین اپنے مرد دوستوں اور مہمانوں کے ساتھ آزادی سے ملتی جلتی تھیں۔ بعض اوقات یہ خواتین مردانہ لباس زیب تن کر کے باہر جاتی تھیں، پولو کھیلتی تھیں اور موسیقی سے دل

---

[1] اکثری عورت کے لیے دیکھیے حالی کی مشہور تصنیف میں پدماوت کا پیار اور اس کی ہم جولیت۔ نیز دیکھیے افغان خواتین کی ہمت اور جاں بازی کی ذو مثالیں۔ ایک موقع پر مردانہ لباس پہن کر انھوں نے دہلی کے قلعہ کو دشمنوں سے بچایا اور دشمن کی تیروں کی بارش کو برداشت کرتی رہیں۔ یہ مقابلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک ان کے شوہر اور دیگر رشتہ دار مرد: گئے (تاریخ داؤدی ص ب برائے تفصیلات) نیز جب کشمیر کے پہاڑی علاقہ میں رہتے ہوئے نیازی پریشان ہو گئے تو ان کی عورتوں نے تیروں، کمانوں، تلواروں اور نیزوں سے مسلح ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا اور آخرکار ان پتھروں کے نیچے دب کر اپنی جان دے دی جن کی بارش اوپر سے دشمن نے کی تھی۔ (منتخب التواریخ جلد اوّل ص ۳۸۸)

[2] ظفرالوالہ جلد سوم ص ۸۷۷۔

بہلاتی تھیں۔ وہ غلیل کے استعمال اور دیگر فنونِ لطیفہ کی بھی ماہر تھیں۔[1] مقابلتہً زیادہ آزادی نے مغل خواتین میں عزت اور خودداری کا ایک احساس بیدار کر دیا تھا اور مشہور مغل شہنشاہوں کی مائیں اپنے اپنے میدانوں میں اتنی ہی فن کارانہ صلاحیتوں کی حامل تھیں جتنے ان کے بیٹے اپنے میدانوں میں تھے۔[2] کمتر درجے کی خواتین کے سلسلے میں مورخین تقریباً خاموش ہیں۔ ہاں اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کی زندگی بھی اعلیٰ طبقے کی خواتین سے مشابہ تھی۔ اس حقیقت کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ بعض داشتائیں بھی بہت سلیقہ شعار اور ہنرمند تھیں۔

پردہ اور مختلف طبقوں میں باہمی سماجی ربط

آئیے اب ہم ہندوستان میں پردے کے رواج اور اس کے ارتقا پر ایک نظر ڈالیں۔ پردہ ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کے معنی ہیں حجاب یا کسی چیز کو چھپانا۔ عام طور پر یہ لفظ نقاب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عورت کے لیے یہ اصطلاح اس کے کسی جداگانہ عمارت یا عمارت کے کسی جداگانہ حصے میں رہنے پر دلالت کرتی ہے جسے دوسرے الفاظ میں حرم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں لفظ حرم سے مراد قیام کی جگہ کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جملہ خواتین عوام کی نظروں سے دور رکھی جائیں۔ ایک

---

[1] دیکھیے گلبدن کا بیان۔

[2] مثال کے طور پر دیکھیے اکبر کی والدہ وحیدہ بانو کا واقعہ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ہمایوں نے اس سے شادی کی پیش کش کی تو اس خاتون نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کسی ایسے مرد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی جس کا اپنا سماجی مرتبہ اس کے سماجی مرتبہ سے بہت زیادہ بلند ہو۔ اس نے کہا " میں ایسے آدمی سے شادی کرنا پسند کروں گی جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکے نہ کہ ایسے آدمی کے ساتھ کہ جس کے قدموں تک میری رسائی نہ ہو۔" یعنی اس کا اصرار اس بات پر تھا کہ وہ ہم رتبہ فرد سے شادی کرے۔ (دیکھیے گلبدن ص ۵۳) اس سلسلے میں نور جہاں اور ممتاز محل کی مثالیں تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔

لڑکی جیسے ہی بلوغ کی عمر کو پہنچتی ہے یا اس سے کچھ پیشتر الگ تھلگ رہنا شروع کر دیتی ہے اور اس رواج کی پابندی اپنی زندگی کے بہترین دور میں اس وقت تک کرتی ہے جب تک کہ وہ بچہ کو جنم دینے کے قابل ہوتی ہے۔ بوڑھی ہونے کے بعد اُسے اُس عزلت کی ضرورت نہیں رہتی لیکن اس وقت تک پوری زندگی اس رسم کو ماننے کی وجہ سے اس کے لیے عوام میں باہر نکلنے کے بجائے حرم کی چار دیواری میں رہنا زیادہ آرام دہ ہوتا ہے یہ امر قابلِ غور ہے کہ زیرِ مطالعہ دور میں حرم میں غلام خواتین، خواجہ سرا اور دیگر جملہ ملازمین جو زنانہ حصوں کی دیکھ بھال اور خدمت پر مامور تھے بھی شامل ہیں۔

پردے کی ابتدا کے بارے میں متعدد متضاد نظریات کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پردے کو رواج دینے کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے ہندوستان کی خواتین آزادی سے باہر نکلتی تھیں[1] دوسرے لوگوں کا خیال ہے نقاب یعنی پردے کا رواج بہت پرانے زمانے کا ہے اور اس نظریہ کو قدیم ہندو سماجی تاریخ کی مثالوں سے مدد ملتی ہے[2] یہ رائیں اس حد تک ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں جتنی کہ یہ پہلی نظر میں معلوم ہوتی ہیں۔ درحقیقت یہ اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں۔ قدیم ہندوستان میں خواتین جزوی طور پر سماج سے الگ تھلگ رہتی تھیں اور ایک خاص طرح کا پردہ بھی کرتی تھیں (جیسے آج کل گھونگھٹ کہتے ہیں) لیکن موجودہ زمانے میں گہرا اور روایتی پردہ مسلمانوں کی ہندوستان میں حکومت کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ موجودہ طرز کے پردے کے ارتقا کے متعدد اسباب ہیں۔ ان اسباب میں اہم ترین اسباب دو ہیں۔ ہندو سماج میں عورت کا درجہ اور اس کے فرائض اور جنسی اخلاقیات پر اس کے خیالات[3]۔ ہم جانتے ہیں کہ اس دور کے ہندو سماج میں عورتیں عام طور پر مردوں

---

[1] دیکھیے مس کوپر ص ۱۰۲

[2] دیکھیے پردے کے سلسلے میں مسٹر مہتہ کی رائے پر مشتمل ایک مضمون جو لیڈر میں الہ آباد سے مئی ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا تھا۔

[3] دیگر غیر اہم وجوہات کے ساتھ ساتھ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمسایہ مسلمان ہندو عورتوں پر جتنے کرتے تھے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں مثلاً روپ متی اور باز بہادر کا عشق۔ نیز دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۹۵۲۔ ایک وجہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے الگ رہتی تھیں اوران کا دائرۂ عمل صرف گھر تک محدود تھا۔ مسلمان ہندوستان میں اپنے ساتھ طبقہ داری اور نسلی تقسیم و امیرانہ وشاہانہ طرز کے مبالغہ آمیز خیالات لے کر ہندوستان آئے جو ہندوستانی ماحول میں جلد ہی مقبول ہوگئے۔ ان وجوہات کے ساتھ ساتھ ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ حملہ آوروں خصوصاً منگولوں کے خوف کی وجہ سے عوام پر یہ احساس بھی طاری تھا کہ وہ غیر محفوظ ہیں اور یہ خوف تقریباً ۲۰۰ سال سے زیادہ تک طاری رہا۔

مسلم دور میں حالات کچھ اس طرح کے تھے۔ عام کسان عورتیں کوئی پردہ یا خصوصی نقاب استعمال نہیں کرتی تھیں اور نہ ہی الگ تھلگ رہتی تھیں۔ جب وہ کسی اجنبی کے پاس سے گزرتیں تو وہ اپنی ساڑی یا سر کے لباس کا پلو تھوڑا سا اپنے چہرے کے اوپر کرلیتی تھیں۔ ان کے بازو اور چہرہ بالکل کھلے رہتے تھے۔ ہندوستان کا کسان متعدد شادیاں نہیں کرسکتا تھا اور عام طور پر گھر میں اس کی بیوی کی کوئی رقیب نہیں ہوتی تھی۔ اس دور کی عورت عام طور پر جسمانی نقطۂ نظر سے تندرست اور مضبوط اخلاق کی حامل تھی اور ایسی کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کا شوہر رشک کرے یا اُسے شک کی نگاہ سے دیکھے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کا کسان یک زوجی، تندرست اور بے فکری کی زندگی ہی گزارنا جانتا ہے[1] اعلیٰ طبقہ کی خواتین اس حد تک ہی پردہ کرتی تھیں جس حد تک کہ ان کے ذرائع اجازت دیتے تھے کیوں کہ وہ گھریلو کاموں سے آزاد تھیں۔ اعلیٰ طبقہ میں پردہ شرافت کی دلیل تصور کیا جاتا ہے۔ جس کا جتنا بڑا درجہ ہوتا ہے اس کے گھر کی کھڑکیاں اتنی ہی چھوٹی اور بلندی پر ہوتی ہیں اور ان کی خواتین اتنی ہی الگ تھلگ رہتی ہیں[2]۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ موجودہ صورت حال کے

(گذشتہ سے پیوستہ) یہ بھی رہتا تھا کہ فیروز تغلق کے والد کی طرح کوئی حکمران یا افسر کسی لڑکی کو بیوی کی حیثیت سے مانگ لے۔ نیز دیکھیے ٹوڈ۔ جلد دوم ص ۹۲۶۔

[1] دیکھیے ایف۔ ڈبلیو۔ تھامسن کی رائے ص ۲، "عورتوں کو الگ تھلگ رکھنے کا رواج مسلمانوں سے لیا گیا ہے لیکن یہ نقل صرف دولت مند طبقے نے ہی کی۔ دیکھیے ابوالفضل آئینِ اکبری۔ جلد دوم ص ۸۲ "شوہر (ہندو عوام میں) اس وقت تک دوسری شادی نہیں کرتا جب تک کہ بیوی بانجھ نہ ہو۔ اسی طرح مرد اس وقت بھی شادی نہیں کرتا جب اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو جائے۔"

[2] دیکھیے کو پر ص ۱۲۱

دباؤ کی وجہ سے حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔

زیر نظر دور میں پردے سے متعلق متعدد تاریخی دستاویزات ملتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نچلے طبقے میں گھونگھٹ کا ذکر ملک محمد جائسی، ودیاپتی اور دیگر افراد نے کیا ہے جنھوں نے عوام الناس کی زندگی کے بارے میں تحریر کیا ہے[1] پردے کی دوسری اور زیادہ ترقی یافتہ شکل اپنے جملہ اصول وضوابط کے ساتھ ہندوستان میں مسلم حکومت کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی۔ فخرالدین مبارک نے لاہور کے غزنوی حاکم بہرام شاہ کی ہندو خواص کے دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ بیمار ہوئی اور ایک ایسے طبیب کو اس کا علاج کرنا پڑا جس نے اس کی جسمانی جانچ کرنے اور نبض دیکھنے پر اصرار کیا۔ یہ بات بادشاہ کے گوش گزار کی گئی۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا اور بہت سے معقول دلائل کے بعد ہی وہ اس پر رضامند ہوا کہ طبیب اس کے چہرے اور بازوؤں کو دیکھے بشرطیکہ انھیں اس کی موجودگی میں زیادہ نہ کھولا جائے[2]۔ رضیہ کی مثال موجود ہے اور ہم اسے شاہی حرم میں پردے کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں[3]۔ فیروز شاہ تغلق سے پیشتر ملک کی رعایا پر پردہ لاگو کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ وہ پہلا سلطان تھا جس نے دہلی کی خواتین کو دہلی سے باہر کے مقبروں پر جانے سے روکا کیوں کہ اس کے نزدیک شریعت نے خواتین کو باہر جانے سے منع کیا ہے[4]۔ اندرون شہر خواتین کی نقل وحرکت کے سلسلے میں کچھ تفصیلات نہیں ملتیں۔ غالباً ان حدود میں ان کے اوپر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس وقت تک یہ رواج بیرونی ریاستوں میں اچھی طرح پھیل چکا تھا[5]۔ ایک شریف عورت چند مرد ملازمین کے ساتھ بند پالکی (ڈولی) میں سفر

---

[1] دیکھیے پداولی بنگیا XIV میکالف جلد چہارم ص ۳۴۷

[2] آداب الحرب ص ۲۰

[3] سلطانہ رضیہ کے بارے میں دیکھیے طبقات ناصری اور امیر خسرو کے حوالہ جات، نادرتی ص ۶۳۸-۶۴۳ دیول رانی ص ۴۹۔ رضیہ نے زنانہ لباس کو ترک کرکے اس رواج کو توڑ دیا اور پردے سے نکل آئی۔ امیرخسرو اس کی اس بے حجابانہ جرأت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔

[4] دیکھیے اپنے انتظام کے بارے میں فیروز شاہ کی اپنی ذاتی رائے۔ فتوحات فیروز شاہی ص ۸-۹۔

[5] نقاب پوش اور سرتاپا کپڑوں میں لپٹی ہوئی عورتوں نے بنگال کے اکدالہ قلعہ میں فیروز تغلق کی محاصرہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کرتی تھی[1] قدرے غریب یا غیر امیر خواتین غالباً سر سے پیر تک ایک لمبے کپڑے میں لپٹی ہوئی جاتی تھیں جسے آج کل برقع کہتے ہیں[2] اپنی خواتین کے لیے سلاطین اور امرا پوری طرح ڈھکی ہوئی اور مقفل پالکیاں استعمال کرتے تھے[3] ہندو امرا نے بڑی سرعت کے ساتھ مسلمان حکمرانوں کے طور طریقوں کو اپنا لیا[4]

اس سلسلے میں ہندو اور مسلم سماج میں شادی سے متعلق اصول اور ضوابط اور پردے سے تعلق کا بھی ذکر بے موقع نہ ہوگا۔ جب کہ ایک طرف عورت کے لیے ان افراد سے سماجی ربط ضبط پر زیادہ پابندی نہیں لگائی جاتی جس سے اس کی شادی اصولی طور پر ممنوع ہے تو دوسری طرف ان افراد سے ربط ضبط قائم نہ کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جن کے ساتھ مستقبل میں ان کے شادی ہونے کے امکانات ہوں۔ بنیادی طور پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے اصول و ضوابط انتخاب کا کافی موقع فراہم کرتے ہیں۔ شادی سے متعلق دونوں فریقوں کو کافی حد تک آزادی دی گئی ہے۔ ایک ہندو عموماً اپنے گوت (LINAGE) سے باہر لیکن اپنی ہی ذات میں شادی کرتا ہے۔ اس طرح ایک طرف اس گوت سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے ساتھ سماجی ربط ضبط رکھنے کی آزادی نہیں ہے، لیکن دوسری طرف ان حدود سے باہر اپنی ذات میں ربط ضبط کی زیادہ آزادی ہے۔ دوسری ذاتوں میں شادی کرنا بڑی شدت سے ناپسند کیا جاتا ہے۔ مختلف ذاتوں اور جنس سے تعلق رکھنے والے افراد پر اس کا ردعمل بُرا ہونے کے بجائے بڑا اچھا ہوتا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں میں شادی فریقین کے درمیان ایک معاشرتی معاہدہ کی حیثیت

(گزشتہ سے پیوستہ) کرنے والی فوج کے سامنے رحم کی بھیک مانگی تھی۔ عفیف ص ۱۱۸

[1] تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۴۲۲

[2] گجراتی بنیا طبقے کی عورتوں کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۱۴

[3] تاتارخاں کی کنیزیں بند اور مقفل پالکیوں میں سفر کرتی تھیں دیکھیے عفیف ص ۲۹۳-۳۹۴۔ تیمور بھی اپنے حرم کو بند پالکیوں میں لے جاتا تھا۔ ملفوظات تیموری ص ۲۸۹

[4] ہندو امرا کے لیے دیکھیے سرکار ص ۱۹۰۔ پوری (اڑیسہ) کے راجہ رُدرا پرتاپ کی بیویاں چیتنیہ کے پاس بند پالکیوں میں آیا کرتی تھیں۔

رکھتی تھی ۔ چند مخصوص ممنوعہ حدود مثلاً ایک خون ، خاندانی تعلق ، دایہ گری اور چند مخصوص واقعات کو چھوڑ کر قرآن نے شوہر اور بیوی کے انتخاب کی مکمل آزادی دی ہے ۔ ان ممنوعہ حدود میں رہنے والے افراد کو محرم قرار دیا گیا باقی سب نامحرم کہلاتے ہیں یعنی وہ جن کے ساتھ شادی جائز ہے ۔ کفو یا رتبہ کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں ۔ اس کے مطابق یکساں سماجی مرتبہ رکھنے والے افراد بلکہ یکساں مذہبی خیالات رکھنے والے افراد میں شادی کرنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے ۔ اسی طرح کے خیالات اور رسوم نے جلد ہی آزادی کے اس ماحول کو محدود کرنا شروع کر دیا تھا ۔

غلاموں کے آقاؤں سے متعلق اختیارات کا بھی ہم ذکر کر چکے ہیں ۔ ان اختیارات کی رو سے انھیں یہ حق تھا کہ وہ کسی بھی غلام کی کسی سے شادی کر دیں ۔ کسی خاندان کے بزرگ کے یہ اختیارات اس کے افراد پر مختلف حالات میں مختلف ہوتے تھے ۔ یہ قبائلی روایات پورے سماجی نظام میں سرایت کر چکی تھیں اور بنیادی ازدواجی اصول وضوابط پر انھیں بالادستی حاصل تھی ۔ غلاموں کے آقا گھریلو حدود میں خود سلطان کی طرح برتاؤ کرتے تھے (جس کا ذکر ہم بیشتر کر چکے ہیں) اور بچوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ ایسا ہی ہوتا تھا جیسا سلطان کا اپنی اولاد کے ساتھ ۔ ان حالات میں ازدواجی اصول وضوابط کا بالکل نیا مفہوم لیا گیا ۔ انتخاب کی بنیادی آزادی کا تعلقات کی نوعیت پر الٹا ردعمل ہوا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار مرد عورت کا سماجی ربط ضبط صرف ان افراد تک محدود ہو گیا جو محرم کہلاتے تھے یا ایک ہی گوت سے تعلق رکھتے تھے یعنی جن کی آپس میں شادی کسی بھی حالت میں کبھی نہیں ہو سکتی تھی ۔

مردوں عورتوں کے باہمی ربط ضبط پر جو پابندیاں عائد کی گئیں ہماری رائے میں یہ انحراف ان پابندیوں کی صحیح نوعیت کا اندازہ لگانے میں معاون ہے ۔ پردے کے رواج کی ابتدا اس لیے ہوئی تاکہ نامحرم (یا وہ مرد جو قانونی طور پر شادی کر سکتے ہیں) ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہیں ۔ کنبہ کے بزرگوں کے ذہنوں پر ہمیشہ یہ خطرہ سوار رہتا تھا کہ اگر مرد عورت کو ممنوعہ حدود سے زیادہ تعلقات رکھنے کا موقع دیا گیا تو وہ غلط راستے پر چل سکتے ہیں اور اس طرح بزرگوں کی مرضی ، مشترکہ خاندان کی رائے ، دیہی برادری یا اعلیٰ خاندان کی مرضی کے خلاف حسب منشا شادی کر سکتے ہیں ۔ اس دور کے لوگوں کی اخلاقی

حالت اور رسوم و رواج پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ عورت کے بے داغ چال چلن پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل تھی کہ لوگ کسی لڑکی کی پاکدامنی پر پورا یقین رکھتے ہوں۔ اس کی شناخت کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ یہ کہ لڑکی حرم کے اندر پردہ میں رہتی ہو یعنی اسے نامحرموں سے ملنے کے مواقع حاصل نہ ہوں۔ اس دور کے سماجی حالات میں ایک شوہر اپنی بیوی کو سماجی ربط ضبط کی آزادی دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور اگر کوئی عورت ایسی آزادی کی زندگی بسر کر چکی ہو تو اس کی اخلاقی ناموس داغدار ہو جاتی تھی اور کوئی اس کے ساتھ شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔[1]

نئی مذہبی تحریکات کے زیر اثر پردے کی اصلاح کے سلسلے میں زیر مطالعہ دور کے اختتام تک کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ گجرات کے چند ساحلی قصبات اندرونِ ملک قصبات کی بہ نسبت اس رواج سے بہت کم متاثر ہوئے۔ چوں کہ ان قصبات کا واسطہ بین الاقوامی تجارت کے ذریعہ غیر ملکی افراد سے پڑتا تھا اس لیے بہ ظاہر یہ صحت مند اثر اسی وجہ سے تھا۔[2]

---

[1] نامحرموں کو ایک دوسرے سے محفوظ رکھنے کے لیے دیکھیے ذیل حوالہ دیکھیے "محمد تغلق جب حرم میں داخل ہوتا تھا تو اس کی بڑی احتیاط کرتا تھا کہ اس کی نظر کسی نامحرم پر نہ پڑے (برنی ص ۵۰۶) عفیف کا بیان ہے کہ سلطان فیروز تغلق کے ایک امیر تاتار خان کی کنیزیں اس لیے بند اور مقفل سواریوں میں سفر کرتی تھیں تاکہ کسی نامحرم کی نظریں ان پر نہ پڑیں۔ ص ۳۹۳ - ۳۹۴

صوفی ہمدانی ان مقامات سے بڑے ڈرتے تھے جہاں مردوں، عورتوں کے ملنے کے امکانات ہوں۔ دیکھیے ذخیرۃ الملوک ص ۶۹۔ دیکھیے امیر خسرو کا مندرجہ ذیل مشورہ کہ اگر کوئی عورت لوگوں کی تنقید سے بچنا چاہتی ہے تو بہتر ہے کہ وہ نامحرموں کی صحبت سے اجتناب کرے اور اگر وہ کسی بھی طرح کے شبہ یا تنقید سے بالکل محفوظ رہنا چاہے تو بہتر ہے کہ وہ پردہ کرے۔ دیکھیے مطلع الانوار ص ۱۹۵۔ دوسری جگہ وہ تحریر کرتا ہے کہ عورت کی پاکدامنی اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب کہ وہ بیرونی دنیا سے قطعاً تعلق نہ رکھے (اعجاز خسروی جلد دوم ص ۳۱۷) مسلمان شوہروں کے رشک کے لیے دیکھیے بار بوسہ جلد اول ص ۱۲۱۔

[2] سنت پیپا (ولادت ۱۴۲۵ء) نے سور سین لڑا (ہندوستانی سرحد پر) کے کسی راجہ کی بیویوں کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۴) خانگی واقعات

خصوصاً دو ہی ذاتوں میں گھریلو زندگی کے نمایاں ترین معاملات میں قدرتی طور پر ایک فرد کی زندگی کی نشوونما کی مختلف منازل تھیں مثلاً پیدائش، آغازِ شباب، بلوغت اور موت۔ ان منازل کے گرد فرد کی زندگی میں ان رسم و رواج کی پوری پیروی کی جاتی تھی۔ یہ جملہ رسوم پوری محتاط تفصیلات کے ساتھ منائی جاتی تھیں۔ ان میں مذہبی جذبات کو پورا دخل تھا۔ حتیٰ کہ سماج میں اسی فرد کو معزز تصوّر کیا جاتا تھا جو ان سماجی اور مذہبی رسومات کی ادائیگی پوری توجہ سے کرتا ہو۔

ابتداً بچّے کی پیدائش کسی کنبہ میں انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی تھی۔ عقلمند اور سوفسطائی افراد زندگی اور موت کے اسرار پر زیادہ زور دیتے ہوں لیکن صحت مند ذہن رکھنے والے افراد کے لیے اس دنیا میں ایک نئے فرد کی آمد ہی اس بات کی مستحق تھی کہ اس پر وہ زیادہ سے زیادہ خوشی منائیں[۱] ننھے میاں کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس کی پیدائش سے پیشتر ہی بہت سے چھوٹے چھوٹے پالنے بنا لیے جاتے تھے[۲] اولادِ نرینہ کی پیدائش پر ہندو کنبہ میں ایک جوش و خروش پیدا ہو جاتا تھا۔ لڑکے کا باپ فوراً تازہ پانی سے اشنان کر کے اپنے آباؤ اجداد کی ارواح اور کنبے کے سرپرست (محافظ) دیوتاؤں کی پوجا کرتا تھا۔ اس کے بعد ایک سونے کی انگوٹھی شہد اور گھی میں ڈبو کر ننھے بچّے کے منہ میں رکھ دیتا تھا[۳] اسی دوران میں عقل کل پنڈت پیدائش کی ساعت اور بچے

(گزشتہ سے پیوستہ) پردے کی مخالفت کی تھی جب وہ اس سے ملنے آئیں تھیں (دیکھیے میکالف جلد ششم ص ۳۴۷) گجرات میں سماجی ربط ضبط میں نسبتاً آزادی تھی۔ دیکھیے باربوسہ کا بیان۔ ایک مقام پر وہ کہتا ہے کہ راندیر کی عورتیں یورپ کی عورتوں کی طرح اپنے منہ کھلے رکھتی تھیں اور گھریلو اور بیرونی فرائض انجام دیتی تھیں۔ اس کا بیان ہے کہ اگرچہ کھمبایت میں عورتیں پردہ کرتی تھیں لیکن وہ بلا روک ٹوک اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملنے بڑی پرتکلف سواریوں میں جاتی تھیں اور انھیں پردے کی حدود میں رہتے ہوئے سماجی ربط ضبط کی کافی آزادی حاصل تھی (باربوسہ جلد دوم ص ۱۴۸-۱۴۱)

[۱] اکبر کے خیالات کے لیے دیکھیے منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۰۵-۳۰۶۔ [۲] امیر خسرو کی دی ہوئی تفصیلات کے لیے دیکھیے کلیات خسرو ص ۵۶، [۳] دیکھیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۸۸

کی پیدائش سے متعلق جملہ تفصیلات قلم بند کر لیتا تھا تاکہ وہ جنم پتری تیار کر سکے۔ اگر کسی وجہ سے وہ صحیح وقت تحریر نہ کر پاتا تھا تو وہ پوری توجہ سے بچے کے جسم کے نشانات لکھ لیتا تھا تاکہ وہ ان ستاروں کے اتحاد کا استخراج کر سکے (لگن) جن میں وہ پیدا ہوا تھا[1]۔ ان ابتدائی تفصیلات کے اختتام پر جشن ہوتا رنگ رلیاں منائی جاتیں۔ ان میں خواتین پیش پیش ہوتی تھیں۔ بچے کی تندرستی کے لیے نذر (نثار یا اتار) اتاری جاتیں ہر امیر غریب، عوام و خواص کو انفرادی اور مجموعی طور پر تحائف تقسیم کیے جاتے[2]۔ مسلمانوں میں اس پر سرت ناپاکی (سوتک) کے بعد عقیقہ کی رسم ادا کی جاتی تھی[3]۔

آخر کار اس کے بعد بچہ کے نام رکھنے کا مسئلہ زیر بحث آتا۔ بچے کی جنم پتری اور موافق ستاروں کے نام کے پہلے حرف پر پوری توجہ دی جاتی تھی۔ عموماً ان ناموں کو مبارک سمجھا جاتا تھا جن کے کل حروف چار سے زیادہ نہ ہوں[4]۔ مسلمان (قدیم اہل فارس کی طرح) ان ناموں سے گریز کرتے تھے جو بت پرستوں میں رائج تھے[5] اور احمد اور علی جیسے سادہ نام رکھنا پسند کرتے تھے[6]۔ بچے کو سحر اور بدروح کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے پیدائش کی تاریخ اور ساعت اور جنم پتری کی مدد سے رکھا گیا اصل نام سختی سے صیغۂ راز میں رکھا جاتا تھا۔ یہ دستور خصوصاً شاہی خاندان میں مروج تھا۔ تیسرے ماہ کے اختتام پر بچے کو سورج کی روشنی میں لایا جاتا تھا۔ اس وقت بھی بچے کو گھر سے باہر لے جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پانچویں مہینے بچے کے سیدھے کان کی لو میں سوراخ کیا جاتا۔ اگر بچہ لڑکا ہوتا تو چھٹے مہینے میں اس کے گرد مٹھائیاں اور

---

[1] دیکھیے ملک محمد جائسی کا بیان۔ پدماوت ص ۲۶ - ۱۱۸

[2] دیگر متعدد تفصیلات کے لیے دیکھیے کلیات خسرو ص ۶۵۷ - ۶۵۸ - طبقات ناصری (قلمی نسخہ) ص ۱۹۶۔

[3] دور جدید کے مشاہدات کے لیے دیکھیے ہندو محمڈن فیسٹ از ROSS ص ۹۸۔

[4] مثال کے طور پر دیکھیے ابو الفضل کے ایک پوتے کا نام خود اکبر نے رکھا تھا۔ آئین اکبری۔ جلد دوم ص ۸۸ و ۲۸۲۔

[5] قدیم ایرانیوں کے لیے دیکھیے ہوارٹ ص ۱۹۲ تحفۂ نصائح ص ۱۱۔ ب

[6] دیکھیے پاپولر ریلیجن از کروک ص ۲۸۱ اور دیگر امثال۔

پھل رکھے جاتے اور اُسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تاکہ وہ اپنی پسند کے مطابق کھا سکے۔ درحقیقت یہ سب معاملات ایک خاص باطنی مفہوم کے حامل تھے اور مستقبل میں اس کی قسمت کی پیش گوئی کرتے تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق کچھ وقفہ گزارنے کے بعد سر منڈانے (موجودہ منڈن) کی رسم ادا کی جاتی تھی[1] چند اور بھی تقریبات تھیں جو مختلف ذاتوں اور طبقوں میں جداگانہ تھیں[2]

بچّے کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ اسے مکتب میں یا کسی استاد کی زیرِ نگرانی تعلیم شروع کراتے وقت بڑی دلکش تقریبات ہوتی تھیں۔ ہندو بچے کو پانچ سال کی عمر میں گرو یا روحانی پیشوا کے سپرد کر دیا جاتا جو اس کے زندگی کی دوسری منزل میں قدم رکھنے کے وقت تک اس کی تربیت اور نگرانی کرتا تھا[3] مسلمانوں میں زیادہ باضابطہ طور پر چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہونے پر بچّے کی بسم اللہ خوانی کرائی جاتی یا بالفاظِ دیگر اس کی مکتب کی تعلیم شروع ہوتی تھی۔ کسی نجومی کے مشورے سے ایک ساعت مقرر کی جاتی اور استاد بچّے کو پہلا سبق دیتا[4] عموماً سات سال کا ہونے پر مسلم بچے کی ختنہ کرائی جاتی تھی اور خاندان کے مالی ذرائع کے مطابق جشن اور تفریحی تقریبات منائی جاتی تھیں[5] تین اعلیٰ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے کسی

---

[1] مسلمان سر کے وسط میں بالوں کا ایک گچھا چھوڑنا پسند کرتے تھے۔ دیکھیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۸۸۔ تحفۂ نصائح ص ۱۱ ب۔ نیز دیکھیے روس فیسٹول پ ۱۰۹۔ دورِ جدید کی رائے کے لیے۔

[2] مثال کے طور پر مغلوں کی تقریبات کی تفصیلات کے لیے دیکھیے ابوالفضل کا بیان۔ جب کوئی بچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا شروع ہی کرتا تھا تو باپ یا گھر کے دوسرے مرد سے پگڑی پھینک کر مارنے کو کہا جاتا تھا تاکہ بچہ گر پڑے۔ اکبرنامہ جلد اول ص ۱۹۴۔

[3] آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۸۸

[4] مسلمانوں کی روایات کے لیے دیکھیے اکبرنامہ جلد اول ص ۲۷۰۔ دورِ جدید کی رائے کے لیے دیکھیے روس ۹۹۔

[5] یوسف گدا کے نظریات کے لیے دیکھیے تحفۂ نصائح ص ۲۷۔ اکبر کی ختنہ اور اس سے متعلق خوشی کی تقریبات کے لیے دیکھیے اکبرنامہ جلد اول ص ۲۴۸۔ اکبر نے ۱۲ سال کی عمر سے پہلے ختنہ کرانا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہندو بچے کی زندگی کی آخری تقریب اپنیان یا زنار پہننے کی ہوتی تھی۔ یہ رسم عموماً نو سال کی عمر ہو جانے پر پوری کی جاتی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکے کا بچپن ختم ہو چکا ہے[۱] لڑکا اور لڑکی اس وقت زندگی کی دوسری منزل یعنی شادی اور عملی زندگی میں داخل ہونے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ بیٹا عموماً اس کے لیے خوشی سے تیار ہو جاتا تھا لیکن بیٹی کچھ افسردہ ہو جاتی تھی۔ کیوں کہ اس کی آزادی کی زندگی ختم ہو جاتی تھی اس لیے وہ اس وقت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے لیے اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی اور والدین کی شفقت سے پوری طرح لطف اندوز ہوتی تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی سالگرہ بھی ہر سال اسی طرح منائی جاتیں اور اس موقع پر ریشم کی خوب صورت ڈوری میں گانٹھ لگا کر اس کی عمر کا شمار کیا جاتا تھا[۲]

(۵) شادی

شادی کے لیے عمر کی کوئی خاص حد مقرر نہ تھی۔ ہندو مسلمان دونوں کم سنی کی شادی کو بہتر خیال کرتے تھے[۳] اکبر نے ان معاملات میں دخل اندازی کی خواہش کی اور اس نے شادی

(گزشتہ سے پیوستہ) ممنوع قرار دیا تھا اور اس کے بعد بھی لڑکے کی مرضی پر منحصر تھا۔ دیکھیے بلاک مین یکجلد اول ص ۲۰۷

۱۔ آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۸۸۔ میکالف جلد اول ص ۱۶-۱۷۔ نانک کے تجارت میں روپیہ لگانے کے لیے دیکھیے ص ۶۱ برائے جنیؤ " جنیؤ یا یجنو پویتم میں تین سوتی ڈوریاں ہوتی ہیں۔ ہر ڈوری میں ۳ یا ۹ دھاگے ہوتے ہیں۔ روئی پودے سے برہمن ہی چنتا ہے اور برہمن ہی کاتتا ہے اور وہی ڈوریاں بناتا ہے۔ یہ بائیں کندھے سے لٹک کر دھڑ کے دائیں حصہ پر پڑا رہتا ہے۔"

۲۔ دیکھیے روسں ایضاً ص ۱۱۱۔ برائے جدید نظریات۔ شادی کے امکانات پر ایک لڑکی کے مخصوص جذبات۔ پدماوت ص ۹۶۔ پدماوت کے جذبات گونے کی خبر ملنے پر۔ ایضاً ص ۱۷۱۔

۳۔ جب نانک کی شادی ہوئی اس کی عمر اس وقت ۱۴ سال تھی۔ میکالف جلد اول ص ۱۸-۱۹۔ ہندو لڑکی کی شادی ۸ سال سے کم عمر میں نہیں ہوتی تھی۔ مسلمانوں میں مشابہ مثال کے لیے دیکھیے ہلارٹ ص ۱۵۱۔ قدیم ایرانی رواج کے مطابق لڑکوں کی شادی ۱۵ سال کی عمر میں ہوتی تھی نیز جب شہزادہ خضر خاں اور دیول رانی کی شادی ہوئی اور ان کی عمریں ترتیب وار دس اور آٹھ سال کی تھیں۔ دیکھیے دیول رانی خضر خاں ص ۹۳۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے لیے کم از کم عمر لڑکے کی ۱۶ سال اور لڑکی کی ۱۴ سال مقرر کی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کے ان قوانین پر کس حد تک عمل ہوا[1] اپنے بچوں کی شادی کرنا اور اس سے متعلق رسوم و تقریبات کی نگرانی کرنا والدین اور خصوصاً والد کا حق تصور کیا جاتا تھا[2] شادی کے وقت والدین کو بہت سے نازک اور پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونا پڑتا تھا مثلاً خاندان کا مرتبہ، آبائی رسوم و روایات اور فریقین کی سماجی عزت۔ والدین عموماً اپنی ذمہ داریاں انتہائی احتیاط اور پوری تفصیل سے کرتے تھے۔ شادی دلہا دلہن کے ذاتی معاملے کی بہ نسبت خاندانی معاملہ تصور کی جاتی تھی۔

شادی کی تقریبات کی مکمل تفصیلات دینا ایک مشکل امر ہے کیوں کہ متعدد اہم سماجی امور کی وجہ سے شادی گھریلو زندگی کا ایک انتہائی نمایاں واقعہ تصور کیا جاتا تھا۔ شادی سے متعلق گفت و شنید کا ایک مرحلہ تو وہ ہوتا جب فریقین دو بچوں یعنی مستقبل کے دلہا دلہن کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنے کے لیے متفق ہو جاتے تھے۔ اس سمجھوتے کو تلک یا منگنی کی رسم کی صورت میں منایا جاتا تھا۔ اس رسمی اقرار کے بعد شادی کے لیے ایک تاریخ مقرر کردی جاتی تھی جسے لگن کہتے تھے اور بڑے پیمانے پر شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ دوستوں اور رشتہ داروں کو مقامی نائی یا خصوصی قاصد کے ذریعہ دعوت نامہ بھیجے جاتے تھے۔

(گزشتہ سے پیوستہ) فیروز تغلق کے زمانے میں مسلمان خاندانوں میں شادی کمسنی میں ہو جاتی تھی۔ دیکھیے عفیف ص ۱۸۰۔ فقۂ فیروز شاہی میں قانونی طور پر لڑکیوں کی شادی کی عمر ۹ سال مقرر ہوئی تھی۔ فقۂ فیروز شاہی ص ۱۳۵۔ نیز دیکھیے وسطی انگلینڈ کی دلچسپ مشابہ امثال .Salgmann ص ۲۵۴۔ "بہت چھوٹی عمر میں بچوں کی شادیاں کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ بعض حالات میں شادی کی اصل تقریبات اس وقت ادا کر دی جاتی تھیں جب دلہا اور دلہن اس قدر چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے کہ انھیں گودی میں اٹھا کر گرجے جانا پڑتا تھا اور وہ اس رسم کے جملہ الفاظ بھی ادا نہیں کر سکتے تھے۔

[1] دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول ص ۲۱۰۔ بلاک مین جلد اول ص ۱۹۵۔

[2] اسی طرح سے مشابہ قدیم ایرانی روایات کے لیے دیکھیے ہوارٹ ص ۱۶۳۔

دلہن کے گھر میں ایک منڈپ تیار کیا جاتا تھا[1] دروازوں پر پھولوں کے ہار یا آم کے پتوں کے تورن لٹکائے جاتے تھے۔ اپنی نیک خواہشات اور خوشی کو ظاہر کرنے کے لیے پڑوسی بھی اپنے دروازوں کو آراستہ کرنے کے لیے ان پر پھولوں کے ہار (یا بندھنوار) سجاتے تھے۔ رات کے ماحول میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ چوں کہ گاؤں کی پوری آبادی (قصبہ کی صورت میں گھروں یا محلوں) دلہن کے گھر پر مل کر سہاگ کے گیت گاتی تھی یا اپنے اپنے گھروں میں مقبول عام سہاگ گیت گائے جاتے تھے۔ جلد سنجیدہ اور مزاحیہ رسوم اور متعدد توہم پرستانہ تقریبات دلہن اور دلہا کے گھروں پر منائی جاتی تھیں جو شادی کی اہم تقریب کے لیے تیاری کرنے میں پوری طرح منہمک ہوتا تھا۔ اسی قسم کے انتظامات (سوائے منڈپ کے) دلہا کے گھر پر بھی ہوتے تھے۔

برات کے تمام لوگوں کے جمع ہونے اور دیگر تیاریوں کے اختتام پر دلہا باجے شہنائی اور ایک خوش وخرم اور مسرت سے بھرپور بھیڑ کے ہمراہ دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوتا تھا۔ اس سفر کے لیے نئے، رنگین، سجے ہوئے بارکش استعمال کیے جاتے تھے۔ بارکشوں اور گھوڑ سواروں کی اس قطار کا نظارہ راستے کے باشندے آگے چلنے والی روشنی یا پیچھے سے اٹھنے والی دھول میں کرتے تھے۔ جب براتی دلہن کے گاؤں یا قصبے کے قریب پہنچتے دلہن کے گھر کے لوگ گاؤں سے باہر ہی انھیں خوش آمدید کہتے اور انھیں قیام کی جگہ پہنچا دیا جاتا۔ پان اور شربت سے ان کی تواضع کی جاتی اور پرصعوبت سفر کے بعد ٹھنڈے اور خوب صورت ماحول میں قیمتی قالینوں پر آرام کے لیے انھیں عمارت کے بڑے کمرے میں لے جایا جاتا۔ اسی دوران میں شادی کی تیاریاں اختتام کو پہنچ جاتیں۔ دوار پوجا اور دیگر تقریبات پوری کی جاتیں۔ فرش پر سواستیکا اور دوسری شکلیں بنائی جاتیں۔ دلہا کے

---

[1] آج کل دیہاتی علاقوں میں منڈپ عموماً ایک درخت کا تنا ہوتا ہے۔ بہار کے موجودہ حالات کے لیے دیکھیے بہار پریزنٹ لائف از گریرسن ص ۲۷۴۔ ۳۸۶۔ ملک محمد جائسی کے بیان کے مطابق درخت کے تنے میں قیمتی پتھر جڑے جاتے تھے۔ ہری شاخوں سے درخت ڈھکا رہتا تھا۔ اس کے چاروں طرف صندل کی لکڑی کے ستون ہوتے تھے جن پر ایک چھت ہوتی تھی جس سے ابرق کے گوٹے لٹکتے رہتے تھے فرش پر ایک گلناری کپڑا بچھا دیا جاتا تھا۔ اس کے نیچے غالباً ایک چبوترہ بنایا جاتا تھا۔

لیے شادی کا جوڑا بھیجا جاتا اور اس تقریب کے لیے کپڑا، روپیہ اور دیگر تحائف تیار رہتے۔ ایک مقررہ وقت پر شرم سے سُرخ دلہا اور شرمیلی کنیا (دلہن) نمودار ہوتے اور منڈپ کے اندر تیار کیے ہوئے چبوترے پر بیٹھ جاتے۔ یہ شادی کی اصل تقریبات شروع ہونے کا اشارہ ہوتا۔ عموماً دلہن کا باپ یہ رسم پوری کرتا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی لختِ جگر کو دلہا کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ اسے کنیا دان کہتے تھے۔ دلہا اور دلہن کے لباس کے کونوں کو آپس میں ملا کر ایک گانٹھ لگا دی جاتی تھی جس کا مطلب ایک دوسرے کی دائمی رفاقت تھا۔ اس رسم کو گانٹھ کی رسم کہتے تھے۔ سب سے آخر میں سات پھیروں کی رسم پوری کی جاتی اور دلہا دلہن مقدس آگ کے گرد طواف کرتے۔ پروہت مقدس منتر پڑھتے رہتے۔ عورتیں سہاگ کے گیت گاتیں اور دلہا دلہن اور دلہن کے قریب ترین رشتہ دار سات پھیرے پورے کراتے۔ یہ آخری اور اہم قدم خدا اور انسان کے سامنے دلہا دلہن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شوہر اور بیوی بنا دیتا تھا۔

باقی دیگر تقریبات دل خوش کن اور ثانوی حیثیت کی ہوتی تھیں۔ شادی شدہ جوڑے کی تندرستی کے لیے نچھاور یا نثار کی رسم ادا کی جاتی۔ مسلمانوں میں کبھی کبھی اس موقع پر بادام اور مصری تقسیم کی جاتی اور لوگ اسے خوش بختی کی نشانی سمجھ کر گھرلے جاتے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ تقریبات مختلف صوبوں اور علاقوں میں مختلف ہوں لیکن حقیقت میں سارے ہندوستان میں شادی کی تقریبات اسی طرح منائی جاتی تھیں [۱]۔ شادی کی خوشی میں دلہن کے گھر والوں

---

[۱] دیکھیے جائسی کا بیان پدماوت (ہندی) ص ۱۲۴ - ۱۲۶۔ شاہ ص ۱۲۰۔ نیز گریرسن برائے جدید امثال صوبوں کے خصوصی رسوم کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۱۶ - ۱۱۷۔ گجرات میں شادی شدہ جوڑے کو مندر میں لے جانے کا رواج تھا جہاں دونوں مہاویر کی مورتی کے سامنے دن بھر روزہ رکھتے تھے۔ دوسرے لوگ آتش بازی، گیتوں اور دیگر تفریحات کے ذریعہ ان کا دل بہلاتے تھے۔ نیز مسلمانوں کی شادیوں کے لیے دیکھیے دیول رانی خضر خاں ص ۱۶۰۔ خصوصاً نچھاور کی تقریب کے لیے دیکھیے فقہ فیروز شاہی ص ۲۰۳ اور بہار پیزنٹ لائف از گریرسن۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشہور مسلمان صوفیا کی درگاہوں کی قائم مقامی اور نکاح کی تقریب کے علاوہ مسلمانوں کی شادی ہندوؤں سے مختلف نہ تھی۔ کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۴۷ - ۴۹ میں ابن بطوطہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے جملہ رسوم اور تقریبات ہندوؤں سے لی تھیں۔ مسلمانوں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے معاشی حالات اور فریقین کے آپسی سمجھوتے کے مطابق کئی کئی دن تک جاری رہتی تھیں۔ دلہا کی برات کم از کم ایک دن اور زیادہ سے زیادہ ۱۰ دن تک ٹھہرتی تھی۔ دلہا اور اس کی دلہن رخصتی سے قبل کی شام کو متعدد دیگر تقریبات ہوتی تھیں جو دورِ قدیم کی دل چسپ یادگاریں معلوم ہوتی ہیں۔ دلہن تک پہنچنے کے لیے دلہا اور اس کے احباب کو زبردستی راستہ بنانا پڑتا تھا۔ بعض مقامات کے رواج کے مطابق دلہا کسی چرائی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کے لیے یا دلہن کو لے کر باہر نکلنے کے لیے کنواری لڑکیوں کو رشوت دے کر اپنا پیچھا چھڑاتا تھا۔ بڑے پیمانے پر جہیز دلہن کے ساتھ دینا ہوتا تھا۔ بعض حالات میں دلہا کو چند لونڈیاں بھی دی جاتی تھیں جو اس کی ملکیت ہو جاتی تھیں۔ چند دیگر پرلطف تقریبات اور مزاحیہ اور دل چسپ گیتوں کے بعد بارات کو دلہن کے ساتھ واپس جانے کی اجازت ملتی تھی۔[1] شادی کی تکمیل (خلوت) کے لیے اگر دلہن کی عمر کم ہوتی تو وہ اپنے والدین کے پاس جلد ہی واپس آ جاتی تھی۔ رخصت یا گونا بعد کی کسی تاریخ کے لیے ملتوی کر دیا جاتا تھا۔[2] متعدد رسوم، تقریبات، خاطر تواضع اس کے بعد بھی طویل عرصے تک چلتی رہتی تھیں لیکن گھریلو اہمیت کا حامل ایک اہم واقعہ پورا ہو جاتا تھا۔ چوں کہ لڑکی قانونی اور رسمی طور پر دوسرے خاندان کی رکن ہو جاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ اب اپنے خاندان کا ایک فرد تصور نہیں کی جاتی تھی بلکہ اپنی ذات پر بھی اس کا اختیار ختم ہو جاتا تھا۔ اس کا تعلق اس کے شوہر سے ہو جاتا تھا اور شوہر کی خواہش کا احترام اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اگر اس

(گزشتہ سے پیوستہ) کی شادی پر ہندوؤں کے اثرات کے لیے دیکھیے ایف۔ ڈبلیو۔ تھامسن کی رلسئے ص ۷۷۔ حالاں کہ اسلام نے مسلمانوں کو چار شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے اور طلاق کے لیے بھی معمولی شرائط پر سہولتیں مہیا کی ہیں لیکن عام طور پر ہندوستان میں لوگ ایک ہی شادی کرتے ہیں اور طلاق کا موقع شاذ و نادر ہی آتا ہے۔ ہندوؤں کے اثرات کا ایک دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ بیواؤں کی شادیاں عنقا ہیں۔

[1] ابن بطوطہ جلد دوم ص ۴۷۔۴۹۔ کنیزوں کے تحفے کے لیے دیکھیے کلیات خسرو ۲۷۰۔ راجستھان میں بیواد ھاری کے جہیز کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ کنیزیں عام طور پر دولہا کی داشتہ بن جاتی تھیں۔ نیز دیکھیے جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز سنہ ۱۹۲۷ء ص ۲۰۲

[2] مثال کے لیے دیکھیے پدماوت (ہندی) ص ۲۸۱

کی شادی طبقۂ امرا میں ہوتی تو عام طور پر وہ حرم میں بند کردی جاتی جہاں باقی دنیا کے ساتھ اس کا ربط ضبط ہمیشہ کے لیے سختی سے ختم کر دیا جاتا تھا[1]

(ب) اس زندگی کا نقطۂ انقلاب ایک فرد کی موت ہوتی تھی۔ موت سے اس فرد کا وجود تو ختم نہیں ہوتا تھا بلکہ تصور یہ تھا کہ وہ ایک زندگی سے دوسری زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ موت پر بڑی دل چسپ رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ موت کے بعد بھی متعدد تقریبات ہوتی تھیں۔ جب کوئی ہندو قریب المرگ ہوتا تو لوگ اسے جلدی سے فرش پر لٹا دیتے پجاری منتر پڑھنا شروع کرتے تھے اور قریبی اعزا غربا و مساکین میں خیرات تقسیم کرتے تھے تاکہ دوسری دنیا میں اس کی روح سکون کے ساتھ چلی جائے۔ فرش کو گائے کے گوبر سے لیپ کر اس پر کوسا گھاس بچھادی جاتی اور اس پر مردے کو لٹا دیا جاتا۔ اس کا سر شمال کی طرف اور پیر جنوب کی طرف اور چہرہ نیچے کی طرف ہوتا۔ اگر مقدس گنگا کا پانی ہوتا تو وہ اس پر چھڑک دیا جاتا۔ ایک گائے کسی برہمن کو دان میں دی جاتی۔ تلسی کے چند پتے مردے کے سینے پر اور ذات کا نشان اس کی پیشانی پر لگایا جاتا۔ ان تیاریوں کے بعد مردے کے جسم کو ارتھی پر رکھ دیا جاتا اور آخری رسوم کے لیے تیاری مکمل ہو جاتی تھی۔ تقلید پسند افراد کا خیال تھا کہ برہمن کے جسم کو پانی میں بہا دینا چاہیے، چھتری کے جسم کو جلانا چاہیے اور شودر کو دفن کرنا چاہیے[2] لیکن ہمارے دور میں ہندوؤں میں مردے کو جلانے کا رواج عام ہے۔ ہاں اگر کسی کا انتقال اپنے گھر اور اعزا سے دور ہوتا تھا تو اس کی یادگار میں ایک چتا تیار کی جاتی تھی جس میں ایک ہرن کی کھال، ایک بانس، کچھ آٹا، چند پتیاں اور ایک ناریل آگ میں جلا دیئے جاتے تھے۔ اس سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ مردے کی ہڈیوں کو سپردِ آتش کیا جا رہا ہے[3] مرنے والے کے بیٹے، بھائی، دوست اور شاگرد اپنے سر اور داڑھی کے

---

[1] مثلاً تاریخ داؤدی میں ص ۳۷ پر دیکھیے حرم کی تفصیلات۔ بیان کیا گیا ہے کہ حرم کے اندر اگر کسی عورت کو کوئی پیغام پہنچانا ہوتا تھا تو اس عورت تک پہنچنے سے پہلے اسے کم از کم تین مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔

[2] میکالف جلد اول ص ۱۸۱ بیرنٹ لائف از گریرسن ص ۳۹۵

[3] ابن بطوطہ کا محولہ ذیلی بیان دیکھیے۔

بال صاف کرا لیتے تھے اور مردے کو جس کے جسم پر بعض اوقات وہی لباس ہوتا تھا جس کو وہ اپنی زندگی میں شوق سے پہنتا تھا مردہ گھاٹ لے جاتے تھے جہاں اُسے مروجہ رسموں کے ساتھ سپردِ آتش کر دیا جاتا تھا۔ جلانے کے بعد ہڈیوں کو ایک لوٹے یا ہرن کی کھال میں جمع کر لیا جاتا تھا اور اگر ممکن ہوتا تو انھیں گنگا میں بہا دیا جاتا۔

ضعیف الاعتقادی پر مشتمل متعدد رسومات مردے کو گھر سے لے جانے سے پیشتر اور اس کے بعد ادا کی جاتی تھیں۔ ان سے یہ یقین کرنا مقصود ہوتا کہ مرنے والے کی روح لوٹ کر نہیں آئے گی[1] تقریبات ۱۰ دن تک (الگ الگ ذاتوں کے رواج کے مطابق دنوں کی تعداد بھی مختلف ہوتی تھی) گھر کو ناپاک سمجھنے کا رواج تھا۔ ان دنوں میں نہ گھر میں کھانا پکتا تھا اور نہ چولہے میں آگ جلتی تھی۔ رشتہ دار کھانا اور دیگر ضروریات مہیا کرتے تھے۔ پورا کنبہ فرش پر پتوں کے بچھونے پر سوتا تھا۔ اس دوران مرحوم کو بھی فراموش نہیں کیا جاتا تھا۔ درحقیقت مرحوم کی غیر مادی روح کو اصل روح کی شکل یا پریت کا جسم حاصل کرنے سے باز رکھنے کے لیے متعدد رسمیں ادا کی جاتی تھیں وہ اس روح کو اس کی آخری منزل تک پہنچاتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے قریب ترین رشتہ دار ان دس اور دو مزید دنوں تک صرف چاولوں کی کھیر پر گزارا کرتے تھے۔ اس طرح مرحوم کے نئے روحانی وجود کو قوت و استقامت بہم پہنچاتے تھے۔ اس عرصے کے اختتام پر تیرھویں روز روح میں اپنے سفر کو پورا کرنے کی طاقت بہم پہنچ جاتی تھی۔ ایک سال کے عرصے میں مختلف وقفوں کے بعد اس وقت تک شرادھ کی رسمیں روح کو مزید طاقت بہم پہنچانے کے لیے منائی جاتی رہتی تھیں جب تک کہ مرحوم کی روح دوسرا جسم حاصل نہ کرے اور کرم کے اصول کے مطابق اس دنیا میں دوبارہ جنم نہ لے لے[2]

---

[1] مثلاً روح کے باہر نکلنے کے لیے عام طور پر دیوار میں ایک کھڑکی کھول دی جاتی تھی اور اس کے بعد فوراً اسے بند بھی کر دیا جاتا تھا تاکہ روح واپس نہ آسکے۔ پاپولر ریلیجن از کروک ص ۲۲۶-۲۲۷ و اشال۔ نیز دیکھیے میکالف جلد ششم ص ۳۸۵۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۹۲۔ یہ رسوم دورِ جدید میں کسی حد تک باقی ہیں۔ دیکھیے روس feasts ص ۵۲۔ اسی سلسلے میں دیکھیے رودھی، دیاباتی اور تلنجر ڈیب سے متعلق گریرسن کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

موت کے موقعوں پر عموماً مغموم احباب و اعزا کے ذریعہ رنج و غم کا اظہار کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں ماں کے گہرے پیار کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ باپ یا خاندان کے سرپرست کی موت پر رنج و غم انتہائی شدید اور حقیقت پر مبنی ہوتا تھا اس لیے کہ اکثر حالات میں پورے بڑے مشترکہ کنبے کی پرورش اور امداد اسی کی زندگی پر منحصر تھی۔ اس طرح ارتھی کے اٹھنے کے وقت پورے کنبے کے مجروح جذبات اور خصوصاً خواتین کا غم و اندوہ بڑی شدت اختیار کر لیتا تھا اور گریہ و بُکا کی آواز سے ایک شور برپا ہو جاتا تھا۔ ماتم کی یہ رسم کئی دنوں بلکہ مہینوں اور بعض حالات میں پورے ایک سال تک جاری رہتی تھی۔ مرد بھی رنج و غم کے اظہار میں پیچھے نہ رہتے تھے خصوصاً اس وقت جب کہ مرحوم بادشاہ ہو[1] سلطان کی موت کا سوگ پوری سلطنت میں سرکاری طور پر تین دن تک منایا جاتا تھا۔ سلطان کا جانشین عموماً نیلے ماتمی لباس میں باہر نکلتا تھا اور شاہی جنازے پر شاہی چھتر آدھا جھکا رہتا تھا[2]۔ مرحوم سلطان کے روحانی ایصالِ ثواب اور قرآن خوانی کے لیے مقرر کیے جانے والے قاریوں کے لیے جو خیراتی وقف قائم کیے جاتے تھے ان کے بارے میں ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید یہ کہا جا سکتا ہے کہ دبدبہ اور تعظیم کے لحاظ سے جو اہمیت اس کی زندگی میں اس کے تخت کو حاصل تھی وہی حیثیت اس کی

(گزشتہ سے پیوستہ) تفصیلات۔ بہار پیزینٹ لائف ص ۲۹۳-۲۹۴۔ مرحوم کے مکان میں کھانا نہ پکانے سے پرہیز کرنے کا مسلمانوں کا رواج دیکھیے فریمپٹن ص ۳۹؛

[1] دیکھیے دیول رانی خضر خاں ص ۲۸۰۔ مرحوم کی بیوی انتہائی رنج کی وجہ سے نقاب نوچ پھینکتی تھی اور بال نوچ لیتی تھی۔ ماتم کی طویل مدت اور اس کے اظہار کے لیے دیکھیے فریمپٹن ص ۱۳۹۔ نیز کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۳۶۔ بلبن کی وفات پر تمام خان اور ملک جنازے کے پیچھے اپنے سروں پر خاک ڈالتے اور کپڑے پھاڑتے ہوئے چلے۔ اس کا کوتوال فخرالدین چھ مہینے تک فرش پر سویا اور دوسرے اہم لوگ چالیس دن تک۔ دیکھیے برنی ص ۱۲۲-۱۲۳۔ جب سلطان بلبن کے والد کا انتقال ہوا تو ماتمی تقریبات میں ہندو امرا ننگے سر شریک ہوئے۔ (دیکھیے کلیات خسرو ص ۴۸)

[2] ماتم کے سرکاری مقررہ وقت کے لیے دیکھیے تاریخ مبارک شاہی ص ۲۸۴۔ جانشین کے ماتمی لباس کے لیے عفیف ص ۴۷۔ برنی ص ۱۰۹۔ اور چھتر جھکانے کے لیے تاریخ مبارک شاہی ص ۲۹۹۔

موت کے بعد اس کی قبر کو حاصل ہو جاتی۔ یہ بات اس دور کے مذہبی عقائد پر روشنی ڈالتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرکاری طور پر چند مظاہر پرست اعمال کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر مرحوم سلطان کے ذاتی محافظوں، ہاتھیوں اور گھوڑوں کو بالکل اسی طرح اظہارِ عقیدت کے لیے اس کے مقبرے پر لایا جاتا تھا جس طرح اس کی زندگی میں۔ اس کے جوتے اس کی قبر کے پاس رکھ دیے جاتے تھے اور لوگ انھیں مرحوم سلطان کی نشانی سمجھ کر اظہارِ عقیدت کرتے تھے[۱]۔

مسلمانوں میں موت کے بعد کی رسموں میں سوئم کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ متوفی کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے احباب و اعزا بڑی تعداد میں جمع ہو کر قرآن خوانی کرتے تھے۔ اس کے اختتام پر جملہ موجودہ لوگوں کے اوپر عرقِ گلاب چھڑکا جاتا تھا اور دعوت کی طرح پان اور شربت سے تواضع کی جاتی تھی۔ اس کے بعد لوگ اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے[۲]۔ چوں کہ اس موقع پر بہت سے لوگوں کو مدعو کیا جاتا تھا اس لیے یہ رسم کافی مہنگی پڑتی تھی۔ اسی کے پیشِ نظر بہلول لودی نے افغانوں کو (جنھیں کسی کی موت پر پورے قبیلے کو مدعو کرنا پڑتا تھا) پان اور شربت وغیرہ پیش کرنے کی رسم سے منع کر دیا تھا اور صرف پھول پیش کرنے اور عرقِ گلاب چھڑکنے کی حد تک محدود رکھا[۳]۔ دیگر تقریبات کو جو آج کل ہندوستان کے مسلمانوں میں عموماً منائی جاتی ہیں زیرِ مطالعہ دور کے اختتام تک زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی[۴]۔

(۱) ستی

اس سلسلے میں ہم بیوہ عورت کے جلانے کی رسم کا ذکر کریں گے جس کا انسداد قانون کے ذریعہ کچھ عرصہ قبل ہو چکا ہے۔ مخصوص حالات کے پیشِ نظر ایک ہندو بیوی کو اس کے

۱۔ ابن بطوطہ کے مشاہدات کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۸۶-۴۷۔

۲۔ کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۴۷۔

۳۔ تاریخ داؤدی ص ۸ ب۔

۴۔ دیگر تقریبات کے لیے دیکھیے ہرکلوٹ کی تصنیف "اسلام" (ایڈیشن کروک)

شوہر کی موت کے بعد جلانا رسم ستی کہلاتا تھا[1] وہ عورت جو خود کو آگ کے سپرد کرتی تھی ستی کہلاتی تھی۔ مجموعی طور پر یہ رواج ہندو سماج کے اعلیٰ طبقات تک محدود تھا اور جنگجو راجپوت اقوام میں اسے خصوصاً پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ادنیٰ طبقہ کی عورتیں اپنے شوہر کی ارتھی کے ساتھ شمشان گھاٹ تک بھی نہیں جاتی تھیں[2]۔ ستی ہونے کا یہ ناگوار فرض دو طرفہ نہ تھا چوں کہ اگر بیوی کا انتقال اپنے شوہر کی حیات میں ہو جائے تو اس کے شوہر کے لیے ستی ہونا ضروری نہ تھا[3]۔ ہندوستان کی اقوام کے قدیم رواجوں میں ستی کی رسم بھی چلی آرہی تھی اور آریوں اور دیگر حملہ آوروں نے آکر اسے اپنے سماجی نظام میں شامل کر لیا[4]۔ بہر حال اس رسم کی تاریخ بہت قدیم دور سے ملتی ہے[5]۔

---

[1] دیکھیے شاہ ص ۱۲۰ (شبد ۷۲) کہ ایک عورت جس کا تعلق غالباً ادنیٰ طبقے سے تھا اپنے شوہر کے جنازے کے ساتھ صرف گھر کی دہلیز تک ہی گئی۔ اس سے آگے صرف رشتہ دار مرد ہی جا سکتے تھے۔ نیز دیکھیے میکالف جلد اول ص ۳۸۱۔

[2] جدید زمانے میں اس خیال کی تائید کے لیے دیکھیے ستی از کمارا سوامی ص ۸۔ مصنف کا خیال ہے "انسانی روح مرد اور عورت سے دو قسم کی عقیدت کا تقاضہ کرتی ہے۔ عورت سے اس کا تقاضہ ہے کہ وہ مرد سے عقیدت رکھے اور مرد اپنے خیالات سے۔"

[3] نتیجہ کے لیے دیکھیے چند تحریری حقائق۔ مردے کے منھ میں پیتل کا ایک ٹکڑا اس لیے رکھا جاتا تھا کہ مردے کی روح جب ویت رانی یعنی ہندوؤں کی پریت ندی کو عبور کرنے لگے تو ناخدا کو اجرت کے طور پر دے دے ٹیمپل ص ۲۲۲۔ اسی طرح گھر میں کسی کی موت کے بعد مستقل چراغ جلایا جاتا تھا تاکہ دوسری دنیا کی تاریکی میں روح کو روشنی عطا کر سکے۔ میکالف جلد اول ص ۳۴۹۔ مجرد روح کو قوت عطا کرنے کے لیے صرف چاول اور دودھ کھلانے کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ابوالفضل نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عام لوگوں کا اعتقاد تھا کہ دوسری دنیا میں شوہر کو کسی خادمہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ دیکھیے آئین اکبری جلد دوم ص ۱۹۱-۱۹۲۔ نیز دیکھیے پیرو ٹیغور ص ۹۰-۹۱۔ پاپولر ریلیجن از کروک ص ۱۵۲۔ اسی طرح کے مظاہر پرستانہ معاملات کے تسلسل میں ستی بھی ایک ذریعہ ہے۔

[4] سکندر کے سپاہیوں نے اس کا رواج پنجاب میں پایا۔ دیکھیے تھامپسن ص ۱۹۔

عورت کو شوہر کے مُردہ جسم کے ہمراہ اور اس کے بغیر دونوں طرح ستی کرنے کا رواج تھا۔ اگر مرحوم شوہر کی لاش مہیا ہو جاتی تھی تو بیوی کو اس کے ہمراہ جلا دیا جاتا تھا، اسے سہہ مرن یعنی ساتھ مرنا کہتے تھے لیکن اگر شوہر بیوی سے دور مرتا یا بعض حالات میں مثلاً کے طور پر اگر بیوی حاملہ ہوتی تو اُسے بعد میں کسی ایسی چیز کے ساتھ جلایا جاتا جس کا تعلق اس کے شوہر سے ہوتا تھا، یا جو اس کے شوہر کی نشانی ہوتی تھی۔ اس طرح جلنے کو انو مرن یعنی قاعدے کے مطابق مرنا کہتے تھے۔ ان اصطلاحات کو بالترتیب سہہ گمنا یعنی ساتھ جانا اور انو گمنا یعنی قاعدے کے مطابق جانا بھی کہتے ہیں[1] اگر کسی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتیں تو جلنے کا اعزاز سب سے بڑی بیوی کو ہوتا اور دیگر بیویاں الگ الگ جلائی جاتیں[2] غیر معمولی حالات میں ایسی بیویاں اپنے زندگی بھر کے اختلافات اور عداوت ختم کر دیتی تھیں اور اسی آگ میں اپنے شوہر کے ساتھ جلنے کا انتظام کر لیتی تھیں[3]

کسی بیوی کا شوہر کی لاش کے ساتھ جلنے کا بیان بہت تکلیف دہ ہے اور اسے صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ ارتھی کے ہمراہ پیچھے پیچھے چلتی تھی اور اسی کے ساتھ جلا دی جاتی تھی۔ بعض حالات میں جلانے کا یہ عمل بہت طویل اور دل چسپ ہوتا تھا۔ اس کے لیے بڑی ہمت اور ضبط کی ضرورت تھی۔ ابن بطوطہ نے دونوں قسم کے واقعات کی تفصیل دی ہے۔ ہم اس کے بیان کردہ تین ایسی عورتوں کے واقعات کا خلاصہ بیان کریں گے جن کے شوہر دور دراز مقام پر جنگ میں شہید

---

[1] دیکھیے تھامپسن ص ۱۵

[2] متعدد بیویوں میں یہ حق صرف چہیتی بیوی کو حاصل تھا کہ جب اُسے جلایا جائے تو اس کی گردن اس کے شوہر کے بازو پر رکھی ہو۔ دیکھیے زیمپن ص ۱۲۷

[3] دیکھیے چتوڑ کے راجہ رتن سین کی دو بیویوں کا واقعہ جن کے زندگی بھر کے جھگڑوں اور تلخیوں کو اس نے قربانی کے آخری واقعے کے ذریعہ ختم کر دیا۔ وہ اپنے شوہر کی لاش کے دونوں طرف انتہائی دوستانہ طریقہ سے بیٹھ گئیں اور خاموشی کے ساتھ شعلوں کی نذر ہو گئیں۔ بغاوت (ہندی) ص ۲۹۵۔

ہو چکے تھے ۔ ان حالات میں بیوی اپنے شوہر کی موت کی خبر سُن کر غسل کرتی۔ اس کے بعد اپنے بہترین کپڑے اور زیورات زیب تن کرتی ۔ جلد ہی اسے ایک جلوس کی شکل میں شمشان گھاٹ کی طرف لے جایا جاتا ۔ برہمن اور دیگر اعزا جلوس کے ہمراہ چلتے اور مستقبل کی بہترین زندگی پر اُسے انتہائی مبارک باد دی جاتی ۔ وہ عورت اپنے دائیں ہاتھ میں ایک کھوپرا اور بائیں ہاتھ میں ایک آئینہ لے کر گھوڑے پر سوار ہو جاتی ۔ جلوس سایہ دار درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف گانے اور باجے کے ساتھ روانہ ہوتا ۔ اس جھنڈ میں پانی کا ایک تالاب اور پتھر کی ایک مورتی تھی۔ (غالباً یہ شو کی مورتی تھی حالاں کہ افریقی سفیر نے اس سلسلے میں وضاحت نہیں کی ہے) تالاب کے قریب آگ جلتی اس پر متواتر تل کا تیل ڈالا جاتا۔ یہ آگ عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوتی تھی ۔ پورا ماحول دوزخ کا منظر پیش کرتا تھا خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے ۔ سایہ دار جھنڈ میں پہنچ کر عورت تالاب کے پانی میں نہاتی اور تب اپنے عمدہ کپڑوں اور زیورات کو ایک ایک کر کے سپردِ آتش کرتی ۔ آخر میں وہ کسی سے ایک بغیر سلا کپڑا مانگ کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیتی اور بہت ثابت قدمی اور جرأت کے ساتھ آگ کی طرف قدم بڑھاتی جو ابھی تک اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوتی تھی ۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اگنی دیوی سے دعا کرتی ۔ تھوڑی دیر خاموشی سے عبادت کرتی اور تب اچانک غیر متزلزل ارادے کے ساتھ خود کو شعلوں کے سپرد کر دیتی ۔ ٹھیک اسی وقت دوسری طرف سے ڈھول تاشوں کا شور بلند ہوتا جس کا مقصد واضح طور پر خوف ناک منظر سے لوگوں کی توجہ ہٹانا ہوتا تھا ۔ دوسرے افراد جو ستی کی حرکات کو بغور قریب سے دیکھتے رہتے تھے ، جلتی ہوئی عورت کے جسم پر لکڑی کے وزنی ٹکڑے ڈال دیتے تاکہ وہ اس سے نکل نہ سکے یا نکلنے کی جدو جہد نہ کر سکے ۔ ابن بطوطہ اس منظر کی تاب نہ لا کر غش کھا گیا ۔ اسے لوگوں نے وہاں سے ہٹا دیا اس لیے اس کا بیان مزید تفصیلات مہیا کرنے سے قاصر ہے ۔ ستی کی رسم میں جو جو واقعات رونما ہوتے تھے یہ اس کا کم و بیش صحیح اور مکمل نقشہ ہے ۔[1]

---

[1] ابن بطوطہ کے بیان کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۳-۱۴۔

دیگر ذرائع سے جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں وہ ابن بطوطہ کے بیان کردہ حالات کی تصدیق کرتی ہیں۔ ستی کی رسم میں مذہبی عنصر اور برہمن کی نصیح ترغیب کو بھی بڑا دخل حاصل تھا۔ برہمن کے لیے بیوہ کے روبرو یہ بات بیان کرنے کا غیر معمولی مناسب موقع ہوتا تھا کہ یہ زندگی قطعی ناپائیدار اور فریب پر مشتمل ہے اور یہ کہ دراصل حقیقی زندگی وہی ہے جو اس کے بعد شروع ہوگی۔ برہمن اسے یقین دلاتا تھا کہ ایک بار جلنے کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ رہے گی اور اسے ہر طرح کی دولت، پوشاک، عزت، خوشی، ناقابل بیان حد تک حاصل ہوگی۔ اس طرح بیوہ کو یہ یقین دلایا جاتا تھا کہ اس کا آگ میں ستی ہونا اس کی شادی کے موقع سے بھی مبارک موقع ہے کیوں کہ اس کے بعد اسے اپنے شوہر کی دائمی رفاقت ملے گی۔[1] لیکن اگر اس نے اس کے برخلاف کیا تو اس کا غیر مطمئن بھوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ارواح خبیثہ میں شامل ہو جائے گا۔ لہٰذا بیوہ کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ عام لوگوں کے لیے بیوہ کا ستی ہونا ایک تفریح کی حیثیت رکھتا تھا۔[3] دیگر تجربہ کار اور دور اندیش افراد ستی ہونے والی بیوہ کو دوسری دنیا میں جانے والے قاصد کی حیثیت سے تصور کرتے تھے۔ وہ لوگ ستی کے ذریعہ دوسری دنیا کے باشندوں کے نام ہر طرح کے پیغامات بھجواتے تھے۔[4]

قدیم زمانے اور غیر متمدن ماضی کی اس نشانی کو ایک ہندو عورت اور اس کے شوہر کی روح اور جسم کی پوری پوری رفاقت کے آخری ثبوت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس واضح نقص سے قطع نظر کہ ستی کا عمل دوطرفہ نہیں تھا

---

[1] دیکھیے نکولو کونٹی کا بیان۔ ذریپٹن ص ۱۳۱ - پیروٹیفور ص ۹۰
[2] اینڈل اور اودل کی جو پرتھوی راج کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے، بیویوں کے جذبات اور عقائد کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۳۲،
[3] دیکھیے تاریخ داؤدی کے مصنف کا مشاہدہ ص ۷۵ ب کہ عام لوگ اسے تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے نیز کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۳۔
[4] دیکھیے پیروٹیفور ص ۹۰-۹۱۔

بلکہ صرف بیوی تک محدود تھا۔ دیگر معاملات بھی اسی قسم کے اخلاقی تلقین کے غیر تاریخی پہلو کو ظاہر کرتے ہیں۔ بیوی کو ستی کرنے کی یہ رسم جیساکہ تمام رواجوں کی تفصیلات اور دیگر مظاہر پرستانہ رسموں سے ظاہر ہے، جن کا بیان ہم اسی باب میں کر چکے ہیں، بہت پہلے اور قدیم زمانے کے لوگوں سے ورثہ میں ملی تھی جب ملک میں غالباً روح کی پوجا اور مظاہر پرستانہ مسلک جاری تھے۔ چند دیگر سماجی امور بھی اس رسم کو جاری رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ ان امور میں ستی کی رسم کی ہمت افزائی کرنے میں ہندو سماج میں بیوہ کی گری ہوئی حالت کا بھی بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ ایسے دستاویزی ثبوت موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ستی کی ابتلا سے فرار کی صورت میں اسے بہت تلخ اور شرم ناک زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ اس لیے وہ یہی بہتر سمجھتی تھی کہ خود کو شعلوں کے سپرد کر دے۔[۱] اس کے ساتھ ہی کنبے کے سماجی وقار کا بھی مسئلہ تھا۔ رائے عامہ اور مذہبی اعتقادات یہ بات ذہن نشین کرانے میں کامیاب ہوتے کہ ستی ہونا عورت کی اعلیٰ ترین اور انتہائی قابل تعریف صفت ہے۔ اگر کوئی بیوہ خود کو اپنے مرحوم شوہر کے ساتھ ستی نہیں کرتی تو یہ اُس کی وفاداری اور عفت کی کمی کی دلیل تصور کیا جاتا تھا۔[۲] بعض حالات

---

[۱] ہندوؤں کے مذہبی فلسفے کے مطابق بیوگی کرم یا پچھلے جنم کے کاموں کا انصاف پسندانہ پھل ہوتا ہے اور اسی طرح بیوہ کو بیوگی کے دوران جو تجربات ہوتے ہیں وہ ان کی مستحق ہوتی ہے۔ دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۲۱۹ - ۲۲۰۔ اور کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۳۔ اپنے شوہر کی وفات پر ایک عورت نے اپنی ہر خوشی اور تفریح ترک کی یعنی اس نے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں اور اپنے زیورات اتار دیے۔ دیکھیے پیرو ٹلغور ص ۹۱ کہ ایک ہندو بیوہ صرف اس لیے بابل بھاگ گئی تھی چوں کہ اس نے آگ میں جلنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ خوف زدہ تھی کہ سماج اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ ابوالفضل نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اگر بیوائیں آگ میں جلنے سے انکار کر دیتیں تو ہندو عوام اسے اس حد تک خوف زدہ کر دیتے ہیں کہ اس کے لیے آگ میں جل کر مرنا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔ جلد دوم ص ۱۹۲

[۲] جو بیوہ آگ میں جلنے کی پیش کش کرتی تھی سب لوگ اس کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اس کے خاندان کے سماجی وقار میں اضافہ ہو جاتا تھا اور وہ وفاداری اور سچائی کے لیے مشہور ہو جاتے تھے دیکھیے یول جلد دوم ص ۳۴۱

میں ایسی عورت پر معاشی دباؤ بھی ڈالا جاتا تھا۔ نکولوکونٹی نے ایسے واقعات نقل کیے ہیں جن میں دلہن کے ستی ہونے یا جہیز کو واپس کرنے کی شرط رکھی گئی۔ موخرالذکر حالت میں اس کے اپنے بچوں کو چھوڑ کر تمام جہیز اس کے مرحوم شوہر کے رشتہ داروں کو دیا جاتا تھا[1]

راجپوت جنگ جو اقوام میں صرف ستی ہی نہیں بلکہ بچوں اور عورتوں کا قتل کرنا عزت کا معاملہ تصور کیا جاتا تھا۔ مایوسی کی اس انتہا کو وہ لوگ ایسی حالت میں پہنچتے تھے جب انھیں قطعی شکست کا یقین اور اس کا قطعی امکان ہوتا تھا کہ پورا کنبہ ظالم دشمن کے پنجوں میں پھنس جائے گا۔ عموماً بیویاں اور چہیتی داشتائیں راجپوت سردار کی موت پر ستی ہو جاتی تھیں۔ لیکن زیادہ بڑا اور تنظ فریب قتلِ عام صرف اس وقت ہوتا تھا جب انھیں جنگ میں شکست ہوتی تھی[2]۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ ستی کے ہر واقعہ میں ایک ہندو بیوی یکساں طور پر وفادار نہیں ہوتی تھی۔ ایسے واقعات تحریری طور پر دستیاب ہوئے ہیں جو

---

[1] پیرو ٹیفور کا یہ بھی بیان ہے کہ اس واقعہ میں بیوہ کی غیر موجودگی میں اس کا دوپٹہ لاش کے برابر رکھ کر جلایا جاتا تھا۔ ص ۹۱۔

[2] ستی کی عام مثالوں کے سلسلے میں راجپوت سردار کی موت کے بعد لاش کے ساتھ جلنے کی لوڈ اور تھامپسن نے متعدد مثالیں دی ہیں۔ بیواؤں کو جلانے یا قتل کرنے کی دیگر مخصوص مثالیں جوہر کے بیان کے سلسلے میں تحریر کی جائیں گی۔ ایک خصوصی مثال کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۵۔ جو Counts of Monto Cristo میں البانیہ کی شہزادی کے بیان کردہ مناظر کی یاد تازہ کراتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ جب راجپوتوں کو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ جنگ میں شکست کھائیں گے تو وہ اپنے محلوں کے گرد سوکھی گھاس اور نیل جمع کرنے کا حکم دے دیتے تھے۔ عورتوں کو اندر بند کر دیا جاتا تھا۔ ایک آدمی اس کام پر مقرر کر دیا جاتا تھا کہ وہ جنگ کے انجام کو دیکھتا رہے۔ اگر اسے یقین ہو جاتا کہ شکست اور مصیبت ٹلنے والی نہیں تو وہ اپنے فیصلے کے بھروسے پر اس میں آگ لگوا دیتا تھا۔ دیکھیے پرش پریکشا ص ۱۲ کہ ہمیر دیو کی وفات پر اس کی عورتوں نے خود کو بلا جھجک ستی کے لیے پیش کر دیا۔ چوں کہ ایک سچی عورت کو یہی کرنا چاہیے نیز گجرات کے مظفر شاہ کی افواج کی پیش قدمی کے موقعوں پر راجہ کی بیویوں نے خود کو آگ میں جلنے کے لیے پیش کر دیا۔ دیکھیے تاریخ مظفر شاہی ص ۲۵۔

ستی کی رسم کے حامیوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں لیکن ایسی مثالیں ہمارے عمومی تجزیے پر اثرانداز نہیں ہوسکتیں[1] مجموعی طور پر ہم ابوالفضل کی اس رائے سے متفق ہیں کہ ستی کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک وہ جنھیں ان کے رشتہ دار چتا میں جانے کے لیے مجبور کرتے تھے۔ دوسری وہ جو اپنے مرحوم شوہروں کے ساتھ انتہائی محبت کی وجہ سے برضا و رغبت اور بخوشی اس ابتلا کو تسلیم کر لیتی تھیں۔ تیسری قسم کی وہ عورتیں جو رائے عامّہ کے پیش نظر خود کو شعلوں کے سپرد کر دیتی تھیں۔ چوتھی قسم کی وہ خواتین تھیں جو خاندانی رسوم و روایات کے پیش نظر ستی ہوتی تھیں اور پانچویں قسم ان عورتوں کی تھی جنھیں ان کی مرضی کے خلاف آگ میں ڈالا جاتا تھا[2]

یہاں ہم ہندوؤں کے اس مروجہ ضابطۂ اخلاق کی پابندی کے سلسلے میں مسلم حکومت کے طرزِ عمل کا ذکر کریں گے۔ ابنِ بطوطہ کا بیان ہے کہ سلاطینِ دہلی نے ایک قانون وضع کیا تھا جس کی رو سے حکومت کی حدود میں ایک بیوہ کو جلانے کے لیے اجازت نامہ لینا ضروری تھا۔ غالباً یہ قانون اس لیے وضع کیا گیا تھا کہ کسی عورت کو زبردستی یا سماج کے دباؤ کے ذریعہ جلنے پر مجبور نہ کیا جاسکے لیکن بالعموم یہ اجازت نامہ دے دیا جاتا تھا چونکہ اس کے برخلاف عمل کرنے کے لیے حکومت کے پاس کوئی خاص وجوہات موجود نہ تھیں[3]۔ سرکاری اجازت نامہ حاصل کرنے کے طریقے کے علاوہ ہمایوں کے دور تک حکومت نے اس سلسلے میں کوئی اور اقدام نہیں کیا۔ مغل شہنشاہ ہمایوں پہلا حکمران تھا جس نے ستی کے ایسے تمام واقعات پر پابندی عائد کر دی تھی۔ کوئی بھی عورت جو بچہ پیدا کرنے کی عمر سے آگے نکل چکی ہو ستی نہیں ہوسکتی تھی خواہ وہ برضا و رغبت ہی خود کو ستی ہونے

---

[1] دیکھیے ایک روپ متی کے جذبات کو احمد العمری نے بیان کیا ہے کرمٹ ص ۸۲۔ یا امیر خسرو کا بیان کردہ دیول رانی کا افسانہ یا مشتاق کا بیان کردہ واقعہ جس میں ایک عاشق نے اپنے معشوق (جس سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی) کو سانپ سے بچایا لیکن خود اس کو سانپ نے ڈس لیا جس کی وجہ سے اس کی موت فوراً واقع ہوگئی۔ اس سے متاثر ہو کر بغیر کسی قانونی یا سماجی دباؤ کے لڑکی نے اس کی لاش کے ساتھ جلنے کا فیصلہ کیا۔

[2] آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۹۱-۱۹۲

[3] کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۳۔

کے لیے پیش کیوں نہ کرے۔ یہ سماجی اصلاح کا بہت دلیرانہ اقدام تھا۔ ہندو مذہبی طبقے نے اور ہندو عوام نے نہ اس کی شدید مخالفت کی اور نہ اس کے خلاف کوئی مظاہرہ ہوا مگر ضعیف الاعتقاد بادشاہ کو یقین دلایا گیا کہ دوسرے لوگوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی اور ایک مقدس رسم پر پابندی لگانے سے اس پر خدا کا قہر نازل ہوگا اور اس کی حکومت کو زوال ہوگا اور شاید یہ اس کی اپنی موت کا باعث بھی بنے۔ ان قابلِ لحاظ امور کے پیشِ نظر مذہب پرست شہنشاہ کو اپنے سابقہ احکامات منسوخ کرنے پڑے۔ بہرحال اس سلسلے میں عام احکامات پر عمل ہوتا رہا کیوں کہ بیوہ کو جلانے کے مواقع پر سلطان کے افسر ہمیشہ موجود رہتے تھے تاکہ لوگ زبردستی نارضامند بیوہ کو جلنے پر مجبور نہ کرسکیں[1] کہا جاتا ہے کہ اکبر نے ستی کے چند مشہور واقعات میں بذاتِ خود دخل اندازی کی تھی اور بیواؤں کو جلنے سے بچایا تھا۔ بہرحال ان چند واقعات میں سے جن میں بادشاہ نے ذاتی دلچسپی لی یہ نتیجہ نکالنا مشکل ہے کہ ستی پر عام طور پر پابندی لگائی گئی یا پابندی لگانے کا خیال تھا۔

مسلمانوں کے لیے ستی کی رسم کے اثرات یا اس طرزِ فکر سے بچے رہنا جس نے اس رسم کو ترقی دی مشکل تھا۔ حالاں کہ اس طرح کے واقعات کافی اور عمومی نہیں ہیں جن کو ہم اپنے اس خیال کی تائید میں پیش کرسکیں۔ مجموعی طور پر یہ طرزِ فکر ان افراد ہی تک محدود تھا جن کا تعلق ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے سے تھا یا جو ہندو ماحول میں رہتے تھے[2] اسلام نے شمالی ہند کی رسموں میں نمایاں تغیّر وتبدل کیا ہوگا۔ دیگر براہِ راست اثرات کے سلسلے میں ہم یہاں رام اور کرشن کے حلقوں کی شہرت کو بھی شمار کرسکتے ہیں جو دھیرے

---

[1] سیدی علی رئیس کا بیان، ویمبرے ص ۶۰

[2] دیکھیے عین الملک کی شکست کا حال جب اس نے سلطان محمد تغلق کے خلاف بغاوت کی۔ جب میدانِ جنگ میں اس کی فوج منتشر ہوئی اور اس کی موت کی افواہ پھیل گئی تو اس کی بیوی نے اپنی جان بچانے سے منع کر دیا اور اپنے شوہر کی طرح قتل ہونے کے لیے وہیں رکی رہی وہ ایک ہندو بیوی کی طرح جلنے کے لیے بھی تیار تھی (کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۶۶) نیز دیکھیے امیر خسرو کی رائے اور ہندو بیوی کے لیے اس کے تعریفی جذبات۔ قرآن السعدین ص ۳۱۔

دھیرے لوگوں کے طرزِ فکر کی تبدیلی کا باعث بنے[۱]

(۲) جوہر

جوہر کی رسم کے ذکر کے بغیر تجہیز و تکفین اور موت کے بعد کی رسوم کی تفصیل تشنہ رہ جائے گی۔ جوہر کی تعریف کرنے کے بجائے اس کی تفصیل بیان کرنا زیادہ مناسب ہے۔ جوہر کی رسم کم و بیش راجپوتوں ہی تک محدود تھی حالاں کہ اس کے برخلاف واقعات بھی دستیاب ہوئے ہیں[۲] جب کسی راجپوت سردار اور اس کے ساتھیوں کو کسی جنگ میں فتح حاصل کرنے کی امید بالکل ختم ہو جاتی تو وہ عام طور پر یا تو اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیتے تھے یا انھیں کسی زمین دوز عمارت میں بند کر کے اس میں آگ لگا دیتے اس کے بعد تلواریں سونت کر وہ یقینی اور بہادری کی موت کو گلے لگانے کے لیے دشمن پر دھاوا بول دیتے تھے۔ راجپوتوں کے اصولِ جنگ مغلوب ہونا یا شکست پر رضامند ہونا نہیں جانتے تھے وہ یا تو جنگ میں فتح پاتے تھے یا خود کو فنا کر دیتے تھے۔

زیرِ مطالعہ دور میں جوہر کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ ایک مشہور و معروف واقعہ رنتھمبور کے جنگ جو چوہان ہمیر دیو کا ہے۔ علاء الدین خلجی کی بہت بڑی فوج کا مقابلہ اس نے طویل عرصے تک جواں مردی سے کیا اور زبردست مقابلے کے باوجود جوہر کیا[۳]

---

[۱] راجپوتوں پر ان کے اثرات کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۶۲۰۔

[۲] گریرسن کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد اول ص ۳۱۰ - ۳۱۱ (حوالہ) جوہر کی اصطلاح "جاتو گرہیا" یعنی لاکھ یا دیگر آتش گیر اشیا کا بنا ہوا مکان ۔ یہ مہابھارت کی اس کہانی کی طرف اشارہ ہے۔ (باب اوّل ص ۱۴۱ - ۱۵۱) جس میں پانڈوں نے ایسی عمارت کو نذرِ آتش کرنے کی کوشش کی تھی۔

[۳] مثلاً دیکھیے ہندو قاتلوں کے جوہر کی وہ تفصیلات جنھوں نے مبارک شاہی نامی سید حکمران کو قتل کر دیا تھا۔ دیکھیے تاریخ مبارک شاہی ص ۲۶۲۔ تیمور کے حملے کے زمانے میں متعدد ہندوؤں کے جوہر کے لیے دیکھیے ملفوظاتِ تیموری ص ۲۸۹

[۴] امیر خسرو کا بیان دیکھیے خزائن الفتوح ص ۲۴

بہرحال جوہر کی زیادہ واضح تفصیلات اس واقعہ میں ملتی ہیں جو کمپلا کے راجہ کے ساتھ پیش آیا۔ سلطان محمد بن تغلق نے ایک سرکاری باغی بہاء الدین گُشتاسپ کو پناہ دینے کی وجہ سے راجہ کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا تھا۔ راجہ نے پہلے تو خفیہ طریقے سے اسے قلعہ سے باہر نکال کر دوسری محفوظ جگہ اُسے پناہ دی اس کے بعد اس نے بڑے پیمانے پر آگ جلانے کا حکم دیا اور اپنے خاندان کے افراد سے یوں مخاطب ہوا "میں اپنی جان قربان کرنے کا ارادہ کرچکا ہوں۔ تم میں سے جو لوگ میرے ساتھ مرنا چاہیں وہ تیار ہوجائیں" اس کی سب عورتوں نے نہا دھوکر اپنے جسم پر چندن ملا اپنے مالک کے لیے اظہارِ وفاداری کیا اور خود خاموشی کے ساتھ آگ میں کود پڑیں۔ اس کے وزرا اور امرا کے خاندان کے افراد بھی اس عظیم قربانی میں ان کے شریک ہوئے۔ اس کے بعد راجا نے اپنے جنگ جو سپاہیوں کے ساتھ نہا دھوکر اپنے جسم پر چندن مل کر ہتھیار لگائے لیکن ڈھالیں نہیں لیں اور جواں مردوں کا یہ گروہ محاصرین سے جنگ کرنے کے لیے آگے بڑھا اور اس وقت تک لڑتا رہا جب تک کہ ان میں سے ہر ایک قتل نہ ہوگیا[1]

جوہر کی یہ رسم بعض اوقات بڑی نازک اور دردناک صورت اختیار کرلیتی تھی چندیری کے راجہ میدنی رائے کی شکست اور جوہر کی تفصیلات بابر نے نقل کی ہیں۔ اپنی شکست کے بعد میدنی رائے کے جنگ جو سپاہیوں نے اپنے تمام بچوں اور عورتوں کو قتل کیا اور آخری دم تک تلواریں سونت کر لڑنے کے لیے نکل پڑے۔ انھوں نے جلد ہی یہ محسوس کرلیا کہ اب لڑنا ممکن نہیں ہے اور انھیں اندیشہ ہوا کہ شاید وہ زندہ گرفتار کرلیے جائیں۔ اس توہین آمیز انجام سے بچنے کے لیے انھوں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے یہ انتظام کیا کہ ایک آدمی کو ننگی تلوار دے کر ایک بلند مقام پر کھڑا کردیا۔ لوگ ایک ایک کرکے اس کے نیچے سے گزرتے رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک ایک کا سر تن سے جدا ہوتا رہا۔ آخر کار سب کے سب اسی طرح قربان ہوگئے[2] اس امر کا یقین کرنے کے لیے ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ ان کا یہ اقدام ناعاقبت اندیشانہ

---

[1] ابن بطوطہ کا بیان۔ کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۵۸۔۵۹

[2] بابر نامہ کی تفصیلات ص ۳۱۲

یا بے موقع نہ تھا۔ اس دور کے فنون جنگ میں جنگی قیدیوں اور زخمیوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کے لیے کوئی دستور یا معاہدہ نہ ہوتا تھا۔ ہر بات کا انحصار فاتح کی اپنی مرضی پر تھا غیور راجپوت اپنے قبیلوں کی باہمی جنگوں میں بھی اس طرح کی توہین برداشت نہیں کرتے تھے اور اس طرح کی جنگیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ مسلمان حملہ آوروں سے مقابلے کی صورت میں وہ اپنے دشمنوں کی طرف سے بدترین سلوک کی توقع رکھتے تھے۔ ایسے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ مسلمانوں نے اس دور کی بربریت اور ظلم کے مقابلے میں بھی متعدد مواقع پر غیر معمولی ظلم و ستم کا مظاہرہ کیا[1]۔

مسلمانوں میں جوہر کی رسم سے کسی نہ کسی حد تک مشابہ رسم کا پایا جانا قدرتی امر ہے کیوں کہ ان کی جنگی روایات بھی راجپوتوں کی طرح اتنی ہی مضبوط تھیں۔ بعض مواقع پر وہ بھی کم و بیش اسی طرح کے ذرائع استعمال کرتے تھے جیسے ان کے دشمن ان کے خلاف کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو نہ کسی رحم کی بھیک مانگی اور نہ رحم دلی کا مظاہرہ کیا گیا اور وحشیانہ قتل عام کا یقین ہونے کے بعد

---

[1] دیکھیے بھیا پورن مل کا چندیری کا واقعہ جس میں انتہائی سفاکی اور عمدہ جذبات اور بہادری کا فقدان نمایاں ہے۔ شیر شاہ نے ہر طرح کی حفاظت کا یقین دلا کر اور قرآن کی قسم کھا کر راجپوت سردار اور اس کے سپاہیوں کو قلعہ سے باہر آنے کے لیے رضامند کر لیا۔ انھیں باہر لا کر شیر شاہ کے سپاہیوں نے دھوکے سے ان کا محاصرہ کر لیا اور رات کی تاریکی میں ان پر حملہ کر دیا۔ راجپوتوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا اور خود بھی لڑتے لڑتے جان دے دی۔ بھیا پورن مل کے لڑکے اور لڑکی کو شیر شاہ نے گرفتار کر لیا جو کسی نہ کسی طرح جنگ میں بچ گئے تھے۔ ان کا حشر بہت برا ہوا۔ افغان حکمراں نے مجبور ہو کر ان بچوں سے سفاکانہ انتقام لیا۔ اس نے لڑکے کو آختہ کرا دیا اور لڑکی کو سڑکوں پر ناچنے کے لیے مجبور کیا۔ راجپوتوں کی باہمی قبائلی جنگوں میں جوہر کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۴۴۷۔

یا بے موقع نہ تھا۔ اس دور کے فنون جنگ میں جنگی قیدیوں اور زخمیوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کے لیے کوئی دستور یا معاہدہ نہ ہوتا تھا۔ ہر بات کا انحصار فاتح کی اپنی مرضی پر تھا غیور راجپوت اپنے قبیلوں کی باہمی جنگوں میں بھی اس طرح کی توہین برداشت نہیں کرتے تھے اور اس طرح کی جنگیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ مسلمان حملہ آوروں سے مقابلے کی صورت میں وہ اپنے دشمنوں کی طرف سے بدترین سلوک کی توقع رکھتے تھے۔ ایسے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ مسلمانوں نے اس دور کی بربریت اور ظلم کے مقابلے میں بھی متعدد مواقع پر غیر معمولی ظلم وستم کا مظاہرہ کیا[1]

مسلمانوں میں جوہر کی رسم سے کسی نہ کسی حد تک مشابہ رسم کا پایا جانا قدرتی امر ہے کیوں کہ ان کی جنگی روایات بھی راجپوتوں کی طرح اتنی ہی مضبوط تھیں۔ بعض مواقع پر وہ بھی کم وبیش اسی طرح کے ذرائع استعمال کرتے تھے جیسے ان کے دشمن ان کے خلاف کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو نہ کسی رحم کی بھیک مانگی اور نہ رحم دلی کا مظاہرہ کیا گیا اور وحشیانہ قتل عام کا یقین ہونے کے بعد

---

[1] دیکھیے بھیا پورن مل کا چندیری کا واقعہ جس میں انتہائی سفاکی اور عمدہ جذبات اور بہادری کا فقدان نمایاں ہے۔ شیر شاہ نے ہر طرح کی حفاظت کا یقین دلا کر اور قرآن کی قسم کھا کر راجپوت سردار اور اس کے سپاہیوں کو قلعہ سے باہر آنے کے لیے رضامند کر لیا۔ انھیں باہر لا کر شیر شاہ کے سپاہیوں نے دھوکے سے ان کا محاصرہ کر لیا اور رات کی تاریکی میں ان پر حملہ کر دیا۔ راجپوتوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا اور خود بھی لڑتے لڑتے جان دے دی۔ بھیا پورن مل کے لڑکے اور لڑکی کو شیر شاہ نے گرفتار کر لیا جو کسی نہ کسی طرح جنگ میں بچ گئے تھے۔ ان کا حشر بہت برا ہوا۔ افغان حکمران نے مجبور ہو کر ان بچوں سے سفاکانہ انتقام لیا۔ اس نے لڑکے کو آختہ کرا دیا اور لڑکی کو سڑکوں پر ناچنے کے لیے مجبور کیا۔ راجپوتوں کی باہمی نتائجی جنگوں میں جوہر کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۴۴۷۔

بہت سے جنگ جو سپاہیوں نے راجپوتوں کے جوہر کی طرح اپنی جانیں قربان کیں[1]
ہاں دکن میں اس طرح کی عسکری روایات کو فروغ نہیں ہوا[2]

---

[1] دیکھیے مثال کے طور پر بھٹنیر کے گورنر کمال الدین اور اس کے ساتھیوں کا واقعہ۔ اپنی عورتوں اور سامان و اسباب نذرِ آتش کر کے خون کے پیاسے عفریتوں کی طرح تیمور سے جنگ کرنے کے لیے نکل پڑے دیکھیے ظفرنامہ ص ۴۵۲ - ملفوظاتِ تیموری ص ۲۷۷ - ہمایوں کے جذبات جب شاہی حرم کی ایک خاتون عقیقہ بی بی قنوج کی شکست کے بعد شیر شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہوئی۔ مغل شہنشاہ کو اس کا افسوس رہا کہ اس نے مصیبت کے آنے سے پیشتر ہی اسے قتل کیوں نہ کر دیا۔ دیکھیے گلبدن ص ۴۶

[2] تلنگانہ کا راجہ علاؤالدین خلجی کے حملے کے وقت جوہر کرنے سے ہچکچایا حالاں کہ اس کے متعدد افسر اس کے لیے تیار تھے۔ دیکھیے خزائن الفتوح ص ۴۰

سماجی اور گھریلو آسائشیں

عمومی مشاہدہ، عام لوگ

اس سے پیشتر کسی باب میں ہم مختلف سماجی طبقات کی آمدنی کا ذکر کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ سب سے اعلیٰ اور سب سے نچلے طبقے کی آمدنی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس ضمن میں ہم نے مسٹر مورلینڈ کی رائے سے اتفاق کا اظہار بھی کیا ہے۔ اپنے انھیں بیانات کی تائید میں ہم ان عوام الناس کی گھریلو زندگی سے مثالیں پیش کریں گے جو اس دور میں آج کل کی طرح دیہاتوں میں بکثرت آباد تھے۔ مغل شہنشاہ بابر ہندوستان کی دیہی آبادی کی انتہائی کم ضروریات پر حیرت زدہ تھا۔ اس کے بیان کے مطابق کسی بھی موجودہ دیہات آبادکاری یا بربادی حیرت انگیز طور پر کم وقت میں مکمل ہو جاتی تھی کیوں کہ دیہی آبادکاری کے لیے بہت ہی کم اشیا کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کا بیان ہے کہ جس مقام پر لوگ طویل عرصے سے رہ رہے ہیں وہاں سے وہ ایک یا پورے آدھے دن میں مکمل طور پر غائب ہو جاتے ہیں اور اپنے پیچھے اپنے وجود کا کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ اسی طرح جب وہ کسی نئے مقام پر آباد ہوتے ہیں تو انھیں نہروں اور پلوں جیسی وسیع تعمیرات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ پانی کی ضرورت کے لیے کوئی تالاب، جوہڑ یا معمولی کچا کنواں کافی ہوتا ہے۔ اپنے رہائشی مکانات کی تعمیر کے لیے ان کی کل ضرورت درختوں کے تنے اور چھپروں کے لیے تھوڑے سے پوال پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کی جماعتی زندگی کے لیے بڑے بڑے مکانات اور چاروں طرف سے گھرے ہوئے قصبات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک دیہات کی آبادکاری انھوں

نے جیسے ہی شروع کی تھوڑی دیر بعد نظر ڈالیے تو ناقابل یقین حد تک مختصر وقت میں آپ کو تعمیر کا کام ختم ہوتا نظر آئے گا اور اب آپ کے سامنے ہندوستان کا ایک مکمل گاؤں کھڑا نظر آئے گا[1] ہندوستان کی دیہی آبادی کا یہ ایک عمومی اور صحیح خاکہ ہے۔

ذرا اور قریب سے نظر ڈالیے۔ دیہی آبادی کے لیے عموماً ایک ایسے مقام کا انتخاب ہوتا تھا جو ذرا بلند ہو یا کوئی بلند پہاڑی ہو۔ بہتر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ایسی جگہ ہو جس کی حفاظت کے لیے قریب کوئی با اثر شخص، سلطان یا کوئی امیر رہتا ہو[2] وہاں قریب ہی پانی ہوتا تھا اور چاروں طرف کاشت کے لیے زمین۔ یہ گاؤں مختلف طبقات کی ایسی جھونپڑیوں پر مشتمل ہوتا تھا جو ایک دوسرے کے برابر ہوتی تھیں۔ اچھوت اور ادنیٰ طبقے کے لوگ بیرونی حصہ میں رہائش اختیار کرتے تھے۔ دوآبہ کے علاقے کی ایک اوسط درجے کی جھونپڑی عموماً مندرجہ ذیل ڈھنگ کی ہوتی تھی حالاں کہ ہم عصر مورخین نے پوری تفصیلات اس سلسلے میں نہیں چھوڑیں۔ ایک انسان کو گرمی، سردی اور برسات سے بچنے کے لیے کم از کم جس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ اس میں موجود ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک چھوٹی سی جگہ کو چار کچی دیواروں سے گھیر لیا جاتا تھا۔ اس پر ایک پھونس کی چھت ہوتی تھی جو لکڑی کے چند لٹھوں کے سہارے اوپر ٹکی رہتی تھی اور معمولی ستون یا لکڑی کے چند لٹھے اسے نیچے سے سہارا دیتے تھے۔ سامنے کی دیوار میں دروازے کے لیے تھوڑی سی کھلی جگہ چھوڑ دی جاتی تھی جس میں دروازے کا لگنا کچھ ایسا ضروری نہ تھا۔ روشنی کے اندر آنے کے لیے اطراف کی دیواروں میں روشن دان نہیں رکھے جاتے تھے۔ خوش حال کسانوں یا گاؤں کے مکھیا کے مکانات زیادہ کھلے اور کشادہ ہوتے تھے[3] ان کے مکانات کے آگے ایک چبوترہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ

---

[1] بابرنامہ ص ۲۵۰

[2] نانک کے خیالات کے لیے دیکھیے شاہ ص ۱۸۷ دیہات میں پانی کی فراہمی کے لیے دیکھیے ابن بطوطہ کا بیان کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۹۴

[3] انگلینڈ میں عہد وسطیٰ میں غریبوں کی حالت کے لیے دیکھیے سالز مین ص ۸۸

ایک بیرونی دروازے سے متعلق کمرا، ایک اندرونی کمرہ، ایک وسیع صحن، ایک برآمدہ اور بعض مکانات میں دوسری منزل بھی ہوتی تھی۔ گھر کے اندر صحن کے چاروں طرف گھر کے افراد کے لیے رہائشی کمرے ہوتے تھے۔ دیواریں عموماً کچی ہوتی تھیں اور چھتیں حسبِ معمول پھونس کی ہوتی تھیں جو غالباً لکڑی کے چند لٹھوں کے سہارے ٹکی رہتی تھیں[1]
اگر ہم وادیِ گنگا میں دولت مند افراد کے گھروں کے حالات سے اندازہ لگائیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مکانات ایک دوسرے کے قریب نہیں بنتے تھے بلکہ اپنے اپنے پھلوں یا کھجور کے باغات کے وسط میں ہوتے تھے۔ ان کی تعمیر کچے مٹی کے ستونوں کی مربع کرسی پر ہوتی تھی اور یہ صحن کے گرد اندر کی طرف بانس یا لکڑی کے لٹھوں پر ٹکے ہوتے تھے۔ بانسوں کو درمیان سے پھاڑ کر اور آپس میں جوڑ کر دیوار سے وابستہ کر دیا جاتا تھا اور بانس ہی کے ایک چوکھٹے پر پھونس کی چھت ٹکی ہوتی تھی۔ اس کے چاروں طرف حفاظت کے لیے ایک خندق، ایک احاطہ یا کسی طرح کی باڑ یا شاہ بلوط کے درختوں کا ایک جھنڈ یا اسی طرح کی کوئی اور چیز ہوتی تھی[2]

جہاں تک گھر کے سامان کا تعلق ہے غربا کے گھر میں بہت کم سامان ہوتا تھا۔ ان کی ہلکی چھت اور آسانی سے مہیا ہونے والے لکڑی کے ستونوں کی طرح ان کے عام استعمال کے برتن بھی پکی مٹی کے ہوتے تھے جو گاؤں ہی میں بنتے تھے۔[3] ہم گزشتہ صفحات میں بھی دیکھ چکے ہیں کہ خوش حال کسان پیتل اور ملی جلی دھاتوں کے برتن بھی استعمال کرتے ہوں گے۔ ان کی زندگی میں لباس کے رکھ رکھاؤ، سنگار یا کھانے پینے کے معاملات کا زیادہ اہتمام نہ تھا۔ وہ لوگ عام طور پر فرش پر سوتے تھے اور جسم کو ڈھکنے کے لیے ایک دھوتی اور معمولی کپڑے کی ایک چادر استعمال کرتے تھے جو ہر ضرورت حتیٰ کہ بچھانے تک کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ باجرے کی ایک روٹی یا چاول اور

---

[1] دیہات میں مکانات سے متعلق اصلاحات کے لیے دیکھیے بہار پیزینٹ لائف از گریرسن ص ۲۳۲-۲۳۳ نیز امپیریل گزیٹر آف انڈیا ص ۱۷۴-۱۷۵

[2] نیز دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد ہشتم ص ۲۳۹-۲۴۰۔

[3] فرشتہ کے بیان کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۸۷،

دال اور کبھی کبھی گھی اور پیاز اور مرچ کی چٹنی ان کی روزمرہ کی خوراک تھی[1] اگر رات کا باسی کھانا بچ جاتا تو وہ دوسری صبح کھالیا جاتا ورنہ عام طور پر دو وقت کھانے کا رواج تھا۔ آج کل بھی یہ لوگ پہلے زمانے کی طرح ایک وقت کے کھانے پر ہی صبر و شکر کے ساتھ گزارا کرتے ہیں[2] ان کا عام مشروب ٹھنڈا اور تازہ پانی ہے اور وہ گزرنے والے مسافروں اور راہ چلتے لوگوں کو خصوصاً گرمی کے موسم میں یہ مشروب پیش کرنا نہیں بھولتے اس زمانے میں تمباکو کے استعمال کا رواج نہ تھا اور افیون کا استعمال چند ہی علاقوں تک محدود تھا۔ شہروں کے عام باشندے پان اور چھالیہ کا استعمال کرتے تھے۔ مخصوص تہواروں پر کسان تاڑی یا سستی دیسی شراب پیتے تھے[3] اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خاندان کے جملہ افراد خصوصاً عورتوں کے لیے سردی میں ایک ہی کمرے میں اور گرمی میں ایک صحن میں سونے کا دستور تھا۔ گھر میں جداگانہ باورچی خانوں اور غسل خانوں کا رواج نہ تھا۔ لوگ نہانے کے لیے کنوؤں یا دریاؤں پر جاتے تھے۔ لوگوں کی زندگی میں خلوت کے مواقع کم تھے اور نفاست بھی کم تھی حالاں کہ بھائی چارے کا احساس اور انسانیت کافی بڑھی ہوئی تھی۔ روزمرہ کی زندگی میں برتے جانے والے اصول بڑے سخت اور پیچیدہ تھے۔ ان اصولوں کو رواج کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ ہمارے اندازے کے مطابق دیہاتی برادریوں کی وسیع ہندوستانی آبادی اس طرح رہتی تھی۔

شہری خاکہ

ٹاؤن پلاننگ اور ہندوستان کی تعمیری روایات بہت قدیم رہی ہیں۔ فنِ تعمیر پر مستقل کتابیں تصنیف کی گئیں جسے شلپ شاستر کا نام دیا گیا اور قدیم قصبات، عمارات کے کھنڈرات قدیم ہندوستانی ذہن کی زرخیز تعمیری روایات کی نشان دہی

---

[1] دیکھیے ہرکلوٹس اسلام از کروک ص ۳۱۷

[2] امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد ہشتم ص ۳۰۸ - ۳۲۷۔ جلد بستم ص ۲۹۲ - ۲۹۳۔ و جلد بست و چہارم ص ۱۷۴

[3] ایضاً جلد ہشتم ص ۳۰۸ - ۳۰۹

کرتی ہیں[1] ایک شمالی ہندو قصبہ کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں کہ اس کی تعمیر کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب کیا جاتا تھا اور دو بڑی سڑکیں زاویہ قائمہ پر ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی شہر کے درمیان سے گزرتی تھیں۔ ہندو عمارتیں وسعت اور مضبوطی میں بڑی نمایاں ہوتی تھیں[2] شاہی عمارات میں سونے کے پتروں کا بے دریغ استعمال ہوتا تھا۔ یہ کئی کئی منزلہ ہوتی تھیں اور سب سے اوپر والی منزلوں کی بلندی بعض اوقات ۵۰ گز تک ہو جاتی تھی۔ چھتوں میں ہرے ٹائل استعمال ہوتے تھے اور قلعہ کے گرد دیواروں یا شہر کے گرد فصیلوں میں مناریں بڑے بڑے دروازے، ہاتھیوں کے مجسمے یا بڑے دروازے پر انسان کھڑے ہوتے تھے۔ جہاں کہیں پتھر مہیا ہو سکتا تھا وہاں اسے تعمیر میں استعمال کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کی عمارات میں منجملہ اور خصوصیات کے تالابوں کی تعمیر، دروازوں اور کھڑکیوں پر نقاشی کا کام، مندروں کی تعمیر اور بت تراشی میں فنی مہارت قابل ذکر ہیں[3]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے V. V. Dattas Town Planning in Ancient India

[2] مثال کے طور پر دیکھیے جے پور کی کیفیت "جے پور شہر کا نقشہ خصوصاً دل چسپ ہے کیوں کہ اس کا شمار ان شہروں میں ہوتا ہے جن کا نشو و نما دھیرے دھیرے اور بے ترتیبی کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ اس کی بنیاد ہندوستہری معماروں کی فنی روایات اور مذہبی کتابوں یعنی شلپ شاستروں کی ہدایات کے مطابق رکھی گئی تھی۔ شہر کی حفاظت کے لیے اس کے ایک طرف ایک پہاڑی ہے، دوسری طرف ناہر گڑھ کا قلعہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کی سڑکیں شلپ شاستروں کی ہدایات کے مطابق شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی ہیں۔ دیکھیے انڈین ارکیٹکچر از ہاول ص ۲۱۷۔ ہندو عمارات کی مضبوطی کے لیے دیکھیے تیمور کا بیان جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ عمارات پانچ سو سے سات سو سال تک قائم رہتی تھیں۔ دیکھیے ملفوظاتِ تیموری ص ۳۰۴-۳۰۵۔ سندھ میں کچی اینٹوں کے ایک قدیم آگ کے مندر کے لیے دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد اول ص ۳۲۹ جو لمبائی چوڑائی میں ۲۰ گز ایک بالشت موٹا تھا اور ان روایات کے مصنف کے زمانے تک قائم تھا۔ سندھ میں سکھوان کی قدیم پختہ اینٹوں کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد سوم ص ۱۳۱۳ (حوالہ)

[3] سونے کے مظاہرے کے لیے دیکھیے پدماوت ص ۲۳-۲۴۔ کئی منزلہ عمارتوں کی تفصیلات کے لیے دیکھیے تیمور کا بیان (ایضاً) کہ ۱۴ ویں صدی میں کشمیر میں لکڑی کے مکانات بعض مقامات پر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ اور کافی زمانہ بعد تک بھی انھوں نے اپنی عمارات اور قصبات کی تعمیر میں ہندوؤں کی تعمیری صلاحیتوں کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے ہندو شہروں کی قدیم خصوصیات ان سے مستعار لیں حالاں کہ کم ہی اعلیٰ درجہ کی عمارات ان کے ہاتھوں سے محفوظ رہ سکیں۔ ہندو شہروں کی غیر معمولی خصوصیات میں انھوں نے اضافہ بھی کیا۔ انھوں نے محلات، تالاب، منادر تعمیر کرائے، کھلی اور وسیع عمارات کا اضافہ کیا اور چند اپنی غیر معمولی خصوصیات ان میں نمایاں کیں اور اس طرح کے شہر بسائے جیسے ہمیں مغلوں کے دور میں ملتے ہیں[۱]۔ منصوبہ بند شہری تعمیرات میں مسلمانوں کی دین کے سلسلے میں ان کی حسین اور وسیع مساجد، ان کے دروازوں، غالباً فواروں کے استعمال، گنبدوں، نئی محرابوں اور شہر کے گرد بہتر طرز کی فصیلوں جن میں مینار یں اور دیگر جنگی سامان ہوتا تھا، کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان کی عمارتیں، ان کے مقبرے، ان کے چھت دار حوض اور حمام اور غسل خانے اور ان کے حسین باغات، سب ہندوستانی شہروں کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہوئے۔

اس دور کے ہندوستان کے ایک اوسط درجے کے شہر کا نقشہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچا جا سکتا ہے۔ یہ کسی دریا کے کنارے آباد ہوتا تھا یا کسی ایسی جگہ پر جہاں متعدد تجارتی راستوں کا اتصال ہو۔ عام طور پر آس پاس کے علاقوں کی بہ نسبت کسی بلند مقام پر آباد ہوتا تھا تاکہ حفاظت آسانی سے کی جا سکے[۲]۔ شہر کے چاروں طرف ایک بلند دیوار

(گزشتہ سے پیوستہ) ۴ یا ۵ منزلہ ہوتے تھے۔ نیز شنگھل کی سات منزلہ عمارات کے لیے دیکھیے جائسی۔ گوالیار کی شاہی عمارات ۴ منزل تک بلند تھیں۔ دو بالائی منزلوں کی بلندی تقریباً ۵۰ گز ہوتی تھی اور مینار یں، دروازے، مجسمے اور ہرے ٹائل کا کام ان کی خصوصیات تھیں۔

[۱] آرکیولوجیکل ڈپارٹمنٹ آف انڈیا کے اندراجات میں دیکھیے دہلی، بدایوں، سیکری آگرہ، اجمیر وغیرہ شہروں کی تفصیلات۔ چندیری میں پتھر کے عالم گیر اور وسیع استعمال کے لیے دیکھیے بابرنامہ ص ۳۱۲۔

[۲] شیر شاہ کے ذریعہ پٹنہ شہر کو آباد کرنے کے لیے جگہ کے انتخاب کی وجوہات اور اس کی بنیاد پڑنے کی تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ داؤدی ص ۹۲-۹۳

ہوتی تھی۔ اس میں جگہ جگہ دروازے ہوتے تھے۔ ان دروازوں پر کوتوال کی ذاتی نگرانی میں دن رات سخت پہرہ رہتا تھا[۱] اندرون شہر میں داخل ہوتے ہی عموماً بڑی مسجد یا مندر آنے والے کی توجہ کو اپنی غیر معمولی بلند اور موقع کی وجہ سے سب سے پہلے اپنی طرف منعطف کرتی تھی۔ بڑی مسجد شہر کے ہر حصے سے تقریباً یکساں فاصلے پر ہوتی۔ وہ اتنی وسیع ہوتی تھی کہ نماز جمعہ یا دیگر مخصوص نمازوں کے اوقات پر کافی بڑے اجتماع کے لیے کافی ہو سکے[۲] بارش کی کمی یا محاصرے کی صورت میں پانی کی فراہمی کے لیے بڑے بڑے پانی کے ذخیرے شہر کے اندر یا اس کے قریب ہی ہوتے تھے[۳] اس قسم کے پانی کے ذخائر پہاڑی قلعوں کے لیے بڑے اہم ہوتے تھے[۴] دو اہم سڑکیں شہر کے وسط میں ایک دوسری

۱۔ کوتوال کے عہدے کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۷۹ اور دیگر مورخین۔ اس دیوار کی تعمیر کے لیے جہاں پناہ کی تفصیلات ملاحظہ ہوں۔ جہاں پناہ دہلی کے گرد وہ دیوار تھی جس کی تعمیر محمد تغلق نے کرائی۔ اس کی موٹائی گیارہ کیوبٹ تھی اور ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر دیوار سے پورے شہر کا چکر لگا سکتا تھا جو کیداروں اور دیگر محافظوں کے لیے اس میں مستقل کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے کمرے بھی تھے جن میں اناج اور منجنیق نیز دیگر بھاری ہتھیار رکھے رہتے تھے جن کا استعمال محاصرین کے خلاف شہر کی حفاظت کرنے کے لیے ہوتا تھا۔ دیوار میں قریب قریب فاصلے پر ۲۸ دروازے اور متعدد برج تھے۔ نیز دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۶۔ تیمور کا بیان ہے کہ فصیل سیری سے پرانے قلعے تک پتھر کی بنی ہوئی تھی (ملفوظات تیموری ص ۲۹۰۔ ظفر نامہ ص ۴۷۶)

۲۔ دیکھیے عفیف ص ۱۳۵۔ فیروز آباد کی مسجد میں جس کی تعمیر کا نقشہ فیروز تغلق کے عہد میں تیار ہوا تھا دس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دہلی کی موجودہ قطب مینار دراصل مسجد قوت الاسلام کی ایک مینار تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی نے بعد میں دوسری مینار کی تعمیر شروع کرائی جس کا محیط قطب کا پانچ گنا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اصل مقصد کو اس سلسلے میں فراموش کر دیا تھا

۳۔ دہلی کے حوض شمسی جو دو میل لمبا اور آدھا میل چوڑا تھا کی تفصیلات کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۷-۱۸۔

۴۔ باؤلی کے لیے دیکھیے ابن بطوطہ کا بیان ایضاً ص ۹۳۔ یہ ایک تالاب ہوتا تھا جس کے گرد پتھر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو خطِ مستقیم پر کاٹتی تھیں اور بیرونی دیوار کے دروازوں سے جا ملتی تھیں۔ ان خاص سڑکوں کے دونوں کناروں پر شہر کے بازار کے چاروں حصے ہوتے تھے جہاں سڑک کے دونوں طرف آمنے سامنے دوکانیں ہوتیں۔ ان دوکانوں پر مختلف طبقات کے فن کار اور دستکاروں کی انجمنیں ہوتی تھیں[1]۔ کبھی کبھی اپنی ذاتی تفریح اور آرام کے لیے بادشاہ محل کے اندر اور باہر بازار تعمیر کراتے تھے[2]۔ بعض حالات میں پُل بھی شہر کی رونق میں اضافے کا باعث ہوتے تھے[3]۔

مختلف سماجی طبقات کے لیے شہر کئی حصوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ اس دور کے سماجی رجحان کے پیشِ نظر لوگوں کے بعض طبقات مثلاً خاکروب، موچی، غریب ترین فقیر اور نچلے درجے کے لوگ باقی آبادی سے بالکل الگ تھلگ اور شہر کے بیرونی حصوں میں رہنے کے لیے مجبور تھے۔ باقی آبادی بھی مذہبی، نسلی، حتیٰ کہ پیشہ ورانہ بنیادوں پر تقسیم ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے رہائشی علاقے بالکل جداگانہ تھے۔ عوام الناس اور امرا شہر کے مخصوص حصوں میں رہائش پذیر تھے۔ عام لوگوں میں متعدد تجارتی اور پیشہ ورانہ اقوام اپنے اپنے حصوں میں آباد تھے۔ شہر کے ہر حصے بڑی

(گزشتہ سے پیوستہ) کی دیوار ہوتی تھی اور پانی تک جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوتی تھیں۔

[1] تاریخ داؤدی ص ۸۴ ب نیز فیروز شاہ کے شہر فیروز آباد کے لیے دیکھیے سید احمد باب دوم ص ۲۴ اس کا قطر ۵ کوس (یا تقریباً دس میل) تھا۔ ایضاً ص ۵۲۔ شاہجہاں کے دور میں دہلی میں ایک بازار تھا جس کی لمبائی ۱۵۰۰ گز اور چوڑائی ۳۰ گز تھی۔ اس کا نام فیض بازار تھا اور یہ بازار دہلی دروازے کے سامنے تھا۔ عفیف ص ۱۵۲

[2] اکبر کے مینا بازار کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ مانڈو کے حرم بازار کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ یہ امر یہاں قابلِ ذکر ہے کہ مغل شہنشاہ ہمایوں نے ایک تیرتا ہوا بازار تعمیر کرایا تھا۔ متعدد بڑی بڑی کشتیوں کو ایک جگہ جوڑ کر ان کے اوپر دوکانوں کی تعمیر کرائی گئی تھی تاکہ اگر شاہی پارٹی جمنا پر تفریح کرنے کے لیے جائے تو انھیں ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی جا سکیں۔ دیکھیے خواندمیر ص ۱۳۸-۱۳۹

[3] عفیف میں دیکھیے پلوں کی تعمیر کا ذکر۔ ناگر (سری نگر) شہر میں جہلم دریا پر ۳۰ پل تھے۔ دیکھیے تیمور کے بیان کے لیے ملفوظاتِ تیموری ص ۳۰۴-۳۰۵

حد تک مکمل اور خودکفیل تھے۔ بعض حصے تو حقیقتاً ایک بڑے شہر کی جملہ خصوصیات کے حامل تھے اور چھوٹے پیمانے پر ایک شہر میں ملنے والی جملہ سہولیات وہاں مل جاتی تھیں۔[1]

شاہی محلات

ملک کا دارالخلافہ ان رہائشی حصوں میں ایک بہت پرشکوہ حصہ ہوتا تھا۔ اس میں حکمران کے رہائشی محلات اور اس کے عملے کے مکانات بنتے تھے۔ ہم سلاطین کے محلات اور عملے کے متعلق پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ بادشاہوں کے رہائشی حصے جو بجائے خود ایک شاندار شہر کی حیثیت رکھتے تھے۔ صرف شاہی محلات اور عملے کے دیگر رہائشی مکانات پر ہی مشتمل نہ تھے۔ فیل خانوں اور اصطبل، فوجی بارکوں پریڈ کے میدانوں کے علاوہ شاہی محلات کی نمایاں خصوصیت اس کے وسیع اور حسین باغات، وسیع کھیل کے میدان، مساجد، حمام، مدارس اور مقبرے تھے۔ شاہی عمارات کا سنگِ بنیاد جملہ مذہبی رسوم کے ساتھ بڑی شان وشوکت سے رکھا جاتا تھا۔ حسبِ معمول وقت کا تعین علمِ نجوم کے ماہرین کے مشورے سے کیا جاتا تھا۔ سید اور دیگر مذہبی عہدیداران ریاست نہ صرف شہنشاہ کے ہمراہ ہوتے تھے بلکہ عمارت کے لیے پتھر، مسالہ اور دیگر سامان کی فراہمی میں بھی مدد کرتے تھے۔ افتتاحی تقریب کے شروع میں شہنشاہ خود اپنے دستِ مبارک سے پہلی اینٹ عمارت کی بنیاد میں رکھتا تھا۔[2] اس کے بعد تعمیر کا اصل کام شروع ہوتا تھا۔ سلطان کی ذاتی رہائش کے لیے استعمال کی جانے والی عمارت میں

---

[1] مسلمانوں کے مکانات کے لیے دیکھیے گپتا ص ۹۰۔ ۹۱۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ طرب آباد دہلی کے موسیقاروں کے علاقے میں اپنا بازار اور مسجد تھی حتیٰ کہ اس میں ایک جامع مسجد بھی تھی۔ کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۸۔

[2] دیکھیے خواندمیر کا بیان ص ۱۴۶۔ نیک ساعت مقرر کرنے کے لیے ہمایوں بھی نجومیوں کی رائے لینے کے ساتھ ساتھ قرآن سے فال نکالنے میں بھی یقین رکھتا تھا۔ نیز دیکھیے میکالف جلد دوم ص ۳۴۔

بہت سے خفیہ دروازے اور راستے ہوتے تھے تاکہ خطرے کے وقت سلطان ان راستوں سے اپنی جان بچاکر نکل سکے یا اسی قسم کے کسی دوسرے موقع پر کام آجائیں۔[1]
شاہی عمارات کے نقشوں کے لیے کوئی واضح اصول وضوابط نہ تھے۔ ہر چیز سلطان کی خوشی اور رضامندی پر منحصر تھی۔ مثال کے طور پر شہنشاہ ہمایوں نے خود ایک تیرتا ہوا بازار، ایک بھول بھلیاں اور ایک تیرتا ہوا محل تعمیر کرایا تھا۔[2] شاہی محلات کی ایک اور خصوصیت وہاں کی گھڑی تھی جس کے مطابق وقت کا اعلان ہوتا رہتا تھا۔[3] درحقیقت

---

[1] برنی ص ۳۰۴

[2] تیرتے ہوئے محل کے لیے دیکھیے خواند میر ص ۱۳۹-۱۴۰۔ اس کی تعمیر تیرتے ہوئے بازار کے طور پر دو بڑی کشتیوں پر ہوئی تھی۔ اس محل کو انتہائی شاندار بنانے کے لیے دارالخلافہ کے کل لکڑی تراشنے والوں، دھات کا کام کرنے والوں آرائش کرنے والوں اور فرنیچر بنانے والوں نے اپنی پوری لیاقت اور ذہانت اس میں صرف کی تھی۔ یہ کل سہ منزلہ تھا۔ بھول بھلیاں کے تفصیلی ذکر کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۴۴۔ یہ آگرے میں جمنا کے کنارے تھا۔ اس کی نچلی منزل میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تین کمرے تھے۔ درمیانی کمرہ ہشت پہلو تھا اور اس میں ایک بڑا پانی کا حوض تھا۔ اس حوض کے بیچ ایک طاقچہ بنا ہوا تھا جس میں سے دوسرے کمروں کو ایک خفیہ راستہ جاتا تھا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ اگر حوض پانی سے پورا بھرا ہوا بھی ہو تو دوسرے کمروں میں پانی نہ جانے پائے۔ ایک آدمی حوض میں داخل ہو کر طاقچے سے گزرتا تھا۔ اس کے گھومنے والے دروازوں میں سے گزر کر ان میں سے کسی ایک کمرے میں جا نکلتا تھا اور وہاں پہنچ کر وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا تھا کہ کمرے انتہائی شاندار ہیں اور ان میں کھانے پینے اور موسیقی کا پورا انتظام ہے۔

[3] گھڑیال کے استعمال کے لیے دیکھیے گزشتہ صفحات میں ایک حوالہ باب ۲۔ جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ سلطان فیروز تغلق نے اس کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا تھا۔ نیز دیکھیے مکالمات جلد چہارم ص ۴۰۰۔ یہ گھڑیال اس آبی گھنٹے کی طرح کا ہوتا تھا جو ہندوستان میں قدیم دور میں استعمال ہوتا تھا۔ دیکھیے این سی اینٹ انڈین واٹر کلاک از فلیٹ جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۱۵ء نیز دیکھیے ایضاً ص ۲۰۰، جس میں مسٹر پراکیٹر نے بیان کیا ہے کہ قدیم زمانے میں شب و روز کا وقت مقرر کرنے کے لیے آبی گھڑی اور دھوپ گھڑی دونوں مستعمل تھیں۔ آدھے پہر کے طویل عرصے کو دھوپ گھڑی کی سوئی اور نادکا کو موخر کر کے ذریعہ ناپا جاتا تھا)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ملک کے ہر اہم شہر میں وقت کا اعلان کیا جاتا تھا خصوصاً صبح کے وقت نقارے بجا کر وقت کا اعلان ہوتا تھا اور مسلم اکثریت کے شہروں میں حسبِ معمول صبح کی اذان سے وقت کا اعلان کیا جاتا تھا[1] رات کو شاہی محل کی دیکھ بھال ایک خصوصی عہدیدار اپنی نگرانی میں بڑی سختی سے کرتا تھا۔ ان افراد کے علاوہ جو رات کی ڈیوٹی پر ہوتے تھے یا جنھیں شہنشاہ کی طرف سے عمارت کے اندر قیام کا خصوصی اجازت نامہ ملا ہوا ہوتا تھا کوئی فرد رات کا پہلا گھنٹہ گزرنے کے بعد محل کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ رات کو ہونے والے جملہ واقعات کی تفصیل ایک خصوصی افسر لکھتا تھا اور صبح کو شہنشاہ کے سامنے پیش کر دیتا تھا[2]

خیموں میں رہنے کا رواج امیر غریب ہر طبقے میں مقبول تھا[3] دارالخلافہ سے باہر شہنشاہ

(گزشتہ سے پیوستہ) ملک محمد جائسی کا بیان ہے کہ گھنٹے، آدھے گھنٹے اور چوتھائی گھنٹے کی پیمائش برتن میں پانی بھر کے کی جاتی تھی (دیکھیے پدماوت ص ۶۴) وقت کا اعلان ملے جلے دھات کے گھنٹے کو بجا کر کیا جاتا تھا اس گھنٹے کی موٹائی انگلی کی چوڑائی کی رکھی ہوتی تھی اور اسے ہر پہر کے بعد بجایا جاتا تھا (بابرنامہ ص ۲۶۵) ہندوستان سے باہر مسلمان زیادہ ترقی یافتہ گھنٹوں اور وقت پیما گھڑیوں سے واقف تھے (دیکھیے صدیقی اسلامک کلچر جلد اول یوز آف کلاکز ان مسلم لینڈز) ہندوستان میں انھوں نے قدیم ہندو طریقے کو اپنایا وقت کے تعین کے سلسلے میں بابر نے چند بہتر طریقے اپنائے۔ اس نے پہر کے علاوہ گھڑی کے اعلان کی ابتدا بھی کی۔ (دیکھیے بابرنامہ ص ۵۱۷) ہمایوں نے خاص وقت مقرر کرنے کے لیے آبی گھنٹوں کے علاوہ اسطرلاب بھی استعمال کیے (دیکھیے گلبدن ص ۵۳) عام طور پر ملک میں گھڑیال (ہندوؤں کا آبی گھنٹہ) استعمال ہوتا تھا۔

[1] دیکھیے ابن بطوطہ کا بیان کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۶۔ دیکھیے خواند میر ص ۱۵۶۔ دن میں کئی بار نقارہ بجا کر وقت کا اعلان کرنے کی ابتدا ہمایوں نے کی یعنی پو پھٹنے کے وقت۔ سورج طلوع ہونے کے بعد، سورج غروب ہونے پر اور قمری مہینوں کی پہلی اور چودھویں شب میں۔ بہرحال اس کے جانشین اکبر نے گھڑیال اور گھنٹے کے قدیم طریقے کی پھر ابتدا کی اور آبی گھنٹے ہمیشہ اس کے لشکر کے ہمراہ رہا کیے۔ (آئینِ اکبری جلد دوم ص ۹)

[2] محافظ شب اور دیگر قوانین کے لیے دیکھیے برنی ص ۴۰۶۔ منتظم محافظ خانہ کے لیے دیکھیے عفیف ص ۱۲۷ عفیف نے اس عہدہ پر وقت کے لیے کام کیا تھا نیز منتظم محافظ خانہ کے دیگر حوالجات کے لیے دیکھیے تاریخ مبارک شاہی ص ۲۷۶

[3] دیکھیے امیر خسرو کا وہ دل چسپ تجزیہ جب بارش کی وجہ سے اس کا مکان گر گیا تھا اور اسے خیمے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مختلف قسم کے خیموں کا استعمال تفریح اور شاہی سفر کے لیے کرتا تھا۔ سلطنت کے ابتدائی
دور میں زیادہ وسیع اور پرشکوہ شامیانے نہ تھے۔ ان میں حسن ونزاکت دھیرے دھیرے
بڑھی۔ یہاں تک کہ مغل شہنشاہ ہمایوں نے مختلف قسم کے چھوٹے اور بڑے خیمے اور شامیانے
تیار کرائے جن سے اس کی ذہانت اور خوش ذوقی ظاہر ہوتی ہے۔ آخر کار خیمہ سازی کی
صنعت نے اس حد تک ترقی کی کہ اکبر اور اس کے جانشین جب کہیں قیام کرتے تو خیموں
کا ایک شہر آباد ہو جاتا تھا۔ مختلف قسم کے شاہی خیمے نسبتاً بڑے ہونے لگے اور ان میں
زیادہ آرام اور آسائش ہونے لگی[1] خیموں اور شامیانوں کا فرنیچر ریشم کی بڑی دریوں
اور قالینوں نیز بڑے بڑے گاؤتکیوں اور اسی قسم کے دیگر سامان پر مشتمل ہوتا تھا[2]

شاہی رہائش گاہوں کی تفصیلات ختم کرنے سے پیشتر شاہی محلات کی چند دیگر
خصوصیات کا بتا دینا بھی ضروری ہے۔ شاہی رہائش گاہیں بہت وسیع اور اگر ممکن ہوتا تو
کسی قدر بلند مقام پر ہوتی تھیں۔ یہ محلات عموماً کسی دریا کے کنارے ہوتے تھے تاکہ دن کے وقت

(گزشتہ سے پیوستہ) میں رہنا پڑا تھا۔ اعجازِ خسروی جلد پنجم ص ۶۱۔ شاہی لشکر میں حکمران اور دیگر افسران کے
لیے خیمے ہوتے تھے اور سپاہیوں کے لیے پھونس کے چھپر۔ دیکھیے تذکرۃ الواقعات ص ۱۲۵ ب۔ ہندوستان میں
برسات کے موسم اور خیموں کی زندگی کے بابر کے تجربات بابرنامہ ص ۳۵۲۔

[1] دیکھیے معزالدین کیقباد سے پہلے شاہی خیموں (بارگاہ) کے سلسلے میں قران السعدین ص ۴۰ پر ابتدائی
حوالہ جات۔ اس سے پہلے بارگاہ یا شامیانہ اتنا چھوٹا ہوتا تھا کہ صرف دو ستونوں کی مدد سے کھڑا رہتا تھا۔ سلطان نے
اس کے حجم اور ستونوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ شاہی چھتر کے لیے دیکھیے گلبدن ص ۶۹۔ اس کی شکل دائرہ نما ہوتی تھی
ہمایوں کے شاہی خیموں کے سلسلے میں دیکھیے خواند میر کا بیان ص ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ مغل شہنشاہ نے ایک شامیانہ
اتنا بڑا تعمیر کرایا تھا کہ اسے کھڑا کرنے کے لیے ستونوں کے بہت سے ڈھانچے تیار کرانے پڑے تھے۔ اس نے
لکڑی کے ڈھانچے کا دوسرا خیمہ بنانے کا حکم دیا جسے (اس کے تیرتے ہوئے محل کی طرح) اکھاڑ کر الگ الگ حصوں میں تہہ
کرکے ایک مقام سے دوسرے مقام تک آسانی سے لے جایا جا سکتا تھا۔ اکبر کے دور تک (دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول
ص ۵۱) اس فن میں مزید ترقی ہوئی اور ابوالفضل نے شاہی استعمال میں آنے والے متعدد قسم کے خیموں کا ذکر کیا ہے۔
جن میں معمولی راوٹی اور درویشی سے لے کر دو منزلہ اور آٹھ ستونوں کے شامیانے شامل ہیں۔

[2] آرائش کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول ص ۵۱۔

اس کا سایہ دریا کے پانی میں پڑے اور شب میں اس کی روشنی کے سائے سے اس کی خوبصورتی دوبالا ہوتی رہے[1]۔ دہلی اور آگرہ یا لاہور اور مانڈو کے شاہی محلات کو دیکھنے کے بعد تاثرات کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ محلات کے ارد گرد حسین باغات اور کافی کھلی جگہ ہوتی تھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ چندیری جیسے مقامات پر، جہاں پتھر دستیاب ہوتا تھا اس کو کس طرح استعمال کیا گیا۔ سرخ پتھر کا استعمال بڑے پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ اسے رگڑ کر اس قدر نفاست کے ساتھ چکنا کیا جاتا تھا کہ امیر خسرو کے مطابق دہلی کے قلعہ کی پتھر کی دیواروں میں انسان اپنا چہرہ دیکھ سکتا تھا[2]۔ بابر کی ہندوستان میں آمد سے پہلے قلعوں کے فرش کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ غالباً بابر کے زمانے میں ہندوستان میں پہلی بار سرخ پتھر اور اس کے خلوت خانے اور دیوان خانے کے فرش میں استعمال ہوا۔ یہ بات اگرچہ قطعی طور پر صحیح معلوم نہیں ہوتی[3]۔ سنگِ مرمر کے استعمال کے سلسلے میں کوئی واضح شواہد نہیں ملتے لیکن باقی ماندہ آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ مغلیہ شان و شوکت کے دور سے پیشتر سنگ مرمر زیادہ استعمال نہیں ہوتا تھا۔

سلاطین کے محلوں میں متعدد حصے ہوتے تھے مثلاً جماعت خانہ یا دیوان خانہ، لباس تبدیل کرنے کے کمرے، غسل خانے، خلوت خانے جن کا دروازہ ملحقہ صحن میں کھلتا تھا اور زنان خانے محل کی دیواریں ریشمی پردوں اور مخملی مشجّر سے آراستہ کی جاتی تھیں جن پر زربفت کی جھالر لگی تھی اور قیمتی جواہرات ٹنگے ہوئے تھے[4]۔ سجاوٹ کے لیے استعمال کی جانے والی اشیا میں عموماً سونے، آبنوس اور پچی کاری کے کام کیے ہوئے ہتھیار، شمع دان، فرش، جھاڑ، قالین آفتابے، خوشبو دان، قلم دان، شطرنج کی بساط، کتاب دان اور سرپوش وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ رات کو کمروں کو روشن کرنے کے لیے شمع استعمال کی جاتی تھی مشعلیں اور

---

۱ قران السعدین ص ۴۲-۴۳
۲ ایضاً
۳ گلبدن کا بیان دیکھیے ص ۱۴-۱۵۔
۴ کمروں اور آرائش کے لیے دیکھیے عفیف ۱۰۰-۱۰۱۔ قصائد بدر چاچ ص ۴۳-۵۔
کلیات خسرو ص ۴۷۲۔

ہلکے فتیلے والے چراغ بھی بعض مواقع پر استعمال ہوتے تھے[۱] بابر نے قدیم محلوں کی عام خصوصیات میں معتدبہ اضافے کیے جن میں چوکنڈی، پھولوں کی کیاریاں سنگ مرمر کے راستے، باولیاں اور آگرے کے فوارے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ ایک طویل عرصے تک سرکاری عہدے دار اور بلند پایہ امرا کی حویلیاں شاہی محل کی حدود سے باہر ہوتی تھیں۔ غالباً ان کا فاصلہ محلوں سے بہت زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ مغل حکومت کے قیام اور جملہ سرکاری حکام میں ایک وسیع ہندوستانی طرزِ فکر کے ارتقا کے بعد ہی تمام امرا میں آزادانہ اور بے تکلف قریبی سماجی ربط ضبط شروع ہوا۔ سیکری میں بیربل اور فیضی کے مکانات ہمیں شہنشاہ اور اس کے پسندیدہ امرا کے درمیان آزادانہ آمدورفت اور باہمی محبت اور دیکھ بھال کا ثبوت ہیں۔

ہم اس سے پیشتر کسی باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ موجودہ دہلی بہت سے قدیم شہروں کے بعد وجود میں آئی ہے اور موجودہ تکمیل قدرتی ہے۔ یہاں ہم صرف یہ بتائیں گے کہ محمد تغلق کے زمانے تک چار شہر وجود میں آ چکے تھے۔ قدیم شہر۔ سیری۔ تغلق آباد اور جہاں پناہ جسے خود سلطان نے آباد کیا تھا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ محمد تغلق ان شہروں کے گرد ایک بڑی فصیل تعمیر کرانا چاہتا تھا لیکن زیادہ خرچ کی وجہ سے اسے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا[۳]

امرا کے مکانات

امرا کی حویلیوں کے بارے میں ہماری معلومات نسبتاً محدود ہیں۔ بہرحال اس قدر اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کے مکانات کی تعمیر بھی شاہی عمارتوں ہی کے طرز پر ہوتی تھی۔

---

[۱] شیشے کے جھاڑ وغیرہ کے لیے دیکھیے قران السعدین ۱۲۳ - ۱۲۴ - ۱۲۷ - بابر نامہ ص ۶۰۹

[۲] دیکھیے گلبدن ص ۱۴ - ۱۵ - جس میں ہشتاروں (برجیوں) میں چھوٹے چھوٹے حجروں کا بھی ذکر ہے لیکن یہ امر مشتبہ ہے کیوں کہ برجیوں کا ذکر مالوہ اور مقامات کے سلسلے میں ہے۔

[۳] کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۵ - ۱۶ -

سلاطین کے مقابلے میں امرا نسبتاً زیادہ محفوظ تھے۔ یہ امر اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ امرا کے مکانات زیادہ پر سکون اور پُر آسائش تھے۔ ان کی حویلیاں بہت بڑی ہوتی تھیں اور ان میں کمرے وغیرہ بھی وسیع تھے۔ ان میں دیوان خانے، غسل خانے، کسی کسی حویلی میں پانی کے حوض، ایک وسیع صحن اور کتب خانہ بھی ہوتا تھا۔ حرم کی خواتین کے لیے جداگانہ رہائشی حصے ہوتے تھے۔ دیوان خانے کی آرائش کے لیے دیواروں کے نہایت قیمتی پردے اور دروازوں کے خوب صورت پردے استعمال کیے جاتے تھے[1]۔ خوش حال ہندوؤں کے مکانات کی دیواروں پر سفیدی اور رنگ وروغن ہوتا تھا اور دروازے بڑے خوش نما ہوتے تھے[2]۔ بنگال اور گجرات کے اعلیٰ طبقات کے گھروں کے سلسلے میں چند تفصیلات ملتی ہیں۔ بنگال میں مکانات اس قدر وسیع ہوتے تھے کہ اس کے ایک طرف حوض، دوسری طرف ایک باغیچہ، تیسری طرف بانس کا ایک کنج اور چوتھی طرف کھلا ہوا میدان ہوتا تھا[3]۔ اڑیسہ میں بھی مکانات وسیع اور عمارات بلند ہوتی تھیں ان میں پھلوں کے باغیچے اور کھیتی کے لیے زمین کا کافی حصہ ہوتا تھا[4]۔ اسی طرح مکانات کی تعمیر کے سلسلے میں گجرات بھی ایک ترقی پذیر ملک تھا۔ کھمبایت بہت ہی پر شکوہ شہر تھا۔ یہاں سبزیوں کے باغیچے اور پھلوں کے متعدد باغات تھے جنھیں وہ

---

[1] دیکھیے کول (علی گڑھ) میں خلیفہ نامی ایک امیر کے گھر کا بیان جہاں مغل شہنشاہ نے گلبدن کا استقبال کیا تھا۔ اس مکان کو قیمتی گجراتی پردوں سے آراستہ کیا گیا تھا جن پر زربفت کی جھالر لگی ہوئی تھی۔ گلبدن اور دیگر خواتین کو جداگانہ کمرے تفویض کیے گئے تھے۔ دیکھیے گلبدن ص ۱۸-۲۰-۲۳۔ ایک امیر کے مکان کی تفصیلات کے لیے دیکھیے امیر خسرو کا بیان اعجازِ خسروی جلد پنجم ص ۵۸-۸۷-۸۸۔ ملوات کے ایک افغان امیر غازی خاں کے مکان میں کتب خانے کی تفصیلات کے لیے دیکھیے بابر نامہ ص ۴۴۴۔ بابر کا بیان ہے کہ اس نے وہاں مذہبی کتب کا بہت بڑا ذخیرہ دیکھا۔

[2] دیکھیے حوالے کے لیے بیکالف جلد اول ص ۲۷۵

[3] دیکھیے جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز ۱۹۲۷ء ص ۱۱۶ نیز باربوسہ جلد اول ص ۶۱ جس میں بنگال کے مسلمانوں کے مکانات میں پانی کے بڑے بڑے حوضوں کا ذکر ہے

[4] عفیف ص ۱۶۵

تفریح کے لیے استعمال کرتے تھے۔ چپانیر اور احمد آباد نے زیرِ مطالعہ دور کے اختتام پر اہمیت حاصل کی۔ ان شہروں میں مکانات بڑے خوب صورت تھے۔ ان میں بڑے بڑے صحن تھے، میٹھے پانی کے حوض اور کنوئیں تھے اور یہ سب چیزیں دونوں شہروں میں پتھر سے تعمیر کی جاتی تھیں[1] اس زمانے میں مارواڑی تاجر غسل کے بڑے شوقین تھے اور اپنے مکانات کے اندر باغوں اور باغیچوں کے علاوہ پانی کے متعدد حوض بھی تعمیر کراتے تھے[2]

تاریخ فرشتہ کے مصنف کا بیان ہے کہ اہل ہند مجموعی طور پر خوب صورت دریاؤں اور پانی کے وسیع ذخائر سے لطف اندوز ہونا نہیں جانتے تھے۔ اس کے خیال کے مطابق دکن کے لوگ بہتے ہوئے دریاؤں کے قریب اپنے مکانات تعمیر کرتے تھے۔ اس کے برخلاف اگر شمالی ہند میں کوئی اپنے خیمے کسی دریا کے کنارے نصب کرتا تھا تو وہ دریا کی طرف سے اسے چھپا لیتا تھا۔ مکانات کی تعمیر کے سلسلے میں بھی خوش ذوقی کی یہی کمی ظاہر ہوتی تھی۔ اس سے فرشتہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کے مکانات جیل خانے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کے قصبات اور شہر بے رونق ہیں[3] یہاں فرشتہ کے اس بیان کی صحت پر بحث نہیں کرنی ہے لیکن کسی بھی حالت میں یہ بات نہ صرف شاہی عمارات پر بلکہ ہندوؤں کے مکانات اور ان کے شہروں پر صادق نہیں آتی جن میں سے زیادہ تر دریاؤں کے کنارے آباد تھے۔

فرنیچر

شاہی محلات میں استعمال کی جانے والی اشیا کے بارے میں ہم کئی بار ذکر کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت مفصل حالات تو مہیا نہیں ہوئے لیکن مندرجہ ذیل

---

[1] کھمبایت کے لیے دیکھیے وارتھیما ص ۱۰۶ باربوسہ جلد اول ص ۱۶۱۔ چپانیر اور احمد آباد کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۲۵

[2] ایضاً جلد اول ص ۱۱۳

[3] دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۸۷

تفصیلات سے ایک رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ فرنیچر سے متعلق عام اشیا میں پلنگوں اور کرسیوں کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ چارپائیاں، جیسا کہ آج کل بھی رواج ہے، چار پایوں پر چار لکڑی کی پٹیاں لگا کر بنائی جاتی تھیں اور انھیں سوتی نواڑ سے بنا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری طرح کی ہلکی اور آسانی سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے والی چارپائیاں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ حتی کہ بعض لوگ سفر پر جاتے ہوئے اکثر اپنی چارپائی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ مسہری سے متعلق دیگر سامان میں ہم دو عدد تکیوں، گدوں اور بالاپوش کا شمار کرسکتے ہیں۔ بعض اوقات امرا اور دولت مند افراد یہ چیزیں ریشم کی تیار کراتے تھے۔ سوتی یا کتان کے بالاپوش گدوں اور تکیوں کے لیے استعمال کیے جاتے تھے اور جلد تبدیل کردیے جاتے تھے۔ بچھانے سے متعلق ان سب اشیا، مع بستر، ہر استعمال کی جانے والی اشیا کے لیے عام اصطلاحی لفظ چھپر کھٹ استعمال کیا جاتا تھا[۱]۔ بعض حالات میں دولت مند لوگ سونے چاندی کے کام سے آراستہ چھپر کھٹ استعمال کرتے تھے اور ان پر ریشمی گدے بچھاتے تھے[۲]۔ کبھی کبھی دولت مند ہندو لوگ گدوں کے بجائے خوب صورت دریاں استعمال کرتے تھے جنھیں سوتل پاٹی کہا جاتا تھا اور اپنے تکیوں میں رائی کے بیج بھر لیتے تھے۔ بنگال کے ایسے حصوں میں جہاں ملیریا پھیلتا تھا مچھردانی بھی استعمال کی جاتی تھی[۳]۔

اعلیٰ طبقے کے لوگ ریشمی گدوں کی لمبی کرسیاں استعمال کرتے تھے۔ دیگر لوگ مونگا یا جیک وڈ کی بنی ہوئی پیڑھی استعمال کرتے تھے جو سوتی ڈوریوں سے بنی جاتی

---

[۱] اس اصطلاح کے لیے دیکھیے برنی ص ۱۱۶۔ دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۴۳

[۲] دیکھیے فریشتہ ص ۱۳۶، مبحر ص ۲۲

[۳] دیکھیے جرنل آف دی ڈپارٹمنٹ آف لیٹرز ۱۹۲۷ء ص ۲۴۱-۲۴۲

تھیں۔ سرکنڈوں کے بنے ہوئے موڑھے استعمال ہوتے تھے[1] غریب طبقے کے لوگ لوہے کے اسٹول اور امیر لوگ دیوان اور گدّے اور گاؤ تکیے استعمال کرتے تھے[2] عام لوگ مختلف قسم کے پنکھے استعمال کرتے تھے اور امیر لوگوں میں کئی طرح کے مکھی اڑانے کے مورچھلوں کا استعمال ہوتا تھا[2]

سلطان فیروز تغلق کے امتناعی احکامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سونے چاندی کے برتنوں، سونے کے کام والی ڈاب، ترکش اور پیالے، لوٹے اور ساغر کا استعمال امرا میں بکثرت ہوتا تھا جسے سلطان اسلام کے منافی خیال کرتا تھا۔ اسی طرح دوسری اشیاء عیش و عشرت میں جن کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ انسانی تصاویر، پردوں پر بنی ہوئی عمارات و مناظر، خیمے اور کرسیوں پر بنی ہوئی قابل ذکر ہیں۔ مزید برآں یہ بات بھی بالکل واضح کردی گئی ہے کہ دولت مند طبقے کے مکانات متعدد قیمتی مسہریوں، بچھانے کی اشیا اور دوسری قسم کے فرنیچر کے سامان سے آراستہ ہوتے تھے[3]

اس ضمن میں گھریلو پالتو جانوروں کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ جملہ گھریلو جانوروں میں طوطے کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ یہ قدیم رشیوں کی جملہ صفات سے بھرپور ہے اور اپنے پالنے والے سے بھائی اور دوست کی طرح محبت کرتا ہے۔ یہ بڑی ذہانت سے متعدد محاورے اور دیگر الفاظ دہرا سکتا

---

[1] منتخب التواریخ جلد اول ص ۱۲۵

[2] مورچھل کے لیے دیکھیے پدماوت (ہندی) ص ۲۱۔ جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز ۱۹۲۷ء ص ۲۲۳ - ۲۲۴

[3] امرا کے مکانات میں فرنیچر کے لیے دیکھیے عفیف ص ۱۰۰۔ پابندیوں کے سلسلے میں سلطان کے بیان کے لیے دیکھیے فتوحاتِ فیروز شاہی ص ۱۰ - ۱۱۔

[4] ملک محمد جائسی کی تصنیف میں دیکھیے پدماوت کے مشہور طوطے ہیرامن کی تفصیل۔ نیز دیکھیے ناہر کے ذریعہ ایک طوطے کو تحفتاً پیش کرنے کے سلسلے میں تیمور کا بیان (ملفوظاتِ تیموری ص ۲۹۰) یہ طوطا متعدد راجاؤں اور حکمرانوں کی صحبت میں رہ چکا تھا۔ نیز دیکھیے آبِ حیات میں محمد حسین آزاد کا بیان کہ ہمایوں کے گجرات پر حملے کے وقت طوطے نے رومی خان کی غداری کی مذمت کی تھی۔ آبِ حیات (اردو) لاہور ۱۸۸۳ء ص ۱۸ - ۱۹۔

ہے اس لیے طوطا امیر وغریب اور حتی کہ شاہی محلوں میں پسندیدہ پالتو پرندہ سمجھا جاتا تھا[1] خاندان کے مالی ذرائع کی نسبت سے طوطے کا پنجرہ گھر کے ساز وسامان کی ایک اہم مد تصور کیا جاتا تھا[2] گھریلو پالتو جانوروں میں بندر کا ذکر بھی آتا ہے لیکن اس جانور کو ہمیشہ بہت بے ضرر عزیز یا معصوم تصور نہیں کیا جاتا تھا[3] مختلف قسم کے کتے بھی بہت پسند کیے جاتے تھے اور انھیں شکار اور گھر کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔

ذرائع آمد و رفت کا مسئلہ بھی بہت دل چسپ ہے کیوں کہ لوگوں کو اپنی سواری کے لیے خود ہی انتظام کرنا پڑتا تھا۔ معمولی سفر کے لیے لوگ گھوڑے کی پیٹھ پر یا گردوں یا مختلف اقسام کی پہیے دار گاڑیوں کا استعمال کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کھمبایت میں بہت خوب صورت سواری گاڑیاں اور رتھ استعمال کیے جاتے تھے ۔ وہ بند ہوتے تھے اور ان پر گھر کے کمروں کی طرح پردا پڑا ہوتا تھا۔ ان کی کھڑکیاں سنہری چمڑے یا ریشمی پردوں سے آراستہ ہوتی تھیں اور ان کے گدّے ریشم سے بنے ہوتے تھے۔ اسی طرح ان کے توشک اور گدّے بھی بڑے قیمتی ہوتے تھے[4] خواتین بند گاڑیوں میں سفر کرتی تھیں مختصر سفر میں خواتین کے لیے عموماً ڈولا کرائے پر لے لیا جاتا تھا جو پالکی کی طرح ہوتا تھا اور اس پر بانس بندھے رہتے تھے اور آٹھ آٹھ آدمی اسے نبروارے جاتے تھے۔

---

[1] بنگالی شاعر چندی داس نے طوطے کے پنجرے کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ پرندے کے بیٹھنے کی جگہ، پیالے اور برتن، پیروں سے بندھی گھنٹیاں سب سونے کی بنی ہوتی تھیں اور پنجرہ سورج دیوتا کے رتھ کی طرح چمکتا تھا۔ دیکھیے جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز سنہ ۱۹۳۰ء ص ۲۷۶-۲۷۷

[2] بندروں کے سلسلے میں امیر خسرو کے حوالہ جات، اعجاز خسروی جلد اول ص ۱۷۹

[3] باربوسہ کے بیان کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۴۱

[4] دیکھیے ابن بطوطہ کا بیان کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۷۵۔ امیر خسرو کے حوالہ جات اعجاز خسروی جلد پنجم ص ۹۳ نیز دیکھیے خسرو خاں کا دہلی سے دیو گیر تک کا طویل سفر جو اس نے آٹھ دن میں پالکی میں طے کیا جب اس پر یہ الزام تھا کہ اس نے مبارک شاہ خلجی کو تخت سے اتارنے کی کوشش کی ہے (برنی ص ۴۰۰)

اس کی ایک چھوٹی شکل اور تھی جسے ڈولی کہا جاتا تھا اور جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ پالکی عموماً امیر لوگ لمبے سفر کے لیے استعمال کرتے تھے۔ راستے میں قیام کے لیے دوکانیں اور سرائیں ہوتی تھیں جہاں باربردار نوکر اور جانور حتیٰ کہ مزید سواریاں بھی مہیا ہو جاتی تھیں۔[1]

ہم مندرجہ ذیل واقعے سے امرا اور دولت مند افراد کے گھریلو عیش و آرام کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جب جون پور کے سلطان حسین کے کچھ امرا اس کے دشمن سلطان سکندر لودی کی حراست میں آگئے اور انھیں اس کے ساتھ قیام کرنا پڑا تو موخرالذکر نے ہر امیر کو دو خیمے اور ایک شامیانہ، ایک سادہ خیمہ، ایک غسل خانہ، دو گھوڑے، دس اونٹ (غالباً آمد و رفت کے لیے) دس ملازمین اور ایک سہری اور ایک بستر مہیا کیا۔[2] مغربی ساحل کے تاجر مکانوں کو آراستہ رکھنے کا بڑا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔[3]

پوشاکیں اور گھوڑے

لباس کے سلسلے میں ہندوستان کے متعدد سماجی اور مذہبی طبقات میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ البتہ کسانوں اور نچلے طبقے کے افراد میں اس حد تک یکسانیت تھی کہ وہ کم از کم لباس استعمال کرتے تھے۔ ہم شاہی لباس اور بادشاہوں کے استعمال کی دیگر اشیا کا ذکر کر چکے ہیں۔ اپنی ذاتی زندگی میں شہنشاہ لباس کے سلسلے میں

---

[1] تاریخ داؤدی کا بیان ص ۲۹

[2] گجرات کے تاجروں میں چینی مٹی کے استعمال کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۴۷ - ۱۴۸۔ لنڈیر کے لوگوں کے پاس مختلف ڈیزائنوں کی خوب صورت چینی برتنوں سے بھری ہوئی الماریاں تھیں۔

[3] قبا کے ابتدائی استعمال کے لیے دیکھیے ماورٹی ص ۶۴۳۔ اس میں استعمال ہونے والے سامان کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول ص ۱۰۲-۱۰۳۔ دگلہ کے حوالے کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۷۳ بالاپوش کے ہمایوں کے نئے ڈیزائن کے لیے دیکھیے خواند میر ص ۱۴۱ - ۱۴۲۔ عام لباس اور لباسِ شب کے لیے دیکھیے اکبرنامہ جلد اول ص ۲۲۵۔ دہلی میں مختلف قسم کے ہلکے جوتوں کو آج کل بھی سلیم شاہی کہا جاتا ہے۔

اپنے اہم امراسے زیادہ مختلف نہ تھا البتہ اس کا لباس نہایت عمدہ قسم کا ہوتا تھا اور وہ اُسے بہت جلدی تبدیل کر دیتا تھا۔ سر کے لباس کے سلسلے میں سلاطین دہلی سلطنت کے ابتدائی دور میں ایک کلاہ یا لمبی تاتاری ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ جلال الدین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پگڑی استعمال کرتا تھا۔ مردانہ لباس میں وہ لوگ تنگ چوغا یا قبا استعمال کرتے تھے جو موسم کی مناسبت سے تن زیب یا عمدہ قسم کی اون سے تیار کی جاتی تھی۔ بعد کے زمانے میں استعمال کی جانے والی پشواز یا انگا کو اسی نمونے پر تیار کیا گیا تھا۔ موسم سرما میں سلطان کبھی کبھی چوغے کے اوپر ایک اور لباس پہنتے تھے جسے دگلا کہا جاتا تھا۔ یہ ایک ڈھیلا ڈھالا لباس ہوتا تھا جسے میں روئی یا ایسی ہی کوئی چیز بھری ہوتی تھی۔ مغربی ممالک سے قریبی تعلق پیدا ہونے کے بعد سلاطین نے فرغل یا فر کے کوٹ استعمال کرنا شروع کر دیے۔ مغل شہنشاہ ہمایوں نے ایک نئے قسم کے بالا پوش کو رائج کیا جو سینے کے اوپر سے کٹا ہوا اور اوپر سے کھلا ہوا ہوتا تھا۔ ہمایوں اسے قبا کے اوپر سے پہنتا تھا۔ اس کے یہ کوٹ اس کے نجومیانہ تصورات کے مطابق مختلف رنگوں کے ہوتے تھے۔ مختلف مواقع پر یہ بالاپوش امرا اور دیگر افراد کو خلعت کے طور پر عطا کیے جاتے تھے۔ معمولی قمیص، شلوار اور ہلکے اور خوب صورت جوتے بھی عام طور پر استعمال ہوتے تھے۔ رات کے وقت دوسرے کپڑے استعمال کیے جاتے تھے[1]

وہ امیر جن کا تعلق سلطان کے مصاحبین خاص کے طبقے سے ہوتا سرکاری تقریبوں پر خلعت پہنتے تھے۔ یہ سرکاری لباس سر کے لیے کلاہ، ایک زربفت اور مخملی کام کا چوغہ اور ایک سفید پیٹی پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایک بلند مرتبہ امیر عموماً ایک شان دار تاتاری گھوڑے پر سوار ہوتا تھا جس پر قیمتی ساز پڑا رہتا تھا اور چند لوگ اس کے آگے یا پیچھے چلتے رہتے تھے[2] اپنی ذاتی زندگی میں امرا عموماً چھوٹی سی ہندوانہ پگڑی (پاگ) عمدہ ساخت کا

---

[1] برنی (قلمی نسخہ) ص ۳، بروکیڈ کی بنی ہوئی کلاہ جس میں تاج اور موتی جڑے ہوتے تھے۔ دیکھیے کلیات خسرو ص ۴،،

[2] ایک امیر کے عام استعمال کے کپڑوں کے لیے دیکھیے واقعات مشتاقی ص ۲، ریشمی اور مخملی چغول
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک چغہ اور عام سادہ سا پاجامہ قمیص پہنتا تھا۔ لباس زیریں عمدہ تن زیب یا کسی اور عمدہ کپڑے کا ہوتا تھا۔ سونے کے لیے الگ کپڑے استعمال ہوتے تھے اور ہر ہفتہ تبدیل کر دیے جاتے تھے[۱] اسی طرح کم درجے کے امرا اور دیگر افراد کے لباس کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مخصوص طبقات کے لوگ اپنا امتیازی لباس استعمال کرتے تھے۔ سپاہی کے لیے کوئی خاص وردی مقرر نہ تھی البتہ اس کے ہتھیار اسے دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں نمایاں کرتے تھے[۲] شاہی غلاموں کی خاص پہچان یہ تھی کہ وہ ایک کمر کی پیٹی، اپنی جیب میں ایک رومال سرخ، جوتے اور کلاہ استعمال کرتے تھے۔ سرکاری عہدے دار عموماً چاندی یا سونے کی مہر دار انگوٹھیاں اپنی انگلیوں میں پہنتے تھے[۳]

مختلف قسم کے لباس کسی بھی طبقے کے اتنے جاذبِ توجہ نہیں ہوتے تھے جتنے مسلمانوں کے مذہبی طبقے کے لباس۔ عام راسخ العقیدہ مسلمان صرف سادہ سوتی کپڑے پہننا پسند کرتا تھا اور شرعی احکامات کے پیش نظر ریشم، مخمل، زربفت

(گزشتہ سے پیوستہ) اور عمدہ ململ کے نیکروں اور قمیصوں کے لیے دیکھیے دیول رانی خضر خاں ص ۳۰۱۔ ایک مشہور نظم میں امیر خسرو نے ہندوؤں کی پگڑی (پاگ) کا حوالہ بھی دیا ہے۔ دیکھیے آبِ حیات لاہور ایڈیشن (اردو) از محمد حسین آزاد ص ۵۲

[۱] مثال کے لیے دیکھیے واقعاتِ مشتاقی ص ۲۲-۲۳۔ ابتدائی دور میں بھاری پگڑیاں مغل سواروں کا امتیازی نشان ہوتی تھی۔ منتخب التواریخ جلد اول ص ۴۵۹۔

[۲] شاہی مہر کے لیے دیکھیے تحفۂ نصائح ص ۱۲۔ غلاموں کے لباس کے لیے دیکھیے عفیف ص ۲۶۸۔ دیگر طبقات کے لباس کے لیے دیکھیے ماہوان کا بیان جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۵ء ص ۵۳۲۔ بنگال کے سبزی دوا فروش (اور غالباً دہلی کے بھی) رنگین ریشم کے ایک گوبند کو اپنے سینے پر باندھ لیتے تھے اور ایک چغہ پہنتے تھے جس پر کلے دھاگے کا کام ہوتا تھا۔ رنگین پتھروں کی ایک ڈوری اور مونگے کی تسبیح اس کے شانے سے لٹکی رہتی تھی اور گہرے سرخ پتھروں کا ایک حلقہ اپنی کلائی پر باندھتے تھے۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ میراثی یعنی پیشہ ور موسیقار لمبے چوڑے اور ڈھیلے بجامے پہنتے تھے۔ دیکھیے اعجازِ خسروی جلد چہارم ص ۴۸۔

[۳] دیکھیے تحفۂ نصائح ۱۲-۱۳۔

یا فر اور رنگین لباس سے پرہیز کرتا تھا۔ اس کی پگڑی عموماً سات گز لمبی ہوتی تھی اور پگڑی باندھ کر اس کے سر سے پشت پر ڈال لیے جاتے تھے۔ وہ عام قمیص اور شلوار پہنتا تھا۔ مذہبی راسخ العقیدہ مسلمان وضو کی طہارت قائم رکھنے کے لیے جوتے اور موزے پہننے میں بڑی احتیاط ملحوظ رکھتا تھا اور وضو کرتے وقت مناسب قرانی آیات پڑھتا تھا۔ (قدر پارہ xcvii) وہ ایک لوہے کے چھلے کے علاوہ انگلی میں کوئی قیمتی انگوٹھی نہیں پہنتا تھا[1] تارک الدنیا افراد کا لباس مقرر نہ تھا بلکہ انفرادی طور پر ہر شخص اپنا جداگانہ لباس پسند کرتا تھا۔ ان میں بعض ایک اونچی درویش ٹوپی استعمال کرتے تھے جسے قلتوازہ کہتے تھے۔ پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں ہوتی تھیں اور جسم کے گرد ایک بغیر سلا کپڑا لپیٹ لیتے تھے[2] صوفیا علما کے دوسرے طبقے کی طرح ادنی کپڑے کا بنا ہوا ڈھیلا لباس پہنا پسند کرتے تھے[3]

حالاں کہ بنگال اور گجرات ملک کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ مختلف نہ تھے پھر بھی بعض نمایاں خصوصیات کے حامل تھے۔ مثلاً بنگال کے دولت مند مسلمان سفید کپڑے کی عام چھوٹی سی پگڑی استعمال کرتے تھے۔ گریبان دار ایک لمبا چغہ۔ چمڑے کے نوک دار جوتے، ایک چوڑا رنگین کمر کا پٹکا اور عام قمیص اور شلوار کا استعمال کرتے تھے۔ بعض اوقات دس پہلوؤں کی ٹوپی استعمال کرتے تھے[4] گجرات میں جہاں عربی اثرات نمایاں تھے بھاری عربی پگڑی، ڈھیلے پاجامے، گھٹنوں تک چمڑے کے لمبے جوتے اور انگوٹھیاں عام طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔ ملازم عام طور پر اپنے مالکوں کے ہمراہ کٹار اور دوسرے ہتھیار لے کر چلتے تھے[5]

---

[1] حوالہ جات کے لیے دیکھیے برنی ص ۱۱۲ آئینہ اسکندری ص ۲۔

[2] دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۹۰

[3] دیکھیے Notices etc. ص ۳۱۳

[4] دیکھیے باربوسہ جلد دوم ص ۱۴۷ نیز جلد اوّل ص ۱۲۰

[5] دیکھیے باربوسہ جلد دوم ص ۱۴۷۔ نیز جلد اول ص ۱۲۰

[6] دیکھیے مثلاً راجپوتوں کے لباس کے سلسلے میں ٹوڈ کا بیان جلد دوم ص ۷۵۹۔ نیز ریاست

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے ہمراہ کٹار اور دوسرے ہتھیار لے کر چلتے تھے[۱]

ہندوؤں کے لباس کا ذکر کرتے ہوئے ہم پہلے بتا چکے ہیں اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں میں ہندوؤں کی پگڑی کا رواج رواج ہو رہا تھا۔ اصولی طور پر ہندو دولت مند طبقے میں مسلمان امرا کے لباس کا رواج روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اگر کوئی ہندو اپنے فرقے کا مخصوص نشان یا اعلیٰ ہندوؤں میں استعمال کیے جانے والے مخصوص زیور کو ہٹا دیتا (مثال کے طور پر راجپوتوں میں استعمال کیے جانے والا کان کا بُندا) تو کسی ہندو اور مسلمان امیر میں فرق کرنا مشکل ہوتا تھا[۲] دیگر متعدد سماجی طبقات میں برہمن اپنی پیشانی پر تلک لگاتا۔ سنہری حاشیہ کی ٹوپی استعمال کرتا۔ اپنی ہاتھ میں ایک دوشاخہ (بیساکھی) رکھتا تھا اور پیروں میں قیمتی دھات کی جڑی ہوئی چپل پہنتا تھا اور اسی حال میں پورے قصبے میں ہر خاص و عام کو برکت کی دعائیں دیتا ہوا گھومتا پھرتا تھا[۳]

تارک الدنیا افراد (سادھو جوگیوں) کا کوئی مقررہ لباس نہ تھا۔ زیادہ دکھاوا کرنے والے ہرن کی کھال استعمال کرتے تھے لیکن اچھے لوگ نام و نمود سے پرہیز کرتے تھے[۴] تارک الدنیا لوگ ایسے بھی تھے جن کا لباس صرف لنگوٹی تک محدود تھا۔

(گذشتہ سے پیوستہ) جیسلمیر میں لباس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے ٹوڈ کا بیان "بھاڑں کا لباس سفید کپڑے یا چھینٹ کے چغے پاجامے پر مشتمل ہوتا ہے جو گھٹنوں تک لمبا ہوتا ہے مگر بند اتنا اوپر بندھا ہوا ہوتا ہے جس سے سینہ بالکل چھپ جاتا ہے۔ پاجامہ بالکل ڈھیلا ہوتا ہے اس میں بہت سی تہیں ہوتی ہیں اور ٹخنوں پر بالکل کسا ہوا ہوتا ہے اور پگڑی جو عام طور پر گلناری رنگ کی ہوتی ہے سر سے اوپر پوری ایک فٹ اٹھی رہتی ہے۔ ایک کٹار کمر کی پیٹی میں لگی رہتی ہے۔ لیک ڈھال جو ہرن کے تسمے میں لگی ہوتی ہے بائیں شانے سے لٹکتی رہتی ہے اور اسی چمڑے کی ایک پیٹی میں تلوار لگی رہتی ہے۔ دیکھیے جلد دوم ص ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ نیز بہار پیزینٹ لائف از گریرسن ص ۱۴۳ - ۱۴۵۔ جس میں قدیم لباسوں اور ایسے لباسوں کے سلسلے میں اصطلاحات دی گئی ہیں جو آج کل بھی رائج ہیں۔

۲؎ پدماوت ص ۱۷۶

۳؎ دیکھیے سرکار ص ۱۱۴

۴؎ ایضاً ص ۵۴ لباس کی انتہائی کمزوری کا ذکر ملّا نے انتہائی حقارت سے کیا ہے "وہ ننگی رہ کر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور دیگر ضروریات زندگی کے لیے ان کے لیے ایک تونبی کافی ہوتی تھی[1] دیگر چند ایسے بھی تھے جو اپنے مذہبی اصولوں کی پابندی کرنے کے لیے عموماً اپنے سر منڈوا لیتے تھے۔ کانوں میں بھاری کنڈل پہنتے تھے اور ساتھ ساتھ ہرن کا سینگ رکھتے تھے اور جسم پر راکھ مل لیتے تھے۔ چند ایسے بھی تھے جو اپنے سامان میں مندرجہ ذیل اشیا کا اضافہ کر لیتے تھے جیسے گیروا لباس، ایک چکر، ایک ترسول، ایک مالا، گول لیے بیجوں کی مالا، لکڑی کی کھڑاؤں، ایک چھاتہ، ایک ہرن کی کھال اور مانگنے کھانے کا ایک پیالہ[2] البتہ گرو نانک کے متبعین ان خصوصیات کو ناپسند کرتے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح سادہ لباس پہنتے تھے۔

ہندو عوام سے متعلق دیگر تفصیلات یہ تھیں کہ وہ عموماً ننگے پیر اور ننگے سر رہتے تھے۔ دھوتی یا لمبے کپڑے کا ایک چادر جسے وہ کمر کے نیچے باندھتے تھے ان کے لیے کافی اور باعزت لباس تھا[3] گجرات میں کچھ لوگ سرخ رومال سر پر باندھتے تھے[4] کچھ گجراتی بنیے ریشمی یا سوتی قمیص قمیص۔ نوک دار جوتے اور ریشمی یا زربفت کے چھوٹے کوٹ پہنتے تھے۔ گجرات کے برہمن صرف دھوتی ہی پہنتے تھے اور بالائی جسم ننگا رکھتے تھے۔ صرف جنیؤ ہی ننگے جسم پر ہوتا تھا[5]

خواتین کے لباس کے سلسلے میں بہت کم تفصیلات ملتی ہیں۔ عموماً یہ لباس دو طرح کا ہوتا تھا۔ پہلا لمبی چادر یا ململ کے عمدہ کپڑے کے ٹکڑے (جو موجودہ ساڑی

(گزشتہ سے پیوستہ) ہوا میں بسر کرنا چاہتی تھی۔" نیز ننگے سادھوؤں کے سلسلے میں دیکھیے دوسرا حوالہ پدماوت ص ۲۳۸

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے سرکار ص ۱۱۱، پدماوت ص ۲۷۳، جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز ۱۹۲۷ء ص ۳۵، شاہ ص ۱۶۴۔ میکالف جلد اول ص ۳۰ - ۳۱ - ۹۴ - ۱۰۲ - ۱۶۲۔

[2] دیکھیے وارتھیما ص ۱۰۹

[3] دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۱۳ - ۱۱۶

[4] دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۱۳ - ۱۱۴۔ پدماوتی بنگیا از ودیاپتی۔

[5] دیکھیے نزہیٹن ص ۱۳۶۔

سے زیادہ نہ ہو۔ نہ ہوتا تھا) اور ایک چھوٹی آستینوں کے چولے پر مشتمل ہوتا تھا جو کمر کے پیچھے آتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک گہرے رنگ کی انگیا بھی ہوتی تھی جسے جوان لڑکیاں یا شادی شدہ عورتیں پہنتی تھیں۔ اس لباس میں ایک آسانی یہ تھی کہ بازو بالکل آزاد رہتے تھے اور سر کا کچھ حصّہ ساڑی کے پلّو سے ڈھکا رہتا تھا[1]۔ دوسری قسم کا لباس جو دوآبے میں زیادہ مقبول تھا یہ لہنگے یا لمبے اور بہت ڈھیلے لباس، ایک چولا یا انگیا اور ایک دوپٹہ یا لمبے انگوچھے پر مشتمل ہوتا تھا جسے کبھی کبھی سر ڈھکنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا[2]۔ گجراتی خواتین سنہری زری کے جوتے پہنتی تھیں[3]۔ دیگر صوبوں کے سلسلے میں کوئی معلومات ہم تک نہیں پہنچیں لیکن اندازہ یہی ہے کہ مردوں کے مقابلے میں خواتین زیادہ تر زیادہ استعمال کرتی تھیں۔ اعلیٰ طبقے کی مسلمان خواتین عموماً ڈھیلی شلوار ایک قمیص، ایک دوپٹہ اور حسب معمول چادر استعمال کرتی تھیں۔ خواتین کے لباس کی وضع قطع کم و بیش اب بھی ہندوستان میں ویسی ہی ہے اس میں یہ اضافہ البتہ کیا جا سکتا ہے کہ ماتم کے دنوں میں نیلا رنگ استعمال ہوتا تھا اور علاوہ چند مخصوص مواقع کے عورتیں روزانہ استعمال کے لیے اس رنگ کا کپڑا پہننے سے گریز کرتی تھیں[4]۔ عورتیں عموماً بھڑکیلے رنگوں، چھینٹوں اور تصویر والے کپڑوں کو پسند کرتی تھیں[5]۔

---

[1] پدماوت کے بیان کے لیے دیکھیے پدماوت ص ۲۱۴۔ آئین اکبری جلد دوم ص ۱۸۳۔ سداما چرتر ص ۱۰

[2] دیکھیے فریپٹن ص ۱۲۶

[3] دیکھیے اکبرنامہ جلد اوّل ص ۱۵۵۔ آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۷۱، ۱۷۲۔

[4] دیکھیے امیر خسرو کے اندازے کے لیے اعجازِ خسروی جلد چہارم ص ۲۷۴۔ نقش و نگار سے آراستہ کپڑے کا حوالہ کپڑے کی صنعت کے سلسلے میں پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔

[5] گزشتہ صدی میں جنوبی ہند میں نانک پنتھیوں کے لباس کے سلسلے میں دیکھیے ہر کلوٹز اسلام ازکروک ص ۱۷۹۔ یہ لوگ اپنی گردنوں کے گرد رنگین ڈوریاں (سیلی) پہنتے تھے۔ اپنی پیشانیوں کے وسط میں کاجل کا نشان لگاتے تھے اور اپنے چہروں پر صندل کی لکڑی گھس کر لگاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قرآن تعویذ کی طرح رکھتے تھے اور سیپ کے ہار گلے میں پہنتے تھے۔ نیز دیکھیے لباسوں کی مختلف اقسام جنھیں گرو نانک پہنتے تھے۔ میکالف جلد اوّل ص ۵۸۔ ۱۳۵۔ ۱۷۴۔ ۱۶۳

اس خیال سے کہ ہندوستانی لباس کی رنگا رنگی اس دور میں بھی کچھ لوگوں کے ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے جو اس خیال کو بہت زیادہ پسند کریں گے کہ سب ہندوستانیوں کے لیے یکساں لباس اختیار کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گرو نانک نے اس مسئلے پر کافی وقت اور توجہ صرف کی۔ سکھ روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندو اور مسلم لباسوں کو یکجا کر کے بارہا استعمال کیا تھا۔ وہ بہر حال ہر ایک کی نمایاں خصوصیات کو ہم آہنگ نہ کر سکے [1] جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ امرا یکساں لباس کو استعمال کرنے میں کامیاب ہو گئے اور غریب عوام سب کے سب تقریباً ننگے ہی رہتے تھے۔

ایسی شہادتیں کم ملتی ہیں جن میں علما نے اپنی مخصوص تمکنت کی اس قدر جدوجہد کی ہو جس قدر اپنے مخصوص لباس کو برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے کی۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں تالیف شدہ قانونی خلاصہ میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ مسلم علما کا لباس ہندوؤں کو نہ پہننے دے [1]۔ ہماری نظر سے ایسی کوئی تحریر نہیں گزری جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ ہندوؤں نے فقہ فیروز شاہی کے ان اندراجات کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا ہو۔ یہ امر قطعی مشتبہ ہے کہ آیا اس قسم کی کوئی تبدیلی پسندیدہ تھی۔ حالانکہ ہندوستان میں لباس کے سلسلے میں کافی تبدیلیاں آ چکی ہیں لیکن قدیم مردانہ اور

---

[1] اس مسئلہ پر بحث کے لیے دیکھیے فقہ فیروز شاہی ص ۴۱۸-ب جس سے اس کی خالص مذہبی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔

[2] زمانہ حال میں مسلمان خواتین کی شلوار کو پنجاب میں ہندو عورتیں استعمال کرنے لگی ہیں دیکھیے امپیریل گزیٹر انڈیا جلد × × ص ۲۹۳۔ دیگر لباس کم و بیش وہی ہیں جو ابتدائی دور میں تھے مثلاً راجپوتانے میں اعلیٰ طبقے کی خواتین ڈھیلا لہنگا استعمال کرتی تھیں (دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۷۵۹ - ۵۹ - ۱۲۵۳ - ۱۲۵۴) بنگال اور بمبئی میں ساڑی تقریباً سبھی طبقوں میں استعمال ہوتی ہے (امپیریل گزیٹر آف انڈیا) جلد xxiv ص ۱۷۴ و xx ص ۲۹۳) مردانہ لباسوں میں دھوتی اور پگڑی (دونوں لمبی اور چھوٹی) سبھی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ نیز دیکھیے بہار پیزینٹ لائف از گریرسن ص ۱۴۷ - ۱۴۹۔ ان لباسوں کے نام بھی دیے گئے ہیں جو ابھی تک مستعمل ہیں۔

زنانہ لباس آج کل بھی بڑی حد تک ویسے ہی پہنے جاتے ہیں۔[۱]

خوشبو، سنگار اور زیورات

دولت مند طبقے کے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے جسمانی حسن میں اضافہ کرنے کے لیے کافی آسانیاں فراہم تھیں۔ تقلید پسند مسلمانوں اور صوفیا دونوں کے اثرات نے جسمانی حسن کی طرف توجہ دینے میں کافی ہمت افزائی کی۔ کسی عالم کی داڑھی اور اس کے لمبے لہراتے ہوئے بالوں کے گچھے دولت مند اور امرا کے نسوانی چہروں سے زیادہ پرکشش ہوتے تھے۔ بہرحال رسولِ خدا نے اس قسم کے چہروں کو ایک بار ناپسند کیا تھا۔[۲] بالوں کا سنوارنا اور خوشبوؤں اور عمدہ لباس کا استعمال شرافت اور اچھے خاندان کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔[۳] جوانی گزرنے کے کافی عرصے بعد بھی جوان دکھائی دینے کا عام شوق تھا۔ اس کے لیے معزز افراد ہر قسم کی ترکیبیں استعمال کرتے تھے۔[۴]

---

[۱] مثلاً دیکھیے گپتا ص ۹۱۔ مسلمانوں کی طویل داڑھیاں بعض حالات میں ان کے سینوں سے نیچے تک بڑھ جاتی تھیں۔ دہلی کے مشہور صوفی شیخ نظام الدین اولیا نے اپنے مریدوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ بالوں کو صاف کرنے کے لیے کنگھے اور دانتوں کے لیے مسواک استعمال کیا کریں۔ برنی ص ۲۴۸

[۲] دیکھیے برنی ص ۱۲۷۔ مورخ برنی عام لوگوں یا بالفاظ دیگر بے حقیقت لوگوں سے ناراض ہے کیوں کہ وہ بھی اپنی داڑھیوں میں کنگھا کرتے تھے، خوشبو استعمال کرتے تھے اور خوب صورت لباس زیب تن کرتے تھے۔

[۳] بالوں کو رنگنے کے سلسلے میں امیر خسرو مضحکہ اڑاتے ہیں۔ دیکھیے مطلع الانوار ص ۱۷۳۔ ایضاً ص ۱۸۶۔ پر سرمہ کے استعمال کا مذاق اڑایا ہے۔ درمیانہ عمر کی عورتیں اپنے ڈھلتے حسن کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی سخت جدوجہد کرتی تھیں۔ اپنی ابروؤں پر رنگ لگاتی تھیں، چہرے پر پاؤڈر اور آنکھوں میں سرمہ لگاتی تھیں لیکن اس کے نتائج غالباً زیادہ خاطر خواہ نہ ہوتے تھے چوں کہ امیر خسرو نے طنزاً انھیں مشورہ دیا ہے کہ وہ نیک اعمال کی خوبصورتی پیدا کریں اور جسم کی خوبصورتی کی طرف توجہ نہ دیں۔ (ایضاً ۱۸۶۔۱۹۴)

[۴] غسل کے انتظامات کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد اول ص ۲۳۳ غسل کے لیے تیل کی کمی کے سلسلے میں گندرام کی شکایت کے لیے دیکھیے گپتا ص ۶۳۔ نیز جرنل آف دی دیپارٹمنٹ آف لیٹرز سنہ ۱۹۲۷ء ص ۳۹۔

نہانے کے لیے وسیع پیمانے پر انتظامات کیے جاتے تھے۔ ہندو لوگ عموماً نہانے سے پہلے سر پر تل کا تیل مل کر ریہہ سے دھو لیتے تھے۔ نہانے کے بعد، جو عموماً بہتے پانی میں ہوتا تھا، ہندو اپنے جسم پر خوشبو ملتے تھے اور بالوں میں خوشبودار سفوف قسم کی کوئی چیز چھڑکتے تھے۔ صابن کے بجائے ہڑ استعمال کی جاتی تھی۔ مرد عورت دونوں مشک اور چندن استعمال کرتے تھے البتہ عورتیں کم کم۔ اگارو عود *Lignum aloes* اور کئی قسم کے خوشبودار تیل استعمال کرتی تھیں۔[1] گجرات میں عورتیں میٹھا خوشبودار مرہم ملتی تھیں کبھی کبھی زعفران میں سفید چندن اگارو، کافور، مشک اور زعفران سب کو عمدہ ڈھنگ سے ملا کر اور عرقِ گلاب میں گوندھ کر استعمال کیا جاتا تھا۔[3] عود کی لکڑی *Aqualaria Agalocha* جملہ اجتماعی مواقع پر گھر میں سلگانے کے کام آتی تھیں۔[4] اگر کوئی کسی سے ملنے باہر جاتا تو وہ عموماً اپنے ماتھے پر تلک لگاتا۔ پھول یا کوئی خوشبو بالوں میں لگاتا اور ایک پان کھاتا۔[5]
عورتوں عورتوں کو حسن کے اہتمام کا زیادہ حق تھا۔ وہ اگر سارا نہیں تو اپنے وقت کا زیادہ حصہ جسمانی حسن کے اضافے اور خوب صورت دکھائی دینے میں صرف کرتی تھیں اور ان کی یہ کوشش زیادہ کامیاب ہوتی تھی۔[6] بالوں کو سنوارنے میں کافی توجہ دی جاتی تھی لیکن اتنی نہیں جتنی برما کے باشندے کرتے تھے۔[7] جسمانی حسن کے اضافے میں جو چیزیں استعمال ہوتی تھیں ان میں آنکھوں کے لیے سرمہ، مانگ میں سیندور، سینہ

---

[1] گجراتی کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۴۱، ۱۱۳۔

[2] ایضاً ص ۲۰۵

[3] مثال کے لیے دیکھیے اعجازِ خسروی جلد دوم ص ۲۱۴

[4] دیکھیے باربوسہ جلد اوّل ص ۲۰۵

[5] مثال کے طور پر دیکھیے ہندو عورت کا ذکر۔ اس کی ابروؤں کا گہرا رنگ اس کے شان دار لہراتے ہوئے بال، سیاہ پتلیوں والی بڑی بڑی آنکھیں اور زیتونی رنگ

[6] دیکھیے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم ص ۵۲۹ کہ ملکہ Ava کی مصاحب نے بال بنانے کے کم سے کم پچپن مختلف طریقے بنائے ہیں جن کا Ava Palace میں رواج تھا۔

[7] دیکھیے پدماولی بنگیا CXVII – CXXXII

پر مشک، ہونٹوں کے لیے پان، دانتوں کے لیے مسّی۔ بھوؤں کے لیے کوئی کالا سفوف اور ایک ہندو کنواری لڑکی کے لیے اس کی ذات کا نشان قابلِ ذکر ہیں[۱]۔ حنا کا استعمال بھی بہت جلد پھیلا اور یہ بہت پسند بہت پسند کی جانے لگی[۲]۔ جنوبی ہند کی عورتوں نے اس سلسلے میں ایک قدم اور بڑھایا اور بناوٹی بال استعمال کرنے لگیں شمالی ہند میں مردوں اور عورتوں دونوں کے بال قدرتی طور پر بڑے لمبے تھے[۳]۔

زیورات اور ظاہری وضع قطع

مردوں یا عورت دونوں کے جسمانی حسن کے لیے زیور اہم مد کی حیثیت رکھتے تھے۔ کانوں میں بالے پہننا اچھے خاندان کی نشانی تصور کیا جاتا تھا۔ ایک راجپوت جنگ جو کی نمایاں خصوصیت اس کے اوپر کو مڑے ہوئے گل مچھے اور کانوں کے بالے ہوتے تھے[۴]۔ گجراتی بنیے قیمتی پتھروں سے جڑے ہوئے سونے کے بالے، انگلیوں میں بہت سی انگوٹھیاں اور کپڑوں کے اوپر ایک سنہری پیٹی پہننے کے شوقین تھے[۵]۔

۱۔ سیساں میں حنا کے پودے کی دریافت کے لیے دیکھیے راورٹی ص ۱۲۲۴۔ امیر خسرو اور ملک محمد جائسی نے حنا کے استعمال کے متعدد حوالے دیے ہیں۔

۲۔ جنوبی ہند کے لیے دیکھیے زیمپٹن ص ۱۳۸۔ میجر ص ۲۳۔ بعض عورتیں نقشین پتیوں سے اپنا سر ڈھکتی تھیں۔ بعض دوسری عورتیں سیاہ رنگ کے مصنوعی بال استعمال کرتی تھیں۔ شمالی ہند کے لیے دیکھیے زیمپٹن ص ۱۳۸۔ عورتیں طویل، چمک دار اور لہردار بال بڑھالیتی تھیں، ان کی چوٹیاں گوندھتی تھیں اور انہیں ناشپاتی کی شکل میں سر کے اوپر باندھتی تھیں۔ اس گانٹھ کے اوپر ایک سنہری بن سنہری زنجیر میں لٹکا رہتا تھا۔ مردوں کو بھی بال بڑھانے کا کافی شوق تھا۔ دیکھیے جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز، ۱۹۳۷ء ص ۴۱ ۴۶۔ گجراتی بنیے بال بڑھاتے تھے اور اس میں چوٹیاں اور گانٹھیں باندھ کر پگڑی کے نیچے کر لیتے تھے۔ دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۱۳

۳۔ دیکھیے پدماوت ص ۶۱۹

۴۔ دیکھیے باربوسہ کا بیان جلد اول ص ۱۱۳

۵۔ دیکھیے آبزرور لندن ۳ جنوری ۱۹۲۲ء جس میں سر جوزف کجن کی رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مردوں کے دیگر زیورات ، اگر ہم انھیں زیور کہہ سکیں، خوب صورت تلواریں، کٹاریں اور دیگر ہتھیار تھے۔ ہندوستان میں آج کل کی طرح صنف نازک کی عام کمزوری سر سے پیر تک زیور پہننا تھی[۱] اضافہ حسن کے لیے جو زیورات استعمال کیے جاتے تھے ان میں عورتیں زیادہ اور وزنی زیورات کو پسند کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پسند اچھی قسم پر کم توجہ دیتی تھی۔ ان معاملات میں عورتوں نے قدرتی حسن کے حامیوں کی رائے کو بہت کم اہمیت دی جو زیورات کے استعمال کو کلی یا جزوی طور پر ختم کرنا چاہتے تھے[۲] ہندوستان کی ہر عورت پورے جسم پر زیور پہننا سہاگ کی نشانی تصور کرتی تھی۔ صرف بیوگی کی حالت میں وہ اپنے زیورات وغیرہ کا استعمال اور مانگ کا سیندور ختم کردیتی تھیں[۳] درحقیقت یہ اپنے جملہ عیش وآرام، خوشیوں حتیٰ کہ اپنی زندگی سے بھی دست بردار ہو جاتی تھیں۔

سر، بازوؤں، ناک، کان، انگلیوں، گردن، گلے، ران اور پیروں میں پہنے جانے والے مختلف زیورات کا شمار کرنا مشکل ہے[۴] ابوالفضل کے خیال کے مطابق

(گزشتہ سے پیوستہ) کی رپورٹ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ ہندوستان میں ایک صدی سے بھی کم مدت میں ۶۰ کروڑ پونڈ کی لاگت کا سونا استعمال ہوا۔ یہ سونا خصوصاً جڑاؤ اور دیگر زیورات کی شکل میں استعمال ہوا۔ مثلاً کانوں کے آویزے، ناک کے بالے، ہار اور پیروں کے چھلّے اور اس کے جملہ زیورات میں استعمال ہوا جنھیں خواتین جسم پر پہن سکتی ہیں۔

[۱] امیر خسرو کی رائے کے لیے دیکھیے دیول رانی ص ۲۲۳۔ اس کا بیان ہے کہ قدرتی طور پر حسین عورتوں کو زیورات یا مصنوعی زیبائش کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ زیادہ زیورات کو پسند نہیں کرتا صرف گلے اور کان کے چند ہلکے جڑاؤ زیورات کو پسند کرتا ہے۔

[۲] پدماوتی بنگیا

[۳] دیکھیے تیمور کا بیان ملفوظاتِ تیموری ص ۲۸۹۔ دہلی کی تباہی کے وقت اس نے دیگر اشیا کے علاوہ بڑی تعداد میں سنہری زیورات خصوصاً جڑاؤ زیورات جمع کیے۔ مختلف زیورات کی تفصیل دیکھیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۸۳۔ ۱۸۵۔ جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز ۲۷ ۱۹۲۷ ص ۱۴۱۔ ۴۶۔ کتاب الرحلہ جلد اول ص ۲۳۶ ۲۳۷۔ موجودہ دور کے زیورات کے لیے دیکھیے بہار پیزینٹ لائف از گریرسن ص ۱۱۵۔۱۱۶ جس میں تقریباً ملتے جلتے نام اور اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں

[۴] آئینِ اکبری جلد دوم ۱۸۳

ایک شریف عورت کے لیے کم از کم سولہ سنگھار ضروری ہیں ۔ ہم نسوانی حسن کی ان آرائشوں کا ذکر کرکے اپنا یہ بیان ختم کرتے ہیں ۔ غسل ، تیل کی مالش ، بالوں کی سجاوٹ ، ماتھے پر زیور پہنا اور چندن کا ٹیکا لگانا ۔ ایک مناسب لباس ، ذات کا نشان ، آنکھوں میں سرمہ کانوں میں آویزے ۔ ایک موتی یا سونے کی ناک کی بالی ۔ گردن کے لیے کوئی زیور یا ہار ہاتھوں پر مہندی ۔ چھوٹی چھوٹی گھنگھروؤں والی پیٹی پہننے کے لیے ۔ پیروں کا کوئی زیور پان کھانا اور آخر کار اپنے طور طریقوں میں رکھ رکھاؤ[۱] مردوں کی سجاوٹ کی بھی اسی طرح کی ایک فہرست مندرجہ ذیل ہے ۔ ایک خوب صورت داڑھی ، صاف ستھرا جسم ، ماتھے پر تلک ، جسم پر تیل یا خوشبو کی مالش ، سونے کے بالے ، ایک مناسب قبا جو بائیں طرف بندھی ہوتی تھی ۔ پگڑی کے سنہرے سرے یا ایک مکٹ جو سامنے کی طرف ہوتا تھا ۔ نیام میں ایک تلوار جو ہاتھ میں رہتی تھی ۔ ایک برچھی جو کمر میں بندھی ہوتی تھی ۔ انگلی میں انگوٹھی ، مناسب جوتے اور آخر میں پان کھانا[۲]

کھانا

ہم اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے کھانے اور آدابِ دسترخوان کے سلسلے میں چند باتیں عرض کریں گے ۔ مختلف قسم کے کھانوں کی تیاری کی طرف بڑی توجہ دی جاتی تھی[۳] عام لوگ گوشت کھانے کے شوقین تھے لیکن بجاری یعنی تارک الدنیا افراد

---

[۱] ایضاً ۔

[۲] ہم نے دعوتوں اور جشنوں کے تفصیلی ذکر کو چھوڑ دیا ہے یعنی مقبولِ عام اور چیدہ کھانوں کی تفصیل نہیں گنائی ہے ۔ اسے ملک محمد جائسی کی تصنیف ابن بطوطہ کے بیان اور کتاب نعمت خانہ ناصر شاہی (انڈیا آفس قلمی نسخہ) میں دیکھا جا سکتا ہے ۔

[۳] باربوسہ جلد اول ص ۲۱۷ میں دیکھیے اس مخصوص برہمن کا ذکر جو چھ دن کے سفر پر اس امید پر روانہ ہوتا ہے کہ اسے اچھا اور پیٹ بھر کھانا ملے گا ۔ میکالف نے جلد ششم ص ۱۱۱ پر ایک فقیر کا ذکر کیا ہے جو دال ، آٹا ، گھی ، جوتوں ، اچھے کپڑوں ، سات طرح کے اناجوں ، دودھ دینے والی گایوں ، بھینسوں ، ایک اچھی بیوی اور حتیٰ کہ ایک ترکستانی گھوڑی کے لیے خدا سے دعا کرتا ہے ۔

تھے۔ برہمن اور مسلمان علما دونوں زیادہ کھانے کے لیے مشہور تھے۔ ایسے تارک الدنیا جو سادہ زندگی گزارنے پر زور دیتے تھے اور کم سے کم کھاتے تھے، بہت کم تھے[1] حتی کہ کھانے کی عمدہ چیزیں جیسے پوری، گنجا دیوتاؤں کو چڑھاوے میں چڑھائی جاتی تھیں[2] لوگ، خصوصاً اعلیٰ طبقے کے لوگ بیحد مہمان نواز تھے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان بلبن کا وزیر عماد الملک روزانہ دوپہر کو اپنے پورے دفتر کو کھانا کھلاتا تھا اور عمدہ ترین کھانوں کی بیس بڑی بڑی کشتیاں بھر کر بھجواتا تھا[3] مہمان نوازی کی تفصیلات ہم کسی دوسرے باب میں اخلاق وعادات کی بحث کے تحت کریں گے۔ یہاں یہ بتا دینا کافی ہے کہ شاہی باورچی خانہ میں محل کی باشندوں کی بڑی تعداد کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا۔ کھانے کی دو فہرستیں ہوتی تھیں۔ ایک خاص جو سلطان اور اس کے ساتھ کھانا کھانے والوں کے لیے مخصوص تھی دوسری عام فہرست جو ستعدد علما اور اور دیگر مذہبی افراد شاہی خاندان کے لوگوں اور دوسرے امرا کے لیے ہوتی تھیں جس کا ذکر ہم پہلے کسی باب میں شاہی عملہ کے تحت کر چکے ہیں[4]

لوگوں کو نرم غذا کھانے کا شوق تھا اور ہر چیز پیس کر، قیمہ کر کے دم دے کر پکائی جاتی تھی یا تلی جاتی تھی۔ مسالہ اور گھی بڑی مقدار میں استعمال ہوتا تھا جیسے پیٹ خراب کرنے کے لیے مسالے ناکافی ہیں اس لیے اچار اور چٹنی بڑی مقدار میں استعمال

---

[1] دیکھیے ملک محمد جائسی کا بیان پدماوت (ہندی) ص ۴۲۹ جس میں پوریوں کو عمدہ آٹے کے گھی میں تلے سموسوں کی طرح بنایا ہے۔ گنجے بھی گھی میں تلے ہوئے ملے جلے گوشت کے ٹکڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔

[2] دیکھیے برنی ص ۱۱۶

[3] دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۳۸۔ ۳۹۔

[4] بعد طعام کھانے کے لیے پھل مٹھائی وغیرہ کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۸۷۔ نیز گلبدن ص ۱۸۔ تذکرۃ الواقعات ص ۱۳۱۔ اچار اور چٹنیوں کے لیے دیکھیے اعجاز خسروی جلد اوّل ص ۱۸۰۔ اچار کے لیے ہرے آموں کی فراہمی کے لیے چٹنیوں میں ادرک اور مرچ کے استعمال کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۰۔

ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد پھل اور مٹھائی کی مد میں مختلف قسم کے حلوے، میٹھے سموسے، شربت اور خشک پھل کھاتے تھے[1] عموماً پانی تازہ پیا جاتا تھا۔ بعد میں پانی کے لیے پیالے استعمال ہونے لگے۔ برف کا پانی سلطان کے لیے بھی نایاب تھا۔ اکبر اس سلسلے میں کافی خوش قسمت تھا کیوں کہ اس کے باورچی خانے میں گرمی کے موسم میں مستقل برف مہیا کی جاتی تھی[2] کھانا ختم کرنے کے بعد پان اور چھالیہ جو کبھی کبھی خوشبودار بھی ہوتی تھیں استعمال کی جاتیں تھیں[3]۔ دولت مند گھرانوں میں عموماً تین وقت کھانا کھاتے تھے۔ یعنی صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور شام کا کھانا[4] سہ پہر کے کھانے کے سلسلے میں تفصیلات نہیں ملتیں۔ صبح کے ناشتے میں ہندو عام طور پر کھچڑی یا ابلا ہوا چاول اور دال کھاتے تھے۔ مسلمان روٹی اور کباب کھانا پسند کرتے تھے[5] عام مسلمان گیہوں کی روٹی اور مرغ کھاتے تھے[6] ہندو زیادہ تر سبزی خور ہوتے تھے۔

قدیم امرا کی دعوتوں اور تقریبات میں کھانے اور دیگر اشیائے خوردنی

---

[1] فیروز تغلق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ سرمور کے پہاڑی مقام پر گیا تو اُسے برف کے چند بڑے ٹکڑے مل گئے۔ اس موقع پر اس نے بڑی خوشی منائی اور سلطان محمد تغلق مرحوم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے دعا کی۔ اکبر کے لیے دیکھیے ابوالفضل کا بیان آئین اکبری جلد دوم ص ۶۔ خواندمیر کا خیال ہے کہ ہندوستان میں ساغر کی ابتدا کا سہرا ہمایوں کے سر ہے۔ دیکھیے خواندمیر ص ۲۵۶

[2] دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۲۹۔ تاریخ شیر شاہی ص ۶۶

[3] دیکھیے کتاب الرحلہ۔ایضاً

[4] ایضاً جلد اوّل ص ۱۲۔ تاریخ داؤدی ص ۱۱۱

[5] دیکھیے ایک دلچسپ بحث کے لیے نقد فیروز شاہی ص ۱۵۸۔ جس میں یہ قانون بتایا گیا ہے کہ علیحدگی کی حالت میں ایک معزز فرد کی بیوی کو خوراک کے مندرجہ بالا معیار کے مطابق خرچ لینے کا حق تھا۔ یہ خوراک تلی ہوئی روٹی۔ عام گیہوں کی روٹی اور مرغ پر مشتمل تھی۔

[6] دیکھیے کول (علی گڑھ) میں گلبدن بیگم کے اعزاز میں اس دعوت کا ذکر جس میں ایک امیر نے میزبانی کے فرائض انجام دیے تھے۔ صرف گوشت کے لیے اس چھوٹی سی محفل میں تقریباً پچاس بھیڑیں ذبح ہوئی تھیں۔ دیکھیے گلبدن بیگم ص ۱۸۔ شاہی باورچی خانہ کے لیے حوالجات پہلے دیے جا چکے ہیں۔

دونوں بڑے پیمانے پر تیار کرائی جاتی تھیں ۔ اوسطاً ہر مہمان کے سامنے بیس سے پچاس قسم کے کھانے ہوتے تھے[1] ان دعوتوں میں کھانا بری طرح ضائع ہوتا تھا اور زیادہ کھانا تیار کرانا سماجی عزت کا نشان تصور کیا جاتا تھا۔ وسیع دسترخوان مہمان نوازی کی دلیل تھی ۔ ضائع ہونے والے کھانے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی اس لیے کہ متعدد فقرا، گھریلو نوکر اور ادنیٰ درجے کے لوگ بچے ہوئے کھانے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اس دور کی سماجی زندگی کا ایک پہلو جواب تقریباً معدوم ہوچکا ہے متعدد ذاتی تنور خانے تھے جہاں ہر قسم کی پکی ہوئی اور خام اشیائے خورونوش مناسب قیمت پر مل جاتی تھیں[2] بہرحال ہندوؤں میں کھانے اور پکانے کی روایات مختلف تھیں۔

اس سلسلے میں کھانے اور پکانے کے طور طریقوں کا ذکر بھی ہم مختصر الفاظ میں کریں گے ۔ مسلمان کھانے کے سلسلے میں مذہب کی عائد کردہ حدود کا خیال رکھتے تھے مثلاً مسلمانوں میں سوٗر کا گوشت یا چند دیگر جانوروں کا گوشت کھانا ممنوع ہے یا غیر شرعی طریقے سے ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت کھانا بھی ممنوع ہے۔ ان پابندیوں کے علاوہ انھیں ہر قسم کا کھانا کھانے اور ہر جگہ کھانے کی اجازت تھی ۔ غیر مذاہب کے افراد کے ہاتھ کا کھانا بہت ہی کم افراد کے لیے قابلِ اعتراض تھا۔ غالباً ادنیٰ ترین افراد کے ہاتھ کا کھانا وہ بھی نامناسب خیال کرتے تھے ۔ اس کے برخلاف ہندوؤں کے کھانا پکانے اور کھانے (چوکا) کے معاملات بہت پیچیدہ تھے ۔ عام طور پر وہ لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ خیال کی پاکیزگی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب

---

[1] دیکھیے برنی کا بیان برنی ص ۳۱۸ - ۳۱۹ - نیز تاریخ داؤدی ص ۳۳۔

[2] چند مثالیں خصوصاً افغانوں میں مذہبی سرگرمی والے افراد کی جو ہم تک پہنچی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے خالص ہندوؤں کے طور طریقے اور ان کے تعصبات اپنا لیے تھے ۔ اس طرح سندھ کے سماروں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے علاوہ کسی کے ساتھ خورونوش کا تعلق نہیں رکھتے تھے ۔

[3] دیکھیے میکالف جلد اول ص ۳۴۴ جلد ششم ص ۹۸

تک انھیں کھاتے ہوئے کوئی دوسرا آدمی نہ دیکھے[1]

کھانے کی تیاری کے لیے باورچی خانے کا پورا فرش اور دیواروں کا کچھ حصہ مٹی اور گائے کے گوبر سے لیپ دیا جاتا تھا۔ یا اگر کھانا کھلی جگہ پر پکانا ہو تو جتنی جگہ پکانے اور کھانے کے لیے کافی ہوتی تھی اُسے لیپ دیا جاتا تھا۔ ہندو عام طور پر کھانے سے پہلے دھوتی کے علاوہ جسم کے سب کپڑے اتار دیتے تھے۔ برہمن اور خصوصاً اگنی ہوتری اور چند دوسرے لوگ یا تو خود کھانا تیار کرتے تھے یا ان کی بیوی کرتی تھی اور کھانا پکانا ایسی جگہ ہوتا تھا جہاں انھیں کوئی دوسرا نہ دیکھ سکے[2]

راجپوتوں میں دونے کی رسم کو بڑی اہمیت حاصل تھی یعنی سردار جس برتن میں کھانا کھا رہا ہوتا تو وہ برتن اس آدمی کو پیش کیا جاتا جس پر سردار مہربان ہوتا یا جو اس کی نظروں میں زیادہ قابلِ عزت ہوتا۔ میواڑ میں جس آدمی پر سردار اس طرح کی نوازش کرتا اُسے قابلِ احترام سمجھا جاتا اور یہ عزت افزائی عام طور پر اس کے شاہی خاندان سے تعلق کا ثبوت سمجھی جاتی۔

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے میکالف جلد اول ص ۱۳۲۔ نیز خورونوش کے ہندو آداب کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۷۲-۱۷۳۔ اس سلسلے میں یہ یاد دہانی کرانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ڈیلی ٹیلیگراف لندن کے معاصر نے ایک مشہور کانگریسی برہمن رہنما کے بمبئی سے روانگی پر اپنے اخبار کو مندرجہ ذیل اطلاع روانہ کی تھی۔ جب وہ برہمن لندن میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہا تھا (دیکھیے ڈیلی ٹیلیگراف ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء)

"راہ میں استعمال کے لیے ۱۲۰ کوارٹ صاف شدہ دودھ کے علاوہ وہ اپنے ساتھ نہانے اور پینے کے لیے مقدس گنگا سے بیس گیلن پانی اپنے ساتھ لایا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ عجیب وغریب سامان جو وہ اپنے ساتھ لا رہا ہے تقریباً نصف ٹن گنگا کی مٹی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چوں کہ پنڈت کا تعلق ملک کے اعلیٰ ترین مذہبی طبقے سے ہے اس لیے وہ اس مٹی سے چھوٹے چھوٹے دیوتا بنا کر ان کی پوجا کرتا ہے۔" لیکن اس کے بیٹے نے اس خبر کے آخری حصے کی تردید کردی تھی۔

[2] دیکھیے ٹوڈ کا بیان جلد اول ص ۲۷۰

تفریح و تفنّن

مجموعی طور پر زیر مطالعہ دور اپنی تفریحات اور مسرتوں کے لیے اہم ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کو عیش و آرام کی غیر معمولی خواہش تھی سوائے اس وقفہ کے جب کوئی فوج حملہ آور ہوتی۔ لیکن یہ وقفہ زیادہ طویل نہیں ہوتا تھا اور نہ ایسے واقعات کچھ زیادہ ناخوشگوار ہوتے۔ لوگ تلواریں اسی طرح رکھتے تھے جیسے آج کل ہاتھ میں چھڑی رکھتے ہیں اور موقع پڑنے پر تلوار کے فن کارانہ جوہر دکھاتے تھے۔ اس دور کے انسان کی زندگی میں فوجی مشق کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فوجی زندگی کو اسی قدر اہمیت حاصل تھی جس قدر کسی مذہبی فرض کی ادائیگی یا نماز کو[1] ہر جنگجو اس بات پر فخر کرتا تھا اور یہ تصور اپنے ذہن میں

---

[1] مثال کے طور پر دیکھیے ہدایتُ الرامی ص ۵ جہاں مصنف نے اصرار کیا ہے کہ کمان صرف اس وقت استعمال کرنی چاہیے جب جسم شرعی نقطۂ نظر سے پاک اور آدمی باوضو ہو۔ اسی طرح آداب الحرب میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ تصور کرنا غلط ہے کہ خدا کے عطیات روح، شعور اور ذہانت تک ہی محدود ہیں بلکہ لکڑی اور لوہے کے ہتھیار بھی اسی کا عطیہ ہیں (دیکھیے آداب الحرب ص ۵۵)۔ دوسرے سلسلے میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ ہر انسان کو بے خوفی، فخر، مقصد کی لگن، تیزی، حملہ کے وقت جارحانہ کارروائی محنت، استقلال، صبر، وفاداری اور ہوشیاری مختلف جنگلی اور گھریلو جانوروں سے سیکھنی چاہیے۔ ایک معیاری سپاہی میں یہ خوبیاں پیدا کرنے کی غرض سے متعدد تفریحات اور کھیلوں کی متعدد شکلیں وجود میں آئیں۔ مصنف نے اس بات پر نمایاں زور دیا ہے کہ ہر شریف آدمی کو تیغ زنی، پہلوانی، لیزو، پٹا اور کمان سنبھالنا حتیٰ کہ ہندو چکر چلانے کا بھی علم ہونا چاہیے (ایضاً ص ۱۵۳، ۱۵۴) نیز دیکھیے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رکھتا تھا کہ میدانِ جنگ میں وہ دشمن سے لڑتا ہوا زندہ گرفتار نہ ہو۔ یا تو وہ متعدد زخم کھا کر کامیابی کے ساتھ لوٹتا ورنہ پوری دلیری سے میدانِ جنگ میں موت کو گلے لگا لیتا تھا۔[1] بندوق اور بارود کی ایجاد کے بعد ان حالات میں یکسر تبدیلی آگئی کیوں کہ موخرالذکر کی ایجاد نے قدیم دور کے بے ڈھنگے ہتھیاروں کو تقریباً غیر موثر بنا دیا۔

ہم نے ان حقائق کی وضاحت یہ بتانے کے لیے کی ہے کہ اس دور کی تفریحات پر بھی عسکری اثرات بڑے گہرے تھے۔ جملہ مورخین نے سماجی زندگی کے دو پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے یعنی رزم یا عسکری زندگی اور بزم یعنی سماجی عیش و عشرت۔ ایک اوسط درجے کا شریف انسان ایک سرگرم سپاہی بھی ہوتا تھا اور اسے اس سپاہیانہ زندگی میں زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ جنگ کے اختتام پر وہ جسمانی قوت کی کمی کو بحال کرنے کے لیے مختلف جسمانی تفریحوں اور کھیلوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔ عام لوگ جو دیگر غیر عسکری پیشوں میں مصروف تھے تہواروں اور مذہبی مقامات پر زیارت سے اپنا دل بہلاتے تھے۔

عسکری اور جسمانی کھیل کود

عسکری کھیلوں میں پولو، شمشیرزنی، کشتی، گھڑ دوڑ، کتوں کی دوڑ، تیراندازی اور دیگر متعدد کھیل پورے ملک میں مقبول تھے۔ دکن اور راجپوتوں میں اگر کوئی ان کی عظمت کو مجروح کرتا تو وہ اس سے دو دو ہاتھ کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے۔ بہرحال سلطنت کی حدود میں کچھ ایسا انتظام تھا جس میں ذاتی دشمنی کی بنا پر انتقام کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور یہ طریقہ تلافی کے لیے قابلِ احترام اور جائز تصور نہیں کیا جاتا تھا۔[2] ڈویل

(گذشتہ سے پیوستہ) اکبر کو ہر قسم کی تفریحات کا شوق تھا مثلاً اونٹ کی سواری، گھڑ دوڑ، شکاری کتوں کی دوڑ پولو، کبوتر بازی اور دیکھیے ابوالفضل کی رائے۔ اکبرنامہ جلد دوم ص ۳۱۷ - ۳۱۸

[1] دیکھیے اس دور کے ایک جنگ جو کے خصوصی جذبات پدماوت (ہندی) ص ۲۸۹

[2] وسط انگلینڈ کی تفریحات کی متوازی مثالوں کے لیے دیکھیے لوڈ، جلد اول ص ۴۱۳۔ دکن میں ڈویل لڑنے کے انتظامات کے بیان کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۹۰ - ۱۹۱ مجرم کو باقاعدہ مقابلے کی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لڑنے والے دونوں جنگ جو جسمانی شہ زوری کے ذریعہ اپنی قوت کی بالادستی کا فیصلہ کرتے تھے۔ کشتی یا دنگل تفریح کا پسندیدہ شغل تھی۔ دراصل ہر خاص و عام اس فن کو کسی نہ کسی حد تک ضرور سمجھتا تھا۔ نہ صرف سلاطین بلکہ مذہبی علما بھی فنِ کشتی کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ پہلوانوں کو ملازم رکھتے تھے اور کشتی دیکھنے کے شوقین تھے اور بعض اوقات دنگلوں میں خود بھی حصہ لیتے تھے[۱]

تیر اندازی ملک بھر میں مقبول تھی۔ ہم کسی دوسرے سلسلے میں کاغذ کے تیر اور کمان تیار کرنے کی صنعت کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وقتاً فوقتاً تیر اندازی کے بڑے دل چسپ مقابلے ہوتے تھے اور تیر اندازی کے مرد میدان پورے ملک میں مشہور ہو جاتے تھے[۲] شمشیر زنی، چکر پھینکنا اور نیزہ اندازی بھی اسی طرح مقبول تھے۔

(گزشتہ سے پیوستہ) دعوت دی جاتی تھی اور اس کے منظور ہونے کے بعد ڈویل لڑنے کے لیے شاہی اجازت حاصل کرنے کی درخواست دی جاتی تھی جو عام طور پر مل جاتی تھی۔ باہمی انتظام کے ذریعہ دن اور وقت مقرر کر لیا جاتا تھا۔ دونوں کے حامی بھی چن لیے جاتے تھے جو ڈویل کے لیے ہتھیار منتخب کرتے تھے۔ یہ ہتھیار دونوں کے لیے یکساں لمبائی کے ہوتے تھے۔ ڈویل کو دیکھنے کے لیے خود حکمران اور اس کے درباری بھی آتے تھے۔ سفیر نے مزید بیان کیا ہے کہ جنوبی ہند میں ایسے ڈویل تقریباً روزانہ ہوتے تھے۔

۱ فنِ کشتی کی ہدایات کے لیے دیکھیے واقعاتِ مشتاقی ص ۳۵ ب۔ شہزادہ اکبر اور اس کے چچیرے بھائی یعنی مرزا کامران کے بیٹے کے دل چسپ واقعہ کے لیے دیکھیے اکبرنامہ جلد اول ص ۲۴۸۔ ان کا جھگڑا ایک طبل کی ملکیت پر تھا اور اس کا فیصلہ ان کی کشتی سے ہوا جس میں اکبر نے اپنے چچیرے بھائی کو شکست دی۔ کامران کشتی کے دوران موجود رہا۔ اسی اکبر کی ختنہ کے موقع پر ہمایوں نے تفریحات اور دعوتوں کا انتظام کیا تھا۔ مزید براں اس نے اپنے امرا سے کہا کہ وہ کشتی کے لیے اپنے حریف منتخب کر لیں اور خود بھی امام قلی نامی فرد کے ساتھ کشتی کی۔ دیکھیے بابر نامہ ص ۳۲۹۔ بابر کا ایک پسندیدہ پہلوان تھا جس کا نام صادق تھا۔ اس نے دوسرے مشہور پہلوان کو کشتی میں پچھاڑا۔ اس پر بابر نے خوش ہو کر اسے دس ہزار تنکے، ایک عمدہ گھوڑا اور تیس ہزار تنکے کی قیمت کے دوسرے انعامات سے نوازا۔ سکھوں کی روایات کے لیے دیکھیے میکالف جلد دوم ص ۱۵۔

۲ دیکھیے عید کے موقع پر ہمایوں کی نمائش۔ عید کے میدان میں آنے کے بعد سپاہیوں کا ایک دستہ نشانہ بازی کا مظاہرہ کر کے بادشاہ کو خوش آمدید کہتا تھا۔ کچھ بلندی پر وہ لوگ خربوزوں کی شکل کے بنے ہوئے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

فن تیراکی کی بھی عام طور پر ہمت افزائی کی جاتی تھی اور بابر کے دور کے تیراکی کے مقابلے مشہور ہیں۔ دیگر اہم کھیلوں میں ہم کشمیر میں ایک طرح کے ہاکی کے کھیل اور بنگال میں گیند پھینکنے (گیرو) کے کھیل کا بھی ذکر کر سکتے ہیں[1]

پولو اور گھوڑ دوڑ وغیرہ

میدانی کھیلوں میں سب سے زیادہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا پولو اور تفریحات میں گھوڑ دوڑ تھی۔ پولو کی ابتدا کے بارے میں اب بھی کوئی خاص رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ اس کھیل کے محققین کا خیال ہے کہ یہ ایران میں ساسانی خاندان کی حکومت کے بانی کے زمانے میں کھیلا جاتا تھا[2] ہندوستان میں اس کی ابتدا مسلمانوں نے کی اور یہاں یہ جلد ہی ہر طبقہ میں مقبول ہوگیا۔ دہلی کے اولین سلطان قطب الدین ایبک نے پولو کھیلتے ہوئے لاہور میں ایک حادثے کے دوران وفات پائی[3] ترک اس کھیل کے اس حد تک شوقین تھے کہ

(گذشتہ سے پیوستہ) سونے اور چاندی کے نشانے لٹکا دیتے تھے۔ اس کے بعد وہ عسکری طرز سے آگے بڑھ کر اپنے تیر چلاتے تھے۔ ان کا نشانہ اتنا عمدہ ہوتا تھا کہ یہ خربوزے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتے تھے ہمایوں اس مظاہرے میں حصہ لینے والوں کو گھوڑوں اور خلعتوں کی شکل میں بھاری انعام سے نوازتا تھا۔ خواندمیر ص ۱۴۹ نیز دیکھیے تاریخ داؤدی کا بیان ص ۹-۱۰۔ سکندر شیروانی ایک مشہور نشانہ باز تھا وہ غیر معمولی مضبوط جسم کا ایک جوان آدمی تھا۔ وہ اپنی کمان میں ۱۱ مٹھی لمبا (یعنی ۴ فٹ سے زیادہ) تیر لگا سکتا تھا اور اس سے ۸۰۰ قدم (تقریباً ۸۰۰ گز) دور تک نشانہ سکتا تھا۔

[1] جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز کی تفصیلات ۱۹۲۵ء ص ۵۲۔ ہاکی کے لیے دیکھیے ٹمپل۔ سرڈینی سن روس کے پاس مغل شہنشاہ جہانگیر کے زمانے کی ایک تصویر ہے جس میں ہاکی کا کھیل کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس میں پولو کھیلنے کے بلّے استعمال کیے گئے ہیں اور شہنشاہ کھیل دیکھ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پولو کا براہ راست اثر ہاکی کی نشوونما پر پڑا۔

[2] دیکھیے Sykes جلد اول ص ۴۴۶۔ پولو کھیلنے والا پہلا عباسی خلیفہ ہارون الرشید تھا۔ معتصم نے اس میں بعض اضافے کیے۔ مروان بھی اس کا بہت شوقین تھا۔ دیکھیے سری نگر ص ۲۵۔ پولو کھیلنے میں فارس کے منگول سلطان الجائیتو کی ہوشیاری کے لیے دیکھیے تجزیۃ الامصار ص ۴۵۵

[3] دیکھیے تاج المآثر کا بیان ص ۸۴-۸۵۔ راورٹی ص ۵۲۸

شاہی دفاتر کے نشانات میں ایک نشان پولو کھیلنے کی لکڑی اور ایک سنہری گیند کی نمائندگی کرتا تھا۔ جب ایک عرصے کے بعد حکومت افغانوں کے ہاتھ میں آئی تب بھی اس کھیل کی مقبولیت پر کوئی اثر نہ پڑا[۱] اسی طرح پولو کھیلنے میں راجپوت بھی بڑے ماہر تھے[۲]

گھڑ دوڑ بھی اسی قدر مقبول کھیل تھا۔ اس کی مقبولیت کی مزید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پیغمبر اسلام نے بھی گھڑ دوڑ پر شرط لگانے کو اتنی سختی سے ممنوع قرار نہیں دیا تھا جتنی سختی سے دیگر تفریحات اور جوئے بازی کو منع فرمایا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں گھوڑوں کی عادات کے مطالعہ، خوراک، پرورش، ان کی دیکھ بھال اور تربیت سے متعلق علوم پر کتابیں تصنیف کی گئیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں اس فن کو سائنسی طریقوں کے مطابق عروج حاصل ہوا[۳] ان حقائق سے آسانی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سلاطین اور امراء کے گھوڑوں کے فارموں میں اچھی نسل کے گھوڑے وافر تعداد میں موجود ہوتے تھے۔ عربی نسل کے مخصوص گھوڑے گھڑ دوڑ کے لیے یمن، عمان اور فارس سے درآمد کیے جاتے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ ہر جانور کی قیمت ایک ہزار سے چار ہزار تنکہ تک ہوتی تھی[۴]

اس دور میں بھی پولو آج کل کی طرح ہی کھیلا جاتا تھا[۵] دوسرے لوگوں کے علاوہ

۱۔ افغانوں کے لیے دیکھیے منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۱۔ نیز دیکھیے تاریخ داودی ص ۳۔ جب ایک افغان امیر اپنے خلاف مردانگی جذبات کا مظاہرہ موزونیت اور عمدگی کی حدود سے بھی آگے بڑھ کر کرتا ہے۔

۲۔ راجپوتوں کی چابک دستی کے لیے دیکھیے ہد مادت (ہندی) ص ۲۸۵۔ پولو کھیلنے میں گجراتیوں کی ہنرمندی کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۱۹۔ ان کے یہاں پولو اسی قدر مقبول تھا جتنا پرتگال کا Reed game

۳۔ گھوڑوں کی پرورش پر باب کے لیے دیکھیے مثلاً آداب الحرب۔ کتوں کی دوڑ کے لیے شرعی جواز نہ تھا اور اس عمل سے انسان کی سب نیکیاں غارت ہو جاتی تھیں۔

۴۔ کتاب الرحلہ جلد اوّل ص

۵۔ جدید دور کے کھیل کے لیے دیکھیے انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا (۱۹۲۹ء ایڈیشن) جلد ۱۸ ص ۱۷۵۔ "پولو کھیلنے کے لیے دونوں طرف چار چار کھلاڑی ہوتے ہیں اور یہ کھیل ٹھیک انھیں اصولوں کے مطابق کھیلا جاتا ہے جن کے مطابق ہاکی یا ایسوسی ایشن فٹ بال۔ ایک بازی تقریباً ایک گھنٹے میں پوری ہوتی ہے۔ اس وقت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

گھڑ دوڑ کے لیے راجپوتوں اور گجراتیوں کی مہارت قابلِ ذکر تھی[۱] یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صرف ترک اور افغان بلکہ درحقیقت ہندوستان کی جملہ حکمران اقوام گھوڑ سواری کے فن میں اعلیٰ درجے کی مہارت کی حامل تھیں۔

شاہی اصطبل کے ہاتھیوں کو سلطان کے سامنے تسلیم بجالانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ اپنے سوار کے ایک اشارے پر یہ جانور زمین پر ٹکا دیتا تھا اور پھر سونڈ اوپر اٹھا کر چنگھاڑتا تھا۔ انھیں زمین سے چیزیں اٹھانے کی تربیت بھی دی جاتی تھی جسے وہ یا تو اپنے منہ ہی میں رکھتے یا اٹھا کر حسب ہدایت اپنے فیل بان کو دے دیتے۔ زمانۂ امن میں ان قیمتی اشیاء جنگ کی کم ہی ضرورت پڑتی تھی۔ کبھی کبھی ان جانوروں کو سواری یا بارکشی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا[۲]

شکار

شکار کے مقابلے میں دیگر جملہ تفریحات یا جسمانی ورزشیں اس قدر ہیجان اور اشتعال انگیز

(گذشتہ سے پیوستہ) کئی حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ درمیانی وقفوں میں طرف تبدیل کیے جاتے ہیں۔ اس طرح دو کھلاڑی آگے کھیلتے ہیں اور دو پیچھے۔ لیکن کھیل کے دوران جب کھلاڑی گیند ایک دوسرے کی طرف پھینکتے ہیں تو اپنی جگہیں متواتر تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ موجودہ کھیل میں بڑی لچک ہے لیکن ہر جگہ ہمیشہ ایک کھلاڑی ہونا ضروری ہے (یعنی نمبر ۱۔ نمبر ۲۔ نمبر ۳ یا نصف بیک یا نمبر ۴ بیک) دیکھیے کلیات میں امیر خسرو کا بیان ص ۷۷، ۷۷۸۔ جہاں مقابلے پر چار چار کھلاڑیوں کی دو حریف ٹیموں کو کھیل کے وقفوں اور گیند کے ذریعہ رن بناتے کا ذکر کیا ہے جس سے کھیل میں فتح و شکست کا تعین ہوتا تھا۔ اس نے سلطان قطب الدین مبارک شاہ کی ٹیم کا ذکر (مدح سلطان) ذکر کیا جس میں سلطان کو ہلال کے اندر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہ بھی ایک حادثہ ہے کہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں ہندوستان میں پولو کی ابتدا اور اس کے ارتقا کی تفصیلات صحت پر مبنی نہیں ہیں۔

[۱] گھڑ سواری میں راجپوتوں کی مہارت کے لیے دیکھیے پدماوت (ہندی) ص ۲۸۵۔ نیز گجراتیوں کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۱۹۔

[۲] دیکھیے تیمور کا بیان ملفوظات تیموری ص ۲۸۸۔ خسرو کے ایک حوالے کے لیے دیکھیے مرزا ص ۱۴۷۔ ہاتھیوں کے پیروں کی سختی کو کم کرنے کے لیے ان کے پیروں کے نیچے تیل کے کپڑے رکھے جاتے تھے۔

نہ تھیں۔ ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام سے بہت پہلے عورتوں نے شکاری جانوروں اور پرندوں کے مطالعہ اور پرورش سے متعلق بڑی ضخیم کتابیں تصنیف کی تھیں[1] مسلمان ہندوستان میں شکار کی یہ جملہ ترقی یافتہ روایات اور اپنے دور کی مشہور ساسانی شکاریوں کی ترقی یافتہ یادگاریں اپنے ہمراہ لے کر آئے جو اپنے دور کے مانے ہوئے شکاری تھے۔ ایشیا کے دوسرے حصوں میں شکار کے اسی طرح کے پرشوق جذبات اور جملہ ہتھیاروں کا وسیع پیمانے پر استعمال کافی ترقی پذیر ہو چکا تھا[2] خاندان غلام کی حکومت کے بانی قطب الدین ایبک سے اکبر تک تقریباً ہر اہم سلطان شکار کا شوقین تھا اور اپنے شاہی فرائض اور دیگر تفریحات کے بعد جو وقت بچتا تھا، شکار میں صرف کرتا تھا۔ جو سلاطین شکار کے زیادہ شوقین نہ تھے وہ بھی شکار کے جملہ انتظامات وسیع پیمانے پر مہیا رکھتے تھے[3] اسی طرح راجپوت بھی شکار کے

---

[1] دیکھیے J. A. S. B. ۱۹۰۷ء کتاب البیزارا پر جو دسویں صدی میں تصنیف ہوئی طلوشس کی مائے۔ نیز شکاری جانوروں اور پرندوں کے لیے کے لیے دیکھیے اعجاز خسروی جلد دوم ص ۹۰

[2] ایرانی روایات کے لیے دیکھیے ہوارت ص ۱۴۶۔ قبلائی خاں کی شکاری مصروفیات اور مارکو پولو کے ذاتی تاثرات کے لیے دیکھیے یول جلد اول ص ۳۹۷۔ ۴۰۳۔ مثال کے طور پر عظیم خاں کو شکاری جانوروں کے تحفتاً پیش کرنے کے لیے دیکھیے ہیجو ص ۴

[3] دیکھیے سلاطین دہلی کے شکار کے واقعات۔ قطب الدین ایبک کی شکار کی تفصیلات کے لیے دیکھیے تاج المآثر جلد اول ص ۹ نیز دیکھیے کلیات خسرو ص ۴۰، ۱۴۱، ۷، جہاں امیر خسرو نے اپنی مصروفیات بیان کی ہیں " اس نے فضا میں پرندوں اور زمین پر جانوروں کو شکار کیا۔" سلطان بلبن کے لیے برنی ص ۵۴۔۵۵ موسم سرما اس کا پسندیدہ موسم تھا۔ اس زمانے میں وہ علی الصبح ہی ریواڑی کی طرف روانہ ہو جاتا تھا اور دوسرے دن آدھی رات کے وقت واپس آتا تھا۔ اس کے ہمراہ ایسے ایک ہزار گھڑسوار ہوتے تھے جن سے وہ ذاتی طور پر واقف ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ہزار سوار اور ہوتے تھے جن کی خوراک شاہی باورچی خانے سے مہیا کی جاتی تھی۔ دارالخلافہ میں اس کی واپسی کا اعلان طبل بجا کر کیا جاتا تھا۔ علاء الدین خلجی کے شکار کے واقعات کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ نیز منتخب التواریخ جلد اول ص ۱۴۸۔ اس کا شکار کا ایک پسندیدہ طریقہ نرغہ یا شکار کرنے والوں کا حلقہ ہوتا تھا۔ (یہ اتفاق ہے کہ یہ طریقہ مغلوں کے قمرغہ کا مورث اعلیٰ تھا) یہ لوگ طلوع آفتاب کے وقت جمع ہو جاتے تھے۔ سلطان بھی ان سے آملتا تھا۔ سلطان محمد تغلق کے شکار کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اتنے ہی شوقین تھے اور موسم بہار کا مشہور شکار اہیر یا مقدس گوری دیوی کے نام پر کیا جاتا تھا اور اس تاریخی شکار میں جو پھاگن کے مہینے میں ہوتا تھا سور کو شکار کرنے کے لیے ہر طرح کے ذرائع استعمال کیے جاتے تھے۔ اس کی اہمیت اس حد تک تھی کہ شکار شروع کرنے کا وقت نجومی طے کرتے تھے اور شکار میں کامیابی یا ناکامی پورے سال کی خوش قسمتی کی دلیل سمجھی جاتی تھی[۱]۔ مجموعی طور پر مسلمان علما شکار کے سلسلے میں راضی برضا تھے[۲]۔

آئیے، شکار کے سلسلے میں شاہی انتظامات پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ ہر سلطان شکار کا انتظام بڑے وسیع پیمانے پر کرتا تھا جس میں شکار کے لیے تربیت یافتہ جانور بڑی تعداد

(گذشتہ سے پیوستہ) ساز و سامان کے لیے دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد سوم ص ۵۷۹-۵۸۰۔ اس کے پاس دس ہزار باز کے شکاری تھے جو شکار میں گھوڑوں پر سوار رہتے تھے۔ علاوہ ازیں تین ہزار ڈھول بجانے والے، تین ہزار ساز و سامان مہیا کرنے والے اور دیگر لوگ بھی ہوتے تھے۔ دو سو اونٹوں پر تہہ ہو جانے والے دو دو منزلہ چار مکانات اس کے ساتھ چلتے تھے۔ ان کے علاوہ خیمے، چھتر اور مختلف قسم کے چبوترے ہوتے تھے۔ فیروز تغلق کے لیے دیکھیے عفیف ص ۱۷۸-۱۷۹ جس کے شوق عمارتوں کی تعمیر اور شکار تھے۔ ان سے وہ پوری طرح لطف اندوز ہوتا تھا۔ "وہ ایک جانور کو تیر سے شکار کرتا تھا، دوسرے کا پیچھا گھوڑے پر سوار ہو کر کرتا تھا اور تیسرے پر اپنے باز چھوڑ دیتا تھا۔ اس طرح اس نے جانوروں کو بالکل تباہ و برباد کر دیا۔" اسی سلسلے میں برنی کا بیان بھی دیکھیے (برنی ص ۵۹۹-۶۰۰) سکندر لودی کا بیشتر وقت شکار اور پولو کھیلنے میں صرف ہوتا تھا۔ دیکھیے طبقاتِ اکبری جلد اول ص ۳۲۳۔ بابر اپنے رفقا کے ساتھ اس وقت بھی شکار میں معروف رہا جب کہ وہ لاہور کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۷۵۔ اکبر کا پسندیدہ مشغلہ شکار تھا۔

[۱] دیکھیے ٹوڈ جلد دوم ص ۶۶۰۔

[۲] شکار میں کتوں، شکاری کتوں اور بازوں کے استعمال کے شرعی جواز کے سلسلے میں بہت سے پیچیدہ اور نازک مسائل پیدا ہوئے۔ مزید برآں مسلمانوں کے لیے اس قسم کے شکار کے گوشت کے استعمال کے جواز میں بھی اختلاف تھا۔ مجموعی طور پر علماء بازوں اور حتیٰ کہ کتوں کے ذریعہ شکار کیے گئے جانوروں کو جائز قرار دینے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ انھیں شکار کرنے کی تربیت دی گئی ہو اور زیادہ گوشت کاٹ کر ضائع نہ کریں۔ دیکھیے تحفۃ النصائح ص ۲۰

میں ہوتے تھے اور بڑے وسیع علاقے صرف شکار کے لیے مخصوص کردیے جاتے تھے فیروز تغلق کے زمانے میں محکمۂ شکار حکومت کا ایک ستون تصور کیا جاتا تھا[۱] اس کے انتظام کے لیے ایک بلند مرتبہ امیر کو امیر شکار مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر عہدے دار بھی ہوتے تھے۔ ان کا مرتبہ بھی امیر شکار سے کمتر تھا۔ ان افسران کے ماتحت دیگر ادنیٰ افسر ہوتے جو شاہی شاہینوں اور دیگر شکاری جانوروں اور پرندوں کی دیکھ بھال اور پرورش کرتے تھے۔ یہ افسر ترتیب وار عارضان شکار، خاصہ داران اور مہتران کہلاتے تھے۔ ان کے ماتحت بہت سے شکار دار ہوتے تھے جو شکار کے دن جانوروں اور پرندوں کو لے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ محکمہ عملی طور پر پورے ملک کے مشہور پیشہ ور شکاریوں اور پہرہ داروں کی خدمات بھی حاصل کرتا تھا۔ ہر قسم کے شکاری جانور اور پرندے مثلاً ہاتھی، شکاری کتے، تربیت یافتہ چیتے، سیاہ گوش، شاہین اور باز جمع کرلیے جاتے تھے[۲] قدیم ایرانی روایات کے مطابق جنگلی اور گھریلو جانوروں کے لیے دیواریں تعمیر کرکے وسیع احاطے شاہی شکارگاہ کے لیے گھیر لیے جاتے تھے[۳] سرکاری شکار گاہ کے لیے تقریباً بارہ کوہ (تقریباً ۲۴ میل) کا وسیع قطعۂ زمین دہلی کے قریب محفوظ کرلیا گیا تھا[۴] اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عام طور پر شکار سے متعلق قوانین بڑے سخت تھے اور ان قوانین کی معمولی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جاتی تھی[۵]

---

[۱] دیکھیے عفیف ص ۳۱۶ اس حقیقت کی تصدیق کے لیے کہ سلطان محمد تغلق کے محکمۂ شکار کا انتظام ملک کے رتبہ کے دو امرا کرتے تھے۔

[۲] دیکھیے برنی ص ۶۰۰۔ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۸۷۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے عفیف کا بیان عفیف ص ۳۱۷ - ۳۱۹۔

[۳] ایرانی روایات کے لیے دیکھیے ہوارٹ ص ۱۴۷ (شکار) گھرے ہوئے علاقوں میں ہوتا تھا جنھیں اس سے پیشتر جنت کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ان میں شیر، جنگلی سور، ریچھ پائے جاتے تھے۔ تھیوفینس کا بیان ہے کہ رومی شہنشاہ ہرکیوس کو قیصر روم کے چھوڑے ہوئے جنگلات میں شتر مرغ، ہرن، جنگلی گدھے، مور، تیتر اور حتیٰ کہ شیر اور چیتے بھی ملے۔

[۴] دہلی کی محفوظ شکار گاہ کے لیے دیکھیے برنی ص ۵۴۔

[۵] اس سلسلے میں دیکھیے ابوالفضل کا بیان۔ زمانۂ شباب میں اکبر شکار کا اس قدر دلدادہ تھا کہ جب

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہرن، نیل گائے اور جنگلی پرندوں کا شکار بہت مقبول تھا۔ گینڈے اور چیتے پنجاب کے پہاڑی علاقوں میں ملتے تھے[1] اگر کہیں شیر کی موجودگی کا پتہ چلتا تو اسے شکار کرنا صرف سلطان کے خصوصی حقوق میں شامل تھا[2] چند سلاطین مچھلی کے شکار کے بھی شوقین تھے[3] دیگر افراد غالباً عام شکار کے مقابلے میں اسے بہت غیر دلچسپ تصور کرتے تھے۔

شکار کے اس ذکر کو ختم کرنے سے پہلے ہم شاہی شکار کے سلسلے میں چند دیگر باتیں بھی عرض کریں گے۔ حالاں کہ فیروز تغلق کے دور کے واقعات اپنے پیش روحکمرانوں اور وارثین کے زمانوں سے بہت قریبی تعلق نہیں رکھتے لیکن ان واقعات سے ہمیں شاہی شکار کے ساز وسامان کے بارے میں بڑا واضح اندازہ ہو جاتا ہے۔ فیروز تغلق کے واقعہ نویس عفیف کا بیان ہے کہ جب کبھی فیروز تغلق شکار کو جاتا تو اس کے ساتھ ایک بڑا جلوس ہوتا تھا۔ اس جلوس میں ۴۰، ۵۰ تک خصوصی جھنڈے اور دو خاص طور پر تیار کیے ہوئے اور مور کے پروں سے آراستہ نشانات ہوتے تھے۔ نشانات سلطان سے آگے داہنے یا بائیں دونوں طرف چلتے تھے۔ ان کے بالکل پیچھے سلطان کے داہنے اور بائیں چار تربیت یافتہ جنگلی جانور اور شکاری پرندے ہوتے تھے۔ متعدد دیگر جانور مثلاً چیتے، تیندوے، سیاہ گوش، شاہین شکاری کتے اور عقاب، ان کی دیکھ بھال کرنے والے افسران گھوڑوں پر سلطان کے پیچھے چلتے تھے۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ شکار میں بہت سے امراء اپنے خیموں اور شامیانوں کے ساتھ اور متعدد سامان ڈھونے والے افراد اور ملازمین کے ہمراہ سلطان کے ساتھ جاتے تھے۔ بعض مواقع پر سلطان فیروز تغلق کا شکار مسلسل ۱۷۔ ۱۸ دن تک چلتا رہتا تھا[4]

---

[1] مثال کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ، جلد اول ص ۷۷۸۔ نیز تاریخ مبارک شاہی ص ۱۴۱۔ بابر نامہ ص ۴۲۹۔ عفیف ص ۲۴۳۔ کتاب کے متن میں لدگدن کی اصطلاح ہے جو ابوالفضل کی تفصیلات کے مطابق گینڈے کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ (آئین اکبری جلد دوم ص ۵۸)

[2] دیکھیے عفیف ص ۳۲۴

[3] فیروز تغلق کے لیے دیکھیے عفیف کا بیان عفیف ص ۳۲۸۔ شمع کی مدد سے گھاگرا دریا میں بابر کے مچھلی کے شکار کی تفصیلات کے لیے دیکھیے بابر نامہ ص ۶۵۵

[4] دیکھیے عفیف کا بیان۔ عفیف ص ۳۲۷۔ ۳۱۹۔ نیز کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۸۲

(ب) اندرون خانہ تفریحات

جشن یا سماجی اجتماعات

پسندیدہ سماجی یا تفریحی اجتماعات کو جشن کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ جب کبھی جشن کا ذکر ہوتا تو سننے والے کے دل و دماغ پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی اور اس کی نظروں کے سامنے ساز اور موسیقی، نفیس شراب، خشک میوہ جات اور اندرون خانہ کھیل جیسے چوسر اور شطرنج وغیرہ گھوم جاتے تھے۔ جہاں جس کمرے میں جمع ہوتے تھے اُسے عام طور پر قیمتی قالینوں سے آراستہ کیا جاتا تھا اور لوبان اور عود وغیرہ مستقل جلتے رہتے تھے۔ محفل پر بار بار عرقِ گلاب چھڑکا جاتا تھا تاکہ فضا میں تروتازگی قائم رہے۔ سونے اور چاندی کے برتنوں میں پھل وغیرہ بڑے سلیقے سے پیش کیے جاتے تھے لیکن ان محفلوں کی دلچسپ ترین مد شراب تھی جسے حسین ساقی کباب وغیرہ کے ساتھ پیش کرتے تھے اور اس طرح (امیر خسرو کی تمثیلی زبان میں) جامِ شراب کا سرپوش جانماز سے زیادہ مقدس دکھائی دیتا تھا[۱]

جشن کی ابتدا اصل میں غروب آفتاب کے بعد رقص و موسیقی سے ہوتی تھی۔ شراب کا دور چلتا تھا اور جب محفل پورے شباب پر ہوتی تھی تو حاضرین پر تھوڑے

---

[۱] تفریحی اجتماعات اور تفریح کی مدوں کے لیے دیکھیے اعجاز خسروی جلد دوم ص ۲۴۱، ۲۴۲-۲۷۱۔ قران السعدین ص ۱۲۹ - ۱۳۰۔ شاہی اجتماعات کو مجلس جشن اور جشنِ دربار کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں۔

تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد روپوں اور اشرفیوں کی بارش کی جاتی۔ یہ محفل صبح تک چلتی تھی۔ آخر کار لوگ تھک کر سو جاتے تھے[1] شاہی تقریبوں میں انھیں خطوط پر تفریحی پروگرام ہوتے تھے۔ شاہی جشن کے لیے چند خاص دن مقرر تھے۔ کسی حکومت کے سفیر یا کسی معزز مہمان کی آمد پر بھی ایسے ہی جشن منائے جاتے تھے۔ مغل شہنشاہ اکبر نے ان سرکاری تقریبوں میں ایک درجن ایرانی تقویم کی رو سے تقریبوں کا اضافہ کیا[2]

ان شاہی جشنوں سے متعلق متعدد دعوتیں اور دیگر تفریحی پروگرام ہوتے تھے جن میں مندرجہ بالا بیان کردہ غیر دلچسپ تقریبات کا اعادہ کیا گیا ہے مثلاً پری چہرہ رقاص مشک بو شرابیں، سنگِ مرمر کے جام، گل کار قالین اور دیگر قیمتی آرائشی سامان اور ہر چیز کی کثرت۔ کبھی کبھی درباری شعرا اپنی مدحیہ نظموں سے محفل میں جان ڈال دیتے تھے اور بعض اوقات شاہی مصاحبین مزاح اور ظرافت کے ذریعہ ان محفلوں کے حسن اور نشاط کو دوبالا کر دیتے تھے[3]

---

[1] دیکھیے بابر نامہ ص ۲۳۰ ب

[2] سلطان فیروز تغلق کے زمانے میں جشن کے ایام کے لیے دیکھیے عفیف ص ۲۷۸۔ مجالس جشن عیدین نوروز اور خصوصی شاہی مہمانوں کی آمد پر منعقد ہوتے تھے اور سفیروں کی آمد اور دیگر شاہی تقریبات کے مواقع پر بھی جشن منائے جاتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں سرکاری مجالس جشن کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول ص ۲۰۰۔

[3] جشن کی تفصیلات متعدد تاریخی کتب میں دی گئی ہیں۔ حسن نظامی نے قطب الدین ایبک اور التمش کی جشن کی محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ مصنف کو کسی بھی نقطۂ نظر سے مذہب سے بیگانہ نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک موقع پر شراب کو اس نے خوشی کا منبع اور مسرت کا خزانہ کہا ہے اور وقتی طور پر اپنی عالمانہ حیثیت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اس نے بلا جھجک بتایا ہے کہ ہر سنجیدہ شخص کے لیے شراب نوشی جائز اور حلال ہے اور صرف ان افراد کے لیے حرام ہے جن پر شریعت کا بھوت سوار ہے۔ ان مجالسِ جشن کے بعد التمش پولو کھیلنے اور شکار کرنے جایا کرتا تھا۔ دیکھیے تاج المآثر جلد دوم ص ۶۳۔ ۶۵۔ سخت گیر سلطان بلبن کے جشن کے لیے دیکھیے برنی کا بیان سلطان سنجر اور خوارزم شاہ کی طرح بلبن کی مجالسِ جشن بڑے پیمانے پر منعقد ہوتی تھیں کمروں کو آراستہ کرنے کے لیے پھولوں کے قالین اور پردے استعمال ہوتے تھے۔ شراب سونے چاندی کے جاموں میں پیش کی جاتی تھی اور ہر قسم کے پھل، مٹھائیاں، مشروبات اور پان کثرت سے ہوتے تھے۔ مہمان شان دار لباس زیب تن کر کے جشن میں شریک ہوتے تھے۔ درباری شعرا اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے دیکھیے برنی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بعض معاملات میں یہ تفریحی محفلیں شاہی درباروں سے جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں کافی مختلف ہوتی تھیں۔ درباروں میں سلطان کا رعب اور دبدبہ حاضرین کے دلوں پر طاری رہتا تھا لیکن اس کے برخلاف انفرادی محفلوں میں یہ رکھ رکھاؤ رسمی ہوتا تھا۔ اگر محفل میں چند چیدہ افراد ہی ہوتے تو سلطان اس رسمی رکھ رکھاؤ کو بھی بالائے طاق رکھ دیتا۔ درباریوں اور مہمانوں کو اپنے بھاری بھاری لباس اتار کر آرام سے بیٹھنے کی اجازت مل جاتی۔ اعلیٰ سطح پر اہم سرکاری معاملات پر تبادلۂ خیالات اور اسی قسم کے دیگر مواقع پر مکمل آزادی اور بے باکی سے گفتگو ہوتی تھی[1]

(گذشتہ سے پیوستہ) ص ۳۴۲۔ مبارک شاہ خلجی انتہائی زندہ دل حکمران تھا۔ اپنے سب سے بڑے بیٹے کے یوم پیدائش کے موقع پر اس نے ایک جشن منعقد کیا جس کی آرائش کے بارے میں ہم گذشتہ صفحات میں ذکر کر چکے ہیں۔ شہر میں محراب دار چبوترے تعمیر کرائے گئے اور انھیں منقش اور مخملی پردوں سے آراستہ کیا گیا۔ پردوں کی ریشم کی گوٹ لگائی گئی تھی۔ اس محراب کی چھت پر ساز بج رہے تھے۔ اس کے گرد ایرانی اور ہندوستانی موسیقار اور رقاص اپنے فنون کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس موقع پر سلطان نے دربار منعقد کیا اس خوشی میں تحائف تقسیم کیے گئے۔ دیکھیے کلیات خسرو ص ۷۶۸۔ ۷۷۲۔ بہار کی مہم سے ہمایوں کی واپسی کے بعد اس کے اعزاز میں اس کی والدہ نے ایک دعوت کا انتظام کیا۔ سپاہیوں اور دوکان داروں کو اپنی دوکانیں اور مکانات آراستہ کرنے کے احکامات صادر کیے گئے۔ اس کی وجہ سے شہر کے اہم راستے خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے۔ شہنشاہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے دعوت کے کمرے میں ایک خصوصی تخت تیار کرایا گیا اور اس پر منقش کپڑے کے گدّے اور تکیے لگائے گئے۔ اس موقع پر جو شاہی چھتر استعمال ہوا اس پر برطانوی منقش کپڑے کی گوٹ اور پرتگالی مخمل لگائی گئی۔ شاہی چھتر کو چار ملمع شدہ ستونوں پر قائم کیا گیا۔ فرنیچر سے متعلق دیگر اشیا میں شمع دان، سلفچی، ساغر، بوتلے اور گلاب چھڑکنے کے ظروف وغیرہ شامل تھے۔ ان سب پر مینا کاری اور سونے کا کام تھا۔ اس موقع پر خوشی میں سات ہزار خلعت، خچروں اور بار بردار اونٹوں کی ۱۲ قطاریں، سو بار بردار گھوڑے اور سواری کے ۷۰ عمدہ گھوڑے تقسیم کیے گئے۔ دیکھیے گلبدن ص ۲۸۔ ۲۹۔ اکبر کے زمانے میں بھی اسی طرح کے جشن ۱۸ دن تک جاری رہتے تھے۔ ہزاروں عورتیں اور مرد، موسیقار اور رقاص اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ آئین اکبری جلد دوم ص ۳۰۹۔

[1] جلال الدین خلجی کی مجالس کے لیے دیکھیے برنی (قلمی نسخہ) ص ۱۰۷۔ ہمایوں کے ساتھ ترکی میں امیر البحر سیدی علی رئیس کی گفتگو کے لیے دیکھیے ویمبرے ص ۵۵۔ ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس کی گفتگو ہمایوں کے ساتھ۔

سلاطین اس قسم کے جشن یا اجتماعات بڑے پیمانے پر سرکاری تقریبوں کے سلسلے میں منعقد کرتے تھے۔ تاجپوشی کے مواقع پر جشن اور بے دریغ عطیات تقسیم کرنے کے سلسلے میں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ سرکاری تقاریب کے بعد غیر رسمی نوعیت کے بڑے پیمانے پر اجتماعات ہوتے جن میں امرا اور دیگر اعلیٰ عہدے دار مدعو کیے جاتے۔ اسی طرح چند اور مواقع پر بڑے پیمانے پر افسروں اور عوام الناس کو سلطان کی مسرتوں میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔

شاہی جشن کی موجودہ خصوصیات میں جن چند نئے امور کا اضافہ مغل حکمرانوں نے کیا ہم یہاں ان پر ایک نظر ڈالیں گے۔ ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ شہنشاہ ہمایوں نے جمنا میں پکنک منانے کے طریقہ کو رواج دیا اور اس مقصد کے لیے چار بڑی کشتیوں پر ایک لکڑی کی وسیع دومنزلہ عمارت تعمیر کی گئی۔ شہنشاہ چند چیدہ امرا اور بیگمات کے ہمراہ وہاں جاتا اور موسیقی اور رقص سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ بھول بھلیاں، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، اس میں بھی بعض اوقات سماجی تعاریب منعقد ہوتی تھیں۔ اس صورت میں ہشت پہلو تالاب کا پانی نکال کر اس کے فرش پر ایرانی قالین بچھا دیے جاتے۔ سلطان اور دیگر جملہ حاضرین کے لیے ذرا بلندی پر نشستیں تیار کی جاتی تھی۔ موسیقار فرش پر بیٹھتے تھے۔ پوری عمارت کو زربفت اور کارچوبی کام کے کپڑوں سے بڑی خوش اسلوبی سے آراستہ کیا جاتا۔ دو طرف ملحقہ زیریں کمروں میں ضرورت کے مطابق مسہریاں، پان دان، جام، مے نوشی کے دیگر برتن اور شاہی آرام کے لیے دیگر ضروری سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ بالائی منزل پر ہتھیار وغیرہ۔ جانماز، کتابیں اور قلم دان خوش نویسی اور مصوری کے نمونے ہوتے تھے اور یہ کمرہ غالباً شاہی پارٹی کی آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس عمارت میں پھل، مشروبات اور دیگر ضروری اشیاء مہیا کی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی حوض نہانے کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے اور لوگ اس میں اترنے سے پیشتر دافع خنکی ادویات کھا کر پورے دن تفریح کرتے تھے[1]۔

اسی طرح ہمایوں نے ایک اور تفریح کی بنا ڈالی جسے اس کے بیٹے اور جانشین

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے خواندمیر ص ۳۵ - ۱۳۷۔

کے دور میں مینا بازار کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ بازار بہت بڑے اور جداگانہ نہ تھے۔ کشتیوں پر تعمیر شدہ دو منزلہ عمارت میں، جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں صرف چھ دوکانیں تعمیر کی گئی تھیں۔ پورے ماحول کی فضا کو خوش گوار بنانے کے لیے ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی ترتیب دیا گیا تھا اور پھولوں کے گملے رکھ دیے گئے تھے۔ دوکانوں کی دیکھ بھال بلند مرتبہ خواتین کرتی تھیں جن کا انتخاب اشیا فروحت کرنے کے لیے کیا جاتا تھا اور شہنشاہ دام طے کر کے اشیا خریدتا تھا[1] اکبر کے زمانے میں اس سلسلے کو بڑے وسیع پیمانے پر کیا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دو کانوں کی بجائے پورا بازار وجود میں آیا جہاں شہنشاہ اور خواتین باری باری سے خریدنے والے اور فروخت کرنے والے تھے۔ یہ ایک مستقل بازار تھا اس میں ہر قسم کا سامان فروخت ہوتا تھا۔ اس شاہی شغل کی دیکھ بھال کے لیے ایک مستقل خزانچی اور ناظر مقرر ہوتا تھا۔ ان دل چسپ معاملات کے سلسلے میں ہماری معلومات کا واحد ذریعہ صرف ابوالفضل ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ان دوکانوں سے مال خریدنے میں شہنشاہ کی دل چسپی کا کوئی اور مقصد اس کے علاوہ نہ تھا کہ اسے ان حسین دوکانداروں کو وسیلے سے ہر قسم کی معلومات بہم ہوتی رہیں۔ ان مینا بازاروں میں ہر طرح کی آزادی تھی اور ہر آدمی بادشاہ تک آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ مثال کے طور پر جب بادشاہ دوکاندار کی حیثیت سے کام کرتا تھا تو خواتین اور دیگر افراد اس کی دوکان پر چلے جاتے تھے اور شاہی محافظ اور نقیب ایسے مواقع پر کسی کو نہیں روکتے تھے۔ اس طرح کسی شے کی خرید و فروخت کے علاوہ لوگ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی تکالیف اور دکھ درد بادشاہ سے بیان کر دیتے تھے[2]

اندرونِ خانہ کھیل

ہلکی تفریحات کے لیے دونوں طرح یعنی شرط لگا کر اور بلا شرط مختلف قسم کے کھیلوں کا رواج تھا۔ شطرنج، چوپڑ، نرد (چوسر کی طرح کا ایرانی کھیل) اور تاش وغیرہ

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے گلبدن کا بیان ۔ گلبدن ص ۳۱۔

[2] دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول ص ۲۰۰ ۔ ۲۰۱۔

ہر طبقہ میں مقبول تھے۔ ان تفریحات کے مذہبی جواز کے سلسلے میں تقلید پسندانہ حلقوں میں شدید بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ تقلید پسند علما ہر قسم کی جوئے بازی کو ناجائز قرار دینے میں متفق الرائے تھے۔ کچھ ہوشیار علما نے ایک حدیث بھی کہیں سے ڈھونڈ نکالی تھی جس کی رو سے نرد کا کھیلنا گناہ قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح حضرت علی سے منسوب کر کے بھی اسی قسم کی بات کہی گئی جس کی رو سے شطرنج کھیلنا ذہنی بالیدگی کے لیے نقصان دہ تھا۔ اس کے برخلاف کھیلنے والوں کا معاملہ سیدھا سادا اور معمولی فہم و فراست اور ذاتی تجربہ پر مبنی تھا۔ ان کے خیال میں شطرنج اور ایرانی طرز کا چوسر دونوں انتہائی اعلیٰ درجے کی شاہی تفریحات تھیں اور جو قطعاً نقصان دہ نہ تھیں بلکہ ان میں نفاست پسندی تھی۔[۱] یہ لوگ بڑی سرگرمی سے ان کھیلوں کی مقبولیت کی حمایت کرتے تھے[۲] اور یہ مشکل تھا کہ مذہبی احکامات کی قوت ان تفریحات کے سلسلے میں ان کے حقیقت پسندانہ طرز فکر پر اثر انداز ہو۔

(الف) شطرنج: مسلمہ طور پر شطرنج کو تمام کھیلوں کے مقابلے میں امیرانہ کھیل تصور کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ہارون الرشید کا یہ قول نقل کیا جاتا تھا کہ "کسی نہ کسی تفریح کے بغیر زندگی بسر کرنا ناممکن ہے اور ایک حکمران کے لیے میرے نزدیک شطرنج سے بہتر کوئی تفریح نہیں ہے۔"[۳] زمانہ قدیم سے یہ تفریح ہندوستان میں ایک خاص مقام حاصل کر چکی تھی۔ زیر مطالعہ دور میں اس کھیل کو کافی عروج حاصل ہوا اور ایک مشہور ہندوستانی کھلاڑی ابوالفتح ہندی نے اس کھیل میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ اسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی۔[۴] حسن نظامی، امیر خسرو اور ملک محمد جائسی کے کثیر حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کھیل ہر طبقہ میں مقبول تھا۔ جائسی نے ایک حقیقت پسندانہ منظرکشی کی ہے جس میں سلطان علاؤالدین خلجی اور راجہ رتن سین کو چتوڑ کے قلعہ میں شطرنج کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔[۵]

---

[۱] اس بحث کی تفصیلات کے لیے دیکھیے تجزیۃ الامصار جلد اول ص ۱۷۱

[۲] ایضاً ص ۱۹۳۔ [۳] بلینڈ ص ۱۷۔

[۴] شطرنج کے کھیل سے اخذ کیے گئے استعاروں کے بیان کے لیے دیکھیے تاج المآثر ص ۱۲۔ امیر خسرو نے اعجاز خسروی اور دیگر تصانیف میں بھی اسی طرح کے استعارے استعمال کیے ہیں۔ ملک محمد جائسی کے بیان کے لیے دیکھیے پدماوت (ہندی) ص ۲۵۷

شطرنج کے ہندوستانی نژاد ہونے پر بڑا اختلاف رہا ہے لیکن امیر خسرو کے دور میں اس مسئلے پر زیادہ اختلاف نہ تھا۔ خود امیر خسرو شطرنج کے ہندوستانی نژاد ہونے کے شدت سے حامی ہیں۔ ہندوستان کا یہ دعویٰ ناقابلِ تردید ہے اور اس کے حق میں متعدد تاریخی شواہد موجود ہیں[1] موجودہ شطرنج کے علاوہ شطرنج کامل یا چہار تنہی شطرنج بھی اس دور میں کھیلی جاتی تھی[2]

---

[1] امیر خسرو کی رائے کے لیے دیکھیے کلیاتِ خسرو ص ۷۰۹۔ مسٹر بلینڈ کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا ایران سے ہوئی۔ اروِن شطرنج پر اپنی کتاب میں شطرنج کو کامیابی کے ساتھ چینی نژاد ثابت کرتا ہے جو متعدد ایجادات کا مبداء ہے۔ اس کی رائے کا انحصار بہت قدیم چینی مخطوطات پر ہے۔ (ان مخطوطات کو اس نے خود نہیں دیکھا) اور اس کی ایجاد کا سہرا اسں چینی سپہ سالار کے سر باندھا ہے جو اپنے سپاہیوں کو کسی کھیل میں مصروف رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ سیاست میں دل چسپی نہ لیں۔ دیکھیے میکڈانل کی رائے۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۸۹۸ء " شطرنج کی اصل اور ابتدائی تاریخ سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ چھٹی صدی کے آخری دور میں کسریٰ نوشیرواں کے دربار میں ایک ہندوستانی سفارت گئی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ ایران میں شطرنج کی ابتدا اس سفارت کے ذریعہ ہوئی۔ اس مضمون سے متعلق ہر مسلم تاریخ میں ہندوستانی سفارت کا ذکر ہے۔ یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس سفارت نے ایران سے واپسی کے بعد ہندوستان میں نرد کی ابتدا کی۔

[2] میکڈانل کا بیان ہے کہ چہار پہلو شطرنج (چتراجی) کا ذکر ۱۵ ویں صدی کے آخری اور ۱۶ ویں صدی کے ابتدائی سالوں کے ایک سنسکرت مصنف نے کیا ہے حالاں کہ اس کا وجود اس سے پیشتر بھی تھا۔ اس کھیل میں چار افراد شریک ہوتے تھے دو پاسے استعمال کرتے تھے۔ پاسہ پھینکنے کے بعد جو تعداد آتی تھی ہر مُہرے کو اس کے مطابق چلتے تھے۔ اس کھیل میں چونسٹھ مربعوں کا ایک بورڈ استعمال ہوتا تھا اور ۳۲ مہرے ۸۔ ۸ کے چار مجموعوں میں استعمال ہوتے تھے۔ ہر مجموعے میں ایک بادشاہ، ایک فیل، ایک گھوڑا اور رتھ پہلی قطار میں اور دوسری قطار میں ان کے چار پیدل سپاہی ہوتے تھے۔ انھیں اس طرح سے رکھا جاتا تھا کہ کھلاڑی کی طرف بائیں ہاتھ کے کونے میں ہمیشہ رتھ ہوتا تھا۔ اس طرح اس میں چار بادشاہ ہوتے تھے۔ ہر ایک کی خدمت میں جو مہرے ہوتے تھے وہ فوج کے چار سپاہیوں کی نمائندگی کرتے تھے جب کہ وزیر غیر حاضر ہوتا تھا۔ اس کھیل کی ابتدا اور ارتقا کا تعین مشکل ہے لیکن بلینڈ کے خیال کے مطابق اسں کی ابتدا ایران سے ہوئی۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(ب) **چوپڑ اور تاش وغیرہ** : چوپڑ کے ہندوستانی نژاد ہونے کی کبھی بھی تردید نہیں کی گئی۔ یہ ایک قدیم کھیل ہے جو آج کل بھی تین مختلف ناموں سے کھیلا جاتا ہے پچیس، چوسر اور چوپڑ۔ ان تینوں کھیلوں کے قواعد یا ان کے کھیلنے کے طریقے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف معمولی اور برائے نام[1] آج کل کی طرح چوپڑ اس دور میں بھی جداگانہ رنگوں کے ۱۶ گوٹوں کے ساتھ کھیلا جاتا تھا۔ یہ گوٹیں چار چار الگ الگ رنگ کی ہوتی تھیں۔ عام طور پر چار کھلاڑی دو دو کی جوڑی بنا کر چوپڑ کھیلتے ہیں۔ ہر کھلاڑی چار گوٹوں سے کھیلتا ہے جنھیں وہ پانسہ (آج کل کوڑیاں) پھینکنے کے بعد چوپڑ کے نقشے پر چلتا ہے چوپڑ کو مندرجہ ذیل شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ دو دو متوازی خطوط ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر مرکز میں کاٹتے ہیں۔ چاروں خطوط کے ایک دوسرے کو کاٹنے سے مرکز میں ایک مربع شکل اور چار مستطیل بنتے ہیں جو اس مربع کے چاروں خطوط سے ملے ہوتے ہیں مرکزی مربع کو چھوڑ کر چاروں مستطیلوں کو چوبیس مربعوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر مستطیل پر آٹھ آٹھ مربعوں کی تین قطاریں ہوتی ہیں[2]۔ چوپڑ کا کھیل ہندوؤں میں خاص طور پر مقبول تھا راجپوت بالخصوص اسے زیادہ پسند کرتے تھے۔ مغل شہنشاہ اکبر نے بعد میں چوپڑ کے اجزا کے بجائے انسانی شکلوں سے کھیلنے کو رواج دیا اور اسے چنڈل منڈل کے دلچسپ کھیل میں تبدیل کر دیا[3]۔

(گزشتہ سے پیوستہ) تیمور بھی چار پہلو شطرنج کھیلتا تھا اور عام خیال ہے کہ شطرنج کا عام کھیل کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق موجودہ شطرنج اس کی مختصر شکل ہے۔ دیکھیے بلینڈ ص ۵۰-۶۰۔

[1] موجودہ چوپڑ کے لیے دیکھیے ہرکا اسلام از کروک ص ۳۳۳ — ۳۳۵

[2] چوپڑ کے نقشے کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول ص ۲۱۸-۲۱۹۔ عملی شکل میں کھیلتے ہوئے دیکھیے پدماوت ص ۴۲۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ موجودہ زمانے میں بھی شمشیر زنی فراخدلی کی خوبی اور درحقیقت چوپڑ کے مہروں کے ذریعہ جوا کھیلنے کے فن میں چھتریوں کی برابری کرنے والے نہیں ہیں۔ قدیم چھترنگا سے چوپڑ کے تعلق کے لیے دیکھیے میکڈانل کے دلچسپ مشاہدات جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۸۹۸ء ص ۱۴۰۔ ہندو سادھوؤں میں شطرنج بڑی مقبول تھی۔ میرا بائی اپنے پسندیدہ دیوتا کے ساتھ چوپڑ کھیلتی ہے (دیکھیے میکلف ص ۳۴۰) چوپڑ کے استعارات کے مکمل بیان کے لیے دیکھیے ملک محمد جائسی کا بیان پدماوت (ہندی) ص ۱۴۱۔

[3] چنڈل منڈل کے بیان کے لیے دیکھیے آئین اکبری ص ۲۱۹۔

اسی سلسلے میں نرد یا ایرانی چوسر کی طرح کھیل کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جس کی ابتدا ہندوستان میں بالکل ابتدائی دور میں ہوئی تھی۔ اس کے تختے اور اجزا بڑی نفاست سے بنائے جاتے تھے[1]۔ نرد لکڑی کے ایک تختہ پر کھیلی جاتی تھی جو مربع شکل کا ہوتا تھا اور اسے چوبیس مساوی مربعوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ پندرہ پندرہ کے تیس اجزا کی مدد سے اسے کھیلتے تھے اور ہر دو کا رنگ جداگانہ ہوتا تھا[2]۔ نرد ہی کے خطوط پر ہمایوں نے ایک نیا کھیل شروع کیا جس میں انسانی شکلیں استعمال کی جاتی تھیں[3]۔ ایسی روایات بیان کی جاتی ہیں کہ نرد ایران سے ہندوستان میں لایا گیا اور اس کے بدلے میں ہندوستان سے شطرنج کی ابتدا ایران میں کی گئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گنجفہ یا تاش کھیلنے کی ابتدا ہندوستان میں سب سے پہلے مغل شہنشاہ بابر نے کی[4]۔ اکبر نے غالباً اس کھیل میں چند اصلاحات کیں۔ یہ کھیل اس کے زمانے میں کافی مقبول ہو گیا۔ مغلوں کے قدیم طریقے کے تاشوں میں بارہ بارہ تاش کے پتوں کے آٹھ حصے ہوتے تھے۔ موجودہ تاشوں کے بیگم اور غلام کے بجائے وزیر ہوتا تھا۔ آج کل بھی مغل دور کے قدیم تاشوں کا استعمال قطعی طور پر ختم نہیں ہوا ہے[5]۔

جملہ اندرون خانہ کھیلوں میں شرط لگا کر کھیلنے کی غیر محسوس خواہش ضرور موجود ہوتی تھی۔ جوا کھیلنے کی ہندوستانی روایات بڑی قدیم اور قابلِ احترام تھیں۔ چوپڑ کے عام کھیل میں قرص یا پالسہ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ عموماً ہاتھی دانت کا بنا ہوا چار پہلو ٹکڑا ہوتا تھا اور ہر پہلو پر ایک وار ایک۔ دو۔ پانچ اور چھ نشانات ہوتے تھے۔ شرط لگا کر کھیلنے میں اسے تین حصے استعمال کیے جاتے تھے[6]۔ جوا بازی صرف ادنیٰ طبقے تک ہی محدود نہ تھی بلکہ بیگم

---

[1] نرد کے کھیل کے لیے جسے ملک کافور نے کھیلا اور جو ایک قسم کی نرد ہوتی تھی دیکھیے منتخب التواریخ جلد اول ص ۱۷۴۔ اعجازِ خسروی میں بھی نرد کے متعدد حوالہ جات ہیں۔

[2] دیکھیے تجزیۃ الامصار جلد دوم ص ۱۹۴

[3] قانون ہمایونی میں اس کھیل کی تفصیلات کے لیے دیکھیے ص ۱۵۵-۱۵۶

[4] دیکھیے بابر نامہ کا بیان۔ بابر نامہ ص ۳۰۷

[5] دیکھیے آئینِ اکبری جلد اول ص ۳۲۰ - ہرکلوٹز کا اسلام از کروک ص ۳۳۵

[6] ہندوستان میں جوئے کے رواج کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۹۰۔ مہروں کے استعمال کے لیے دیکھیے پرشش پریکشا ص ۱۳۸

کا بیان ہے کہ جب شاہی خاندان کابل میں تھا تو ہمایوں شرط لگا کر ہی کھیلوں میں شریک ہوتا تھا۔ وہ ہر کھلاڑی مرد عورت کو بیس بیس اشرفیاں تقسیم کرتا تھا جو شرط کی ضمانت کی حیثیت سے رکھے جاتے تھے[1]

دیگر غیر اہم تفریحات میں ہم کبوتر بازی اور مرغوں کی لڑائی کا ذکر کر سکتے ہیں۔ قدامت پسند مسلمان کبوتر بازی کی مخالفت اتنی شدت سے نہیں کرتے جتنی مخالفت مرغوں کی لڑائی کے منحوس شوق کی۔ بہر حال عام لوگ کسی بھی تفریح کے سلسلے میں ان کی رہنمائی اور مشورے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے[2] سلطان علاؤالدین خلجی کے یہاں ایک مستقل کبوتر خانہ تھا جو معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملا تھا۔ اکبر کو اپنی ابتدائی زندگی میں خصوصاً کبوتر بازی کا بڑا شوق تھا۔ نوجوان شہزادہ اپنے پرندوں کو خود ہی دانہ کھلاتا تھا اور اس تفریح کو بڑے رومانی اصطلاح میں عشق بازی کہا کرتا تھا[3]

(ج) مقبول عام تفریحات

مختلف اقسام کی اور بہت سی عوامی تفریحات بھی تھیں۔ ان میں سے کچھ مذہبی تہوار اور مقدس مقامات کی زیارت کے مواقع تھے اور دیگر عام استقبالی دعوتیں اور سرکاری تقاریب تھیں۔ عوامی رقص گانے، جادوگری روزانہ کی زندگی میں عام لوگوں کی تفریحات تھیں اور وہ لوگ ان معصوم تفریحات میں اپنی سخت زندگی اور سخت گیر محنت کو مختصر وقفہ کے لیے فراموش کر دیتے تھے[4]

---

[1] دیکھیے گلبدن ص ۷۷

[2] کبوتر بازی اور مرغوں کی لڑائی کے لیے دیکھیے مسلمان علماء کے خیالات کے لیے تحفۂ نصائح ص ۲۰ نیز اعجاز خسروی جلد اول ص ۱۷۹

[3] علاؤالدین کے کبوتر خانے کے ایک ضمنی حوالے کے لیے دیکھیے برنی ص ۳۱۸۔ اکبر کے لیے دیکھیے اکبر نامہ جلد دوم ص ۳۱۷-۳۱۸۔

[4] ٹھٹھہ (سندھ) کے لوگوں کے بارے میں تاریخ طاہری کی رائے "گو کہ دیگر اقوام کے پاس زیادہ دولت اور زیادہ فنون ہوں لیکن اس قدر اطمینان اور قناعت کہ ہفتہ میں ایک دن کام کریں اور باقی دن آرام کریں، خواہشات بہت محدود ہوں اور زندگی بہت آرام سے گزرے۔ یہ صرف ٹھٹھہ کے لوگوں کے لیے ہی مخصوص ہے" دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد اول ص ۲۷۴۔

ھندوؤں کے تہوار :۔ مسلمانوں کے تہواروں کے مقابلے میں ہندوؤں کے سماجی اور مذہبی تہواروں کے منانے کے طریقوں کے علاوہ اہم بات یہ تھی کہ وہ موسم کے لحاظ سے بڑے مناسب وقت پر ہوتے تھے۔ یہ تہوار عموماً اس وقت ہوتے ہیں جب کہ کسان لوگ نسبتاً خالی ہوتے ہیں اور پھر وہ رقص اور مقبول عام موسیقی سے اپنے دل بہلاتے ہیں متعدد خاندان برسرِ اقتدار آئے اور ختم ہو گئے، حادثات اور مصائب آئے اور لوگوں نے انھیں فراموش کر دیا، یا لوگوں نے تکالیف اٹھائیں اور تڑپے لیکن مقامی اور عام تہوار ہنوز اسی حالت میں باقی ہیں اور ہمیشہ اسی جوش و ولولے کے ساتھ منائے جاتے ہیں ۔ نئے مسالک اور مذہبی عقائد وجود میں آئے لیکن ان عوامی تہواروں میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے برخلاف ہر آنے والے نے ان کی مقبولیت میں کچھ اضافہ ہی کیا۔ اگرچہ یہ تہوار چند لوگوں کے مذہبی جذبات کی ضیافتِ طبع کا ہی سامان مہیا کرتے ہیں تاہم ایک بڑی اکثریت کے نزدیک ان کی کوئی مذہبی اہمیت نہیں ہے ۔ ان کے نزدیک یہ تہوار سماجی تفریح اور ملنے جلنے کے مقبول مواقع کے علاوہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

عام اور مقامی تہواروں کا بیان کرنا مشکل ہے۔ ان میں سے چند کو جو آج کل بھی رائج ہیں خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی[۱] زیادہ مقبول تہوار بسنت پنچمی، ہولی، دیپاولی (یا دیوالی) اور شوراتری تھے۔ دیگر تہوار وہ تھے جو کرشن کی زندگی کے مختلف واقعات سے متعلق تھے۔ بسنت بہار کے موسم کا نقیب تھا اور ماگھ کے مہینے میں ہوتا تھا۔ اس میں لوگ گیت گاتے اور عمومی رقص کرتے تھے اور ایک دوسرے پر سرخ سفوف (گلال) چھڑکتے تھے۔ شودروں یا ہندوؤں کے ادنیٰ طبقات کے لیے ہولی زیادہ اہم تہوار تھا۔ لوگ اس موقع پر آگ جلاتے، عوامی گیت گاتے اور ایک دوسرے پر گلال چھڑکتے تھے۔ ہولی کا تہوار پھاگن کے مہینے میں ہوتا تھا۔ شوراتری کا تہوار ماگھ کے مہینے کی ۲۹ ویں شب کو ہوتا تھا۔ اس میں مذہبی طرزِ فکر کے لوگ شب بیداری اور عبادت کرتے تھے۔ دیوالی یا دیپاولی کا تہوار کارتک کے مہینے کی ۲۵ ویں تاریخ کو ہوتا تھا[۲]

---

[۱] ہندوؤں کے تہواروں کے لیے دیکھیے ہندو محمڈن فیسٹِس از روس ص ۱۷۔ ۱۸۔ ۳۵۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔

[۲] ہندو تہواروں کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری۔ جلد دوم ص ۱۴۴۔ ۱۹۱۔

ان سب تہواروں کو منانے کا ان کا اپنا ایک طریقہ تھا۔ مثال کے طور پر بسنت کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ مہادیو کی پوجا ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کے اوپر گلال اور سرخ سفوف اس کثرت سے ڈالتے تھے کہ ملک محمد جائسی کے تشبیہی الفاظ میں زمین سے آسمان تک ہر چیز سرخ ہو جاتی تھی۔ جوان لڑکیاں شیو مندر میں پھل پھول چڑھاتی تھیں۔ شیو کے نشان کو صندل یا عود کی لکڑی کے قطیر یا رقیق مادہ سے دھوکر، اس پر گلال مل کر اپنی قلبی خواہشات کی تکمیل کے لیے دعائیں کرتی تھیں۔ ان دعاؤں میں ایک محبت کرنے والے شوہر کی خواہش بھی ہوتی تھی۔ اس کے بعد غالباً خواہش کی تکمیل کی شرط پر دوبارہ چڑھاوا چڑھانے کا وعدہ کرکے واپس آتی تھیں[۱]۔ اسی طرح ہولی کے مواقع پر متواتر تین دن تک ہر طبقہ اور قوم کے ہندو کیسری اور رنگین پانی ہر خاص وعام کے اوپر ڈالتے تھے حتیٰ کہ مسافروں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ تیسرے روز شام کو تقریباً پوری آبادی ایک بڑے آگ کے الاؤ کے گرد جمع ہو جاتی اور اگلی فصل کی خوشحالی کے لیے فال نکالتی تھی۔ عام لوگ شِوراتری کے تہوار پر آتش بازی چھوڑتے تھے اور زیادہ سنجیدہ اور مذہبی رجحان رکھنے والے لوگ شب بیداری کرتے تھے۔ لکشمی دیوی کی پوجا کے بعد لوگ مشعلیں اور جلتی ہوئی لکڑیاں گھماتے تھے[۳]۔

بعض لحاظ سے دیوالی بہت دل کش اور مسرت بخش تہوار تھا۔ اسے صحیح طور پر روشنیوں کا تہوار کہا گیا ہے۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ مرحوم افراد کی ارواح سال میں ایک بار اپنے دنیاوی گھروں اور اپنے سابقہ ماحول میں فانی لوگوں سے ملنے آتی ہیں۔ قدرتی طور پر مرحومین کے رشتہ دار اپنے آباؤ اجداد کی ارواح کو خوش آمدید کہنے میں خوشی محسوس کرتے

---

[۱] بسنت پنچمی کی ایک خصوصی تقریب کی تفصیلات کے لیے دیکھیے پدماوت ص ۴۷۔ ۴۲۷

[۲] ہولی کے تہوار کی تقریب کے لیے دیکھیے پاپولر ریلجن از کروک ص ۳۴۳۔ نکولو کونٹی کے ایک بیان کے لیے جو غالباً اسی تہوار کے سلسلے میں ہے دیکھیے فریبٹن ص ۲۴

[۳] راجہ لکشی کے سپاہیوں کی شوراتری کی ایک تقریب کے لیے دیکھیے پرش پریکشا ص ۲۵۔ نیز جلتی ہوئی لکڑی کے کھیل کے سلسلے میں دیکھیے کارپینٹر ص ۳۰۶۔ یہ کھیل لڑکوں کا بہت قدیم اور پسندیدہ کھیل تھا۔ لڑکے ایک جلتی ہوئی لکڑی کو تیزی سے ہوا میں گھماتے تھے جو آگ کا ایک دائرہ سا دکھائی دیتا تھا۔

تھے۔ گھروں کے اندر اور باہر جملہ مندر اور سرکاری عمارات میں بڑی تعداد میں مٹی کے دیے روشن کیے جاتے تھے۔ ہر جگہ روشنی کا ایک طوفان سا معلوم ہوتا تھا[1] دلشیوں یا ساہوکاروں اور سب تجارت پیشہ فرقوں کا یہ بہت اہم تہوار تھا۔ ہر خاص و عام آئندہ سال کے لیے اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جوا کھیلنے کو ایک روحانی ذریعہ تصور کیا جاتا تھا[2]

چھتریوں اور دیگر جملہ کاشت کار طبقے کے لیے دسہرہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ تہوار جیٹھ کے مہینے کی دس تاریخ (جسے آج کل وجے دشمی کہتے ہیں) کو ہوتا تھا اور یہ طبقے درگا ماتا کی پوجا کرتے تھے۔ اس کی ایک یہ بھی تھی کہ لوگ اپنی تجارت اور کاروبار سے متعلق اوزاروں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ راجپوت اپنے گھوڑوں کی پیشانیوں کو باجرے کی ہری شاخوں سے آراستہ کرکے لاتے تھے۔ کسان اور دیگر فن کار اپنے اوزار لاتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے[3] پورن ماشی برہمنوں کا تہوار تھا اور ساون کے مہینے کی پورے چاند کے دن ہوتا تھا۔ کنواری لڑکیاں راکھی (ریشمی دھاگے اور گوٹے کی بنی ہوئی ڈوریاں) نوجوانوں کی کلائیوں پر باندھتی تھیں اور ان سے خوش قسمتی اور شفقت حاصل کرتی تھیں۔

سماجی اہمیت کے تہواروں میں رام، کرشن، پرش رام اور نرسنگھ کے یوم پیدائش پر منائے جانے والے تہوار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دیوتاؤں میں کرشن سب سے زیادہ مقبول تھا اور اس کے ماننے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ پڑ پری میں سال میں کئی بار جگن ناتھ کا جلوس رتھ میں بڑی دھوم دھام سے نکالا جاتا تھا۔ کرشن کی اس مورتی کے ساتھ لوگ ایسا سلوک کرتے تھے جیسے وہ کسی زندہ دیوتا کے ساتھ کرتے۔ وہ عام لوگوں کے پاک اور نفیس ترین جذبات کا مظہر تھا۔ برج (یوپی میں متھرا کے قریب) میں جہاں کرشن پیدا ہوئے اور اپنے ساتھیوں اور گوالنوں کے ساتھ کھیلے تھے، ان کی زندگی کے ہر واقعے کو بڑی عقیدت کے ساتھ یاد کیا جاتا تھا۔ کرشن لیلا کے بارے میں ہم بعد میں ذکر کریں گے[4]

---

[1] دیوالی کے تجزیے کے لیے دیکھیے پاور ریلیجن از کروک ص ۳۴۹۔ چراغوں کے بیان کے لیے دیکھیے فریپسٹن ص ۴۲

[2] دیوالی کے موقع پر جوئے کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۸۸۔ ۱۹۱۔

[3] ایضاً

[4] چیتنیہ کی سوانح کی تفصیلات اور اس کی بندرابن میں آمد کے لیے دیکھیے سرکار ص ۱۹۴

زیارت کرنا بھی عام طور پر بہت مقبول تھا۔ لوگ مشہور مزاروں اور صوفیاء کی یادگاروں کی زیارت کرنے جاتے تھے۔ دیگر لوگ آج کل کی طرح مقدس مقامات کی سیر کو جاتے تھے۔ زیر مطالعہ دور میں دریا کی زیارتوں میں خصوصاً قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو دریائے گنگا میں اشنان کرنے تک ہی محدود تھیں۔ زائرین مجموعی طور پر آسانی اور حفاظت کے لیے ل کر سفر کرتے تھے اور طویل سفر میں کافی سامان خورد و نوش اپنے ہمراہ رکھتے تھے۔ مشکل سفر اور پرخطر راستوں کے اس دور میں یہ یاترائیں مجموعی طور پر بڑی خوش گوار اور رومانی ہوتی تھیں[1]

مسلمانوں کے تہوار:۔ تقلید پسندانہ نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی زندگی میں مجموعی طور پر سماجی تہواروں کی کم ہی گنجائش تھی۔ لوگ بڑی تعداد میں حج کرنے کی غرض سے مکہ جاتے ہیں اور عیدین کی نمازیں ادا کرتے ہیں۔ لیکن ہر حال میں ان مذہبی اجتماعات کا ماحول اس قدر سنجیدہ اور سادہ ہوتا ہے کہ انھیں سماجی تہواروں کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ بہرحال ہندستان کے ماحول اور یہاں کی روایات کا ردِّ عمل مسلمانوں نے مذہبی رسوم کے کٹر پن پر پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالاں کہ قدیم مذہبی عبادات تو اسی شکل میں قائم رہیں لیکن ہندوستانی ماحول میں ان کی ظاہری شکل اور مقصد میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ مسلم تقویم میں بہت سے نئے تہوار شامل ہوگئے جن کی بنیاد ہندوستانی ماحول کے زیر اثر پڑی اور جو سماجی تہوار کہلا سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے عقائد اور ان کی روایات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں یہاں ہم نے ان کے ذکر سے گریز کیا ہے اور ہم صرف ان تہواروں تک اپنے اس بیان کو محدود رکھیں گے جن کو مسلمانوں کے قدامت پسند طبقے نے بھی تسلیم کیا تھا۔ جن تہواروں کو سرکاری سطح پر تسلیم کیا گیا ان میں نوروز کا ایرانی تہوار بھی شامل تھا جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ نوروز عموماً بڑے بڑے باغات اور دریا کے کنارے کھلے میدانوں میں موسیقی اور پھولوں کے ساتھ منایا جاتا تھا[2]

---

[1] ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد اول ص ۲۷۳۔ نیز ہندوؤں کے مقدس مقامات کی سیر کے لیے دیکھیے ہندو محمڈن فیسٹس از روس۔

[2] تفصیلات کے لیے دیکھیے اعجاز خسروی جلد چہارم ص ۳۳۰۔ اس موقع پر منظوم شاعری کے لیے دیکھیے کلیات خسرو ص ۱۸۔

مجموعی طور پر نوروز صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات اور خصوصاً ان لوگوں تک محدود تھا جن کا سلاطین سے بڑا قریبی تعلق ہوتا تھا۔ اب یہ کم و بیش ہندوستان میں ختم ہو چکا ہے[۱] مغل شہنشاہ ہمایوں پہلا شخص تھا جس نے مذہبی اثرات کے زیر اثر نوروز منانے پر پابندی عائد کی۔ نوروز کے دن شاہی دعوت بہرحال جاری رہی[۲]

دوسرا اہم تہوار شب برات تھا جو شعبان کی ۱۴ تاریخ کو منایا جاتا تھا[۳] اسے نامناسب طور پر اسلام کا Guy Fawkes day کہا گیا ہے حالاں کہ راہ و رسم کے لحاظ سے یہ اپنے مماثل انگریزوں کے اس تہوار سے قطعی مختلف ہے۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ شب برات ایک خاص اسلامی روایت کی یاد میں منایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اس کے منائے جانے کا صحیح جواز تو مشکل ہے لیکن غالباً یہ ہندوؤں کے تہوار شوراتری کی نقل ہے[۴] کچھ مذہبی لوگ شب برات کی پوری شب نوافل، قرآن اور دوسری دعائیں پڑھنے میں گزارتے تھے[۵] عام لوگ خوشی منانے میں ہی اپنا وقت خرچ کرتے تھے۔ شب برات کی ایک نمایاں رسم آتش بازی کا وسیع پیمانے پر استعمال اور مکانات و مساجد میں چراغاں کرنا تھی[۶]

---

[۱] مرشد آباد (بنگال) میں نوروز کی بقا کے لیے دیکھیے ہندو محمڈن فیسٹس از روس ص ۱۱۰

[۲] خواندمیر ص ۱۵۰۔ [۳] شب برات کا تہوار دوسری مذہبی تقریب شب قدر سے بہت مختلف ہے۔ گو کہ اس کی صحیح تاریخ تو متعین نہیں ہے لیکن عام رائے یہ ہے کہ یہ رمضان کے مہینے کی ۲۷ تاریخ کو ہوتی ہے آج کل شب برات کی تقریب منانے کے سلسلے میں دیکھیے روس ص ۱۱۱-۱۱۴۔ مزید تفصیلات کے لیے مسز میر حسن علی کی تصنیف۔

[۴] دونوں تہواروں میں ایک قدر مشترک شب بیداری اور آتش بازی ہے۔ جنوبی ہند کے تہوار مہانذی کے موقع پر بھی آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ دیکھیے ہیجر۔

[۵] ایک مثال کے لیے دیکھیے تاریخ داؤدی ص ۱۰۴-۱۰۵۔

[۶] امیر خسرو کا بیان ہے کہ دہلی کے جوان لڑکے آتش بازی چھوڑتے تھے اور دہلی پر صحیح معنوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے کی ایک جلتی ہوئی دوزخ کا گمان ہوتا تھا۔ اس نے مزید بیان کیا ہے کہ ہر شخص مقامی مسجد کو روشن کرنے کے لیے ایک چراغ مسجد میں بھیجتا تھا۔ دیکھیے اعجاز خسروی جلد چہارم ص ۳۲۴۔ نیز دیوان حسن دہلوی میں تائیدی بیان کے لیے دیکھیے ص ۳۲۔

شب برات کا عام رواج ہونے کے بعد سلاطین بھی اس کی تقریبات میں شامل ہونے لگے۔ مثال کے طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان فیروز تغلق اس تہوار کو چار دن تک مناتا تھا۔ شب برات کی آمد پر وہ آتش بازی اور پٹاخے بڑے پیمانے پر جمع کر لیا کرتا تھا۔ اس سامان کے چار بڑے انبار سلطان کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔ ایک اس کے بھائی باربک کے لیے دوسرا ملک علی کے لیے اور تیسرا ملک یعقوب کے لیے ہوتا تھا۔ آتش بازیوں کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف پٹاخے تیس گدھوں پر لدواکر منگائے جاتے تھے۔ شب برات کے بعد شعبان کی ۱۳-۱۴ اور ۱۵ تاریخ کو یہ آتشبازیاں چھوڑی جاتی تھیں۔ مورخ کے الفاظ میں آتش بازی کی وجہ سے شب میں دن کی سی روشنی ہوجاتی تھی۔ جو لوگ فیروزآباد میں آتش بازی دیکھنے کے لیے جمع ہوجاتے تھے انھیں بھی آتش بازی تقسیم کرنے کے لیے چار بڑے ٹوکروں میں بھرکر موسیقاروں کے ساتھ بھیجی جاتی تھیں۔ خیرات خانوں اور دیگر خیراتی اداروں کو شعبان کی ۱۵ تاریخ کی شب میں عطیے بھیجے جاتے تھے۔[1]

محرم کو بہت کم لوگ مناتے تھے۔ تازیوں (شہیدان کربلا کے بناوٹی مقبرے) کی ہندوستان میں تیمور کے ذریعہ ابتدا کا بیان ممکن ہے حقیقت پر مبنی ہو لیکن ہندوستان کے اس علاقے میں اس کا اثر نہیں محسوس کیا گیا[2] لیکن ہندوستان جیسی ایک سرزمین میں ایک زمانے کے بعد محرم کی تقریبات کی وسیع پیمانے پر ابتدا قابل تعریف ہے[3] قدامت پرست

۱۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے عفیف ص ۳۶۵ - ۳۶۷

۲۔ مسز میر حسن علی کی تصنیف میں دیکھیے محرم کی تقریبات کا مفصل حال۔ نیز ہندوستان میں بدھ کے مجسمے کے جلوس کے لیے دیکھیے چینی سفیر فاہیان کی تفصیلات ہر کلوٹز اسلام از کروک ۱۹۴ ہسٹری آف آرین رول از ہیول ص ۱۶۸

۳۔ آج کل کے محرم میں شہدائے کربلا کی مصائب کی تمثیل کے متعدد عناصر اس زمانے میں بھی موجود تھے مثلاً تعزیہ یا شہدائے کربلا کے مقبروں کے چھوٹے چھوٹے نمونے، ان کی متبرک نشانیاں اور متعدد نوحہ و رونے کے مظاہرے۔ مسلمانوں میں متبرک نشانیوں کی پرستش کا عام رواج تھا جو آدم اور محمد کے فرضی قدموں کی اسی جوش وخروش سے پرستش کرتے تھے جس جوش کے ساتھ ہندو اپنی متبرک اشیاء کی پوجا کرتے ہیں۔ جگناتھ کے رتھ کرشن لیلا اور ان کے جلوس محرم کے جلوسوں سے بڑی حد تک مشابہ تھے۔

اور مذہبی رجحان رکھنے والے مسلمان محرم کے ابتدائی دس دن تک شہیدانِ کربلا کی زندگی کے حالات پڑھتے تھے اور ان کی ارواح کو ثواب پہنچانے کے لیے عبادات کرتے تھے[1] سلاطینِ دہلی کے زمانے میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔

مقبول عام زیارتیں مشہور صوفیا کے مقابر تک محدود تھیں جن میں اہم ترین بہرائچ (یو۔پی) کے مسعود سالار غازی تھے[2] مشہور صوفیا کے عرس کی مقبولیت کا یہ ابتدائی دور تھا۔ بعض صوفیا اور چند مشہور صوفیا کے پیرو سال میں ایک بار صوفیاء کے مقبروں پر جمع ہوتے تھے لیکن ایسے افراد کی تعداد بہت کم تھی۔ مقبروں کی زیارت کو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سلطان فیروز تغلق نے خواتین کو بیرون دہلی کے مقابر پر زیارت کے لیے جانا ممنوع قرار دے دیا تھا۔ سندھ میں چاند کے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مرد اور عورتیں بڑی تعداد میں ماکلی پہاڑ پر کسی مشہور صوفی کے مقبرے کی زیارت کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ سندھ میں ہی ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اسی طرح کی دوسری زیارتوں کے ثبوت بھی ملتے ہیں اور ایسے مقامات تقریباً بارہ تھے۔ ان مقامات پر لوگ اس قدر بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے کہ کھڑے ہونے کے لیے بھی بمشکل جگہ ملتی تھی۔ لوگ دن بھر تفریح کرتے، خوشی مناتے اور شام کو دیر میں گھر لوٹتے۔

قدامت پرست لوگ اور خصوصاً علما ان مواقع پر عورتوں اور مردوں کے اس آزادانہ اختلاط اور ناعاقبت اندیشانہ تفریحات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ عام لوگ ان نصیحتوں پر کم ہی توجہ دیتے تھے اور جیسا کہ تاریخ طاہری کے مصنف کا بیان ہے "ان لوگوں

---

[1] چند حوالہ جات کے لیے دیکھیے اعجاز خسروی جلد چہارم ص ۳۲۸۔ سید جہانگیر اشرف نے اپنے مکتوبات میں بڑھتے ہوئے شیعہ اثرات اور احساسات کی اچھی تصویر کشی کی ہے (مکتوبات برٹش میوزیم۔ قلمی نسخہ)

[2] اس سلسلے میں یہ امر قابل غور ہے کہ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی (دیکھیے ترکستان کے بارے میں اسٹین کا بیان) مسلمانوں کے متعدد مزار بودھوں اور ہندوؤں کے قدیم کھنڈرات پر واقع ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید سالار کا مقبرہ سورج مندر پر تعمیر کرایا گیا تھا (دیکھیے بہرائچ ضلع میں بودھوں کے قدیم آثار کے لیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد اول)

ہیں یہ رسوم اتنے طویل عرصے سے جاری ہیں اور وقت کی اتنی طویل چھاپ ان لوگوں پر پڑ چکی ہے کہ یہ لوگ ان رسوم کو کسی طرح بھی چھوڑ نہیں سکتے۔[۱] اس طرح قدیم رواجوں کو دیگر جملہ نقطہ ہائے نظر پر فوقیت حاصل ہو گئی۔

سرکاری استقبال اور شاہی تقریبات

اس سلسلے میں چند ایسی سرکاری تقریبات کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جن میں ہر خاص و عام کو مدعو کیا جاتا تھا خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو اور اس کا سماجی مرتبہ کچھ بھی ہو ایسے مواقع کثرت سے آتے تھے۔ مثلاً کسی اہم مہم سے سلطان کے دارالخلافہ میں واپسی پر استقبال، کسی فتح کی خوشی کا جشن، کسی شہزادی یا شہزادے کی شادی، کسی سلطان کے پہلے بیٹے کی پیدائش وغیرہ۔ ایسے مواقع پر ہمعصر ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں تقریباً یکساں تقریبات منائی جاتی تھیں۔ ایک بڑے کھلے میدان میں محراب دار چبوترے تعمیر کیے جاتے تھے، انھیں قیمتی اور منقش کپڑوں سے آراستہ کیا جاتا تھا فرش پر قالین بچھائے جاتے۔ کبھی کبھی ان محرابوں پر باجہ بجتا اور ان کے نیچے آرائش اور روشنی کے لیے بڑے بڑے جھاڑ لٹکائے جاتے۔ رقص کرنے والی لڑکیاں اور موسیقار اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے۔ مہمانوں کو شربت اور پان پیش کیے جاتے۔[۲] ہندو راجا ان محرابوں میں بعض اوقات ڈوری میں آم کے پتے باندھ کر لٹکا دیتے اور مہمانِ خصوصی کی آمد کا اعلان

---

[۱] دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد اول ص ۲۷۳-۲۷۴

[۲] ان محراب دار چبوتروں کے سلسلے میں دیکھیے ایک ابتدائی حوالہ تاج المآثر (جلد سوم) ص ۸۷-۸۸۔ یلدوز کی لڑکی سے شادی کرنے کے بعد جب قطب الدین ایبک غزنی سے واپس آیا تو اسے خوش آمدید کہنے کے لیے ان محرابوں کو فوجی ہتھیاروں سے آراستہ کیا گیا۔ نیز سرمور پہاڑیوں کے راناؤں کی بغاوت فرو کرنے کے بعد الغ خاں بلبن کا شاہی استقبال ہوا تھا۔ سلطان ناصر الدین اور اس کے عوام حوض رانی پر جمع ہوئے مورخ کا بیان ہے کہ قیمتی ملبوسات اور آرائش کے دیگر ساز و سامان کی وجہ سے پورا میدان رنگ برنگے پھولوں کا باغ معلوم ہو رہا تھا (تفصیلات کے لیے دیکھیے راورٹی ص ۸۳۴-۸۳۵) بنگال کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد سلطان بلبن کی دہلی واپسی کے لیے دیکھیے برنی ص ۱۰۶۔ اسی طرح جب معز الدین کیقباد اپنے والد بغرا خاں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

باجوں کے شور سے کرتے تھے نمود و نمائش کے ایسے مواقع پر بڑی تعداد میں جری پہلوان

(گزشتہ سے پیوستہ) سے ملاقات کے بعد دہلی واپس آیا تو شراب بڑے بڑے برتنوں میں جمع کرلی گئی تھی اور لوگوں کو مفت تقسیم کی گئی تھی (دیکھیے برنی ص ۱۶۴) دہلی میں مبارک شاہ خلجی کے ذریعہ خسرو خاں کے شاہی استقبال کے لیے دیکھیے امیر خسرو کا بیان کلیات خسرو ص ۷۰۰۔ ابن بطوطہ نے سلطان محمد تغلق کے دور میں شاہی استقبال کا دو مواقع پر ذکر کیا ہے۔ ایک موقع پر جب عباس خلیفہ کا سفیر خلعت اور منشور لے کر دہلی میں داخل ہوا تو اسے خوش آمدید کہنے کے لیے ایک بہت بڑا جلوس تیار کیا گیا تھا۔ اس واقعہ کی خوش خبری میں دہلی میں چار چار منزلہ پختہ محرابیں تیار کرائی گئیں۔ ان سب کو زردوزی کے کام کے کپڑے سے آراستہ کیا گیا اور عوام کو لطف اندوز کرنے کے لیے موسیقار و رقاص عورتیں اور مرد مقرر کیے گئے۔ شربت کے بڑے بڑے برتن رکھ دیے گئے تھے اور اس میں حصہ لینے والے جملہ افراد کو شربت اور پان مفت پیش کیا گیا تھا (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الرحلہ جلد اول ص ۹۲) دوسرا واقعہ وہ ہے جس میں سلطان کا متعدد مہمات سر کرنے کے بعد دہلی آنے پر استقبال کیا گیا تھا۔ شاہی جلوس کے لیے ہاتھی مقرر کیے گئے تھے جن پر ملمع کا ساز پڑا ہوا تھا اور جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ اور دہلی کے شاہی راستہ کو ریشم سے آراستہ کیا گیا تھا اور دیواروں پر قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے۔

مغل دور میں شہر کی آرائش سرکاری افسران کی نگرانی میں ہوتی تھی (ملاحظہ ہو گلبدن ص ۲۸) لیکن دیگر معاملات میں یہ تقریبات کچھ زیادہ مختلف نہ تھیں۔ مثلاً اکبر کے دور میں شاہی تقریبات کے مواقع پر آگرہ اور سیکری کے بازاروں کو آراستہ کیا جاتا تھا اور ہزاروں موسیقار اپنے فن کے مظاہرے سے عوام کو لطف اندوز کرنے کے لیے مقرر ہوتے تھے۔ دیوان خاص کو یورپ کے بنے ہوئے قیمتی فرنیچر اور شاندار تصاویر سے آراستہ کیا جاتا تھا شاہی دربار کے لیے شان دار چبوترے اور شامیانے نصب کیے جاتے تھے (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو آئینِ اکبری جلد دوم ص ۳۰۹) اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بعض اوقات شاہی فتح و کامرانی کی خبر کے اعلان کے لیے بھی محراب دار چبوترے تیار کرائے جاتے تھے۔ اس طرح یہ اعلانات مسجد کے منبر اور ان محرابوں دونوں مقامات سے ہوتے تھے۔ (ملاحظہ ہو برنی ص ۲۴۰) استقبال کے سلسلے میں آزادانہ اور بالواسطہ حوالوں کے لیے دیکھیے تجزیۃ الامصار ص ۲۴۷

لہ ملاحظہ ہو بداونی بنگیا ص C XXVII شاہی مہمانوں کے استقبال کا ایک عام طریقہ دہلی سلاطین کے دور میں یہ تھا کہ وہ اس کے لیے چند میل آگے جاتے تھے اور تب اسے ان فاتحانہ محرابوں میں سے گزار کر جلوس کے ہمراہ لاتے تھے۔ مثال کے لیے ملاحظہ ہو برنی ص ۶۰

شعبدہ باز اور دوسرے ایسے لوگ جمع ہو جاتے تھے جو اپنے کرتب دکھا کر لوگوں کو محظوظ کرتے اور اچھی خاصی رقم کما لیتے تھے[۱] مغل شہنشاہوں کے دور میں بھی کم و بیش اسی طرح کی خصوصیات کی حامل یہ جملہ تفریحات جاری رہیں۔

رقص و موسیقی

دیگر تفریحات کے ساتھ ساتھ رقص و موسیقی بھی عام لوگوں میں کافی مقبول تھیں آج کل بھی ہندوستانی دیہاتوں میں کسان اور دوسرے لوگ ہولی منانے کے لیے چوپالوں میں جمع ہوتے ہیں جہاں وہ اپنی پسندیدہ آلھا اور رقص سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بالخصوص دوآب کے بعض علاقوں میں آلھا کھنڈ کے مقبول واقعات اور نل دمینتی کی کہانی اب بھی شام کو سنی جا سکتی ہے۔ غالباً راجہ رتن سین کے دہلی کے شاہی قید خانے سے بچ نکلنے اور ہمیر دیو کی جنگ کے واقعات دیہات کے موسیقاروں اور شاعروں کو ان کے واقعات گا کر سنانے کے لیے جوش دلاتے ہوں گے۔ ساون کے گیت (جس کے لیے ہنڈولا اور سادتی دو راگ زیر مطالعہ دور میں ترتیب دے لیے گئے تھے) بے حد ہر دل عزیز تھے اور شاید آج کل کی طرح کورس میں اور جھولوں میں بیٹھ کر گائے جاتے تھے[۲]

رقص آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ مقبول تھا۔ کرشن کے مسلک کے حامیوں نے اس میں مزید جان ڈال دی تھی اور مرد اور عورتیں کبھی کبھی اپنے پیروں میں گھنگھرو باندھ کر مل کر رقص کرتے تھے[۳] دیگر رقصوں کے علاوہ ہر دل عزیز گجراتی رقص (جسے آج کل گربھا بھی کہتے ہیں) کا مغربی ساحلی علاقے میں بہت زیادہ رواج تھا اور مغربی ممالک کے لوگ اسے خصوصاً پسند کرتے تھے[۴] ہندوستان کے افغانوں نے بھی اپنے قومی رقص

---

[۱] شاہی استقبال کے دلچسپ حال کے لیے دیکھیے دیول رانی ص ۱۵۳۔ ۱۵۵

[۲] نئے سریلے گیتوں کے لیے ملاحظہ ہو شاہ ص ۱۸۲۔ ۱۸۳

[۳] مثال کے لیے ملاحظہ ہو پداولی بنگیا ص LXXXII

[۴] نکولو کونٹی کے بیان کے لیے ملاحظہ ہو فریمپٹن ص ۱۴۲۔ میجر ص ۲۰ سیاح کو اس رقص کو دیکھنے کے بعد (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو فراموش نہیں کیا تھا اور عموماً اپنے اہم قومی تہواروں پر بڑے جوش اور چاؤ سے کئی کئی دن تک رقص کرتے تھے[1] ناٹک کا فن دھیرے دھیرے اپنی خوبیاں کھو رہا تھا اور اس کی جگہ پیشہ ور مسخروں کے بیہودہ مذاق مقبول ہو رہے تھے۔ ایسے وقت مسلک کرشن نے اس فن کو کسی حد تک مزید تنزل سے بچایا۔ مسلک کرشن کے ماننے والوں کے تصورات فن تمثیل کی ضرورت کے لیے زیادہ مناسب تھے کیوں کہ یہ تصورات رام کے ماننے والوں سے زیادہ عاشقانہ تھے۔ ان ناٹکوں کو کرشن لیلا کہتے تھے اور یہ ناٹک ملک کے مخصوص حصوں میں کھیلے جاتے تھے۔ ان میں کرشن کی زندگی کے مشہور و مقبول واقعات اور معرکوں کو کھیل کی صورت میں پیش کیا جاتا تھا مثلاً گوالنوں کے ساتھ اس کا پیار اور دل لگی، رادھا سے اس کی جدائی اور اس کا غم اور ظالم کنس کا قتل وغیرہ[2] رام لیلا بعد میں وجود میں آئی اور اس کی وجہ رام کے مسلک کی ہر دل عزیزی اور تلسی داس کی نظمیں تھیں جو آج کل بھی بہت مقبول ہیں۔ رام لیلا کا رواج کرشن لیلا کے خطوط ہی پر ہوا۔ بہرحال یہ نیا جذبہ ہندوؤں کی تمثیل نگاری کی قدیم عظمت کو زندہ کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ رقص اور موسیقی کی قدیم خوبیاں بھی ختم ہونے لگیں۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہ فن رقص و موسیقی کا پیشہ اختیار کرنے والوں کی ایک ذات تک محدود ہو کر رہ گیا اور اعلیٰ طبقے کی تفریح اور مذہب

(گذشتہ سے پیوستہ) بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے اس رقص کا موازنہ ہم عصر یورپین رقص سے کیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے دائرے کی شکل میں رقص کرتے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں منقش عصا ہوتے تھے اور جب وہ آپس میں ملتے تھے تو عصا تبدیل کر لیتے تھے۔ یہ رقص پورے گجرات میں مشہور ہے اور آج کل اس کے رواج کو ترقی دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسی طرح کا رقص یو پی میں بھی ہوتا ہے اور دیہاتوں میں ہولی جیسے تہواروں کے مواقع پر کیا جاتا ہے۔

[1] شیرشاہ کے شاہی اختیارات حاصل کرنے کے بعد افغان رقص کی تقریبات کے لیے دیکھیے تاریخ شیرشاہی ص ۴۸ ب

[2] ملاحظہ ہو بیکالف جلد اول ص ۵۸۔ نیز روس ص ۳۶، ۳۷ و ۴۱ جہاں چند ہندو تہواروں کا ذکر ہے چار ماہ کی طویل نیند کے بعد کارتک کے اول نصف حصہ میں ۱۲ یا ۱۳ قمری تاریخ کو ہری یا وشنو کے بیدار ہونے کی تقریب کرشن کی ولادت یا جنم اشٹمی اور ڈول یاترا جب دیوتا کو جھلایا جاتا ہے۔

کی خدمت کے دائرے سے آگے نہ نکل سکا۔

قلاباز، بازی گر اور بہروپیہ وغیرہ

ایسے نٹ اور بازی گر کافی بڑی تعداد میں تھے جو جانوروں کی مدد سے یا اس کے بغیر کرتب دکھلاتے تھے۔ ہندوستان میں نٹوں کی روایات بہت قدیم ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے فن میں بہت بلند مرتبہ حاصل کر چکے تھے۔ ہر فرمانروا اپنا اور اپنے مہمانوں کا دل بہلانے کے لیے متعدد ملازم رکھتا تھا[1] عام اور نچلے درجے کے کرتب دکھانے والے مینڈھوں کو بازار میں نچا کر یا بندر نچا کر اپنی روزی کماتے تھے[2] رسّی پر چلنے والے اور کٹھ پتلی کا تماشا دکھانے والے عام میلوں یا دیگر بھیڑ بھاڑ کے مواقع پر عام طور سے دیکھے جاتے تھے[3] بہروپیے آج کل کی طرح اپنے کام میں مصروف رہتے تھے[4] بنگال میں ایک کبھی ایک آدمی پٹے سے بندھے ہوئے چیتے کو لیے دکھائی دیتا تھا۔ اپنا کرتب دکھانے کے لیے وہ اس درندے کا پٹہ کھول دیتا اور اسے کھینچتا، گھونسے اور ٹھوکر مارنا شروع کر دیتا۔ اس عمل کو وہ اس وقت تک جاری رکھتا جب تک کہ درندہ غیض وغضب میں نہ بھر جاتا اور اس پر ٹوٹ نہ پڑتا۔ اس کے بعد وہ آدمی اور درندہ دونوں آپس میں گتھ کر زمین پر لڑھکنے لگتے اور کرتب دکھانے والا لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنا ننگا بازو درندہ کے منھ میں ڈال دیتا لیکن درندہ اس کے بازو پر کاٹنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ تماشا دکھانے کے بعد وہ تماش بین سے پیسے اور خیرات جمع کرتا اور اس طرح اپنی اور درندے کی گزر بسر کرتا[5] جنوبی ہند میں کبھی کبھی ہاتھی کو ساز بجا کر نچایا جاتا اور جانور

---

[1] مثال کے لیے ملاحظہ ہو پدماوت (ہندی) ص ۲۵۳

[2] مینڈھے کے رقص کی ایک مثال کے لیے دیکھیے پدماوت ص ۱۵۱۔ شاہ ص ۱۷۶ و ۱۹۳ بندر کے رقص کے لیے۔

[3] تنی ہوئی رسی پر چلنے والوں کے لیے دیکھیے شاہ ص ۲۲۔ کٹھ پتلی کے رقص کے لیے پدماوت ص ۵۹

[4] اعجاز خسروی جلد چہارم ص ۲۷۰

[5] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو جرنل آف دی رائل ایشاٹک سوسائٹی ۱۸۹۵ء ص ۵۳۳

کے لیے سونڈ اوپر اٹھا دیتا[1]

نٹوں اور بازی گروں کے مشہور کرتبوں میں مورچھل (مور کی چال) ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے دو نٹوں کا مظاہرہ اور رسّی پر چلنا زیادہ مقبول تھے۔ مغل شہنشاہ بابر مورچل کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتا ہے۔ نٹ کے پاس سات عدد گھیرے ہوتے تھے جن میں سے ایک وہ اپنی پیشانی پر رکھتا تھا، دو اپنے گھٹنوں پر باقی چار میں سے دو اپنی انگلیوں میں اور باقی دو اپنے پیروں کی انگلیوں میں اور سب کو بیک وقت تیزی سے گھماتا تھا۔ کبھی کبھی دو نٹ ایک دوسرے سے لپٹ کر تین چار بار قلا بازیاں کھاتے۔ ایک نٹ لکڑی کی ایک بَلّی کا سرا اپنے گھٹنے یا ران پر جما لیتا اور دوسرا اس بلّی پر چڑھ جاتا اور اوپر جا کر اپنے کرتب دکھاتا تیسرا کرتب یہ ہوتا تھا کہ ایک پستہ قد نٹ تیزی سے اِدھر اُدھر چلتا ہوا اپنے کرتب دکھاتا لیکن پستہ قد اس کے چلنے پھرنے کا کوئی اثر قبول کیے بغیر اس کے سر پر کھڑا ہوا اپنے کرتب دکھاتا رہتا[2]

ان میں اہم ترین کرتب جسے رسّی پر چلنا کہتے ہیں اور جو اس دور میں بہت مشہور ہے لوگوں کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس امر کی متعدد مثالیں قابلِ اعتماد مورخین کے یہاں موجود ہیں کہ اس کرتب کو دیکھ کر لوگ حیرت اور الجھن میں پڑ جاتے تھے[3] یہ کرتب ایک کھلے میدان میں مندرجہ ذیل طریقے سے دکھایا جاتا تھا۔ ایک قلا باز تماشہ بین کے سامنے آتا۔ اس کے ہمراہ ایک عورت ہوتی جسے وہ اپنی بیوی بتاتا تھا۔ وہ ازراہِ مذاق تجویز کرتا تھا کہ وہ تماشہ بین افراد کے نیک و بد اعمال کے

---

[1] دیکھیے بیجر ص ۳۸

[2] دیکھیے بابر نامہ ص ۳۳۰

[3] مثال کے طور پر امیر خسرو کے مشاہدات کے لیے دیکھیے دیول رانی ص ۱۵۵۔ ابوالفضل نے بھی تسلیم کیا ہے جب یہ جادوگر عام لوگوں کو اپنے کمالات دکھاتے تھے تو لوگ آسانی سے انھیں پیغمبروں کے معجزے تصور کر لیتے تھے۔ حال ہی میں لیفٹیننٹ کرنل آر۔ ایچ۔ ایلیٹ کے سربراہ اوکلٹ کمیٹی آف دی میجک سرکل لندن نے رسّی پر چلنے کے مظاہرے کے سلسلے میں ہر ایک کو مقابلے کے لیے للکار کر اس دلچسپی میں نئے سرے سے جان ڈال دی۔

اندراجات معلوم کرنے آسمان پر جارہا ہے۔ سب لوگ اس کے لیے اپنی رضامندی دے دیتے۔ قلاباز اپنی جیب سے ایک گانٹھ لگی ہوئی رسی برآمد کرتا اور اس کا ایک سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے سرے کو ہوا میں اچھال دیتا جو اوپر چڑھتا رہتا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہوجاتا۔ وہ پھر اسی سے متعلق رسی پر سیڑھی کی طرح چڑھتا اور جلدی ہی نظروں سے اوجھل ہوجاتا۔ تھوڑے وقفے کے بعد اس کے اعضا ایک ایک کرکے نیچے گرنے لگتے۔ اس کی بیوی انھیں یکجا کرتی اور ہندوؤں کے رواج کے مطابق انھیں جلا دیتی اور خود بھی ان کے ساتھ ستی ہوجاتی۔ اس کے کچھ بعد قلاباز اچانک نمودار ہوتا اور اپنی بیوی کے بارے میں معلوم کرتا۔ اسے یہ پوری کہانی سنائی جاتی لیکن وہ یہ ظاہر کرتا جیسے یقین نہ کر رہا ہو۔ وہ اپنے میزبان یا اپنے فرد کو جس کی سرپرستی میں یہ سب کرتب دکھائے جا رہے ہوتے الزام دیتا کہ اس نے اس کی بیوی کو زبردستی اپنے گھر میں ڈال لیا ہے اور اسے بلانے کے لیے اس شخص کے گھر کے زنانہ حصے کی طرف جاتا جہاں سے اس کی بیوی مسکراتی ہوئی برآمد ہوجاتی ہے[1]

یہ قلاباز ایک اور حیرت انگیز کرتب دکھاتے تھے۔ وہ سب لوگوں کے سامنے ایک آدمی کو قتل کرنے اور اس کے چالیس ٹکڑے کرکے کسی کپڑے سے ڈھک دیتے۔ لیکن اس کے پکارنے پر وہ مردہ آدمی زندہ ہوجاتا۔ دیگر کرتبوں میں آم والے کرتب کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک برتن میں آم کی گٹھلی رکھتے۔ اس میں مٹی اور دیگر چیزیں ڈال دیتے چند گھنٹوں میں وہ گٹھلی پھلنے پھولنے کے جملہ مراحل طے کرلیتی اس میں پھل آجاتے اور تماش بین خود ان پھلوں کو چکھ کر اس کے کمال کی داد دیتے[2] دیگر حیرت انگیز کرتبوں میں بےموسم کے پھل مہیا کرنا، تلوار نگل جانا اور اسی طرح کے دوسرے کمالات شامل تھے جنھیں دیکھ کر عام حالات میں لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے تھے[3]

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو آئین اکبری جلد دوم ص ۵۷

[2] ایضاً، ص ۵۸

[3] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ایضاً نیز دیول رانی۔ آم کے شعبدے کے سلسلے میں نسبتاً جدید تفصیلات اور دیگر حیرت انگیز کرتب فرانسیسی مصنف جیکالیٹ تصنیف اوکلٹ سائنسیز ان انڈیا میں دیکھی جاسکتی ہیں یہ تفصیلات مصنف کے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں

تفریح اور تفنن کے اس ذکر کو ختم کرنے سے پہلے بہروپیوں اور پیشہ ور مسخروں کا ذکر کردینا بھی ضروری ہے۔ یہ لوگ ہر قسم کا مسخرہ پن اور نقالی کرتے تھے اور اپنے ٹھٹھول اور حاضر جوابی سے تماش بین مجمع کو ہنساتے اور ان کا دل بہلاتے تھے۔ ان میں بعض مسخرے بہت ہی مضحکہ خیز لباس پہن کر لوگوں کو حیرت زدہ کرتے اور انھیں ہنساتے۔ بعض مواقع پر یہ لوگ امرا اور ان کے مصاحبین کا خاکہ اڑاتے اور ایک اثر قائم کرنے کے لیے ان کی جھڑک اور دھتکار سنتے[1] لیکن مجموعی طور پر ان مسخروں اور بہروپیوں کے مذاق کا معیار بہت پست تھا اور رسم پرست علما کی نظر میں ان کا طرزِ زندگی بہت اہانت آمیز تھا۔[2] جس طرح ہندو اور مسلم حکمراں مسخروں اور بہروپیوں کو ملازم رکھتے تھے اسی طرح ہندو اور مسلمان امرا کے ملازمین کے عملے میں پیشہ ور مسخرے اور بہروپیے بھی شامل تھے[3]

---

[1] نقاب کی دل چسپ مثالوں کے لیے دیکھیے اعجازِ خسروی جلد پنجم ص ۶۰ و ۱۲۲ - ۱۶۵۔ بہروپیے آج کل بھی انھیں قدیم روایات پر عمل کرتے ہیں۔

[2] مشاہدات کے لیے ملاحظہ ہو ذخیرۃ الملوک ص ۱۴۹

[3] مثالوں کے لیے دیکھیے پدماوت ص ۵۹۔

آداب و رسوم

کسی قوم یا کسی دَور کے آداب و رسوم کا تجزیہ کرنا انتہائی مشکل کام ہے کیوں کہ قومی خصوصیات سے متعلق کلیے بڑے گمراہ کن ہوتے ہیں۔ اس کی صریح وجہ یہ ہے کہ ان میں سماجی اور انفرادی تغیر پذیری کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ جیسا کہ ہم بیشتر بارہا ذکر کر چکے ہیں یہ تغیرات ہندوستانی سماج میں نہ صرف مختلف طبقات بلکہ مختلف افراد میں بھی بہت زیادہ تھے۔ بہرحال موجودہ دور کی سماجی پیچیدگیوں اور سماجی آداب و رسوم کے مقابلے میں زیرِ نظر دور زیادہ سادہ، زیادہ غیر متبدل، زیادہ پختہ اور یکسانیت کا حامل تھا دھرم نے جو بلحاظ معنی ہندوؤں کی وسیع اور جامع اصطلاح ہے اور جس کا انگریزی ترجمہ کرنا ایک مشکل امر ہے متعدد طبقات اور ذاتوں کے فرائض کا تعین کرتا ہے۔ حالاں کہ اس اصطلاح کی روحانی خصوصیات ختم ہو چکی ہیں لیکن اس میں مختلف سماجی طبقات کے طرزِ فکر کو مقرر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح اس کا وجود ایک ترقی یافتہ طبقاتی برتاؤ اور اخلاقی طرز کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

یہ امر ناقابلِ تردید ہے کہ مجموعی طور پر لوگوں کی زندگی بڑی بے کیف تھی۔ وہ محض چند جسمانی اور اخلاقی قوتوں کے ارتقا سے آگے قدم نہیں بڑھا سکے تھے اور ان کے باہمی تعلقات بڑے محدود تھے۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس دور کی خوبیاں اور برائیاں مجموعی طور پر گنی چنی تھیں۔ تاہم یہ خصوصیات خاصی ترقی یافتہ اور مضبوط بنیادوں پر قائم تھیں۔ رسوم و رواج اور مذہب جنھوں نے ان طور طریقوں کی مختلف صورتوں سے حفاظت کی موجودہ دور کے ذہنی اور اخلاقی اعتقادات سے زیادہ مضبوط قوتیں تھیں۔ مجموعی طور پر ان اصولوں نے استحکام اور فلاح کی طرف سماج کی رہنمائی

کی۔ ایک بار یہ محسوس کر لینے کے بعد کہ آباو اجداد نے ایک خاص موقع پر ایک خاص ڈھنگ اختیار کیا تھا زندہ جانشینوں کے لیے اسی پر گامزن ہونا ضروری اور واضح تھا اور اس راہ پر وہ پوری قوت سے گامزن تھے۔

(۱) خوبیاں

آیئے پہلے اس دور کے لوگوں کی خوبیوں پر ایک نظر ڈال لیں۔ ابتدا میں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ قوت اور تازگی کی ایک خاص مقدار کے علاوہ مسلمان ایک طبقہ کی حیثیت سے بنیادی طور پر اپنے ہندو ہم وطنوں سے زیادہ مختلف نہ تھے۔ اول الذکر بعض مقامات پر چند معاملات کو بنیادی اہمیت دیتے تھے جن میں وہ ہندوؤں کی قطعی طور پر ضد تھے لیکن جیساکہ آئندہ صفحات سے واضح ہوگا دونوں طبقوں کے بنیادی نظریات میں مشابہت تھی۔

ہندوؤں کی امتیازی خصوصیات کے اہم پہلوؤں کو ہم وسیع معنی میں دو الفاظ وفاداری اور انسانی ہمدردی میں بیان کر سکتے ہیں۔ ہماری رہنمائی کے لیے ابوالفضل نے ہندوؤں کی خوبیوں کی طویل فہرست دی ہے جنھیں انھیں دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے[۱] ابتدائی دور کے مسلمانوں کی خوبیوں کی رسمی فہرست میں متعدد مقدس نیکیوں پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو اس اندازے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں[۲] اصولاً مسلمان حکومت کی وفاداری کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور اسے ایک اہم خوبی قرار دیتے ہیں جس کی وجوہات ظاہر ہیں لیکن بہرحال یہ غیر معمولی اہمیت اس نیکی کی ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی

۱؎ ملاحظہ ہو ابوالفضل کے تجزیے کے لیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۴۔ ۵۔

۲؎ مسلمانوں کی خوبیوں کے لیے ملاحظہ ہو جوامع الحکایات ص ۴۹۰۔ مصنف ہر مسلمان سے مندرجہ ذیل صفات کی توقع رکھتا ہے۔ خدا کی عبادت، انسانوں کے ساتھ مہربانی، دوستوں سے وفاداری، عقل مندوں کی تعظیم اور بے وقوفوں سے درگزر۔ بزرگوں کی عزت اور خدمت اپنے سے کمتر لوگوں کے ساتھ محبت اور ان کا خیال رکھنا، سلطان کی فرماں برداری اور آخر میں حکومت کے مخالفین سے جنگ۔

پیدا نہیں ہوتی جس کا دل نشین کرنا مقصود ہے[1] اس طرح زیرِ مطالعہ دور کے ہندوستانی باشندوں کی قومی خصوصیات میں وفاداری اور رحم دلی کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ پہلے ہم وفاداری پر بحث کریں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوبی کو ہر زمانے میں ہندوستان کے اخلاقی حیثیت سے مانا گیا ہے۔ سہولت کے خیال سے ہم اس کو تین مختلف حیثیتوں سے بیان کریں گے چوں کہ وفاداری کے تین قسم کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ مالک یا حاکم سے وفاداری، کسی دوست یا ہم رتبہ سے وفاداری اور ایک طرزِ زندگی (یا جاں بازی) سے وفاداری کم رتبہ افراد کے ساتھ تعلقات کو رحم دلی کے تحت بہتر ڈھنگ سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(الف) مالک یا حاکم سے وفاداری

ہندوؤں کے مذہبی فلسفے اور اخلاقیات کے مطابق روحانی نجات کا ایک راستہ بھگتی مارگ یا دینِ عقیدت تھا۔ اس اصول کے نتیجے کے طور پر ایک دور رس نتائج کا حامل جو مذہبی انقلاب شمالی ہندوستان میں زیرِ مطالعہ دور میں رونما ہوا ہمیں اس موقع پر اس سے بحث نہیں کرنی ہے۔ ہمیں یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ قدیم دور کی یہ اہم روحانی اصطلاح ہندو سماج میں حاکم اور محکوم کے درمیان سیاسی تعلقات کو روحانی بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک خود مختار مطلق العنان حکمران کا رتبہ ایک روحانی گرو کے برابر تھا[2] ایک ہمہ گیر خیال یہ

---

[1] امیر خسرو کی رائے ملاحظہ ہو۔ قران السعدین ص ۹، پر اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ غلاموں (یعنی سلطان کی رعایا) کے لیے سلطان کے خلاف کسی بات کو سوچنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ دوسرے موقع پر اس نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی ہے کہ وہ سلطان کا شکر گزار رہے کیوں کہ اس کی رائے میں انسان کی بات تو الگ رہی ایک کتا بھی اس بات کو جانتا ہے کہ وہ اپنے مالک کی ملکیت کی دیکھ بھال کس طرح کرے اور یہ بات بڑی شرم ناک ہوگی اگر انسان اس سلسلے میں جانوروں سے بدتر ہو جائے۔ ملاحظہ ہو کلیات خسرو ص ۶۷۸ نیز دیکھیے ص ۱۲۳

[2] تشریح اور مثال کے لیے دیکھیے پرشن پرکیشا ص ۱۴۰۔

تھا کہ کسی مالک کی خدمت کے لیے ضروری ہے کہ خادم مکمل اور غیر مشروط طور پر اپنی شخصیت اور اپنی خواہشات کو قربان کر دے۔ اس روحانی طرزِ زندگی میں اس امر کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ مالک کے اوصاف اور اس کی زندگی کے اصول و ضوابط کیا ہوں[1]

وفاداری کے ان جذبات کے اظہار کے لیے مسلمانوں میں نمک حلالی کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ اس سے مراد تھی خدمت کی ذمہ داری اور نمک خوری کے بدلے میں جاں نثاری[2]۔ زندگی کے روحانی نظریہ کے مقابلے میں یہ نظریہ زیادہ حقیقت پسندانہ تھا۔ چوں کہ اس میں ان تعلقات کے دنیاوی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور مادی مفاد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ بہرحال ان تعلقات کے نتیجے میں جو جذبات پرورش پاتے تھے وہ قطعی طور پر ہندوستانی تھے اور ان کی حیثیت روحانی تھی۔ زیرِ مطالعہ دور کی تاریخ میں مالک کی خدمت کے لیے عظیم قربانیوں کی متعدد مثالیں موجود ہیں[3]

---

[1] عقیدہ یہ تھا کہ اگر ایک شخص اپنے مالک کی خدمت کرتا ہوا موت سے ہم کنار ہوتا ہے تو سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو پدماوت (ہندی) ۲۳۶۔ جنوبی ہند کی ایک دل چسپ مثال کے لیے دیکھیے یول جلد دوم ص ۳۳۹۔ مارکوپولو کا بیان ہے کہ دکن کے ایک راجہ کے چند امرا تھے جو اس کے بڑے وفادار ساتھی تھے اور انھیں حکومت کی طرف سے بہت سے حقوق ملے ہوئے تھے۔ ان کی وفاداری اس حد تک تھی کہ اگر راجہ کا انتقال ان سے پہلے ہوتا تو یہ امرا خود اس کے ساتھ جل کر مر جاتے اور اپنے اس طریقے سے قطعی مطمئن تھے کیوں کہ ان کے نزدیک یہ بات بہت اہم تھی کہ وہ نہ صرف اس دنیا میں بلکہ زندگی بعد موت میں بھی اپنے مالک کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ ملاحظہ ہو پدماوت کے واقعہ میں رتن سین کے دو وفادار سپاہیوں گورا اور بادل کے متعدد بیانات۔

[2] نمک حلالی کی خوبیوں کے لیے دیکھیے مطلع الانوار جلد سوم

[3] اس نمک حلالی کی چند مثالیں برنی نے دی ہیں۔ برنی کا بیان ہے کہ جب ملک چھجو اور اس کے ساتھیوں نے جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کی اور گرفتار ہوئے تو سلطان نے نہ صرف انھیں معاف کر دیا بلکہ انھیں انعامات سے نوازا کیوں کہ انھوں نے نمک حلالی کا ثبوت دیا تھا اور بلبن کے زوال پذیر گھرانے کا ساتھ دیا تھا اس لیے سلطان نے انھیں معاف کر دیا۔ ملاحظہ ہو برنی ص ۱۸۴۔ ملاحظہ ہو علاؤالدین کا دشمنوں اور ان غداروں کے ساتھ برتاؤ جنھوں نے جلال الدین کا ساتھ دیا تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ قدیم ہندو روایات میں گہرے یقین ہی کی وجہ تھی کہ مغل شہنشاہ ہمایوں کی جلاوطنی

(گذشتہ سے پیوستہ) اس نے اپنے ان حامیوں کو سزا دی جنھوں نے اپنے قدیم آقا کے ساتھ غداری کی تھی اور اپنے دشمنوں کی جان بخشی کردی (تفصیلات کے لیے دیکھیے برنی ص ۲۵۰-۲۵۱) ایک معاملے میں سلطان نے اور زیادہ سختی کی۔ حاجی دبیر کے بیان کے مطابق اس نے سابق غدار سپہ سالار محمد شاہ کو بڑے تزک واحتشام سے دفنایا جو اپنے قدیم ہندو آقا ہمیر دیو کا اپنے آخری دم تک وفادار رہا تھا۔ اس واقعے کی تفصیلات بہت مشہور ہیں۔ اس کی موت کے بعد سلطان نے بڑی عزت سے اس کی تجہیز و تکفین کی اور بتایا کہ وفاداری کا جذبہ خواہ دشمن میں ہو اس کی تعریف کرنی چاہیے (تفصیلات کے لیے دیکھیے ظفرالبار جلد دوم ص ۸۱۰) سلطان محمد تغلق نے اپنی سوانح میں دعویٰ کیا ہے کہ (برٹش میوزیم قلمی نسخہ ص ۳۱۶ ب) وفا باز خسرو خاں کے خلاف لڑنے کا اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ اس سے اپنے مشترکہ آقا سلطان مبارک شاہ خلجی کے خاندان کی توہین اور بے عزتی کا انتقام لے۔ اسی طرح فیروز تغلق کے خیال کے مطابق ملک کافور کے مقبرے کی مرمت کرانا خدا ترسی کا کام تھا کیوں کہ وہ جو اپنے آقا کے ساتھ نمک حلالی کے لیے مشہور تھا اور اسے حکومت کا وفادار تصور کیا جاتا تھا۔ (دیکھیے فتوحات فیروز شاہی ص ۱۳) نیز برنی نے فیروز تغلق کے ایک امیر کی تعریف کی ہے کہ وہ تختِ حکومت کا وفادار رہا۔ (دیکھیے برنی ص ۵۸۴) اس نظریے کی وضاحت کے لیے دو اور واقعات بیان کرنے ضروری ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیر خاں (یعنی شیر شاہ) جب ایک رات صرف چند ساتھیوں کے ہمراہ تھا تو مغل فوج نے اچانک اس پر حملہ کردیا اس کے ایک افسر نے جس کا نام سیف خاں تھا ہمایوں کو روکنے کی پیش کش کی تاکہ شیر شاہ بچ کر نکل سکے۔ علی الصبح اس نے اپنے بھائیوں کو جمع کیا اور اپنے آقا کے لیے قربان ہو جانے کی خوبیاں بیان کرنا شروع کردیں۔ اس نے کہا "اپنی جان دینے سے کبھی گریز نہ کرو کیوں کہ موت سے ہر حال میں ہمکنار ہونا ہے اور کوئی بھی فانی شے اس سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ تمھارا آقا جو زمانۂ امن میں تمھاری کفالت کرتا ہے اور تمھیں آسانیاں فراہم کرتا ہے اس کے بدلے میں تم سے توقع کرتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو تم اس کے لیے جان بھی دے دو۔ اس لیے تمھیں سپاہی کے وقار کو برقرار رکھنے کے لیے بغیر کسی جھجک کے دونوں جہانوں میں سرخروئی حاصل کرنی چاہیے اور فوراً اپنی جان دے دینی چاہیے"۔ سیف خاں اپنا وعظ ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس کے بھائیوں نے اسے یاد دہانی کرائی کہ کام کے دھنی باتوں میں اپنا وقت نہیں گنوایا کرتے اور وہ لوگ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے چل پڑے اور آخری سانس تک لڑتے ہوئے اپنی جانیں قربان کردیں۔ دیکھیے تاریخ شیر شاہی ص ۱۴۱ ب۔

دوسرا واقعہ ہمایوں کے وفادار افسروں اور ساتھیوں سے متعلق ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار کامران نے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اور غریبی کی مشکلات میں بھی ان چالیس ہندوستانی محافظوں کے ہاتھوں میں اپنی زندگی کو زیادہ محفوظ سمجھا اور ان لوگوں نے بھی جملہ مصائب میں اس کا ساتھ دیا۔ اس کے برخلاف ان لوگوں پر اُسے بھروسہ نہ تھا جن کے ساتھ اس کا خونی رشتہ تھا۔[۱]

(ب) کسی ہم مرتبہ یا دوست کے ساتھ وفاداری

کسی ہم مرتبہ فرد کے ساتھ وفاداری میں اس کا عہدہ یا رتبہ اور نمک خوری کا فرض حائل نہ ہوتا تھا بلکہ صریح وجوہات کی بناپر دوستی اور رفاقت کے جذبات کی کشش زیادہ تھی۔ اس میں وہ دوستانہ تعلقات بھی شامل ہیں جو مختلف سماجی مرتبہ کے افراد کے درمیان ہوتے تھے مثلاً حاکم اور اس کی رعایا کے تعلقات یا کسی فوجی افسر اور اس کی زیر کمان سپاہیوں کے تعلقات[۲]۔ دوستی اور رفاقت کو عام طور پر اصطلاحاً یاری کہا جاتا تھا (یعنی ساتھی اور رفیق) اس میں ان تعلقات کا ایک رومانی نقطہ نظر یہ شامل تھا مثلاً دوستی کو لافانی تصور کیا جاتا تھا۔ یہ ایک فرد کا اپنے دوست سے مکمل اور غیر مشروط تعلق ہوتا تھا جس کا مطلب تھا زندگی بھر کی خدمت اور جاں نثاری۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے رفیقوں اور دوستوں

(گذشتہ سے پیوستہ) اچانک کابل کے قلعے پر اس وقت قبضہ کر لیا جب ہمایوں اور اس کے ساتھی شہر سے باہر تھے۔ جب واپسی پر انھوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو کامران نے ان خاندانوں کی جان لینے کی دھمکی دی جو اس کے قابو میں تھے۔ ہمایوں کا ایک افسر قراچہ خاں قلعہ کی فصیل کے قریب گیا اور چلاکر کامران کو بتایا "تمھیں یہ بات واضح طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہماری زندگی کا واحد مقصد اپنے آقا کی خدمت کرنا ہے اور موت یا خاندان کی تباہی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہم ہمایوں کی خدمت کے لیے زندہ رہیں گے اور اسی مقصد کے لیے جان دے دیں گے اور جب کہ ہم اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہیں تو ہمارے خاندان ہمارے لیے ثانوی اہمیت رکھتے ہیں" بہرحال یہ الفاظ نہ کامران کو ظلم سے باز رکھ سکے اور نہ ہمایوں کے ہمراہیوں کو غیر مشروط وفاداری سے۔ ملاحظہ ہو اکبرنامہ جلد اول ص ۲۶۴ - ۲۶۵ برائے تفصیلات

[۱] دیکھیے تذکرۃ الواقعات ص ۶۴

[۲] ایک مثال ملاحظہ ہو جس میں مغل شہنشاہ ہمایوں اپنے سپاہیوں کے ساتھ مساوی حیثیت سے وفادار رہنے کا عہد کر لیتا ہے۔ اکبرنامہ جلد اول ص ۱۸۶

کے انتخاب میں مضبوط انسانی صفات کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ کند ذہن اور کمزور ساتھیوں کے لیے خواہ وہ کتنے ہی شیریں زبان اور محبت سے پیش آنے والے ہوں ان کے یہاں کوئی گنجائش نہ تھی اور نہ ان کی جذباتی زندگی میں ان کے لیے کوئی مقام تھا۔ اس دور کے مخصوص حالات میں دوستی، خطرات اور بُرے وقت کے لیے ایک سماجی تحفظ کی ضامن ہوتی تھی۔ امیر خسرو کے الفاظ میں ایک سچا دوست وہ ہے جو دوست پر حملے کی صورت میں تلوار کا کام کرے اور بچاؤ کے لیے زرہ بکتر کا کام دے[1] اسی طرح گرو نانک ہر ایک کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے دوست چھوٹے چھوٹے دوکان داروں کو نہ بنائیں چوں کہ یہ طبقہ خود غرضی اور کمینے پن کے لیے بہت بدنام ہے۔ سکھ رہنما مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس طرح کے واقعات میں دوستی کی بنیادیں بڑی کمزور ہوتی ہیں[2]

ہندو اور مسلم سماجی تاریخ سے دوستی کی لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہم صرف دو مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ تاریخ مغلیہ کے طالب علم ہمایوں کے سگے بھائی شہزادہ کامران کے نام اور ہمایوں کے خلاف اس کی کئی بغاوتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ چند ہی لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ وہ بہ ظاہر کسی قدر کھرا اور بے درد تھا لیکن اس کے دل میں الفت کا مادّہ تھا اور اس میں دوست بنانے اور دوستی کو قائم رکھنے کی صلاحیت تھی۔ جب آخر کار کامران گرفتار ہو کر اندھا کر دیا گیا تو ہمایوں نے اسے جلا وطن کر کے مکہ روانہ کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب نابینا شہزادہ جلا وطنی کی زندگی گزارنے کے لیے جا رہا تھا تو شہنشاہ نے کوکہ نام کے ایک مشترکہ دوست سے دریافت کیا کہ وہ شہزادے کی رفاقت میں جلا وطنی کی زندگی گزارنا پسند کرے گا یا عیش و عشرت کی زندگی گزارنا اور عنایاتِ شاہی سے فیض یاب ہونے کو ترجیح دے گا۔ کوکہ نے بلا معمولی تردد کے نابینا جلا وطن کے ہمراہ جانا پسند کیا اور شہنشاہ کو بتایا کہ دوستی اور ذاتی عقیدت کے امتحان کا یہی موقع ہے اور ایک قدیم دوست کی خدمت ایسے ہی وقت پوری جا سکتی ہے۔ لہٰذا کوکہ نے خود عائد کردہ جلا وطنی کی زندگی کو ترجیح دی[3]

---

[1] دیکھیے مطلع الانوار ص ۱۰۷-۱۰۸

[2] دیکھیے میکالف جلد اول ص ۱۲۲

[3] دیکھیے اکبرنامہ جلد اول ص ۳۳۱۔

رفاقت کی دوسری مشہور مثال وہ دوستی ہے جو دو مغل امرا بیرم خاں اور ابوالقاسم میں تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیر شاہ کے ہاتھوں مغلوں کی شکست کے بعد مغل امرا منتشر ہو گئے اور جان بچانے کے لیے پناہ کی تلاش میں تھے۔ بیرم خاں چوں کہ ہمایوں کا بھروسے کا سردار اور مغل فوج کا سپہ سالار تھا اس لیے افغان اس کی تلاش میں تھے اور اسے گرفتار کرنے کے لیے پورا انتظام کر چکے تھے۔ بیرم خاں اور اس کا دوست اپنی جان بچانے کے لیے تیزی سے سفر کر رہے تھے اور گجرات کی آزاد اور دور افتادہ حکومت میں بحفاظت پہنچنے ہی والے تھے کہ اتفاقاً وہ ایک افغان ایلچی کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ یہ ایلچی گجرات سے لوٹ رہا تھا۔ افغان کو شبہ ہوا کہ ان میں سے ایک قیدی بیرم خاں ہے لیکن یہ بات وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ دونوں میں سے بیرم خاں کون ہے۔ بیرم خاں نے بڑے سکون، وقار اور ہمت سے افغان کو بتایا کہ وہ خود بیرم خاں ہے جس کی افغانوں کو تلاش ہے۔ ابوالقاسم زیادہ دل کش شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے بیرم خاں کو بات نہیں ختم کرنے دی اور نہ اتنا موقع دیا کہ افغان کوئی رائے قائم کرے۔ اس نے گفتگو میں دخل اندازی کی اور افغان سے مخاطب ہوا۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ (بیرم خاں) اس کا بہت پرانا اور وفادار غلام ہے اور جب اس نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا اور اپنے آپ کو سپرد کر دیا تو اس نے ایک وفادار غلام کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کیا۔ لیکن وہ اپنے اور اپنے غلام کے لیے یہ بہتر خیال نہیں کرتا کہ وہ اپنی شخصیت کو پوشیدہ رکھے چوں کہ وہ خود ہی اصل بیرم خاں ہے۔ ابوالقاسم کی اس بے لاگ گفتگو سے افغان کو یقین ہو گیا۔ اس نے بیرم خان کو چھوڑ دیا اور ابوالقاسم کو شیر شاہ کے پاس لے گیا جہاں اسے وہ سزا ملی جو اس کے ساتھی کے لیے مخصوص تھی۔ جب شیر شاہ کو اس واقعہ کی اصل حقیقت کا پتہ چلا تو اس نے انتہائی طیش میں اسے قتل کرا دیا۔[1]

(ج) کسی خاص طور طریقے کے لیے وضع داری (جانبازی)

دوسری اور اتنی ہی قابلِ قدر خوبی کسی خاص طرز یا برتاؤ کے لیے وضع داری کا جذبہ تھا۔

---

[1] ایضاً ص ۳۰۲

روایت کو اس دور میں بہت مقدس اور لازمی ورثہ تصور کیا جاتا تھا۔ جنگجو طبقوں خصوصاً راجپوت اقوام کی نظروں میں روایات کو مقدس اور اہم مقام دیا جاتا تھا۔ سلاطین دہلی کے خوفناک انتقام اور غضب سے بچنے کے لیے جو لوگ راجپوتوں کی پناہ میں جاتے ان کی حفاظت کرنا اور انھیں پناہ دینا راجپوتوں کا عام اور مشہور طریقہ تھا۔ یہ بات بخوبی واضح ہوئی تھی کہ راجپوت سردار کے لیے سلطنت کے کسی دشمن کو پناہ دینے کا مطلب تھا کہ وہ جنگ کو دعوت دے رہا ہے اور اپنے خاندان کی تباہی پر تلا ہوا ہے۔ جنگجویانہ روایات میں بہرحال یہ امر قابلِ نفرت تھا کہ ایسے مواقع پر نتائج کی پروا کی جائے۔ ان کی غیرت اس بات کو گوارا نہیں کرتی تھی۔ جانبازی اور عزت کے ان جذبات کی ترجمانی کے لیے ہم چند مثالیں بیان کریں گے۔ ایسی مثالوں کے لیے قدرتی طور پر ہمارا اہم ذریعہ راجپوتوں کی تاریخ ہی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ قتلغ خان سلطان ناصرالدین کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے اور شکست کھانے کے بعد کسی پناہ کی تلاش میں تھا۔ اس نے ایک بہت چھوٹی سی ریاست سنتور کے حاکم رانا رن پال سے پناہ کی درخواست کی۔ غیور ہندو سردار نے بلا حیل وحجت اس تجویز پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ مسلم مورخ کے بیان کے مطابق اس نے اپنے خاندان کی قدیم روایات کو نباہا جس کے مطابق وہ ہر اس آدمی کی حفاظت کے لیے تیار ہو جاتے تھے جو بھی ان کے پاس آکر پناہ کی درخواست کرتا تھا[1]۔ رنتھمبور کے ہمیر دیو کا واقعہ راجستھان کی تاریخ میں مشہور ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب گجرات میں علاؤالدین خلجی کے سپہ سالار کے خلاف منگولوں نے ناکام بغاوت کی تو باغی سردار محمد شاہ نے ہمیر دیو سے اسے اپنی پناہ میں لینے کی درخواست کی اور خود کو اس کے سپرد کر دیا۔ مغرور راجپوت نے اسے بتایا کہ اب کہ وہ اس کی حفاظت میں آچکا ہے "اب یم راج (موت کا دیوتا) بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مسلمان سلطان کی تو کیا مجال ہے۔ یہ سن کر علاؤالدین خلجی بڑا غضب ناک ہوا اور اس نے ہمیر دیو کے خاندان کو ختم کر دیا اور اس کے ملک میں تباہی مچادی۔ اس واقعے کی تفصیلات کو تاریخ ہند کے طالب علم اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہر سچا راجپوت اس مشہور جنگجو کے

---

[1] دیکھیے راورٹی ص ۸۳۹

نا عاقبت اندیشانہ لیکن عظیم کارنامے پر فخر کرتا ہے [1]

دوسرے واقعہ میں ان جذبات کی ترجمانی زیادہ وضاحت سے کی گئی ہے ۔ ہم شیرشاہ کے مارواڑ پر حملہ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ افغان حملہ آوروں کے خلاف اپنے جنگجو دستوں کے ہمراہ مالدیو کی مدد کے لیے آنے والے سرداروں میں ایک کنھیا نام کا سردار بھی تھا ۔ افغان سلطان کے سلمان حملہ آوروں کی پرانی چال چلی اور متحدہ بہادر سرداروں کے درمیان ایک دوسرے کے لیے شبہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا چونکہ اسے ڈر تھا کہ وہ متحدہ قوت سے کسی بھی غیر ملکی یا افغان حملہ کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ کنھیا کو جب افغانوں کی اس چالاکی کا پتہ چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی ۔ اس نے اپنے ساتھی راجپوت سردار کو اپنی وفاداری اور مدد کا یقین دلانے کی پوری کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اور اس نے آخر میں وہی قدم اٹھایا جو ایک راجپوت خود کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اٹھا سکتا تھا۔ وہ تنہا اپنے سپاہیوں کے ساتھ دشمن سے لڑا اور جیسی کہ توقع تھی دشمن کی بڑی تعداد کے مقابلے میں اپنی جانیں قربان کر دیں ۔ راجپوت شجاعت کے اس مظاہرے سے فاتح افغان خوف زدہ ہو کر بعجلت راجپوتانہ سے چلے گئے [2]

(۵) خیرات

اعلیٰ سماجی مرتبے کے ایک فرد اور نسبتاً کمتر درجے کے مابین تعلقات کو بہتر طریقے سے رحمدلی کی ایک معمولی اصطلاح کے ذریعے بیان کیا جا سکتا ہے ۔ مثال کے طور پر جب کوئی سلطان کسی امیر کو یا امیر کسی محتاج اور غریب کو کوئی عطیہ دیتا تو اس وقت یہی نظریہ پیش نظر ہوتا تھا۔ حالاں کہ دونوں حالات میں مختلف اصطلاحیں استعمال ہوتی تھیں ۔ پہلی صورت میں اسے سخاوت کی اعلیٰ خوبی تصور کیا جاتا تھا جب کہ دوسرے واقعہ میں اسے خیرات کا ایک معمولی کام۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں وسیع پیمانے پر عطیات اور سخاوت

---

[1] دیکھیے واقعہ نگاروں کی اور خصوصاً حاجی دبیر کی تفصیلات ۔
نیز دیکھیے پرسش پریکشا ص ۱۰-

[2] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۲۸

کی عام اور بڑے پیمانے پر تشہیر کے لیے زیر مطالعہ دور خصوصاً نمایاں ہیں۔ درحقیقت عام طور پر کفایت شعاری کو تنگ ظرفی تصور کیا جاتا تھا۔ لوگوں کے مذہبی طرزِ فکر کے تجزیہ کے بعد ہر آدمی یہ تاثر آسانی سے قائم کر لیتا ہے کہ شاہ خرچی اور فضول خرچی کو سماجی عیوب نہیں تصور کیا جاتا تھا بلکہ نیکی کی اعلیٰ ترین قدر کی حیثیت سے اس کی ہمت افزائی کی جاتی تھی اور یہ یقین کیا جاتا تھا کہ اس کا بدلہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ ملے گا[1] اس کے برخلاف کفایت شعاری کو گناہِ کبیرہ اور ایک عیب تصور کیا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی لوگوں میں یہ بات ایک مذہبی عقیدے کی حیثیت اختیار کر گئی کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی خیرات کیا جائے گا دوسری دنیا میں اس کا دس گنا ملے گا[2] ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے دوکاندار سماج میں کس قدر بدنام تھے اور ان پر ملامت کی جاتی تھی اور یہ بدنامی وسطی یورپ میں یہودیوں کی بدنامی سے کسی طرح بھی مختلف نہ تھی

ان اخلاقی خیالات کے ارتقا کی وجوہات تلاش کرنے کے لیے ہمیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھیں سماجی طبقات کی معاشی بنیادوں میں تلاش کرنا ہوگا۔ اعلیٰ طبقہ میں دولت کی فراوانی تھی اور نچلا طبقہ شدید مفلسی اور احتیاج میں مبتلا تھا[3] یہ امور ہم کسی اور جگہ زیادہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ وضاحت کرنی ہے کہ مختلف سماجی طبقات کی متعلقہ معاشی حالت ایک سماجی دھکی تھی۔ آبادی کے ایک بڑے حصے کی انتہائی مفلسی کی وجہ سے دولتمند طبقے میں نفسیاتی طور پر ایک خوف و اضطراب پیدا ہوگیا تھا۔ ایسے وقت میں فراخدلی کے ان جذبات نے ایک حفاظتی اقدام کی

---

[1] دیکھیے تحفۂ نصائح ص ۱۷ اب۔ ایک حکمراں کی خوبیوں کو قدیم نظریہ کے مطابق صرف دو جملوں میں تحریر کیا ہے کہ وہ جنگ کے وقت غارت گری کرتا ہے اور زمانۂ امن میں اس لوٹ کے مال کو عطیات کی صورت میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کی فوج ہمیشہ دشمن کی مملکت پر حملہ کرتی رہتی ہے اور لوگوں کا جمِ غفیر ہمیشہ اس کی عنایات کا متنی رہتا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۵۱۔

[2] دیکھیے پدماوت (ہندی) ص ۳۰۰۔ ودیاپتی ٹھاکر نے دلچسپ مثالیں دی ہیں۔ دیکھیے پرش پریکشا ص ۲۳

[3] مثلاً دیکھیے امیر خسرو کے مشاہدات کلیات خسرو ص ۲۷۱۔

حیثیت سے ان کی مدد کی [1] موجودہ دور میں جس طرح حکومتیں قانونی طور پر لوگوں کی ذاتی املاک کی حفاظت کی ضمانت لیتی ہیں اس طرح کا کوئی نظام اس وقت نہ تھا ذاتی املاک کی حفاظت کا کوئی احساس نہ تھا۔ ہر وہ خوش قسمت ہم جو دولت منداور خوش نصیب ہو سکتا تھا جو کسی موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری فوجی طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ ایسے حالات میں لوگ اپنی دولت کو خیرات کرنا زیادہ بہتر خیال کرتے تھے بہ نسبت اس کے کہ یہ دولت ان سے زبردستی کوئی چھین لے۔ کسی دوسری شکل میں دولت کی تباہی یا ضبطی سے بہتر یہی تھا کہ لوگ اسے خیرات کر دیں [2]

انفرادی خیرات کے واقعات متعدد اور بڑے دل چسپ ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خواص خاں نام کا ایک افغان امیر جب روز صبح گھر سے نکلتا تھا تو چند خادموں کے سر پر بڑی تعداد میں مٹھائی اور چاول ہوتے تھے۔ وہ راستے میں ہر فقیر کو بیدار کرتا اور اُسے کچھ چاول، مٹھائی اور ایک چاندی کا سکہ دے کر دوسرے کی تلاش میں آگے بڑھ جاتا [3] اسی طرح اسد خاں نامی دوسرا افغان امیر نہ صرف چاول اور مٹھائی تقسیم کرتا بلکہ

---

[1] ہندوؤں میں عام عقیدہ یہ ہے کہ اصل رقم کی ایک خاص مقدار کو اگر خیراتی کاموں میں خرچ کر دیا جائے تو باقی رقم نقصان اور تباہی سے محفوظ رہتی ہے۔ دیکھیے پدماوت (ہندی) ص ۱۷۷؛ ۳۲۳۔

[2] دیکھیے امیر خسرو کے مشاہدات کے لیے مطلع الانوار ص ۱۱۲ و ۱۲۲-۱۲۳۔ ایک موقع پر عفیف نے شہرت حاصل کرنے کا ایک یقینی ذریعہ بتایا ہے یعنی ـــ شعر

فریدون فرخ فرشتہ نہ بود	ز عود و ز عنبر سرشتہ نہ بود
ز داد و دہش یافت او خسروی	تو داد و دہش کن فریدوں توئی

(دیکھیے عفیف ص ۲۹۸) ایک موقع پر اس بات کو واضح کرنے کے لیے خسرو نے استعارے کی زبان میں بات کی ہے۔ اگر کوئی زمین پر چاند سورج کی طرح چمکنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی دولت دوسروں کو دینے کی خوبی اپنے اندر پیدا کرے۔ اسی طرح جس طرح چاند سورج اپنی روشنی کا خزانہ لٹاتے ہیں۔ دیکھیے آئینہ سکندری ص ۱۴۱

[3] دیکھیے تاریخ داؤدی کا بیان ص ۱۰۰ - ۱۰۲۔

اچار چٹنیاں اور پان بھی تقسیم کرنا اور بجائے چاندی کے سکّے کے سونے کا سکّہ پیش کرتا۔[1] بلبن کے ایک کوتوال کی مثال ہم پہلے دے چکے ہیں جو ہر سال ایک ہزار کنواری لڑکیوں کے جہیز دیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کبھی بھی ایک بستر پر دوبارہ پہنتا نہ تھا بلکہ یہ سب خیرات کر دیے جاتے تھے۔[2]

خیرات کے منظم ادارے اس سلسلے میں زیادہ اہم ہیں۔ ہندوؤں کا غریبوں یا سادھوؤں کو دان دینا آج کل بھی رائج ہے رائج ہے۔ مانگنے والا اگر کھانے کو کچھ مانگتا تو اُسے آٹے کی مقررہ مقدار، گھی، چاول اور دیگر اشیا خوردنی مہیا کی جاتی تھیں۔[3] ہندوستان کے امرا اور خصوصاً مسلمان امرا کی ایک اہم خوبی مہمان نوازی تصور کی جاتی تھی۔ کسی دوسرے موقع پر ہم تحائف اور تفریحات پر امرا کے اخراجات کا ذکر کر چکے ہیں۔ بعض مواقع پر مہمانوں کی تعداد قطعی غیر معمولی حد تک حیرت انگیز ہوتی۔[4]

اسی سلسلے میں مہمانوں کی نگہداشت اور تفریح سے متعلق سرکاری محکمے کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ابن بطوطہ نے حکومتِ دہلی کے سرکاری مہمانوں سے متعلق

---

[1] تاریخ داؤدی ص ۴۸

[2] برنی ص ۱۱۷

[3] دان کے لیے دیکھیے پدماوت (ہندی) ص ۱۷۷ و ۳۲۳۔ مسلم اداروں کے بارے میں ایک رائے قائم کرنے کے لیے دیکھیے چند مثالیں۔ دہلی میں سیدی مولا کی خانقاہ میں ۲۰۰۰ من میدہ ۵۰۰ من معمولی آٹا، ۳۰۰ من کچی شکر اور ۲۰ من عمدہ شکر روزانہ استعمال ہوتی تھی (دیکھیے برنی ص ۲۰۸-۲۰۹) نیز تاریخ فیروز شاہی جلد اول ص ۱۶۱۔ مذکورہ بالا افغان امیر خواص خاں نے غریبوں کے لیے ایک خیرات خانہ قائم کیا تھا جس میں غریبوں کی رہائش کے لیے ۲۵۰۰ جداگانہ کمرے تھے۔ بلالحاظ عمر یا ضرورت روزانہ ہر فرد کے لیے دو سیر اناج مقرر تھا۔ اس مستقل ادارے کے علاوہ وہ ملک میں جہاں کہیں بھی جاتا غربا اور بیواؤں کے لیے خیمے نصب کرا دیتا تھا۔ ان خیموں میں بھی راشن، کپڑے اور بستر مہیا کیے جاتے تھے۔ سلاطین کے مقابر سے متعلق خیراتی اداروں کے سلسلے میں ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں

[4] خواص خاں نے بغیر کسی اطلاع کے چالیس ہزار گھڑ سواروں کو طعام مہیا کیا تھا۔ دوسرے موقع پر ایک دعوت میں صرف ۴۰۰ من شکر خرچ ہوئی تھی۔

انتظامات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس طرح کے انتظامات دوسری صوبائی حکومتوں اور دکن میں بھی تھے[1] جب شاہی مہمان ملک کی حدود میں قدم رکھتا تو ایک اہم عہدے دار اس کی پیشوائی کے لیے وہاں موجود ہوتا وہاں سے دہلی تک سفر تک کے لیے باورچیوں اور گھریلو لازمین کا ایک مستقل عملہ اس کے ہمراہ رہتا تھا اور سفر میں اس کی جملہ ضروریات پوری کرتا تھا۔ ان انتظامات کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے لیکن یہ انتظامات بڑے وسیع پیمانے پر ہوتے تھے راہ میں جہاں بھی قیام ہوتا اُسے بہترین غذا، پھل وغیرہ اور مشروبات پیش کیے جاتے خاطر مدارات میں معمولی کوتاہی بھی نہیں کی جاتی تھی۔ دارالخلافہ میں پہنچنے کے بعد اُسے ایک بڑی رقم پیش کی جاتی۔ اس سے اس کے جملہ خدام اور مصاحبین کی فہرست لے لی جاتی تھی۔ ان کے سماجی مرتبہ کے مطابق ان کی درجہ بندی کی جاتی اور انھیں بھی معقول رقم ادا کی جاتی تھی۔ آٹے، گوشت، شکر، گھی، پان اور دیگر ضروری اشیا بڑی نیاضی کے ساتھ سب کے لیے روزانہ مہیا کی جاتی تھیں[2]

بُرائیاں

خوبیوں کی طرح ان میں خامیاں بھی تھیں اور ان کی زندگی میں رچ بس گئی تھیں۔ انھیں مختصراً دو الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی شراب اور عورت بالفاظ دیگر لوگ مختلف قسم کی متعدد تفریحات میں ملوث تھے اور یہ ایسا گناہ تھا جو دوسروں کی نظروں سے چھپ نہیں سکتا تھا۔ جوان اور بوڑھے، ہندو اور مسلمان، امیر و غریب اس حد تک ان برائیوں میں پھنسے ہوئے تھے جس حد تک ان کی صحت اور معاشی ذرائع کفیل ہو سکتے تھے[3] انھیں نہ ان کے نتائج کی پروا تھی اور نہ شرعی قیود کی۔ کسانوں اور مزدوروں

---

[1] وبے نگر کے سلسلے میں عبدالرزاق کا بیان دیکھیے۔ بجر

[2] دہلی میں ابن بطوطہ کی آمد پر اسے دو ہزار تنکوں کی ایک تھیلی پیش کی گئی تھی۔ اس کے ملازمین اور ساتھیوں میں سے ہر ایک کو ۲۰۰ سے لے کر ۶۵ تنکے تک دیے گئے۔ اس طرح مورش سفر کے ہمراہیوں میں ۴۰۰۰ تنکے تقسیم ہوئے تھے۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۷۳-۷۴

[3] مثال کے لیے دیکھیے اعجاز خسروی جلد پنجم ص ۸۸، نیز دیول رانی ص ۳۰۹

کی بڑی تعداد سیدھی سادی اور سنجیدہ زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔

شراب نوشی

قرآن میں جس قدر سختی سے شراب نوشی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے[1]، اسی شدت کے ساتھ ایرانی روایات نے اس فعل کو جائز قرار دیا اور اس کی تشہیر کی[2]۔ موخرالذکر حالات میں شراب نوشی پر اصرار کرنا زیادہ قابلِ قبول تھا چوں کہ اس کے لیے لوگوں کو بڑے معقول انداز میں تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے لیے اس طرح کے مقولے استعمال کیے جاتے تھے جیسے "شراب تندرستی کی بحالی کے لیے بہترین مشروب ہے بشرطیکہ کم مقدار میں پی جائے۔" "زیادہ شراب نوشی اسی طرح مضرِ صحت ہے جس طرح کوئی دوسرا مفید مشروب دوا یا اکسیر"۔[3] ہندوستان سے باہر دیگر ممالک میں جہاں اسلام زیادہ موثر طریقہ پر قائم ہے مسلمانوں کے لیے قرآنی قوانین میں تاویل کرکے جواز نکال لینا عام بات ہوگئی

---

[1] قرآن مقدس ۵۔ ۹۰

[2] ایرانی روایات کے لیے دیکھیے جوامع الحکایات ص ۲۸

[3] ہم عصر دنیائے اسلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ مارکو پولو کا بیان ہے کہ چالاک ایرانی لوگوں کا اس مسئلے کے سلسلے میں اپنا الگ ہی ایک طریقہ تھا۔ وہ شراب کو اتنا ابال لیتے تھے کہ اس کا مزہ بدل جاتا تھا اور یہ میٹھی ہو جاتی تھی لیکن اس میں نشہ باقی رہتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے بعد اسلامی قانون کے مطابق یہ حرام نہیں رہتی " چوں کہ مزے کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس کا نام بھی بدل جاتا ہے " ملاحظہ ہو یول جلد اول ص ۸۴۔ جنبلی آزادی پسندوں نے بہت سے گناہوں کے لیے راہیں نکال لی تھیں۔ مثال کے طور پر ابنِ بطوطہ کا بیان ہے کہ سلطان ازبک نبیز (کھجور کا جوشش دیا ہوا رس) اتنی مقدار میں پیتا تھا کہ اسے نشہ ہو جاتا تھا اور یہ جائز تھا۔ اس کی لڑکیاں، بہنیں، امرا، دیگر خواتین اور بڑی بیگم سب اسے ترتیب وار اس کی صحت کے لیے یہ مشروب پیش کرتی تھیں اور ان محفلوں میں وہ ہر بار شریک ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود سلطان کی دینداری میں شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے کہ وہ ہر جمعہ کی نماز میں پابندی سے شریک ہوتا تھا دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم۔ ص ۲۰۸ - ۲۰۹، مجر مڑ کے مسلمان بھی اسی طرح کی ترکیبیں استعمال کرتے تھے۔ دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۹۶

ہندوستان میں جہاں کا پورا طرز فکر واضح طور پر دنیاوی تھا بہت کم لوگ شراب نوشی کی عادت پر نادم تھے ۔ اس کے برخلاف لوگ پورے جوش وخروش سے اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے حتیٰ کہ کچھ لوگ اسلامی احکام کو رد کرنے میں بے جا فخر محسوس کرتے تھے ۔ درحقیقت ایک ہندو مذہبی مصلح کو بنگال کی حکومت کا نقشہ کھینچنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اصطلاح نہ ملی کہ " یہ ملک کثرت سے شراب نوشی کرنے والے ایک مسلمان سلطان کی سرزمین ہے "۔[1]

مسلمانوں میں بمشکل ہی کوئی ایسا سماجی طبقہ ہوگا جو شراب نوشی کا عادی نہ ہو خواتین کا شراب نوشی کرنا اور آزاد زندگی گزارنا عام بات تھی ۔ بچوں کے اساتذہ شراب نوشی میں مبتلا تھے حالاں کہ بہت سے علما اس سے اپنا دامن بچائے ہوئے تھے لیکن مذہبی حلقوں میں بھی خفیہ طور پر شراب نوشی کی جاتی تھی اور سپاہی اور فوجی لوگ نہ صرف شراب نوشی کے عادی بلکہ بڑے شوق سے اور عام لوگوں کے سامنے شراب نوشی کرتے۔[2] شراب نوشی

---

[1] سرکار ص ۱۹۲ - حسن نظامی کے مشاہدات کا حوالہ ہم صفحات بالا میں دے چکے ہیں (ملاحظہ ہو تاج المآثر جلد دوم ص ۶۴) کہ ان بیوقوفوں کے علاوہ شراب نوشی سب کے لیے جائز ہے جن کے اوپر شریعت مسلط ہے - نیز دیکھیے خسرو کا بیان (قران السعدین ص ۱۳۱) کہ نمک (یعنی مسالے دار چٹنی) کی وجہ سے شراب حلال ہو جاتی ہے - اس موقع پر لفظ نمک کا ذو معنی استعمال کیا ہے ۔ مثال کے لیے دیکھیے برنی ص ۶۲ جس میں بتایا گیا ہے کہ سرکاری حکام کو رشوت میں شراب پیش کی جاتی تھی۔

[2] خواتین کی شراب نوشی کے لیے دیکھیے مطلع الانوار ص ۱۹۴ - نیز موجودہ زمانے میں جنوبی ہند میں عورتوں کی خفیہ طور پر شراب نوشی کے لیے ملاحظہ ہو کلونز اسلام ان کروکس ص ۴۷ - ایک اتالیق کی مثال جس میں شراب نوشی موت کا باعث بنی دیکھیے عفیف ص ۵۰۰ - نیز دیکھیے فقہ فیروز شاہی میں دلچسپ بحث ص ۱۴۱ - جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض حالات میں لوگ جب نشے میں ہوتے تھے تو اپنی بیویوں کو طلاق دے دیتے تھے اور نشہ اترنے کے بعد رجوع کرنا چاہتے تھے ۔ اس سے متعدد پیچیدگیاں پیدا ہوتی تھیں چوں کہ فقہ حنفی کے مطابق بعض حالات میں طلاق مکمل اور ناقابل رجوع ہو جاتی ہے ۔ مذہبی طبقہ سے متعلق افراد کی شراب نوشی کی متعدد دلچسپ مثالوں کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں دیکھیے راورٹی ص ۵۴۷، جس میں ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جو منشیات سے مکمل پرہیز کرتا تھا اور چوں کہ یہ ایک غیر معمولی مثال تھی اس لیے اسے تحریر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کی محفلوں کی مختلف شکلیں اور تقریبات دھیرے دھیرے عروج پاتی رہیں۔ حاکموں کے جام صحت تجویز کرنے کی خصوصی تقریبات وسیع پیمانے پر منائی جانے لگیں۔ جام صحت نوش کرنے کی تقریبات بڑے پیمانے پر ہونے لگیں۔ ایسے موقع پر احباب اور مہمان ایک قطار میں اپنے اپنے جام سامنے رکھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ شراب کے چند قطرے زمین پر گراکر وہ لوگ اس تقریب کی ابتدا کرتے تھے۔ اس کے بعد سب اپنے پیالے بیک وقت اوپر اٹھاتے تھے۔ محفل کا سربراہ تندرستی کے لیے دعا کرتا۔ جملہ موجودہ افراد اس میزبان یا خصوصی مہمان کی طرف دیکھتے جس کا جام صحت تجویز کیا جاتا اور اس کے بعد سب اپنے جام نوش کرتے۔[۵۰] کسی دشمن پر فتح حاصل کرنے کے بعد خاص طور پر محفل شراب نوشی منعقد کی جاتی تھی۔[۵۱] ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ شراب نوشی کی محفلیں تہواروں اور دیگر عام تقریبوں پر بھی منعقد کی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی غمگین افراد بھی اپنے رنج و غم کو بھونے کے لیے شراب نوشی کرتے تھے۔[۵۲] اصولی طور پر شراب دوستوں کے ساتھ محفل میں پی جاتی تھی۔ مشروب کے ساتھ تلی ہوئی چیزیں بھی بطور گزک کھائی جاتی تھیں۔ عام لوگ سستی جو کی شراب اور وہسکی پیتے تھے جو آسانی سے مل جاتی تھیں۔[۵۳]

(گذشتہ سے پیوستہ)

کہا گیا۔ امیر خسرو نے بڑے تلخ الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "علما اسی سینے میں شراب انڈیلتے ہیں جس میں قرآن محفوظ ہوتا ہے"۔ دیکھیے مطلع الانوار ص ۵۸) ایک موذن کے منہ سے اس وقت شراب کی بو آرہی تھی جب وہ مسجد میں داخل ہوا۔ (دیکھیے اعجاز خسروی جلد چہارم ص ۱۷۵) ایک تارک الدنیا بزرگ نے سلطان کی صحبت میں خفیہ طور پر شراب نوشی کی اور اسے نشہ ہوا۔ دیکھیے مطلع الانوار ص ۸۵ ایک مشہور افغان میاں بایزید کا واقعہ جو مغلوں کے خلاف جنگ میں اس وقت مارا گیا جب وہ بالکل حالتِ مدہوشی میں تھا۔ دیکھیے تاریخ شیر شاہی ص ۳۳ نیز اکبر نامہ جلد اوّل ص ۱۳۱ پر تحریر ہے کہ مٹھی بھر مغلوں نے شراب کے نشے میں بدمست ہوکر گجراتیوں کے جم غفیر کو منتشر کر دیا۔ ہندوؤں میں شراب نوشی کے لیے دیکھیے ٹیپل ص ۲۲۶۔ پدماوت (ہندی) ص ۱۴۶۔ شاہ ص ۱۹۳۔ یہ لوگ بعض اوقات معمولی عقل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔

۵۰ ملاحظہ ہو قران السعدین ص ۱۳۳

۵۱ فتح کے بعد جشن شراب نوشی کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۵۱-۵۲

۵۲ مثال کے لیے دیکھیے ایضاً ۳۴ ۱۹۳

۵۳ خسرو کے مشاہدات کے لیے دیکھیے آئینہ سکندری ص ۲۲ و مطلع الانوار ص ۷۸

حکومت شراب نوشی کی برائیوں سے بے اعتنائی برتتی تھی۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ایک موقع پر ایک سرکاری تقریب میں شراب اور دیگر مشروبات عوام کو مفت مہیا کیے گئے تھے۔ صرف علاء الدین خلجی ایک ایسا حکمران تھا جس نے شراب نوشی کو ختم کرنے کی ایک بار کوشش کی۔ اسے بذاتِ خود شراب نوشی پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن وہ چند انتظامی امور کی بنا پر شراب نوشی پر پابندی لگانا چاہتا تھا۔ ایک مختصر عرصے کے لیے اس نے شراب کی کشید اور فروخت بند کرنے کی غرض سے بڑے وسیع پیمانے پر جاسوسی کا محکمہ قائم کیا اور خلاف ورزی کرنے والوں کو بڑی سخت سزائیں دیں۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے پھر چوری سے شراب فروشی کے پرانے طریقوں کو اپنا لیا۔ شراب کی ناجائز طریقے سے خرید و فروخت مشکوں میں بھر کر، سوکھی گھاس اور ایندھن میں چھپا کر اور دیگر ہزاروں طریقوں سے کی جانے لگی۔ آخر کار سلطان کو اپنے اقدامات میں تبدیلی کرنی پڑی لہٰذا ایک نیا قانون وضع کیا گیا جس کی رو سے شراب کی کشید اور فروخت پر سے تو پابندی ہٹالی گئی لیکن اس کی عام تقسیم اور شراب نوشی کو اجتماعی شکل میں ناجائز قرار دے دیا۔ اس قانون کو اس فرد سے کوئی سروکار نہ تھا جو اپنی شراب کشید کر کے اپنے گھر میں تنہا بیٹھ کر پیتا تھا[۱]۔ ہمیں بخوبی علم ہے کہ اس کے زندہ دل جانشین مبارک شاہ نے ان تبدیل شدہ ضوابط کو قائم رکھا۔

مغل شہنشاہ اکبر شراب نوشی سے متعلق بڑے وسیع پیمانے پر قوانین بنانا چاہتا تھا۔ ذاتی طور پر وہ شراب کے محدود استعمال کو مفید تصور کرتا تھا بشرطیکہ شراب طبیب کے مشورے سے پی جائے اور پینے والا اپنی صحت کا پورا خیال رکھے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس طرح کی شراب نوشی کرنے والا عوام کے لیے وبالِ جان نہ بنے اس لیے سرکاری افسران کی نگرانی میں اکبر نے سرکاری شراب خانے کھلوائے۔ شراب کی قیمتیں مقرر کر دی گئیں اور شراب کی فروخت کی تفصیلات کا اندراج رکھا جانے لگا تاکہ حکومت کے افسر اس امر سے مطمئن ہو جائیں کہ عوام کی صحت کا پورا خیال رکھا جا رہا ہے اور شراب پینے والے عام لوگوں کے لیے تکلیف دہ ثابت نہیں ہو رہے۔ عادی شرابیوں کے لیے دوسرے شراب خانے

---

[۱] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو برنی ص ۲۸۴-۲۸۶۔

کھلوائے جہاں غالباً شراب نوشی پر پابندیاں کم تھیں۔ یہ انتظامات اکبر کی بہتر سیاسی اور انتظامی سوجھ بوجھ کو ظاہر کرتے ہیں لیکن حسب معمول قدرتی طور پر تنگ نظر علما نے ان اقدامات کو غلط سمجھا[1]

اس سلسلے میں استعمال منشیات کا ذکر کرنا بے موقع نہ ہوگا جو بہر حال چھوٹے پیمانے پر چلتا تھا۔ افیون بہت سے لوگ کھاتے تھے کچھ لوگ اسے صرف نشہ کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے[2] جب کہ دوسرے لوگ کیف و سرور حاصل کرنے کے لیے۔ بعض حالات میں افیون کسی خطرناک فرد کو ختم کرنے کے لیے بھی استعمال کی جاتی تھی[3] ہمایوں بادشاہ کا افیون کھانا بہت مشہور ہے۔ راجپوت بھی افیون کھانے کے سلسلے میں بہت مشہور تھے اور اس کمزوری کے لیے اب بھی بدنام ہیں۔ عام لوگوں میں آج کل بھی افیون کھانے کا رواج ہے حالاں کہ ابھی حال ہی میں لیگ آف نیشنز کی عاید کردہ پابندیاں اس کی پیداوار اور استعمال کو کافی حد تک محدود کرنے میں کامیاب ہوئی[4] ہندوؤں کے مذہبی طبقات کا پسندیدہ نشہ بھنگ (برگ حشیش) تھا۔ مذہبی کتابوں میں اس کے متعدد حوالے ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ سکھوں کی روایات کے مطابق مغل شہنشاہ بابر نے سکھوں کے گرو نانک کو بھنگ اس طرح پیش کی تھی

---

[1] بدایونی کے بیان کے لیے دیکھیے منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۰۱-۳۰۲۔ متعصب مورخ یہ نہیں جانتا کہ شراب کیسی ہوتی ہے اس لیے اسے اس حد تک شبہ ہے کہ یہ بھی سور کے گوشت کا جزو ہوتی ہے واللہ عالم بالصواب۔

[2] پرش پریکشا کا بیان دیکھیے ص ۱۲۳

[3] بے چاری عورتوں کی افیون کھا کر خودکشی کے لیے دیکھیے ایضاً۔ امیر خسرو کا خیال ہے کہ ملک کافور کی موت افیون کی وجہ سے واقع ہوئی تھی دیکھیے دیول رانی ص ۲۶۵-۲۶۶۔

[4] افیون کے استعمال کے لیے دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد ہشتم ص ۳۰۸-۳۰۹۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں میں افیون کے استعمال کے لیے دیکھیے ہرکلوٹز اسلام ازکروک ص ۳۲۵۔ ٹوڈ نے (جلد دوم ص ۴۹۰) راجپوتوں میں افیون کھانے کے متعدد واقعات نقل کیے ہیں Watts Dictionary کے مطابق عربوں نے خصوصیت کے ساتھ مشرق میں پوست کے پودے کی اشاعت کی۔

جس طرح کوئی ایک درویش ایک مقدس تحفہ دوسرے درویش کو پیش کرتا ہے[1]
تمباکو نوشی کی ابتدا زیر مطالعہ دور کے بعد ہوئی اس لیے اس سے براہ راست ہمارا
کوئی تعلق نہیں ہے۔ غیر معمولی حالات میں زہر کے دفیعے کے لیے زہر ہی استعمال کیا جاتا تھا
قدرتی طور پر یہ عادت ان شہزادوں تک ہی محدود تھی جنھیں ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ
کوئی انھیں زہر نہ دے دے۔ ہندو قصے کہانیوں میں عام طور پر زہر کنیا موجود ہے۔ گجرات
کے محمود شاہ اور محمد شاہ دونوں بڑی مقدار میں زہر کھانے کے لیے مشہور ہیں[2]

۲۔ عصمت فروشی

عصمت فروشی کا پیشہ بعض لحاظ سے ہندوستان میں قدیم زمانے سے رائج تھا
ہم اب دکن کی دیو داسیوں کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔ زیر مطالعہ دور میں مقدس
مندروں میں لڑکیاں پیش کرنے کی روایت کافی مضبوط تھیں۔ قدیم ہندو کتابوں میں عصمت
فروش عورتوں کا عام طور پر ذکر ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت سے مواقع پر قابل
احترام تصور کی جاتی تھیں اور کافی مشہور تھیں۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے بہت
پہلے علم جنسیات خصوصاً کام سوتر پر متعدد تصنیفات ہوئیں جنھیں اس علم کی وضاحت
کے لیے بہترین تصانیف تصور کیا جاتا ہے[3] سلاطین اور امرا کے حرم اور ان میں رہنے
والی بیگمات کی وسیع تعداد کے بارے میں ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔
علاؤالدین خلجی کے زمانے کے ایک واقعے سے جنسی معاملات میں عام مسلمانوں کا طرز فکر

---

[1] دیکھیے میکالف جلد اول ۱۲۰ - ۱۲۵ - موجودہ استعمال کے لیے دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد XX ص ۲۹۳۔

[2] عام لوگوں میں رائج متداول روایات وعقائد میں حوالہ جات کے لیے دیکھیے پرشش پریکشا ص ۸۲ - مظفر شاہ کے زہر کھانے کی تفصیلات کے لیے دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۲۲

[3] جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرز میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ کام سوتر کی تصنیف مغربی ہندوستان میں تیسری صدی عیسوی میں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۲۱ء ص ۱۴۱ - ۱۱۷ -

بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ تاریخ فرشتہ کا بیان ہے کہ ایک بار کسی درباری نے خلجی سلطان سے شکایت کی کہ حالاں کہ سلطان نے استعمال کی جملہ ضروری اور پسندیدہ اشیا کو مقررہ قیمت پر فروخت کرنے کا انتظام کیا ہے لیکن بازار میں جس شے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اس کی قیمت کا تعین نہیں کیا گیا۔ سلطان کو یہ محسوس کر کے کسی قدر حیرت ہوئی کہ عصمت فروش عورتیں اب تک اس کی نظروں سے بالکل بچی رہیں تھیں کیوں کہ ان کے مکانات سپاہیوں کے لیے پسندیدہ جگہیں تھیں اور ہزاروں نوجوان ان کے فریب میں اپنی زندگیاں برباد کر چکے تھے۔ سلطان نے اس شکایت کو مسکرا کر سنا، ان کا بھاؤ مقرر کر دیا اور ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے مقررہ بھاؤ سے زیادہ رقم وصول کرنا سختی سے ممنوع قرار دیا گیا[1] اس دور کی منظوم تصانیف اور صوفیوں کی لکھی ہوئی کتب میں متعدد مقامات پر جسمانی اور نفسیاتی محبت کا ذکر ملتا ہے جو اس دور کے عام جنسی رجحان کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایسی حالت میں عصمت فروشی کے رواج اور اس کے وسیع پیمانے پر وجود کو ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں دہلی میں عصمت فروش عورتوں کی وسیع تعداد سے حکومت کو تشویش ہوئی۔ آخر کار اس تعداد کو کم کرنے کے لیے بہت سی ایسی عورتوں کی شادی کر دی گئی تاکہ اس پیشے کو فاحشہ عورتوں کی کثرت سے نجات مل جائے[3]

---

[1] دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۹۹۔

[2] دیکھیے بازاری عورتوں کی شہوت پرستی کے سلسلے میں امیر خسرو کا بیان۔ اعجاز خسروی ص ۸۸ ۸۹۔ چالاک شوہروں کی نظر وں میں فاحشہ عورتیں جذبات کی تسکین کے لیے عظیم خزانے کی حیثیت رکھتی تھیں دیکھیے پرشن پریکشا ص ۱۳۶ ۔ ملک محمد جائسی نے سنگھل کی فاحشہ عورتوں کے ایک بازار کا ذکر کیا ہے جو چھجوں میں بیٹھ کر اپنے غمزہ و ادا سے لوگوں پر جادو کرتی تھیں۔ دیکھیے پدماوت ص ۵۷۔ جنوبی ہند کے لیے دیکھیے نکولو کونٹی کا بیان اس نے ایک شہر کی ہر گلی کو فاحشہ عورتوں سے پُر پایا جو خوشبوؤں، نرم تیلوں کی مالش اور کم سنی کے ذریعے لوگوں کو لبھاتی تھیں۔ دیکھیے زیمپٹن ص ۱۳۷-۱۳۸۔

[3] دیکھیے امیر خسرو کے مشاہدات کے لیے خزائن الفتوح ص ۹۔

عصمت فروشی کے خلاف حکومت نے جو بھی اقدامات کیے وہ کسی اخلاقی یا مذہبی اصلاح کے پیش نظر نہیں کیے اور مذہبی بنیادوں پر عصمت فروشی کو ختم کرنے یا ممنوع قرار دینے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برخلاف، جیساکہ ہم بیان کر چکے ہیں حکومت اس پیشے کو قانونی شکل دینے میں معاون ہوئی اس لیے کہ یہ پیشہ حکومت کے لیے آمدنی کا ایک ذریعہ بھی تھا۔ عصمت فروش خواتین رقص وموسیقی سے بھی گہرا تعلق رکھتی تھیں جس کا سماجی تفریحات میں اہم مقام تھا۔ اس سلسلے میں مغل شہنشاہ اکبر ایک قدم اور آگے اٹھانا چاہتا تھا بالکل اسی طرح جس طرح اس نے شراب نوشی کے سلسلے میں کیا تھا۔ دہلی کے بیرونی علاقے میں اس نے عصمت فروش عورتوں کے لیے جداگانہ رہائشی مکانات تعمیر کرا دیے تھے جس کو وہ مزاحاً شیطان پورے کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ سب عصمت فروش عورتوں کو وہاں رہنے کا حکم دیا گیا۔ وہاں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے خصوصی سرکاری افسر مقرر کیے گئے جو مرد کسی عصمت فروش عورت کے ساتھ شب باشی کرنا چاہتا اس کو اپنی جملہ تفصیلات ایک رجسٹر میں درج کرنی ہوتی تھیں۔ اگر کوئی افسر یا سرکاری ملازم کسی باکرہ لڑکی سے ہم بستر ہونا چاہتا تو اسے شہنشاہ سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا ہوتا تھا۔ ان قواعد کی خلاف ورزی پر بڑی سخت سزا دی جاتی تھی[1]

یہ ذکر نامکمل رہ جائے گا اگر ہم گمراہ کن اور مخرب اخلاق جنسی طور طریقوں کا ذکر نہ کریں جس کے لیے وافر شواہد موجود ہیں۔ ایک معشوق لڑکے کی محبت جس کا ہم عصر فارسی شاعری اور ادب میں اہم مقام ہے ایک غیر صحت بخش جنسی پیچیدگی ظاہر کرتا ہے چاہے یہ کسی اور پہلو کی طرف دلالت نہ کرتا ہو۔ غالباً غلامی اور پردے کے رواج اور آبادی کے ایک حصے کے عام گھریلو زندگی سے الگ تھلگ فوجی کیمپوں میں رہنے کی بنا پر ایک جوان لڑکے کا خوب صورت دکھائی دینا غیر ضروری تعریف اور پسندیدگی کا باعث ہوتا تھا ہو سکتا ہے وہ نفسیاتی خواہشات کا ذریعہ نہ بنتا ہو[2] بیرونِ ہند ایرانی، ترک اور سور اقلام کے

---

[1] دیکھیے منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۰۱-۳۰۲

[2] دیکھیے جام سمہ کا دل چسپ واقعہ جس کی بلا اجرت خدمت کرنے کے بے متعدد افراد اس لیے تیار رہتے تھے کہ وہ بہت خوبصورت تھا۔ منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۲۳

قبیح فعل میں مبتلا تھے[1] ہندوستان میں بھی یہی اثر محسوس کیا جا رہا تھا۔ صرف ہندو سماج اس بدفعلی سے کسی قدر محفوظ تھا۔ اس سلسلے میں لوگوں کی اخلاقی حالت غیر معمولی حد تک خراب تھی۔ معزالدین کیقباد کے اپنے مرد معشوق سے، علاؤالدین خلجی کے ملک کا فور سے اور اس کے بیٹے اور جانشین مبارک شاہ کے تعلقات خسرو خاں کے ساتھ اس قدر مشہور ہیں کہ ان کی تفصیلات میں جانا فضول ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان واضح بدفعلیوں پر مورخین یا مذہبی صوفیا نے اخلاقی یا مذہبی بنیادوں پر کوئی رائے زنی نہیں کی حالاں کہ یہی افراد تھے جنھوں نے رضیہ سلطان کو صرف اس لیے بدنام کر دیا تھا کہ اس نے پردہ ترک کر کے ایک باصلاحیت حبشی کو ایسے عہدے پر مامور کر دیا تھا جو اس سے پہلے صرف ترکوں کے لیے مخصوص تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہی اخلاقی امور سے متعلق ایک کتاب میں امرا کے لیے اغلام بازی کی سفارش کی گئی ہے[2] ایک حوالہ ایسا بھی ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ غیر فطری بدفعلی کی جاتی تھی لیکن اس سے متعلق مزید شواہد نہیں ملتے بہر حال اس بدکاری کا وجود کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے[3] خصوصاً امیر خسرو کی تصانیف میں چند اقتباسات سے اس مخصوص فعل سے متعلق انتہائی پست عادات پر روشنی پڑتی ہے[4]

اہم سماجی عیوب کی اس فہرست کو مکمل کرنے کے سلسلے میں جوئے بازی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ تفریحات اور تہواروں کے ذکر میں ہم پہلے جوئے بازی کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ جوا قدیم کھتریوں کی بہت زمانے سے قابلِ احترام روایت رہی ہے اور زیر مطالعہ دور کی طرح آج کل بھی بعض خاص تہواروں پر

---

[1] باربوسہ کے مشاہدات دیکھیے جلد اول ص ۹۱-۹۲

[2] دیکھیے فریپٹن ص ۱۳۸ میجر ص ۲۳

[3] دیکھیے قابوس نامہ (برٹش میوزیم قلمی نسخہ ص ۴۷/۴۸) بمبئی ایڈیشن میں سے یہ مخصوص عبارت حذف کر دی گئی ہے۔

[4] تحفۂ نصائح ص ۲۷ ب

[5] دیکھیے اعجاز خسروی جلد پنجم ص ۱۰۶-۱۱۳

جوئے کو مذہبی جواز کی شکل دے کر کھیلا جاتا ہے۔ یہاں صرف اتنا اضافہ کرنا ضروری ہے کہ جوئے بازی کا یہ عیب صرف ہندوؤں اور مغل شہنشاہوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ امیر خسرو نے ایک ایسے مسلمان کا ذکر کیا ہے جو سماج میں ایک اہم جوئے باز کی حیثیت سے مشہور تھا۔[1]

دیگر آداب و رسوم

(الف) ظاہری رکھ رکھاؤ اور برتاؤ۔ ہم سلطان اور طبقۂ امرا کے منصبوں اور اعزازوں کے بارے میں پہلے کچھ لکھ چکے ہیں۔ باقی لوگوں کے لیے اعلیٰ طبقے کے افراد کے رسوم، رواج اور برتاؤ مشعل راہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ ضرب المثل کہ سنجیدگی اور متانت اور ظاہری رکھ رکھاؤ انسان کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں لوگوں میں عام طور پر مشہور تھی۔ عموماً یہ یقین کیا جاتا تھا کہ سلطان کا لوگوں کی رسائی سے باہر ہونا اس کی ایک مفید ترین دولت ہے۔ لوگ اس کی عزت کرتے تھے کیوں کہ وہ اس کا دیدار ایک قابلِ احترام فاصلے سے ہی حاصل کر سکتے تھے۔[2] پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ جب امرا باہر جاتے تھے تو وہ بڑی قیمتی پالکیوں میں سوار ہوتے تھے اور عموماً ان کے آگے آرائشی ساز و سامان سے آراستہ جنگی گھوڑے ہوتے تھے۔ ان کی پالکیوں کے ارد گرد ملازم اور خدمتگار ہوتے تھے جن میں گھڑ سوار، پیدل، باجے والے، مشعل بردار، موسیقار اور دیگر ملازمین ہوتے تھے۔ مخصوص حالات میں بعض امرا کے جلوس میں نقارے بجتے تھے جب کہ وہ دارالخلافہ سے کہیں باہر جا رہے ہوں۔[3]

---

[1] دیکھیے کلیات خسروی ص ۱۳۱۳ مطلع الانوار ص ۱۵۱ میں خسرو نے ایک مسلمان جوئے باز کی قلمی تصویرکشی کی ہے۔ اس کے بیوی بچوں کو نہ کھانا ملتا ہے اور نہ مناسب لباس اور شاعر کا خیال ہے کہ اسے اپنی بیٹی کو فروخت کرنے میں بھی کوئی دریغ نہ ہوگا۔ اسے حیرت ہے کہ مسلم سماج اسے کیوں برداشت کر رہا ہے۔ جوئے کے ایک حوالے کے لیے دیکھیے مایکنٹ جلد اول ص ۱۹۰

[2] مطلع الانوار ص ۱۰۶۔

[3] دیکھیے راورٹی کی ایک امیر کی تفصیلات ص ۶۶۰۔ طبل بجوانے کے خصوصی حقوق کے لیے دیکھیے عفیف ص ۴۴۳۔

ان سرکاری طور طریقوں کا لوگوں کی انفرادی زندگی پر بھی ردِ عمل ہوا۔ وجاہت اور تکبّر ہم عصر طبقۂ امرا کی غیر معمولی خصوصیات تھیں۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ دو افراد کی باہمی جنگ بھی ہوتی تھی اور لوگ آزادانہ ایک دوسرے کو مقابلے کے لیے للکارتے تھے اور اس چنوتی کو قبول کرتے تھے۔ ذاتی وقار کے ان جذبات کو برقرار رکھنے کے لیے متعدد جنگیں لڑی گئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وارنگل کے راجہ نے سلطان مبارک شاہ خلجی کے سپہ سالار کو اپنے جملہ ذخائر اور خزانے سپرد کیے اور موخرالذکر پھر بھی مشتبہ رہا کہ شاید راجہ نے اپنے وعدے کو ایمانداری سے نہیں پورا کیا ہے۔ یہ الزامات راجہ کے گوش گزار کیے گئے۔ راجہ اگرچہ سلطان کے سپہ سالار کے مقابلے میں خود کو بالکل لاچار اور مجبور محسوس کرتا تھا لیکن اس کے باوجود راجہ نے بے خوف ہو کر باوقار انداز میں یہ کہلوا دیا کہ وہ اس سلسلے میں مزید وضاحت نہیں کرے گا۔ راجہ نے فخر سے اُسے بتایا کہ وہ خان کی دھمکیوں اور عنایات کی کس حد تک پروا کرتا ہے اسے وہ اچھی طرح جانتا ہے[1] راجپوتوں اور حتیٰ کہ مسلمانوں کی تاریخ سے اسی طرح کی دیگر مثالیں پیش کرنا غیر ضروری ہے۔ امیر خسرو نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اعلیٰ طبقہ کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے وہ کہتا ہے کہ ایک کوہ کی خاموش بلندیاں اپنے وقار اور اپنی شان و شوکت کی حفاظت خود کرتی ہیں[2]

لیکن اس کے باوجود لوگ انتہائی اخلاق اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہم یہ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ صنفِ نازک کے ساتھ لوگ عام طور پر بہت اخلاق سے پیش آتے تھے۔ اسی طرح جب کوئی کسی امیر سے ملنے آتا تھا تو موخرالذکر اپنی نشست سے اٹھ کر اور مہمان کی طرف چند قدم چل کر اس کا استقبال کرتا تھا۔ مہمان کو دیوان خانے میں لاکر وہ اس بات پر مصر ہوتا کہ مہمان پہلے تشریف رکھے جو عموماً امیر کی اپنی نشست

---

[1] کلیات میں امیر خسرو کے بیان کے لیے دیکھیے ۶۹۶۔ نیز ہندوؤں میں ایمان داری کی مخصوص مثالوں کے لیے دیکھیے جوامع الحکایات ص ۸۶۔

[2] مطلع الانوار ص ۱۱۳

سے زیادہ آرامدہ اور اونچی ہوتی تھی اور مہمان کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کے قریب بیٹھے ناشتہ کے لیے موسم کے تازہ پھل سے فوراً اس کی تواضع کی جاتی تھی۔ اگر مہمان میزبان کے لیے کوئی نذر (بھینٹ) پیش کرتا تو مہمان میزبان کی واپسی کے وقت اس سے زیادہ قیمت کا تحفہ اس کی نذر کرتا تھا۔ درحقیقت اس رسم کی پابندی ہر خاص و عام کرتا تھا اور اسے رخصتی تحفہ (دستوری رفتگان) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا[1] اس سلسلے میں ہم شاہی رسوم کا ذکر کر چکے ہیں۔ اگر کوئی امیر کسی سے رسماً ملنے جاتا تو وہ عام طور پر ایک اچھے جنگی گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا تھا۔ میزبان اپنے مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لیے کچھ فاصلے تک اس کی طرف چل کر آتا تھا۔ قریب پہنچ کر وہ اپنے اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر جاتے اور اپنی چھتریاں اور دوسری رکاوٹیں ہٹا کر ایک دوسرے کی طرف بڑھتے اور آدھے راستے میں گرمجوشی اور محبت سے بغل گیر ہو جاتے۔ اس کے بعد وہ میزبان کے گھر کی طرف روانہ ہوتے جہاں مہمان کو ہر قسم کی آسائش بہم پہنچائی جاتی اور مرغوب ترین غذاؤں سے اس کی تواضع کی جاتی[2]

(ب) گفتگو

رسمی اجتماعات میں جب تک کوئی مخاطب نہ کرے گفتگو شروع نہیں کی جاتی تھی اس تکلف کے ختم ہونے کے بعد بھی گفتگو ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھتی تھی۔ یہ گفتگو ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھتی تھی۔ یہ گفتگو عام طور پر مختصر اور خوش گوار ماحول میں ہوتی تھی۔ متکلم اپنے کارناموں اور اپنی وسیع القلبی کے حوالے دینے سے گریز کرتا تھا۔ دورانِ گفتگو بڑی نرم اور شیریں زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ گفتگو میں جارحانہ انداز پیدا نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں ایک مشہور مقولے کا خیال رکھا جاتا تھا کہ "ایک نا عاقبت اندیش گفتگو سے اکثر اوقات بڑی ناموزوں الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں" کسی بھی حال میں غیر مہذب زبان استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ گندے مذاق اور بے ہودہ گفتگو کی طرف لوگ متوجہ نہیں ہوتے تھے اور قہقہہ مار کر ہنسنے سے

---

[1] دیکھیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۸ پر ابن بطوطہ کا بیان۔ نیز اعجاز خسروی جلد دوم ص ۲۶۶ - ۲۶۵ - اور راورٹی ص ۲۲، ۷۲۳۔ بھینٹ (نذرانہ) کا رواج آج کل بھی یوپی کے دیہاتوں میں خصوصاً رائج ہے

[2] ایک مثال کے لیے دیکھیے عفیف ص ۲۳۷

گریز کیا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ گفتگو مختصر ہوتی تھی اور دورانِ گفتگو خوش گوار الفاظ استعمال کیے جاتے تھے[1]

قسم کھانے کے مسئلے کو بیان کرنا قدرے مشکل ہے۔ راسخ العقیدہ لوگ اصولاً کسی بھی حال میں قسم کھانا اچھا نہیں سمجھتے تھے[2] لیکن چند خاص مواقع پر اگر قسم کھانی پڑتی تو بڑے غور و فکر کے بعد مقدس اشیا میں سے انتخاب کر کے قسم کھائی جاتی تھی[3] قسم کھانا سپاہیوں کی عام کمزوری تھی۔ مہذب فوجی افسر صرف حقا (خدا کی قسم) پر اکتفا کرتے تھے[4] بعض معاملات میں کسی لفظ کی تصدیق کے لیے اللہ، پیغمبر، شریعت، امام، قرآن مجید، تلوار اور نمک کی قسم کھائی جاتی تھی[5] عام لوگوں کے بہ افراط قسم کھانے اور ان کے قسم کھانے کے طریقے کو دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے اپنے بیان میں قوت اور زور پیدا کرنے کے لیے ہندو لوگ عام طور پر گنگا کی قسم کھاتے تھے[6] راجپوتوں میں حاکم کا تخت اور ستی قسم کھانے کے لیے مقدس الفاظ تھے۔

چند خاص مواقع پر دوستی کسی معاہدے کو تسلیم کرنے کے رواج کا ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ راجپوتوں میں پان (بیڑا) پیش کرنے اور اسے قبول کرنے والے رشتۂ اتحاد میں منسلک ہو جاتے تھے۔ معاہدے کو تسلیم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ ایک دوسرے کو کمر کا پٹکا یا لباس کے سروں کی ایک جگہ گانٹھ لگا دیتے

---

[1] گفتگو کے اصولوں کے لیے دیکھیے مطلع الانوار ص ۱۱۳ - ۱۱۷ - ۹۶ - ۹۸ - کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۴۴

[2] دیکھیے تحفۂ نصائح کے مصنف کی رائے ص ۱۵ ب

[3] دیکھیے کلیات خسرو ص ۶۶۳ پر ایک دل چسپ مثال۔ امیر خسرو کی کسی بات سے ایک سید کی دل شکنی ہوئی۔ معذرت کرتے ہوئے شاعر نے اپنی معصومیت ثابت کرنے کے لیے انتہائی مقدس اشیاء کا حوالہ دیا مثلاً خدا، خدا کے رسول محمد اور آپ کے دس اصحاب اور آپ کی اولاد اسلام کے اماموں اور صوفیا اور آخر میں (اور یہ بہت ہی پاکیزہ اور مقدس شے تھی) یعنی اپنے پیر یا روحانی پیشوا کی جانماز۔

[4] شہزادے شہید کی مثال کے لیے دیکھیے برنی ص ۶۷ ۃ

[5] علاؤالدین نے ملک کافور سے بستر مرگ پر جو عہد و پیمان کیے ان کے لیے دیکھیے دیول رانی ص ۲۵۰

[6] دیکھیے تاریخ مظفر شاہی میں ایک حوالہ ص ۲۵

تھے اور اس کے بعد دشمن کے مقابلے کے لیے نکلتے تھے۔ ہندوؤں کی اس قدیم رسم نے بعد میں مسلمانوں میں بھی رواج پایا[1]

ج۔ ہندو اخلاق و رسوم

ہندوؤں کے اخلاق اور طور طریقے مجموعی طور پر خوش گوار اور غیر رسمی تھے اور مسلمانوں کی طرح پر تصنع اور اظہار پسندانہ نہ تھے۔ کسی ہندو گھرانے میں مہمان کی آمد پر اسے خاص طریقے سے خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ عام حالات میں مہمان کی تواضع پان اور پھولوں سے کی جاتی تھی[2] کسی خاص مہمان کی آمد پر ایک بلند چبوترہ تیار کر کے اس پر پھول بچھائے جاتے تھے اور اس کی پیشانی پر لگانے کے لیے صندل تیار رکھا جاتا تھا مہمانوں کو نظر بد کے ممکنہ اثرات سے دور رکھنے کے لیے اس کے سامنے مٹی کے دیے جلا کر آرتی اُتاری جاتی تھی[3] اگر مہمان خاندان کا گرو یا روحانی پیشوا ہوتا تو اس کی انتہائی تعظیم و تکریم کی جاتی تھی۔ اس کی آمد پر اس کے پیر خوشبودار پانی سے دھوئے جاتے تھے بشرطیکہ میزبان ان اخراجات کا متحمل ہو سکے۔ اس کے بعد اس کے پورے جسم پر صندل ملا جاتا تھا۔ اس کی گردن میں پھولوں کا ہار ڈالا جاتا اور تلسی کے پھولوں کا ایک گچھا اس کے سر پر رکھا جاتا تھا۔ ان ابتدائی رسوم کے بعد میزبان گرو کے قدموں میں لیٹ کر اور ہاتھ جوڑ کر اپنی اطاعت کا اظہار کرتا اور اپنی عقیدت کا ثبوت دیتا تھا۔ میزبان کی بیوی اپنے ہاتھ سے گرو کے لیے کھانا تیار کرتی تھی[4] گرو کی ان روایات کے موجودہ

---

[1] واقعات مشتاقی ص ۳۷ ب پر دیکھیے ایک افغان امیر میاں کالا پہاڑ کی تفصیلات نیز ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد اول ص ۳۱۲۔ ٹوڈ نے آخری دور کی مغل تاریخ سے ایک رقت انگیز مثال دی ہے جب مارواڑ کے راجہ بجے سنگھ نے یہ منظور کیا تھا۔ دیکھیے جلد دوم ص ۱۰۴۰۔

[2] دیکھیے مثال برائے پدماوت (ہندی) ص ۲۶۲۔ پداولی بنگیا ص ۵۹۔ سداما چرتر ص ۱۰۔

[3] پداولی بنگیا ص ۳۰۰۔

[4] دیکھیے سرکار ص ۵۴۔ ۱۶۷۔ سداما چرتر ص ۱۴۔ اس سلسلے میں دیکھیے ایس سکوتلا (جو کسی زمانے میں بیڑسیا کے ایم۔ پی تھے) کی رائے جس کا اظہار انھوں نے ہندوستان کے سیاسی رہنما ایم۔ کے۔ گاندھی کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں کیا تھا۔ اس خط کو متعدد ہندوستانی اخبارات نے مارچ ۱۹۲۷ء کی ابتدائی تاریخوں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہندو طور طریقوں پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے

ہندو عورت

ہندو گھرانوں میں عورت کو بہت قابلِ احترام مقام حاصل تھا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ماں کی حیثیت سے اس کے ساتھ خاص عقیدت مندانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر سفر کا قصد کرنے سے پہلے ہندو اپنی ماں کے قدموں میں جھک کر اس کی دعائیں لیتا تھا[1]۔ اس دور میں بھی ہندو ہمیشہ اپنی ماں کو بڑی عقیدت سے یاد کرتے ہیں حالانکہ شوہر اور بیوی کے تعلقات کسی حد تک رسمی ہی ہوتے تھے لیکن ان میں نزاکت اور خوشگواری ہوتی تھی۔ عقیدت کے گہرے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے ہندو بیوی شوہر کے قدموں سے اپنی پیشانی یا اپنی آنکھیں رگڑتی تھی۔ شوہر بھی اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتا تھا۔ عام لوگوں کی موجودگی میں شوہر بیوی ان حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ نئی دلہنیں حیا کی وجہ سے دوسروں کی موجودگی میں اپنی ساڑی یا لباس

(گذشتہ سے پیوستہ) میں شائع کیا تھا۔ ان ہندوستانی عوام کے جو گاندھی کے قریب سے گزرتے وقت نظریں نیچی اور ہاتھ باندھے رکھتے تھے عام برتاؤ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے ان واقعات کا ذکر کیا ہے جنھیں اس نے عینی شاہد کی حیثیت سے بوتمل میں خود دیکھا تھا۔ اس نے لکھا ہے "میں اس بات پر سختی سے معترض ہوں کہ آپ نے میرے ملک کے مردوں اور عورتوں کو اپنے پیر چھونے اور انگلیاں آنکھوں سے لگانے کی اجازت دی ہے۔ آپ کو چھونے کی رسم اچھوت ہونے سے زیادہ قابلِ نفرت ہے اور میں یہ خواہش رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہ خواہش جلد ہی پوری ہو جائے کہ دو آدمی ایک دوسرے کو نہ چھوا کریں بہ نسبت اس کے کہ ایک فرد دوسرے فرد کو اس طرح چھوا کرے جس طرح آپ کو چھوا جاتا ہے۔ پست طبقات کو اس سماج نے بالکل نااہل بنا دیا تھا لیکن یہ نیا پہلو جس میں پست طبقہ کا ایک فرد اپنے نجات دہندہ کے قدموں کی پوجا کرتا ہے، زیادہ حقیقی طور پر زندگی کو زیادہ پستی اور تنزل کی طرف دھکیلتا ہے۔ آپ میرے بارے میں کسی حد تک بھی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ میں آپ سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس لغو رواج کو ختم کر دیں۔ دیکھیے ایک کتابچہ "اِز انڈیا ڈفرینٹ" لندن سنہ ۱۹۲۷ء

[1] ایک مثال کے لیے دیکھیے ص ۹

کے پلّو سے شوہر سے ہلکا سا گھونگھٹ نکال لیتی تھیں[1] دوسرے مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات بہت رسمی تھے لیکن رسمی تعلقات میں بھی مرد عورت دونوں وضع داری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے[2]

ہندوؤں کے دیگر اخلاق وعادات میں انسانیت اور مہربانی کے ایک عام جذبہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ غریبوں میں کھانے کے سامان کی تقسیم کے علاوہ مسافروں اور پیاسے راہ گیروں کو موسم گرما میں تازہ اور ٹھنڈا پانی مہیا کیا جاتا تھا[3]

۲۔ اہنسا (یا عدم تشدّد)

اس سلسلے میں گجرات کے ہندوؤں کے ایک طبقے میں انتہائی عدم تشدد کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سرزمین ہند کے تمام ہندو جملہ جانداروں پر انتہائی ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ جانوروں کے مارنے اور خون بہانے کو عام طور پر بہت خوفناک اور نفرت انگیز تصور کیا جاتا تھا[4] گجرات میں جو جین مذہب کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس طرزِ فکر پر لوگ انتہا پسندی اور بعض اوقات مضحکہ خیز حد تک عمل کرتے تھے۔ مثلاً گجرات میں بعض لوگ کیڑوں اور پرندوں کی جان بچانے کے لیے یا انہیں

---

[1] دیکھیے پدماوت (ہندی) ص ۲۹۰۔ ایضاً ص ۲۸۰

[2] راکھی کے تہوار کی اہمیت اور تبصرہ کے لیے دیکھیے ٹوڈ جلد اول ص ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ راکھی یا رکشا بندھن کا تہوار ان چند مواقع میں سے ایک ہے جب ہندو دوشیزہ راکھی باندھ کر کسی کو اپنا منہ بولا بھائی بناتی ہے۔ بعض اوقات راکھی کو ریشم کی پیٹی کے ساتھ واپس کر دیا جاتا ہے۔ تحائف کے اس تبادلے سے دونوں افراد ایک بہت نازک اور قریبی رشتہ میں منسلک ہو جاتے ہیں اور جیسا کہ ٹوڈ کا خیال ہے کہ کسی بہتان کی وجہ سے بھی مرد کے خلوص کو کسی دوسرے تعلق کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

[3] مسلمانوں پر اس کے اثرات کے لیے دیکھیے تحفۃ النصائح ص ۲۸۔

[4] دیکھیے امیر خسرو کے مشاہدات کلیات خسرو ص ۷۰۹۔ امیر خسرو یقین کے ساتھ تحریر کرتے ہیں کہ ہندو کسان اس قدر نرم دل ہوتے ہیں کہ وہ ایک نقصان پہنچانے والے ہرن کو بھی بہلا پھسلا کر اپنے کھیتوں سے نکالتے ہیں اور کسی طرح کے غیر مناسب تشدد کے مظاہرے کی ضرورت نہیں پیدا ہونے دیتے۔ عدم تشدد پر دیکھیے ودیاپتی کے جذبات۔ پرش پریکشا ص ۱۱۲۔

قید سے محفوظ رکھنے کے لیے خرید لیا کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ لوگ فدیہ کی بھاری رقمیں ادا کرکے مجرموں کو چھڑا لیتے تھے۔ سڑکوں پر چلتے ہوئے یہ لوگ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ چونٹیاں اور دیگر کیڑے مکوڑے ان کے پیروں کے نیچے نہ کچلے جائیں۔ اس خیال سے کہ رات کی تاریکی میں کسی جاندار کو ان سے تکلیف نہ پہنچے، یہ لوگ غروبِ آفتاب سے پیشتر کھانے سے فارغ ہو جاتے تھے۔ درحقیقت مذہبی لوگوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آچکا تھا جو اپنے جسم اور بالوں میں جوؤں اور کیڑوں کی پرورش کرتا تھا اور اس وجہ سے ان کی سماج میں بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ مانگنے کا پیشہ کرنے والے چالاک لوگ ان گجراتیوں کے سامنے خودکشی کا خوف دلاکر ان سے مستقل خیرات وصول کرتے رہتے تھے۔ وارتھیما کو گجرات کے سفر کے بعد پوری طرح یقین ہوگیا تھا کہ گجراتیوں کی نجات محض اس وجہ سے ہو جائے گی کہ وہ دوسروں کے ساتھ ہرگز وہ برتاؤ نہیں کرتے جس کی توقع وہ دوسروں سے نہ کرتے ہوں۔ سمجھدار سیاح کا بیان ہے کہ ان کی انھیں خوبیوں کی وجہ سے مسلمان حملہ آور ان کی سلطنت اور ان کی خود مختاری صلاحیت سے محروم کرنے میں کامیاب ہوگئے [1]۔

دیگر معاملات میں پڑوسی کے حقوق کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور پڑوسی کی غیرحاضری میں اس کے کاروبار اور دیگر معاملات میں دلچسپی لی جاتی تھی۔ لوگ اس کے نفع کا خیال رکھتے تھے۔ اس ہمسایہ ہمدردی کی اہمیت اور انتہائی افادیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے جب ہم یہ محسوس کریں کہ بعض اوقات جنگی فرائض کی بنا پر سپاہی گھر سے دور مہینوں رہنے پر مجبور ہوتے تھے [2]۔

۲۔ انفرادی حفظانِ صحت

ہندوؤں کے طور طریقوں کی تفصیلات ان کے مذہبی خیالات کی تفصیل نہ دینے سے تشنہ رہ جائیں گی۔ یہ مذہبی خیالات مسلمانوں کے رسوم و رواج پر بھی بڑی حد تک اثر انداز ہوئے۔ ہم ذات پات اور گھریلو رسوم و رواج کی تفصیلات پہلے بیان

---

[1] دیکھیے باربوسہ جلد اول ص ۱۱۱-۱۱۲۔ وارتھیما ص ۱۰۹

[2] ایک تشریحی واقعہ کے لیے دیکھیے تاریخ داؤدی ص ۱۲-۱۵

کر چکے ہیں۔ انفرادی حفظانِ صحت کے خیالات پر مذہبی عقائد اسی قدر اثر انداز ہوئے۔ چھوت چھات اور نجس ہونے کا خوف ایک قدامت پرست ہندو پر غیر معمولی حد تک طاری رہتا ہے مثلاً (حیض) ماہانہ کورس کے زمانے میں اور اس کے بعد بارہ دن تک عورت کو نجس سمجھا جاتا تھا۔ اسے اس زمانے میں الگ تھلگ رہنا پڑتا تھا اور اسے کھانے پینے کی چیزوں یا مردوں کے کپڑوں کو چھونے یا باورچی خانے کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی[1] ہندوؤں میں نجس اشیاء کی ایک طویل فہرست تھی جس کی وجہ سے زندگی عام طور پر ناقابل برداشت ہوتی ہوگی۔ لیکن ہندو لوگ اپنی خوش تدبیری کی وجہ سے زندگی کو خوشگوار بنا لیتے تھے۔ ان نجس کرنے والی اشیا کے ساتھ ساتھ اسی قدر طویل فہرست پاک کرنے والی اشیا کی بھی تھی جو نجس اثرات کو زائل کر دیتی تھیں۔ جو لوگ ان تفصیلات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں وہ ابو الفضل کی آئینِ اکبری کی طرف رجوع کریں[2] البتہ اگر کسی پر کوئی برہمن پجاری مہربان ہوتا تھا تو اس کی زندگی کافی خوش گوار اور پسندیدہ ہو جاتی تھی۔

دیگر رسوم و رواج میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ لوگ بڑے خوش قسمت سمجھے جاتے تھے جو بہار میں دریائے کرم ناس کے مغربی سمت یا گنگا کے بالائی میدانوں میں پیدا ہوتے اور اسی مقدس علاقے میں فوت ہوتے تھے۔ تصور یہ تھا کہ جو لوگ ان جغرافیائی حدود سے باہر پیدا ہوتے ہیں وہ دوسرے جنم میں بڑی زندگی گزارتے ہیں۔ یہ عقیدہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ مقامی لوگوں میں آج بھی رائج ہے[3] ان حالات میں مسلمان ان اور اسی طرح کے دیگر ہندو میلانات و عقائد کا اثر قدرتی طور پر قبول کرنے کے لیے مجبور تھے۔

---

[1] دیکھیے آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۸۳

[2] ایضاً ص ۱۴۰

[3] دیکھیے بابر کے مشاہدات بابرنامہ ص ۲۴۲ ب۔ کرم ناس کے ضمن میں دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ عقیدہ آج تک بھی رائج ہے دیکھیے شاہ ص ۱۴۴۔ کبیر نے اس بیہودہ عقیدے کا مضحکہ اڑایا ہے جو مگھر (ضلع بستی۔ یو۔پی) میں موت واقع ہونے سے متعلق تھا۔

مسلمانوں پر ہندو ذاتوں اور گھریلو رواجوں کے اثرات کا مشاہدہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں چند اور اثرات ملاحظہ فرمایئے۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پیر اندر رکھنا ضروری تھا اور اس اصول کی خلاف ورزی موجبِ ملامت ہوتی تھی[1] اسی طرح نجاست سے بچنے کی وہ انتہائی کوشش کرتا تھا۔ مثلاً بغیر وضو کیے قرآن کو چھونا گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ مزید یہ کہ ناپاکی کی حالت میں کھانا کھانے کی ممانعت تھی۔ مسلمان کے لیے بالکل ننگا ہو کر پیشاب کرنا سختی کے ساتھ ممنوع تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرنا پرہیزگاری کی علامت تھی جو میدانوں کی گرم آب و ہوا کے عین مطابق تھا۔ روزانہ غسل، دانت صاف کرنا اور دوسرے رسوم دونوں اقوام میں یکساں تھے[2]۔

---

[1] دیکھیے منتخب التواریخ جلد اول ص ۴۶۸۔ ہمایوں نے اصول کی خلاف ورزی کی وجہ سے ایک جہلان کو سزا کے طور پر واپس بھیج دیا اور اسے اصولوں کے مطابق دوبارہ حاضر ہونے کا حکم دیا۔

[2] ہندواستان کے لیے دیکھیے کلیات خسرو ص ۷۰۶۔ لیکن وہ لوگ غسل خانہ زیادہ استعمال نہیں کرتے (فریمپٹن ص ۱۴۲) بلکہ بہتے ہوئے پانی میں نہانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ پینے کے پانی کے لیے وہ لوگ اپنے اپنے برتن رکھتے ہیں۔ (دیکھیے جلد دوم ص ۳۴۲ آئینہ سکندری ص ۳۲)۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی دلچسپ ہے کہ کھانا کھانے اور دیگر صاف ستھرے اور مناسب کاموں کے لیے صرف دایاں ہاتھ ہی استعمال کرتے تھے۔ (دیکھیے یول جلد دوم ص ۳۴۲) گھر میں داخل ہوتے وقت ہندو اپنے جوتے دروازے پر ہی اتار دیتے تھے پدماوت (ہندی) ص ۲۵۰۔ گھر کے صحن کو لیپنے کے لیے گائے کا گوبر دن میں کئی کئی بار استعمال ہوتا تھا (دار ضیا ص ۱۵۵)

اکبر کے دورِ حکومت سے پیشتر کا ہندوستان

ہندوستان کی سماجی زندگی کا یہ مختصر اور مجمل جائزہ اب اختتام پر ہے۔ اس کے بعد اکبر اعظم کے دور سے پیشتر کے ہندوستان کے سماجی ارتقا کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہوگا۔ ہم نے ابتدا ہی میں یہ بتایا تھا کہ زیر مطالعہ دور تاریخ ہند کا ایک تشکیلی دور ہے۔ چوں کہ یہ تشکیل شاہانِ مغلیہ کے دور میں ہوئی اور کسی حد تک وہی تشکیل آج بھی باقی ہے۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اکبر کے زمانے کی سرکاری تحریریں جنھیں اس کے قابل اور ذہین دوست اور مصاحب نے تحریر دیا تھا کسی حد تک نامکمل ہیں چوں کہ ان میں اکبر کے پیشرو سلاطین نے سماجی ارتقا میں جو رول ادا کیا اس کے ساتھ انصاف کرنے میں غفلت کی گئی ہے۔ سیاسی ارتقا کی تاریخ کے مطالعے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جیسے جیسے سلطنت کی سیاسی حدود میں اضافہ ہوا اسی رفتار سے سماجی اور تہذیبی ارتقا بھی ہوتا رہا اس سلسلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چند امور کے علاوہ جن کا ذکر مناسب مقامات پر آچکا ہے سماجی ارتقا کا کام بڑی حد تک سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے تک پورا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سلطنت کا انحطاط شروع ہوا۔ ہندوستان کے اس دور کے سلاطین اور اعلیٰ طبقے کے لوگ انتہائی عیش وعشرت اور شستہ وشائستہ زندگی گزارتے تھے جس حد تک اس دور کا تمدن آگے بھی بڑھ چکا تھا۔ ہر نقطۂ نظر سے دہلی کی حیثیت ایشیا بھر میں انتہائی ترقی یافتہ دارالخلافہ کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی اور اس کے بیٹے اور جانشین نے خلیفۂ اسلام کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ محمد بن تغلق جس نے خلافت کو برائے نام تسلیم کیا تھا دنیائے اسلام میں اپنی لاثانی عظمت سے پوری طرح واقف تھا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک محدود اعلیٰ طبقہ کی اس تہذیب و شائستگی کو عام لوگوں کی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ عام لوگوں میں بڑی اکثریت کی زندگی غیر مبتذل تھی اور ان لوگوں کے تہذیب و تمدّن کی انتہائی پست حالی کی نمائندگی کرتی تھی۔ عوام کی معاشی حالت کا اندازہ ان چند حوالات سے ہو سکتا ہے جو مناسب مقامات پر دیے گئے ہیں۔ اگر موجودہ جائزے میں ان کی مذہبی زندگی اور تمدن کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس میں انتہائی ضعیف الاعتقادی اور جادو ٹونا ملے گا۔ ان کے دل و دماغ میں متداول روایات و عقاید، عام گیتوں اور بھوت پریت کی کہانیوں سے آگے ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ عام لوگوں کی سیاسی زندگی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا اس لیے مشکل ہے کہ انھیں اپنے فرائض اور مالی مشکلات سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس دور کے عظیم کارناموں کا ذکر کرتے وقت ہم سماج کے نصف ثانی کی حالت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس دور کی پوری زندگی اور تمدن کو اس کے اچھے اور بُرے پہلوؤں اور اس کے حسن و قبح کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہمارے موضوع کی وسعت انحطاط کی وجوہات پر بحث کرنے کی اجازت نہیں دیتی لیکن اس مطالعہ سے ہم اتنا اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں کہ سماجی زندگی میں یہ نمایاں تضاد بڑی حد تک انحطاط کا ذمہ دار تھا۔

اس سلسلے میں مغل شہنشاہ بابر کے مشاہدات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ مشاہدات ان مورخین کے نزدیک بڑے مقبول اور اہم تھے جو اس دور کا تاریخی مطالعہ تنقیدی نقطۂ نظر سے نہیں کرتے۔ ہم دیباچہ میں بیان کر چکے ہیں کہ ابوالفضل نے اپنے سرپرست شہنشاہ اکبر اعظم کے کارناموں کو غیر ضروری اہمیت دے کر ہندوستان کی سماجی تاریخ کے ظاہری تناسب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے بانی کے

---

[۱] نکولو کونتی کے مشاہدات کے لیے دیکھیے پیرو ٹیفور۔ کونتی پیرو ٹیفور کو ہندوستان جانے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نے اسے بتایا کہ "ہندوستان میں جانے کے بعد دولت کے مظاہرے کے بڑے ناگوار مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہاں موتیوں، سونے اور قیمتی پتھروں کی فراوانی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن دیکھنے والا ان سے اس لیے مستفید نہیں ہو سکتا کیوں کہ جو لوگ انھیں پہنتے ہیں، درندے ہیں۔"

مشاہدات نے اس عام غلط فہمی کو مزید قوت عطا کی لیکن اس کی عالمانہ نیک نیتی، باریک بینی، صلاحیت اور پختہ علمی ذوق شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ وہ ایشیا کی دو قوی نسلوں منگولوں اور ترکوں کی مردانہ صفات کا مجموعہ تھا۔ ان خوبیوں میں اس نے ایرانیوں کی شائستگی کا مزید اضافہ کیا۔ ہم اس کے ممنون ہیں کہ اس نے ہندوستان میں ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں بڑے عظیم شہنشاہ اور مایہ ناز معمار پیدا ہوئے جن کے کارنامے آج بھی ان کی یاد دلاتے ہیں۔ آگرے کا تاج محل، دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ مغل دور کی شان و شوکت کی اسی طرح نشان دہی کرتے ہیں جس طرح خان خاناں کی نظمیں، بیربل کی کہانیاں ابوالفضل کی علمی فضیلت، ٹوڈرمل کی انتظامی صلاحیتیں اور ان سب نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن میں چار چاند لگائے ہیں۔ حقیقتاً مغل شہنشاہ اکبر کے بارے میں عوام الناس میں اس طرح کے قصے کہانیاں مشہور ہیں جس طرح قدیم زمانے کے بہادروں رشیوں اور مُنیوں کے بارے میں فرضی قصے مشہور ہیں۔ اس لیے مغلوں کی دین سے انکار کا تو ذکر ہی کیا ہے، ہندوستان کی تہذیبی اور تمدنی ترقی میں وہ بلند مقام کے مستحق ہیں۔

اگر ہم بابر کے مشاہدات کی روشنی میں ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا اندازہ لگائیں تو ہندوستان کو سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے ترقی یافتہ کہنا تو کجا ہم ہندوستان کو ایک مہذب ملک بھی بمشکل ہی کہہ سکتے ہیں۔ بابر نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اسے ہندوستان میں صرف ایک خوبی یہ نظر آئی کہ یہاں بڑی مقدار میں سونا چاندی اور ہر قسم کے لاتعداد کاریگر تھے۔ اس کے خیال میں ہندوستان میں خوبیاں کم ہیں۔ نہ یہاں کے باشندے خوب صورت ہیں نہ ان میں سماجی ربط ضبط کا سلیقہ ہے اور نہ وہ ملاقات کے لیے جانا اور کسی ملاقاتی کو خوش آمدید کہنا جانتے ہیں۔ نہ ان میں ذہانت ہے اور نہ وسعتِ ظرف۔ ان کی دستکاری اور دیگر کاموں کی نہ کوئی شکل ہے اور نہ موزونیت، باقاعدگی اور خوبی۔ انگور، خربوزے یا عمدہ پھل، برف یا ٹھنڈا پانی بھی نہیں ہے۔ یہاں نہ اچھی روٹی ملتی ہے اور نہ بازار میں اچھا کھانا۔ نہ یہاں گرم حمام ہیں نہ مدارس۔ نہ مشعلیں نہ شمع اور نہ شمعدان۔ اسے یہاں کی آب و ہوا بھی پسند نہیں آئی کیوں کہ اس کے خیال کے مطابق اس آب و ہوا میں ماوراءالنہر کی کمانوں کو استعمال نہیں کیا جا سکتا[1]

---

[1] دیکھیے بابر نامہ ص ۲۹۷ - ۲۹۸ - بیورج جلد دوم ص ۵۱۸ - ۵۲۰

ہندوستان کے بارے میں اتنی واضح اور مکمل عیب جوئی شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔

ہم یہ سمجھنے سے قطعاً قاصر ہیں کہ بابر نے اپنے زمانے کے ہندوستان کے سماجی ارتقا کے بارے میں اتنی بڑی اور تاریخی حقائق کے خلاف رائے کیوں قائم کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس کی آمد سے پیشتر تیمور سنہ ۱۳۹۸ء میں ہندوستان کو اس حد تک تباہ و برباد کر چکا تھا کہ اس کے بعد ۱۲۵ سال کی نسبتاً غیر مستحکم اور کمزور مرکزی حکومت خانگی جنگوں کی وجہ سے سماجی زندگی کے ڈھانچے کو بحال کرنے میں ناکام رہی۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ فطری طور پر ایک فاتح کی حیثیت سے اس نے مفتوح لوگوں کے کارناموں کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہو۔ بہر حال ہندوستان کے بارے میں اس کے اس اندازے نے اس کے پُرکشش سوانح حیات کے تکنیکی پہلو کو مجروح کر دیا ہے۔ بابر دہلی، آگرہ اور لاہور کے گرد و نواح کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ اس نے گوالیار کے محلات کا مشاہدہ بھی کیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی اس نے ہندوستان کے بارے میں ایسی رائے قائم کی۔ یہ صحیح ہے کہ ایک لحاظ سے اس کے یہ مشاہدات بالکل مبنی بر حقیقت ہیں لیکن یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ بابر نے اس نقطۂ نظر سے ہندوستان کا مشاہدہ کیا ہو۔ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ ہندوستان کے لوگوں کی بڑی تعداد کا چند لوگوں کی عیش و عشرت اور شائستگی سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر بابر نے سماجی ارتقا کے حد سے زیادہ جمہوری اور جدید ڈھنگ سے یہ مشاہدات کیے تو وہ قطعی حق بجانب ہے لیکن ہم اس نقطۂ نظر کو اس لیے تسلیم نہیں کر سکتے کیوں کہ خود اس نے اور اس کے جانشینوں نے اسی طرزِ زندگی کو نہ صرف زندہ جاوید کیا بلکہ اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کے درمیان جو خلیج تھی اُسے اور واضح کر دیا[1]۔

ہم دیباچہ میں بیان کر چکے ہیں کہ درحقیقت ترکوں اور افغانوں نے اپنے دور میں اپنے جانشینوں کے لیے نہ صرف ایک قابلِ تقلید نمونہ چھوڑا بلکہ ان کا دورِ حکومت اکبر سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کے بانی کے دورِ حکومت سے تو اس کا موازنہ کرنا

---

[1] شاہ جہاں کے دورِ حکومت کے بارے میں مورلینڈ کی رائے کے لیے دیکھیے "اکبر ٹو اورنگ زیب" ص ۳۰۲ - ۳۰۵۔

ہی بیکار ہے۔ علم و ادب اور تہذیب کے میدان میں امیر خسرو، ملک محمد جائسی، چندی داس اور مکندرام کا مقام آج بھی اتنا ہی بلند ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تلسی داس نے جو بعد کے زمانے میں پیدا ہوئے مذہبی شاعری میں انتہائی بلند اور لاثانی شہرت پائی لیکن تلسی داس جس تحریک کی پیداوار تھے اس کی ابتداء صرف اکبر سے بلکہ بابر سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ اگرچہ صنعت اور فنِ تعمیر میں مغل شہنشاہ شاہجہاں نے بڑی شہرت حاصل کی لیکن مقابلۃً "سلاطینِ دہلی اور صوبائی حکومتوں کے فرماں رواؤں کی عمارتیں بھی اس میدان میں کم نہ تھیں۔ انتظامِ سلطنت میں ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ اکبر سے پہلے کا زمانہ ہندوستان میں انتظامی لحاظ سے بہت کامیاب نہ تھا تاہم شیر شاہ سوری اور علاء الدین خلجی کا انتظام نہ صرف انتہائی کامیاب رہا بلکہ مغلیہ انتظام کا ڈھانچہ بھی انھیں کے خطوط پر خطوط پر تیار کیا گیا۔ ایک لحاظ سے زیرِ مطالعہ دور مغل دور کے مقابلے میں بلند و برتر ہے۔ یہ دور نشوونما اور صحت مند قوت کا یعنی عنفوانِ شباب کا اور ایک لحاظ سے یہ دور بلوغت کا دور تھا جب کہ آنے والے دور کے اختتام پر تنزل اور انتشار شروع ہوا۔ اول الذکر دور کے پورے تہذیبی ڈھانچے میں ہمیں قوت و توانائی ملتی ہے جب کہ بعد کے دور کی عظمت کو تنزل کے جراثیم اور قوت و نشوونما کی کمی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔[۱]

آئیے اب ہم بابر کے مشاہدات کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں۔ گہری نظر سے مطالعہ کرنے پر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کے جملہ مشاہدات کو تین اہم سماجی خصوصیات کے تجزیے کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی جسمانی حسن و خوب صورتی، سرزمین ہند کے حیوانات و نباتات اور مادی آسائشیں۔ آئیے اس کا مطالعہ ترتیب وار کریں۔

۱۔ جسمانی حسن و دل کشی

بابر نے حسن و دل کشی کے فقدان کی شکایت کی ہے۔ ہم کسی گذشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ جسمانی حسن و دل کشی حاصل کرنے کے لیے کسی طرح جاں فشانی کی جاتی تھی۔

---

[۱] مغل تہذیب سے متعلق ایک بہت دل چسپ دستاویز کے لیے دیکھیے ایک مضمون ۱۹۱۳ء J.P.A.S.B. میں از ہدایت حسین مرزا نامہ کو صلاں کو مرزا کامران سے منسوب کیا گیا ہے لیکن یہ غالباً بہت بعد میں لکھا گیا تھا۔

حتیٰ کہ اس کے مقابلے میں بعض اوقات دل و دماغ کی دیگر خصوصیات کو بھی ثانوی حیثیت دی جاتی تھی۔ جسمانی حسن کے لیے اسی قدر محنت کی جاتی تھی جتنی کہ نیکی کے حصول کے لیے کی جاتی ہے ہم عصر علوم کے طالب علم زنانہ حسن کے نمونے کی ۳۲ (یا بقول بعض ۱۶) خصوصیات سے واقف ہیں۔ ان صفات میں عورت کے جسم کا تقریباً ہر پہلو آجاتا ہے یعنی بال، گردن، ناک، لب، ابرو، مژگان، انگلیاں اور جسم کے دیگر حصے۔ عشقیہ ادب میں مکمل زنانہ حسن کے نمونے کو پدمنی کے مشہور نام سے موسوم کیا گیا ہے اور یہ لفظ آج کل عام اور کہاوت کے طور پر استعمال ہوتا ہے[1] ان لوگوں نے حسن کی رائے کو انسانوں اور دیگر اشیا کے بارے میں اہمیت حاصل ہے ان دل چسپ سوالات کا ذکر اپنی تصنیفات میں ضرور کیا ہے۔ مثال کے طور پر امیر خسرو ترکی، تاتاری، ایرانی، چینی، یونانی، روسی اور دیگر ممالک کی اس دور کی مشہور اقوام کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہندوستان کی عورتیں ان ممالک کی عورتوں کے مقابلے میں بدرجہا خوب صورت ہیں۔ دیگر ممالک کی عورتوں میں بعض صفات زیادہ تھیں اور بعض شدت سے کم تھیں لیکن صرف ہندوستان کی خواتین ہی جملہ اخلاقی جسمانی اور ذہنی صفات سے متصف تھیں۔ باوجودیکہ خسرو کے اس خیال میں اس کی حب الوطنی کے جذبات کو بھی دخل ہے لیکن اس کے اس خیال کو قطعی طور پر یکطرفہ نہیں کہا جاسکتا[2] اس لیے کہ اس کی رائے کو دوسرے لوگوں کی تحریروں کو بھی تقویت ملتی ہے[3]

---

[1] دیکھیے پدماوت ص ۷۶ - ۷۷۔ ہندی عبارت ص ۲۱۴ جس میں ایک پدمنی عورت کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

[2] امیر خسرو کے اندازے کے لیے دیکھیے دیول رانی ص ۱۳۳ - ۱۳۴۔ حالاں کہ شاعر کو کسی حد تک چہرے کے سرخی مائل رنگ کا احساس ہے لیکن وہ اپنے اس خدشہ کو یہ سوچ کر دور کرتا ہے کہ گیہوں کا رنگ بھی سرخی مائل ہے جس نے مسلمانوں کی روایات کے مطابق آدم علیہ السلام کو ورغلایا اور اس طرح بلاواسطہ دنیا کی تخلیق کا باعث بنا۔

[3] دیکھیے ہم عصر کشمیری عورت کے بارے میں ذکریا قزوینی کی رائے (Wustenfeld ایڈیشن ۶۹) نیز دیکھیے راجپوت خواتین کے لیے ٹوڈ۔

۲۔ حیوانات ونباتات

دیگر اشیا کے ساتھ ساتھ بابر نے پھلوں کی کمی کی بھی شکایت کی ہے۔ اس میں وہ کسی حد تک حق بجانب ہے کیوں کہ اس کے دعوے کے مطابق ہندوستان میں خربوزے کا کاشت کا بانی وہ خود ہی ہے لیکن اس کی وجہ سے ہندوستان کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا ہے اس میں وہ حق بجانب نہیں ہے کیوں کہ ہندوستان میں ہمیشہ پھلوں اور پھولوں کی کثرت رہی ہے اور جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ہندوؤں کی مذہبی اور سماجی تقاریب پر پھولوں اور پھلوں کے استعمال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہم پہلے کسی دوسرے موقع پر اس سلسلے میں لکھ چکے ہیں لیکن اس موقع پر امیر خسرو کے ایک مشاہدے کا اضافہ کریں گے اس دور کے پھولوں کی درجہ بندی کرتے وقت امیر خسرو نے ان پھولوں کا ذکر کیا ہے جو بہت پیشتر ہندوستان میں ایران سے لائے گئے تھے مثلاً بنفشہ، یاسمین اور نسرین۔ دوسرے ایسے پھول جو ہندوستان میں ہی پیدا ہوتے تھے لیکن جنھیں غیر ملکی ناموں سے پکارا جاتا تھا مثلاً گل کوزہ، گل صد برگ۔ موخرالذکر پھولوں کو ہندوستانی ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنے مخالفین کو دعوت دی ہے کہ وہ ہندوستان سے باہر کسی بھی ملک میں ان پھولوں کا وجود ثابت کریں۔ ہندوستانی پھولوں میں اس نے چند دیگر پھولوں کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً بیلا، کروا، چمپا، مولسری، سیوتی، دونا، کرنا اور لونگ (جسے لوگ اس کے عربی نام قرن پھل سے جانتے تھے) ہم خسرو کی اس رائے سے متفق ہیں کہ اس سلسلے میں غیر ضروری انکسار سے ہندوستان کی شہرت کو نقصان پہنچا ہے کیوں کہ اگر شام یا یونان میں اس قسم کی دولت ہوتی تو وہ ساری دنیا میں اپنی شہرت و فخر کا اعلان کرتے پھرتے[۱] کسی گذشتہ باب میں ہم پھولوں اور باغات کا ذکر پہلے ہی کر چکے ہیں[۲]

۳۔ مادی آسائشیں

بابر نے جس آخری اور اہم ترین پہلو پر روشنی ڈالی ہے وہ ہم عصر ہندوستان کی

---

۱ پھولوں کے سلسلے میں مفصل بیان کے لیے دیکھیے دیول رانی ص ۱۲۹ - ۱۳۲

۲ امیر خسرو کے تم سے اودھ کے ایک باغ کا حال دیکھیے مرزا ص ۹۸ - ۹۹۔

مادّی آسائشوں اور سماجی آداب سے متعلق ہے۔ دہلی کے امرا اور سلاطین کے آرام و آسائش اور سماجی تفریحات کے بارے میں امیر خسرو، ضیاالدین برنی اور شمس سراج عفیف جیسے ہم عصر مورخین کی کتابوں اور مسالک الابصار اور ابنِ بطوطہ کے سفرنامے سے ایک رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم کسی دوسرے موقع پر بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ہم ہندو سماج اور مالوہ اور بنگال کی صوبائی حکومتوں سے چند مثالوں پر ہی اکتفا کریں گے۔ ان جملہ معاملات میں آسائش کا معیار سلاطینِ دہلی کے مقابلے میں قطعی طور پر کمتر تھا۔

متعدد مواقع پر ملک محمد جائسی نے ہندو آسائشوں کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ وہ سنگھل دیپ Simhala میں (جو دوآبہ کے لیے استعمال ہوا ہے جیسا کہ ہم دیباچہ میں ذکر کر چکے ہیں) پدماوت کے والد کے محلات کی منظر کشی کرتا ہے۔ شادی کے بعد ہیرو اور ہیروئن محل کے ایک کمرے میں شبِ عروسی گزارتے ہیں۔ اس پورے بیان میں ایک حقیقی ماحول نظروں کے سامنے آجاتا ہے جس سے خوش ذوقی اور شائستگی ظاہر ہوتی ہے اس میں ہمیں پتھر کے ستونوں پر تراشے گئے مجسموں کا ذکر ملتا ہے جن میں عوام کی روزانہ زندگی کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ایک عطر فروش اپنے ایک ہاتھ عطر فروخت کر رہا ہے اور دوسرے ہاتھ میں ایک سایہ دار مشعل لیے ہوئے ہے۔ دوسرے لوگ مشک، سندور، پان اور پھول وغیرہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی کارکردگی کامل اور غیر مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ کمرے کے وسط میں شادی شدہ جوڑے کا پلنگ ہے جس پر دُھنے ہوئے ریشم سے بھرے ہوئے تکیے لگے ہیں، ان پر پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ عروسی پلنگ کے گرد ستون ہیں اور ستونوں پر سیپی کے بنے ہوئے فتیلہ دار چراغ ہیں، ان پر سرخ رنگ کا سایہ ہے جس پر قیمتی پتھر لگے ہوئے ہیں۔ فرش پر بہت خوب صورت اور قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں[1] یہ منظر ہندو امرا کے گھروں سے متعلق ہے۔ دیگر مناظر کے لیے ہم بابر کی بیان کردہ گوالیار اور چندیری کی تفصیلات کی طرف رجوع کریں گے۔ مثال کے طور پر ہم دھولپور کے گرد باغات کے وسیع سلسلے کی طرف پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔ دھولپور کو جانے والے راستوں پر ان درختوں کا سایہ رہتا تھا۔

[1] دیکھیے پدماوت (ہندی)، ص ۱۳۱-۱۳۲- برائے تفصیلات۔

مالوے کے بارے میں جو تفصیلات ہمیں ملتی ہیں وہ نہ صرف آرام و آسائش اور عیش و عشرت ہی سے متعلق ہیں بلکہ ان میں بڑے اونچے درجے کی نفاست اور شائستگی بھی ہے۔ مثلاً تاریخ مظفر شاہی کی ان تفصیلات کو لیجیے جو مظفر شاہ کی مانڈو میں آمد پر موقع پر مانڈو کو آراستہ کرنے سے متعلق بیان کی ہیں۔ جملہ شاہی عمارات بڑی محنت سے آراستہ کی گئی تھیں۔ کچھ مقامات پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تخت بچھے تھے اور ان کے گرد مصنوعی باغات بلائے گئے تھے۔ ان باغات اور درختوں اور پھلوں کو دھات، ہیروں اور قیمتی پتھروں سے سجایا گیا تھا۔ شہر کو آراستہ کرنے کے لیے تربیت یافتہ ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ بازار کے دونوں طرف مومی درختوں کی سایہ دار قطاریں تھیں اور انھیں قیمتی ریشم میں عطر بسا کر آراستہ کیا گیا تھا۔ پورے راستے پر موسیقار اور رقاص مانڈو کے سلطان اور معزز مہمان گجرات کے سلطان کی شان میں قصیدے پڑھ کر لوگوں کو لطف اندوز کرتے تھے۔ چند مقامات پر حلوائی اور مٹھائیاں فروخت کرنے والے مہمانوں کو سونے کی پلیٹوں میں مٹھائیاں، شربت اور پان پیش کرتے تھے[۱] ان سرکاری تقاریب کے اہم خط و خال دہلی کی تقریبات کے خط و خال سے مشابہ تھے۔

آئیے کتاب نعمت خان ناصر شاہی کی ان تفصیلات کا تجزیہ بھی کر لیں جو غالباً مالوہ کے خلجی سلطان کے دور میں تصنیف ہوئی۔ اس کتاب میں ہمیں متعدد قسم کے مشروبات اشیاء آرائش اور کھانوں سے روشناس کرایا گیا ہے اور ان کے بنانے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی ہیں۔ شرابوں کے ذکر میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ایک ایسی شراب تیار کی جاتی تھی جس میں صندل، گلاب، زعفران اور کچھ عنبر وغیرہ کی خوشبو شامل ہوتی تھی[۲] سامان آرائش کا ذکر کرتے وقت صرف ابٹن یا جسم پر ملنے کے سفوف پر ہی اکتفا کیا گیا بلکہ بغل، سانس کی خوشبو اور دانت کے رنگ کے لیے استعمال کیے جانے والے مختلف سفوف کی جزویات بھی

---

[۱] تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ مظفر شاہی ص ۴۹ - ۵۰۔

[۲] کتاب نعمت خانہ ناصر شاہی ص ۱۷۷ - ۱۷۸۔

بیان کی گئی ہیں۔ سونگھنے کے سفوت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اور شکار کے انتظامات کا ذکر بڑی توجہ اور تفصیل سے کیا گیا ہے[1] کھانا پکانے کی ترکیبوں میں بے شمار اقسام بتائی گئی ہیں جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے بہترین قسم کے کھانے شامل ہیں۔ ہر قسم کے ایک ایک کھانے کی تیاری کے لیے الگ الگ کئی گئی ترکیبیں ہیں مختلف موسموں کے لیے بھی کھانے مختلف ہیں مثلاً برسات کے لیے، موسم سرما کے لیے اور موسم بہار کے لیے جب کہ ٹھنڈی اور تازگی بخش ہوائیں چلتی ہیں۔ ضیافتوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ دیگر مصروفیات میں جن پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی شکار اور پک نک تھے۔ یہ فہرست یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ بہت طویل ہے[2] کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں موجودہ دور کی سی نزاکت نہ تھی۔ کسی حد تک نمائش کا جذبہ بھی شامل تھا اور سونے کی نمائش کا شدید اور غیر ضروری جذبہ بھی تھا۔ لیکن بایں ہمہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان معاملات میں اس دور کے حالات کے پیش نظر بہت برتر تھا۔

ایک آخری مثال بنگال کی لیجیے۔ رزق اللہ مشتاقی کا بیان ہے کہ ہمایوں بنگال کے عیش و عشرت کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ مورخ کے مصورانہ الفاظ میں اسے اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ بنگال کے ہر گوشے میں ایک جنت ہے جس میں عیش و عشرت سے پُر محلات ہیں ان میں حوریں رہتی ہیں۔ ان محلات

---

[1] خوشبودار روغن اور سفوت کی تفصیلات کے لیے دیکھیے کتاب نعمت خانہ نامر شاہی ص ۱۴۱-۱۴۴۔ شکار کے انتظامات کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۱۵۲ - ۱۵۵۔ مولف نے مفصل ہدایات دی ہیں۔ اس کے مشورے کے مطابق شکار کے ساز و سامان میں دیگر اشیاء کے علاوہ ایک ہلکا رومال بھی ہونا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہوا کس سمت میں چل رہی ہے۔ لباس کا ایک خاص جوڑا، وقت معلوم کرنے کے لیے ایک اسطرلاب ایک سوزی نشانہ بازی کا سکان (جھونپڑا) اور حتیٰ کہ کچھ صندل اور کافور بھی ہونا ضروری ہے تاکہ موزے اور جوتے پہننے سے پیشتر پیروں پر ملا جا سکے اس نے رائے دی ہے کہ پسینہ کی بدبو سے محفوظ رہنے کے لیے کچھ کافور جوتوں میں بھی سی دینا چاہیے۔

[2] خصوصی کھانوں کی تعداد کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۱۵۶-۱۵۸۔

کے باغوں میں فوارے جاری تھے اور فرشوں پر قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ ان کے طاقچوں اور نعمت خانوں میں سنہرے کام کے جام خوشبو سے بھرے ہوئے رکھے رہتے تھے۔ عمارتوں کے ستون صندل کی لکڑی کے تھے۔ فرشوں پر چینی ٹائل لگا ہوا تھا۔ اسی طرح کے ٹائل کمروں کی دیواروں میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ محلوں کے کمروں کی آرائش کے لیے قیمتی فرنیچر اور بڑے شان دار پردے استعمال ہوتے تھے۔ باغ میں پھولوں کی کیاریاں اور آبپاشی کے لیے پتھر کی نہریں تھیں۔ جب ہمایوں کو ان عمارات میں سے ایک میں قیام کرنے کا موقع ملا تو پورے ماحول نے اسے اس قدر مسحور کیا کہ متواتر دو مہینے تک وہ عیش و عشرت میں غرق رہا۔ اس زمانے میں ایک شاہی دربار بھی منعقد نہ کیا۔[1] بابر کے بیٹے نے اپنے باپ کے مورخ اور اہل نظر ہونے کے بارے میں بڑی حقیر رائے قائم کی ہوگی۔

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے واقعات مشتاقی ص ۴۵۔

ضمیمہ الف

چند عام معلومات

اس ضمیمہ میں ہم سرسری طور پر چند حقائق پر غور کریں گے۔ مثلاً آبادی، سلطنت دہلی کا مرکز، وقت اور فاصلے کے پیمانے، سکّے اور اوزان۔ آخر میں اس دور کے چاندی کے سکے یعنی ٹنکہ کی جدید روپیے کے تناسب سے قیمت بھی دی جائے گی۔

۱۔ آبادی

زیر مطالعہ دور میں ہندوستان کی آبادی کے بارے میں کوئی واضح رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کی آبادی کے ترتیب وار اندراجات کسی بھی حکومت نے نہیں رکھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب محمد تغلق نے دہلی کی رعایا کو مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا تو اس نے محکمۂ انصاف کے افسران کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ دہلی کے مختلف حصّوں کی آبادی سے متعلق اعداد و شمار کی فہرستیں تیار کریں لیکن اس واحد کوشش سے متعلق کاغذات بھی آج کل نایاب ہیں۔ مزید یہ کہ ہم اس امر سے بھی لاعلم ہیں کہ کیا مالی امداد کے مواقع پر عام طور پر یہی طریقہ اپنایا جاتا تھا یا ایسے اقدامات دہلی سے باہر کے علاقوں میں بھی ہوتے تھے[1] سرکاری اعداد و شمار نہ ہونے کی صورت میں ہماری جملہ کوششیں محض قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔

---

[1] دیکھیے ابن بطوطہ کا بیان۔ کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۵۱۔

واقعہ نگاروں اور مورخین میں صرف ایک جامع التواریخ ایسی تصنیف ہے جس میں تجزیے کے طور پر کچھ اعداد و شمار دیے گئے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دی ہوئی معلومات بھی کسی دوسرے ذریعہ سے مہیا کی گئی ہیں[1]۔ مصنف کے اندازے کے مطابق سوالک کے علاقے ۱۲۵۰۰۰ "شہر" تھے۔ گجرات میں ۸۰۰۰۰، اور مالوہ میں ۴۹۳۰۰۰ گاؤں تھے[2]۔ لیکن مصنف نے علاقوں کو شہروں، قصبات اور دیہات میں تقسیم کرنے کے بعد یہ بتانے کی زحمت نہیں کی ہے کہ ان میں آبادی کا اوسط تناسب کیا تھا۔ جامع التواریخ کے اندازے کے مطابق مغربی ہندوستان میں دیہاتوں کی تعداد تقریباً دس لاکھ تک پہنچتی ہے۔ لیکن اگر ہم سوالک، گجرات اور مالوے کے علاقوں کو ہندوستان کے کل رقبہ کا ایک چوتھائی بھی تصور کریں اور بلاشبہ یہ علاقہ گھنا آباد بھی ہے تو اس طرح پورے ہندوستان میں دیہات کی تعداد چالیس لاکھ تک پہنچتی ہے اور یہ تعداد موجودہ برصغیر کے کل دیہاتوں کے شمار سے بہت زیادہ ہو جاتی ہے[3]۔ یہ اس قدر وسیع تعداد اس حد تک بعید از قیاس ہے کہ اسے مسترد کرنے میں کبھی دو رائے نہیں ہو سکتیں۔

بڑے شہروں کی آبادی کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود اور غیر مکمل ہیں۔ بنگال کے اہم شہر گوڑ (گورو) کی آبادی کا تخمینہ دو لاکھ افراد ہے[4]۔ اگر اس تخمینے کو صحیح تصور کر لیا جائے جو بعید از قیاس نہیں ہے تو دہلی کی آبادی کئی وجوہات کی بنا

---

[1] ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سوالک کا علاقہ گجرات اور مالوہ کے قریب وجوار میں تھا اور اس سے مراد غالباً وہ علاقہ تھا جسے آج کل راجپوتانہ کہتے ہیں۔ سوالک کی آبادی کے ہندسے (جس کا مطلب ہے سوا لاکھ) اس لفظ کے معنی سے اس قدر مشابہ ہیں جس سے کسی نہ کسی طرح کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ ملتا ہے جو گو کہ ایک بالکل خیالی بات ہے لیکن یہ قطعاً ناممکن بھی نہیں ہے۔

[2] دیکھیے ایلیٹ ص ۴۲۔۴۳

[3] دی انڈین ایربک ۱۹۳۱ء میں ہندوستان کے کل دیہاتوں کی تعداد (مع ہندوستانی ریاستوں کے) ۶۸۵۶۶۵ یا دس لاکھ سے کم ہی دی گئی ہے۔ دیکھیے انڈین ایربک سنہ ۱۹۳۱ء ص ۱۶۔

[4] باربوسہ جلد دوم ص ۲۴۶ (ضمیمہ)

ہند گوروسے بہت زیادہ تھی۔ اسی طرح ہم کھمبایت، ملتان، لاہور، آگرہ، پٹنہ جیسے ہندوستان کے بڑے شہروں اور متھرا، بنارس اور اجین جیسے مذہبی مرکزوں کی آبادی کے بارے میں بالکل تاریکی میں ہیں۔ حالاں کہ ان شہروں کی آبادی کافی تھی لیکن غالباً دہلی کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ شہری اور دیہی آبادیوں کے بارے میں ان دونوں تخمینوں سے ہمیں پورے ہندوستان کی آبادی کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ مورلینڈ صاحب کا خیال ہے کہ سنہ ۱۶۰۵ء کے ملتان سے مونگیر تک شمالی ہند کے میدانی علاقے کی آبادی تین کروڑ سے کافی زیادہ ہونی چاہیے اور ہو سکتا ہے کہ یہ آبادی چار کروڑ سے کچھ کم ہو۔ پورے ہندوستان کی آبادی کے سلسلے میں اس کا اندازہ دس کروڑ کے قریب ہے[1]

۲۔ مرکزی حکومت کا صدر مقام

سلطان سکندر لودی کے دور سے حکومت کا صدر مقام دہلی تھا۔ اس میں سے اس مختصر سے عرصے کو نکال دیجیے جب سلطان محمد تغلق نے دیوگیر کو دارالخلافہ بنایا اور اس کا نام دولت آباد رکھا۔ سنہ ۹۰۹ھ (یعنی ۱۵۰۳ء) میں سکندر لودی دہلی سے آگرے گیا اور اس وقت سے مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے زمانے تک آگرہ صدر مقام رہا۔ شاہ جہاں نے دہلی کو صدر مقام بنایا[2]

چوں کہ دہلی شمالی ہند میں تھا اس لیے غالباً سلطان محمد تغلق نے یہ محسوس کیا کہ ایسی حکومت کے لیے جو دکن تک وسیع ہو چکی تھی دہلی سے انتظام حکومت زیادہ بہتر نہ ہو سکے گا لہٰذا اس نے دہلی کی بہ نسبت زیادہ مرکزی اور زیادہ قابلِ رسائی دارالخلافہ تجویز کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی گئی تھی کہ وہ اجین کو دارالخلافہ بنائے کیوں کہ یہ شہر تاریخی حیثیت سے بھی مشہور تھا اور جغرافیائی لحاظ سے بھی موزوں تھا، لیکن اس نے اس تجویز کو کن بنیادوں پر مسترد کیا اس کی

---

[1] دیکھیے انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر از مورلینڈ ص ۲۲

[2] دیکھیے ظفر الوالہ جلد سوم ص ۸۵۳۔ نیز تھامس ص ۳۶۵۔

تفصیلات نہیں دی گئیں[1] بدقسمتی سے موزوں انتخاب کے باوجود دیوگیر کو دارالحکومت بنانے کا تجربہ ناکام رہا۔ سلطان نے دہلی کی پوری آبادی کو دیوگیر منتقل کیا اور پھر لوگوں کو دہلی واپس آنا پڑا۔ آخر کار پورے ہندوستان کی حکومت کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جا سکا اور سلطان محمد تغلق کے جانشینوں کو اپنے شمالی مقبوضات پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔

۲۔ وقت کے پیمانے

اگر وقتی طور پر کال اور کلپ کے فرضی پیمانوں کو نظرانداز کر دیا جائے تو ایک صدی سے کم وقت کا طویل ترین پیمانہ قرن ہوتا تھا جس کی مدت ۳۱ سال ہوتی تھی[2] قمری نظامِ تقویم جس کا آج کل بھی کافی رواج ہے، استعمال ہوتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو نظامِ تقویم کا زیادہ رواج تھا[3] ہندوؤں کے نہ صرف تہوار ہی بلکہ درحقیقت جملہ تقریبات چاند کے دنوں یا تتھی کے حساب سے مقرر کی جاتی تھیں۔ ہندوؤں کا ایک قمری مہینہ ۳۰ قمری دنوں پر مشتمل ہے اور پورے

---

[1] دیکھیے فرشتہ کا بیان تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۴۲

[2] برنی ص ۱۵۵۔ اسی طرح ہندو لوگ بھی وقت کے چھوٹے پیمانوں کی تقسیم بہت باریکی سے کرتے تھے۔ انھوں نے ایک پل کو ۶۰ چپیا اور ایک چپیا کو ۶۰ وسپیا میں تقسیم کیا تھا۔

[3] اس سلسلے میں یہ امر قابلِ غور ہے، گو کہ راورٹی اس رائے سے متفق ہے اور اس نے سرکاری ضروریات کے لیے ہندو مہینوں کے استعمال کا مشورہ دیا ہے۔ (دیکھیے حاشیہ ص ۷۴۸) لیکن اس نے جس طرح عبارت کو پڑھا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ راورٹی نے طبقاتِ ناصری کی عبارت کو ایک مقام پر اساڑھ (ہندو مہینہ) پڑھا ہے۔ طبقات کے برٹش میوزیم کے قلمی نسخہ (Add ۲۶۱۸۹) کی عبارت میں بغیر کسی علامت کے لفظ باہر دیا ہوا ہے (فولیو ۲۰۳) جسے فاضل مترجم نے آہار لکھا ہے اور اس سے نتیجہ اخذ کر کے اسے ہندو مہینہ سے متعلق کر دیا ہے۔ لیکن اس عبارت کو زیادہ آسانی سے بہار پڑھا جا سکتا ہے اور اس طرح لفظ وقت اساڑھ کے بجائے وقت بہار زیادہ مناسب ہے اور اول الذکر ایک واضح غلط تعبیر معلوم ہوتی ہے۔

چاند کے دن یا نئے چاند سے شروع ہوتا ہے۔ دو ہفتہ کا وہ عرصہ جس میں پورا چاند روشن رہتا ہے اُسے روشن پندھرواڑہ اور وہ عرصہ جس میں دو ہفتہ تاریکی رہتی ہے، تاریک پندھرواڑہ کہلاتا ہے۔ اس کے بر خلاف مسلمانوں کا سن ہجری گو کہ قمری حساب کے مطابق ہے لیکن اس میں مہینوں کا حساب چاند کی ۳۰ سالہ چکر کی رفتار کے مطابق مقرر کیا گیا ہے جس میں ۱۹ سال میں ہر سال ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے اور ۱۱ سال جن میں لوند کا مہینہ ہوتا ہے ہر سال ۳۵۵ دن کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے چاند کے اس چکر میں کل ۱۰۶۳۱ دن ہوتے ہیں اور ۲۹ جوبیسی سالوں اور ۲۹ دنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر سال میں ۱۲ مہینے ہوتے ہیں اور مہینوں میں یکے بعد دیگرے ۳۰ اور ۲۹ دن ہوتے ہیں۔ صرف لوند کے مہینے والے سالوں میں آخری مہینے ہمیشہ ۳۰ دن کے ہوتے ہیں۔ دوسرا، پانچواں، ساتواں، دسواں، ۱۳ واں ۱۶ واں، ۱۸ واں، ۲۱ واں، ۲۴ واں، اور ۲۹ واں سال لوند کے مہینوں والے سال کہلاتے ہیں ہجری مہینوں کو علم نجوم کے اصولوں کے مطابق ترتیب نہیں دیا گیا ہے۔ یہ مہینہ اس شام سے شروع ہوتا ہے جس وقت نیا چاند دکھائی دے۔ مہینے کے دنوں کی تعداد کا انحصار فضا کی حالت پر منحصر ہے اور یہ تعداد مختلف مقامات پر مختلف ہو سکتی ہے لیکن کسی بھی حالت میں ایک مہینے میں ۲۹ سے کم اور ۳۰ سے زیادہ دن نہیں ہوتے۔ ہندو اور مسلم مہینوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں[1]

ہندو مہینے	مسلم مہینے
۱۔ بیساکھ	۱۔ محرّم
۲۔ جیٹھ	۲۔ صفر
۳۔ اساڑھ	۳۔ ربیع الاوّل
۴۔ ساون	۴۔ ربیع الثانی
۵۔ بھدرا	۵۔ جمادی الاوّل
۶۔ اسون	۶۔ جمادی الثانی
۷۔ کارتک	۷۔ رجب

[1] دیکھیے Hind Mohammadan feasts از Ross تعارف ص ۱۱۵ فیر۔

۸۔	اگرہائن	۸۔	شعبان
۹۔	پوس	۹۔	رمضان
۱۰۔	ماگھ	۱۰۔	شوال
۱۱۔	پھاگن	۱۱۔	ذیقعدہ
۱۲۔	چیتر	۱۲۔	ذی الحجہ

پورے دن رات کو گھنٹوں میں تقسیم کرنے کے لیے آٹھ پہر (ایرانی پاس) میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہر پہر ہمارے آج کل کے وقت کے مطابق ۳ گھنٹے کا ہوتا تھا۔ آٹھ پہروں کو مزید ساٹھ گھڑیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور ہمارے حساب سے ہر گھڑی ۲۴ منٹ کے مساوی ہوتی تھی۔ گھڑی کو ساٹھ پلوں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور اس طرح ایک دن رات میں ۳۶۰۰ پل ہوتے تھے۔ پہر یا گھڑی کی صحیح مدت کا تعین علم نجوم کے اصولوں کے مطابق کیا جاتا تھا۔ اسس طرح نظام تقویم کی مدد سے صحیح وقت کا تعین کرنے میں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ بابر اور ابو الفضل نے اسس سلسلے میں مفصل رائیں ظاہر کی ہیں۔

وقت کے تعین کے لیے آبی گھنٹے اور بڑے شہروں میں وقت کا اعلان کرنے کے لیے گھڑیال یا گھنٹے بجائے جاتے تھے۔ اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں کئی بار آچکا ہے۔

۴۔ فاصلے کے پیمانے

فاصلے کا ایک عام پیمانہ کروہ (جو آج کل کوس کہلاتا ہے) تھا۔ یہ اصطلاح اکبر کے دور تک عموماً استعمال ہوتی رہی۔ ایک کروہ ہمارے موجودہ میل کے مطابق تقریباً دو میل کے برابر شمار کیا جاسکتا ہے[1] ڈاک کے ہرکاروں اور فوجی نقل وحمل کے انتظامی اعداد وشمار کی سہولت کے لیے کروہ کو مزید تین دھاون

---

[1] تزک بابری کے ترجمے میں دیکھیے اے۔ ایس۔ بیورج کی رائے۔ نیز آئین اکبری جلد اول ص ۵۹۷ جس میں پورے مسئلے پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

میں تقسیم کیا گیا تھا۔[1]

ہندوستانی گز کی تاریخ بڑی دل چسپ رہی ہے۔ گز کے مختلف پیمانے استعمال ہوتے تھے جو نہ صرف مختلف مقامات پر مختلف تھے بلکہ مختلف اشیا کے لیے بھی ان کی ناپ مختلف تھی۔ سلطان سکندر لودی نے سرکاری اعداد و شمار کے لیے یکساں ناپ کے گز کی ابتدا کی جو آج کل کی ناپ کے مطابق (ایک انچ کے $\frac{1}{8}$ ۴ ویں حصے کا اضافہ کرکے) ۳۰ انچ کا ہوتا تھا۔[2] اس طرح پیمائش کے لیے ہمارے موجودہ گز کا اس دور کے گز سے ۶ : ۵ کا تناسب تھا۔

۵۔ سکّے

اس دور کے سکوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی قیمت علامتی نہیں بلکہ مالی ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بعض مخصوص مواقع پر جنوبی ہند میں سناروں اور سونے چاندی کی تجارت کرنے والوں کو صحیح وزن اور اصل قیمت کے سکے ڈھالنے کا قانونی حق دے دیا جاتا تھا۔ حکومت اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ سکے کا وزن صحیح ہو اور اس میں ملاوٹ نہ کی جائے۔[3]

---

[1] دیکھیے ابن بطوطہ کی رائے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۲۔ نیز ایلیٹ اینڈ ڈاوسن جلد دوم ص ۵۸۷۔

[2] دیکھیے ایڈورڈ تھامس کی رائے ص ۳۷۱۔ تفصیلی بحث کے لیے آئینِ اکبری جلد اول ص ۲۹۶،۲۹۵ و تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۹۴ - ۳۹۵۔

[3] تھامس ص ۲۴۴۔ سلطان فیروز تغلق کے وزیر کی بہت دل چسپ کہانی کے لیے دیکھیے عفیف ص ۳۴۵ یہ وزیر خود ایک مجرم کو بری کرانے کا ذریعہ بنا جس پر سکوں میں ملاوٹ کرنے کا الزام تھا۔ وزیر نے سلطان کو بتایا کہ سلطان کے لیے سکے کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی ایک باپ کے لیے اپنی کنواری بیٹی کی۔ اگر اتفاق سے یا حقیقتاً یا کسی کینہ توزی کی بنا پر کسی کنواری لڑکی کے چال چلن پر شبہ ہو جائے، یا اس پر جھوٹا الزام لگایا جائے یا کسی بھی طرح وہ بدنام ہو جائے تو خواہ وہ حسن صورت اور حسن سیرت کے لحاظ سے کتنی بھی بلند ہو، اس سے شادی کرنے کے لیے کبھی بھی کوئی رضامند نہ ہوگا۔ خان جہاں نے مزید تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اسی طرح دھات کا خالص پن اور سکے کا صحیح وزن لوگوں کے لیے خود ایک سفارش ہے

سلطان علاؤالدین خلجی پہلا حکمراں تھا جس نے سکّوں کا وزن گھٹانے کی عملاً نمایاں کوشش کی۔ اس نے چاندی کے تنکوں کی قیمت کو ۱۷۵ گرین سے گھٹاکر ۱۴۰ گرین کرنے کا ارادہ کیا[۱] سلطان محمد تغلق کی علاتی سکّے چلانے کی واحد کوشش ناکام ہوئی۔ اس طرح یہ بات اصولی طور پر تسلیم کی جاسکتی ہے کہ سکّوں میں صحیح دھات استعمال ہوتی تھی اور ان کا وزن بھی مقرر ہوتا تھا۔

اس دور میں جن سکّوں کا سب سے پہلے ذکر ملتا ہے وہ دہلی وال (بیل اور گھوڑسوار) بل اینڈ ہارس مین کی ساخت کے ہیں[۲] یہ ضروری ہے کہ یہ سکّے اور بعد کے زمانے کے سکّے بالکل یکساں رہے ہوں لیکن ہمارے تانبے کے جیتل ہندو دور کے قدیم دہلی وال ہی کے سلسلے کی ایک کڑی تھے[۳] جیتل کا استعمال کافی زمانے تک رہا اس کے بعد سلطان بہلول لودی نے ان کی جگہ بہلولی کو رائج کیا۔ اس ارتقا کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ تانبے کے جیتل کی طرح چاندی کا تنکہ جسے سلطان التمش نے شروع کیا تھا ۱۷۵ گرین کا ہوتا تھا اور قدیم ہندو مالی نظام سے متعلق تھا۔ تنکہ بھی کافی زمانہ تک رائج رہا۔ اس کے بعد شیرشاہ اور اکبر کے دور میں روپیے کا رواج جسے آج کل بھی روپیہ کہتے ہیں۔ سونے کی مہروں کے بھی کچھ حوالے ملتے ہیں لیکن شاید یہ لین دین میں کام نہیں آتی تھیں اس لیے ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔

قدیم رواج کے مطابق مسلمان بھی چاندی کے سکّوں کو تانبے کے سکّوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ہندو لوگ گنتی کے لیے (چوتھائی شرح کے سکّے) quarternary کا طریقہ استعمال کرتے تھے۔ ۵ اور ۱۰ کی تعداد کا زیادہ رواج نہ تھا اور اعشاریہ کا طریقہ بالکل نا رائج تھا

---

[۱] دیکھیے تھامس ص ۱۵۸ - ۱۵۹ اور حاشیہ

[۲] دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد دوم ص ۱۴۴ تھامس ص ۴۷۔ ایلفنسٹن کی رائے ہے کہ قدیم مسلمان شہزادے خلفاء بغداد کے دینار اور درہم استعمال کرتے تھے اور انھیں سکّوں کے بدلے میں ترتیب وار تنکہ اور جیتل استعمال ہونے لگے۔ (ہسٹری ص ۴۷۹-۴۸۰)

[۳] امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد دوم ص ۱۴۴ - تھامس ص ۴۷

[۴] دیکھیے تھامس ص ۲۲۰۔

اس لیے سلاطین نے چاندی کے تنکے کو ۶۴ جیتل یا تانبے کی کنیوں یا آٹھ ہشت کنیوں میں تقسیم کیا (ہشت کنی ۸ جیتل کے برابر سکہ ہوتا تھا)[1] بہلول لودی نے بہلولی شروع کی جو شیر شاہ اور اکبر کے دام کی طرح تنکہ کا ۱/۴۰ واں حصہ شمار کیا جاتا تھا۔ سلطان سکندر لودی نے تانبے کا تنکہ شروع کیا جو چاندی کے سکّے کے بدلے میں ۲۰ ملتے تھے اور یہ سلسلہ بالکل اسی طرح چلتا رہا[2] یہ سکندری تنکہ یا دام کا دوگنا اکبر کے دام کا مورث اعلیٰ تھا[3] اگر تنکہ کی قیمت کو متعین تصور کر لیا جائے تو سکندری تنکہ کی قیمت ۲۰/۶۴ یا ۳۲۲ جیتل ہوتی ہے اور شیر شاہ اور اکبر کے دام یا بہلولی کی قیمت ۴۰/۶۴ یا ۱۶۶ جیتل ہوتی ہے۔

تانبے، چاندی اور سونے چاندی کی نسبتی قیمتیں بہر حال وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھیں شیر شاہ کے دور میں تانبے کی قیمت گر کر ۶۴ سے ۷۲:۱ ہوگئی۔ بعد کے دور کے لیے مورلینڈ کا بیان ہے کہ تانبے کی قیمت ۸۰ گجراتی پیسے سے بڑھ کر ۶۱۶ اور ۶۰ یا اس سے بھی کم سے ۱۶۲۷ تک پہنچ گئی جب کہ چاندی کی قیمت کم و بیش یکساں رہی

---

[1] مسالک الابصار کی رائے کے لیے دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد سوم ص ۵۸۲-۵۸۳۔ نیز ابن بطوطہ کی رائے کے لیے کتاب الرحلہ جلد دوم ص ۱۴۲۔ مسالک الابصار میں واضح طور پر کانی اور جیتل کی یکساں تفصیل دی ہے اور ۸ ہشت کانیوں کو ایک تنکے کے مساوی بتایا ہے۔ ابن بطوطہ نے ۸ درہموں کو دہلی کی ایک دینار کے مساوی قرار دیا ہے جو بالترتیب ہشت کنی تنکہ کے قائم مقام ہیں چاندی کے تنکے یا تنکہ سفیدہ کے برخلاف جیتل کا نام تنکہ سیاہ تھا۔ دیکھیے طبقات اکبری جلد اوّل ص ۱۹۹۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ فرشتہ (فارسی عبارت جلد اوّل ص ۱۹۹) کے یقین کے مطابق تنکہ پچاس جیتل کے مساوی ہوتا تھا۔ گو کہ اس نے قطعی طور پر تو کوئی بات نہیں کہی ہے لیکن یہ ضرور کہا ہے کہ لوگ ایک تنکے کے بدلے میں پچاس جیتل دیا کرتے تھے جس سے بہر حال تبادلہ کے معیار کا تعین نہیں ہوتا۔ ممکن ہے یہ معاملہ محض تبادلے کے مقامی حالات پر ہی منحصر ہو۔

[2] تھامس ص ۳۶۷

[3] ایضاً ص ۱۴۴

[4] امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد چہارم ص ۵۱۴

(علاوہ بنگال کے) شاہجہاں کے عہد کے آخری ایام تک یہ قیمت پھر حسب معمول اسی معیار پر آگئی[1] سونے چاندی کا تناسب جو ابتدائی دور میں ۱:۸ تھا اور علاؤالدین کے زمانے میں دکن کی فتح کے بعد ۱:۷ تک گرچکا تھا شیر شاہ کے دور تک ۱:۹،۴۴ ہو گیا[2] تانبے اور چاندی کی متعلقہ قیمتوں میں تدریجی تبدیلی کی وجہ سے شیر شاہ نے سکۂ رائج الوقت میں چند اصلاحات کیں۔ اس نے چاندی اور تانبے کی غیر معین ملاوٹ کو ختم کیا جس کا رواج اس سے پہلے دور میں تھا اور کمتر دھاتوں چاندی اور تانبے کی متعلقہ قیمتوں پر نظر ثانی کی اور اس میں ہم آہنگی پیدا کرکے پورے نظام کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ قدیم تنکہ کے مقابلے میں اس کا ۱۷۸ گرین وزن کا روپیہ ۳ گرین زیادہ تھا[3] اکبر کا روپیہ ½۱۷۲ گرین وزن کا تھا اور موجودہ روپیہ (جس کا وزن ۱۶۵ گرین خالص چاندی ہے) سے وزن میں مشابہ تھا[4] اسٹرلنگ کے مقابلے میں روپیہ کی حیثیت اب مستحکم ہو گئی ہے جو ایک شلنگ اور چھ پینس کے مساوی ہے[5]

۶۔ اوزان اور اعداد

اوزان کے معیار میں یکسانیت نہ تھی۔ قیمتی دھاتوں کے تاجر، غلہ فروش، عطر فروش، سب کے اوزان کے معیار جداگانہ تھے اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں بھی مختلف تھے۔ اس کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق اکبر کے زمانے سے پہلے سیر کا وزن کبھی ۱۸ دام، کبھی ۲۲ دام، کبھی ۲۸

---

[1] دیکھیے "فرام اکبر ٹو اورنگ زیب" از مورلینڈ ص ۱۸۲۔۱۸۵

[2] امپیریل گزیٹر آف انڈیا۔ جلد چہارم ص ۵۱۵

[3] شیر شاہ کی سکوں کے سلسلے میں اصطلاحات اور موجودہ طریقے سے اس کا تعلق دیکھیے ایضاً جلد اوّل ص ۱۴۵۔۱۴۶

[4] دیکھیے انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر از مورلینڈ ص ۵۵ و امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد ششم

[5] دیکھیے انڈین ایر بک سنہ ۱۹۳۱ء ص ۸۶۹

دام رہا اور جب ابوالفضل نے اسے تحریر کیا ہے تو اس وقت اس کا وزن ۳۰ دام تھا[1] بدنظمی کے ان حالات میں جب کسی عاقل حکمران نے وزن یا ناپ کے یکساں اور مساوی پیمانوں کی ابتدا کی تو اس اصلاح کو بڑی اہمیت دی گئی اور بھاٹوں اور شاعروں نے اس کی تعریف کی[2] سلاطین دہلی کے عہد میں سرکاری اوزان ۲۸ء۷۸ پونڈ Avoirdupois کا ایک من یا ہنڈرڈ ویٹ سے کچھ زیادہ یا غلہ کے پیمانے سے ذرا کم مقرر کیے گئے تھے[3] اسی کے مطابق سیر اور چھٹانک کا حساب لگایا جاسکتا ہے۔ یہ تخمینہ مسالک الابصار کے بیان اور ابن بطوطہ کی تصنیف کے فرنچ ایڈیشن کے اندراجات پر مبنی ہے۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا یہ تخمینہ کس حد تک اس سے پہلے اور بعد کے زمانے پر لاگو ہوسکتا ہے۔ اگر ہم اکبر کے دور کے لیے ابوالفضل کے اندراجات کو معیاری تسلیم کرلیں تو اس کے دور کا من (من = ۴۰ سیر) وزن میں ۲۸۳۷۲۵ گرین یا عملی ضرورت کے لیے ۵۵ پونڈ Avoirdupois یا ۶۵ پونڈ یا تقریباً آدھا کلوواٹ ہوتا تھا۔ اس طرح اکبر کے زمانے کے ۴۰ من ایک ٹن کے برابر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف آج کل عام استعمال میں ۲۷ من کا ایک ٹن ہوتا ہے[4]

---

[1] آئینِ اکبری جلد دوم ص ۶۰

[2] مارواڑ کی ۱۵ ویں صدی کی تاریخ سے ایک مثال کے لیے ملاحظہ ہو ٹوڈ جلد دوم ص ۹۴۶

[3] تھامس ص ۱۶۲

[4] دیکھیے انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر از مورلینڈ ص ۵۳۔ موجودہ معیاری من کا وزن ۲۸ء۸۲ پونڈ ہے (امپریل گزیٹر آف انڈیا جلد دوم ص ۱۳۷) اوزان کا موجودہ معیار جو عموماً پورے شمالی ہند میں اور بمبئی اور مدراس میں بہت کم استعمال ہوتا ہے مندرجہ ذیل ہے۔

ایک من = ۴۰ سیر اور ایک سیر = ۱۶ چھٹانک تک یا ۸۰ تولہ

نہ صرف مختلف اضلاع میں بلکہ مختلف دیہاتوں میں بھی سیر کا اصل وزن مختلف ہے لیکن معیاری طریقے کے مطابق ایک تولہ ۱۸۰ ٹرائے گرین (روپیہ اصل وزن) کے مساوی ہے اور اس طرح سیر کا وزن ۲۰۵ء۲ پونڈ ہوتا ہے اور من ۲۸ء۸۲ پونڈ کا۔ (دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا۔ تعارف ص ۱۳۷) اس طرح ایک سرسری جائزے کے مطابق زمانے کا ایک معیاری من اکبر کے دور کے آدھے من کے برابر تھا۔ اس طرح ہم اندازاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا من موجودہ من سے ۲۷:۴۰ کی نسبت کا تھا یا ہمارے من کا ۲/۳ گنا موجودہ من کے وزن کے مساوی ہوگا۔

محض برائے معلومات یہاں یہ ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ایک سو ہزار کا ایک لاکھ ہوتا ہے۔ دس لاکھ کا ایک ملین اور ۱۰ ملین کا ایک کروڑ ہوتا ہے۔

تنکہ کی قوتِ خرید اور آمدنی کا معیار

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اوسط آمدنی کا اندازہ لگانا مشکل امر ہے۔ اس مسئلہ کو بہتر طریقہ سے سمجھنے اور موازنہ کرنے کے لیے ہم کچھ اعداد و شمار کا سرسری طور پر اعادہ کریں گے۔ سلطان محمد تغلق اور فیروز تغلق کے غلاموں کے مشاہرے کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سلطان کے ملازمین کے لیے کم از کم مشاہرہ دس تنکہ ماہانہ تھا۔ سپاہی کی تنخواہ ــــــ ۱۹ تنکہ ماہانہ تھی۔ تاریخ داؤدی اور مسالک الابصار کی مہیا کردہ معلومات کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اوسط درجے کے ایک کنبہ کا خرچ ۵ تنکے ماہانہ ہوتا تھا۔ ظاہر ہے یہ تمام اعداد و شمار اندازاً اور تجرباتی ہیں اور ان میں مختلف سماجی طبقات کی آمدنی کے حیرت انگیز فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔

اسی طرح تنکہ کی اس دور کی قوت خرید کا تعین بھی مشکل امر ہے۔ ہم کسی دوسرے موقع پر ان مختلف عناصر کو بیان کر چکے ہیں جو بازار کی قیمتوں پر منفی اثر ڈالتے ہیں۔ مسٹر مورلینڈ نے اکبر کے دور کے روپے کی قیمت خرید کا جو حساب اندازاً پیش کیا ہے اُسے مدنظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا تنکہ اندازاً اکبر کے دور کے روپے سے دوگنا ہوتا تھا یعنی اکبر کے عہد میں چاندی کے ۱ روپیہ سے جس مقدار میں ضروریاتِ زندگی خریدی جا سکتی تھیں اس سے دگنی مقدار وہی اشیا تنکہ مہیا کرتا تھا[1] اس طرح ہمارا تنکہ جنگِ عظیم سے پہلے موجودہ روپیہ کے مقابلے میں ۱۲ گنی قیمت رکھتا تھا۔

---

[1] اس سلسلے میں چند حقائق کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ چاندی اور تانبے کے تناسب کا اندازہ ۱ : ۹۴ لگایا گیا ہے۔ اس طرح چاندی اور تانبے کی متعلقہ قیمت کے مطابق تنکہ کا وزن خالص چاندی کے ۱۷۵ اور ۱۷۹ گرین کے مابین رہا ہے۔ اکبر کا دام قیمت میں تنکہ کا ۱ ۲/۳ گنا ہوتا ہے یعنی اس کا تناسب ۵ : ۸ ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اکبر کا من وزن میں ہمارے من کا تقریباً دوگنا ہوتا تھا۔ سکندری گز کی ناپ اور اکبر کے گز کی ناپ میں بہت ہی معمولی یعنی مقابلۃً ۱/۳۳ انچ کا فرق تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق ایک خاندان کا اوسط ماہانہ خرچ زیادہ سے زیادہ ۵ تنکے تھا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(گذشتہ سے پیوستہ) اینٹ پاتھنے والے، بڑھئی، معمار، توڑے دار بندوق بنانے والے اور تیر انداز جیسے مزدوروں کی اجرت ۵ روپیہ اور ڈیڑھ روپیہ کے مابین دی گئی ہے (دیکھیے تھامس ص ۴۲۹ - ۴۳۰)

آئیے اکبر کے دور میں ضروریاتِ زندگی کی ضرورتوں کا موازنہ علاء الدین خلجی کے دور کی قیمتوں سے کریں جسے ہم نے نمونے کے طور پر معیار تسلیم کر لیا ہے۔ اکبر کے زمانے کی قیمتوں کو ہم نے جیتل میں ظاہر کیا ہے۔

اشیاء (قیمت فی من)	اکبر کے دور میں		علاؤالدین کے دور میں
	قیمت دام میں	قیمت جیتل میں	قیمت جیتل میں
۱- گیہوں	۱۲	۹ ۳/۵	۷ ۱/۲
۲- گیہوں کا آٹا	۲۲ سے ۱۵	۱۲	-
۳- جو	۸	۶ ۲/۵	۴
۴- چاول	۲۰	۱۶	۵
۵- دالیں	۱۸	۱۴ ۲/۵	-
۶- ماش	۱۶	۱۲ ۱/۵	۴
۷- نخود	۱۶ ۱/۲	۱۳ ۱/۵	۵
۸- مونٹھ	۱۲	۹ ۳/۵	۳
۹- جوار	۱۰	۸	-
۱۰- شکر (سفید)	۱۲۸	۱۰۲ ۲/۵	۱۰۰
۱۱- شکر (کچی)	۵۶	۴۴ ۴/۵	۲۰
۱۲- گھی	۱۰۵	۸۴	۱۶
۱۳- تیل	۸۰	۶۴	۱۳ ۳/۱۰
۱۴- نمک	۱۶	۱۲ ۴/۵	۵
۱۵- گوشت	۶۵	۵۲	۰
۱۶- بکری کا گوشت	۵۴	۴۳ ۱/۵	۱۰

ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مجموعی طور پر ہمارے زمانے کی قیمتوں اور اکبر کے دور کی قیمتوں میں ۱:۲ کی نسبت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(گذشتہ سے پیوستہ) ہے۔ مورلینڈ کے تخمینے کے مطابق عام ضروریات میں اکبر کے روپیہ کی قیمت خرید جنگ عظیم اول سے پہلے ۶ روپیہ کے برابر ہوگی یا بالفاظ دیگر ۵ روپے کی ماہانہ آمدنی اتنی ہی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچا سکی ہوگی جتنی سنہ ۱۹۱۲ء میں تیس روپے کی ماہانہ آمدنی (دیکھیے انڈیا اون دی ڈیتھ آف اکبر ص ۵۶) بالفاظ دیگر ہمارا اندازہ گمراہ کن نہیں ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ زیر مطالعہ دور کے ایک تنکے میں سنہ ۱۹۱۴ء سے پیشتر کے روپیے کے مقابلے میں ۱۲ گنی اشیا خریدی جا سکتی ہیں۔ بہرحال یہ حساب صرف اندازے پر مبنی ہے لیکن اس سے اس دور کے معاشی حالات کے بعض حقائق کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ضمیمہ ب

سلاطینِ دہلی کی ترتیب وار تاریخیں

(۱۲۰۰ تا ۱۵۵۶ عیسوی)

خاندانِ غلامان

ہجری		عیسوی
۶۰۲	قطب الدین ایبک	۱۲۰۶
۶۰۷	آرام شاہ	۱۲۱۰
۶۰۷	شمس الدین التمش	۱۲۱۰
۶۳۳	رکن الدین فیروز شاہ اوّل	۱۲۳۵
۶۳۴	رضیہ	۱۲۳۶
۶۳۷	معز الدین بہرام شاہ	۱۲۳۹
۶۳۹	علاء الدین مسعود شاہ	۱۲۴۱
۶۴۴	ناصر الدین محمود شاہ اوّل	۱۲۴۶

خاندانِ بلبن

۶۶۴	غیاث الدین بلبن	۱۲۶۵
۶۸۶	معز الدین کیقباد	۱۲۸۷

خلجی

ہجری		عیسوی
۶۸۹	جلال الدین فیروز شاہ دوم	۱۲۹۰
۶۹۵	رکن الدین ابراہیم شاہ اوّل	۱۲۹۵
۶۹۵	علاء الدین محمود شاہ اوّل	۱۲۹۵
۷۱۵	شہاب الدین عمر شاہ	۱۳۱۵
۷۱۶	قطب الدین مبارک شاہ اوّل	۱۳۱۶
۷۲۰	ناصر الدین خسرو شاہ	۱۳۲۰

تغلق خاندان

ہجری		عیسوی
۷۲۰	غیاث الدین تغلق شاہ اوّل	۱۳۲۰
۷۲۵	محمد دوم بن تغلق	۱۳۲۴
۷۵۲	فیروز شاہ سوم	۱۳۵۱
۷۹۰	غیاث الدین تغلق شاہ دوم	۱۳۸۸
۷۹۱	ابوبکر شاہ تغلق	۱۳۸۸
۷۹۲	محمد سوم تغلق	۱۳۸۹
۷۹۵	سکندر شاہ اوّل تغلق	۱۳۹۲
۷۹۵	محمود شاہ دوم تغلق	۱۳۹۲
۷۹۷	نصرت شاہ (درمیانی مدت)	۱۳۹۴
۸۰۲	محمود دوم تغلق (بحال شدہ)	۱۳۹۹
۸۱۵	دولت خاں لودی	۱۴۱۲

سیّد خاندان

ہجری		عیسوی
۸۱۷	خضر خاں	۱۴۱۴
۸۲۴	معز الدین مبارک شاہ دوم	۱۴۲۱
۸۳۷	محمود شاہ چہارم	۱۴۳۳

ہجری		عیسوی
۸۴۷	علاء الدین عالم شاہ	۱۴۴۳

لودی خاندان

ہجری		عیسوی
۸۵۵	بہلول لودی	۱۴۵۱
۸۹۴	سکندر دوم بن بہلول	۱۴۸۸
۹۲۳	ابراہیم دوم بن سکندر	۱۵۱۷

مغل خاندان

ہجری		عیسوی
۹۳۲	بابر	۱۵۲۶
۹۳۷	ہمایوں	۱۵۳۰

سور خاندان

ہجری		عیسوی
۹۴۶	شیر شاہ	۱۵۳۹
۹۵۲	اسلام شاہ	۱۵۴۵
۹۶۰	تین دیگر	۱۵۵۲

مغل خاندان

ہجری		عیسوی
۹۶۲	ہمایوں	۱۵۵۴
۹۶۳	اکبر	۱۵۵۶

الف

ب

پ

ت

ٹ

ج

چ

ح

خ

د

ذ

ر

ز

س

ش

ص

ض

ط

ظ

ع

غ

ف

ق

ک

گ

ل

م

اِصطلاحات

Abeyance	التوا
Abject	حقیر
Abominable	قبیح
Absolute	غیر محدود / مطلق العنان
Accession	فائز ہونا
Accession	معاون
Acclimaligation	آب و ہوا یا حالات کا عادی ہونا
Accredited	معتمد
Accretion	نشو و نما
Accumulate	ذخیرہ اندوزی
Adept	ماہر
Advent	ظہور، وقوع، تخت نشینی
Adversity	ادبار، مصیبت
Agnesticism	معصیت
Ambition	حبّ جاہ، غائیت
Antipodal	ضد
Arbitrary	بے قاعدہ
Armourer	اسلحہ ساز
Assignment	جاگیر
Assume	فرض کرنا، اختیار کرنا
Astrolabe	اسطرلاب
Attendent	خدمت گار
Attachment	تعلق
Backgammon	نرد
Background	پس منظر

Balance	توازن
Bard	بھاٹ
Barrier	رکاوٹ
Basic	بنیادی
Basis	اساس
Benevolent	رعایا پرور
Bequeath	وراثت
Bibliography	کتابیات
Blushing	شرمیلا
Boon companion	ہم مشرب
Bountiful	فیاض
Bounty	فیاضی
Breach	خلاف ورزی
Brocade	زربفت
Bulletin	اہم واقعات کی اطلاع یا خبرنامہ
Buffoons	مسخرہ
Bushel	غلہ کا پیمانہ
Cabinet	حجرہ، کمرہ
Calling	پیشہ
Callous	بے حس
Canonical	شرعی
Contempt	حقارت
Cash card	نقد نامہ
Canopy	سائبان
Candelabra	فرشی جھاڑ

Cap	کلاہ
Catalogue	فہرست کتب
Ceremony.	رسم
Ceremonial	رسمی
Chronometer	ٹھیک گھڑی
Characteristics	خصوصیات
Civil	معاشرتی
Classification	درجہ بندی
Clawn.	نقال
Clepsydra	آبی گھنٹہ
Compeer	ہم رتبہ
Conceit	خودرائی۔ خود بینی
Corporate	تخت نشینی۔ جماعتی
Costume.	لباس
Coterminous	لازم وملزوم۔ قریبی تعلق
Courtier	مصاحب، درباری
Covenant.	معاہدہ
Circumambulation	طواف
Cult	فرقہ۔ مسلک
Culture	تہذیب، زراعت، کاشت
Damsel	دوشیزہ
Debt	قرض
Decagonal	دس پہلو کا
Deceptive	پُر فریب
Defeatist	شکست پسندانہ

Deference	تعظیم
Defilement	بے ادبی
Deposed	معزول
Demand	مطالبہ، طلب
Demnable	ملعون
Demonstrative	مظاہر پرست
Demonstrative	ظہار پسند
Despotic	مطلق العنان
Detached view	غیر جانب دارانہ رویّہ
Device	تدبیر۔ ساحت
Diadem	شاہی کلاہ
Diameter	قطر
Dice	پانسے
Despot	مطلق العنان
Digression	انحراف
Digression	تجاوز
Diginities	وقار، مراتب
Dress of Honour	خلعتِ فاخرہ
Dimention	حجم
Discreet	برمحل، محتاط
Disembodie	غیر مادی
Dynasty	شاہی سلسلہ
Ebony	آبنوس
Edifics	عمارت
Emblem	نشان، علامت

Employment	پیشہ
Encircles	محصور کرنا
Endogamous	گوت یا شادی سے متعلق
Equipage	ساز و سامان
Equal	مساوی
Erotic	عاشقانہ
Etiquette	عوائدِ رسمیہ ۔ آدابِ مجلس ۔ درباری رسوم
Envoy	سفیر
Expectant	متوقع ۔ امیدوار
Expenditure	اخراجات
Expiatory	کفارہ دینے والے والی
Explain away	تاویل کرنا
Explore	کھوج لگانا
Expose	راز فاش کرنا
Explosive	بھک سے اڑ جانے والا
fabulous	ناقابلِ اعتبار حد تک زیادہ
Fanatical	متعصبانہ ، متشددانہ
Fanciful	خیالی
Fascination	دل کشی، سحر، جادو
Fauna and Flora	حیوانات و نباتات
Feat	کرتب
Fertile	زرخیز
Fertility	زرخیزی
Festoon	تورن
Fife	بانسری

Figurative	تمثیلی
Flat	بے لطف
Flageolent	نفیری
Foreign	غیر ملکی، بیگانہ
Formal	رسمی
Formative	تعمیری
Functionary	کارکن
Fosterpage	دایہ گیری
Grantee	مقطا
Grant	اِقطا
Gargentuan	دیو قامت
Gaudniness	نمائش، بھڑکیلا پن
Genealogy	نصب نامہ
Grandeur	عظمت۔ شان
Geographical	جغرافیائی
General oath	بیعتِ عام
Generic	جنسی/اصطلاحی
Gilded	سنہری
Ground Kissing Ceremony	شرط زمیں بوس
Glorious	شاندار
Growth	نشو و نما
Handmaid	کنیز
Harbenger	نقیب
Headgear	سر کا لباس
Hemp	حشیش

Hem	حاشیہ
Hereditary	موروثی
Heterodox	غیر مقلد ، آزاد خیال
Historical figure	تاریخی شخصیت
Hoarding	ذخیرہ اندوزی
Holocaust	قتلِ عام
Homougeneous	یکساں - ہم جنس
Humanity	انسانیت
Hypocrisy	ریاکاری
Ignorant	ناواقف ، لاعلم
Imaginative	تصوراتی
Inexo	ناقابلِ رسائی
Inexorable	بے رحم
Inevitabl	ناگزیر - لازمی
Immune	محفوظ
Index	اشاریہ - دلیل
Indigenous	دیسی
Indignant	برہم
Indispensible	ناگزیر
Indulgent	شفیق - بامروت
Industry	صنعت
Imports	درآمدات
Impor	اہمیت ، مفہوم
Intelligentsia	اہلِ سعادت ، اہلِ قلم
Intelligible	قابلِ فہم

Intercourse	آمدورفت
Interest	سود
Interest	سود، دل‌چسپی
Interference	دخل اندازی
Interpretation	ترجمانی
International	بین الاقوامی
Introduction	تعارف، تمہید، ابتدا
Ironically	طنزاً
Isolated	الگ، جداگانہ
Indifference	بے اعتنائی
Intercalary	لوند کا مہینہ
Jester	مسخرہ
Job-hunter	وقت پرست، خود غرض
Joint	مشترک
Joint family	مشترکہ کنبہ
Judicial functionary	قاضی، صدر
Julian	جولیس
Kindred	مشابہ، متعلق
Knight	سردار
Laity	عوام
Lapel	گریبان
Lemmergeyer	ریش دار کرگس
Levee	دربار شاہی
Liklihood	امکان
Limited	محدود

Lunar	قمری
Luxuries	تعیشات
Machination	ریشہ دوانی ، سازش
Magnanimous	عالی ظرف
Maintainer	کفیل
Manumit	آزاد کرنا
Mark	نشان ، علامت
Mass	وسعت ، انبار
Maid of honour	ملکہ کی مصاحب
Means	ذرائع
Menial	شاگرد پیشہ
Menu	فہرست طعام
Mercurial Treatment	پارہ آمیز دوا کے ذریعہ علاج
Metaphorical	استعاری
Misdemeanour	خفیف جرم
Misconstruction	غلط تعبیر
Monarchy	مطلق العنان حکومت
Money Considration	مال وزر کی اہمیت
Monopoly	اجارہ داری
Mythical	خرافاتی ، فرضی ، خیالی
Monument	نشانی ، یادگار
Nature	نوعیت
Necessities	ضروریات
Net	خالص
Negligible	برائے نام

Netch	طاقچہ
Noble	امیر
Nondescript	دوغلا
Non-recurring	غیر مسلسل، غیر مستقل
Nobodies	بے حقیقت
Nobility	طبقۂ امرا
Oath of allegiance	بیعت
Obeisance	کورنش
Observation	مشاہدہ
Observatory	رصدگاہ
Occult	پراسرار
Omnipotent	قادر مطلق / قاضی الحاجات
Ordeal	آزمائش، ابتلا
Oriental	مشرقی
Orientalist	مستشرق
Organisation	تنظیم
Orthodox	تقلید پسند
Ostentation	خود نمائی
Out cast	نیچ ذات
Out line	خاکہ
Out look	نظریہ
Overcoat	بالاپوش
Octagonal	ہشت پہلو
Pages	امرا کا کم عمر خدمت گار
Paradoxical	متناقضانہ

Paraphernalia	ساز و سامان
Parasol	چھتر
Passing-in	سرسری طور پر
Pattern	اعلیٰ نمونہ
Perdition	عذاب
Perpetual	ابدی
Personification	مجسم
Peninsula	جزیرہ نما
Petitioner	مذہبی / دادخواہ
Polostick	چوگان
Platitude	فرسودہ
Preceptor	معلم
Precept	قول، مقولہ
Predatory	سفاکانہ
Prejudicial	مضرت رساں
Preventive	دافع
Privilege	خصوصی حق
Primitive	قدیم
Production	پیداوار
Prosaic	فرسودہ
Prototype	اصل نمونہ
Profit	منافع
Puberty	بلوغت
Provision	قانونی گنجائش

Private	خانگی
Private	نجی
Pursuivant	عملہ
Qualification	وصف، شرط
Quadruple	چارتہی
Quarternary	سہ ماہی
Quantity	مقدار
Quiver	ترکش
Ransom	فدیہ
Ravage	انتقام
Reciprocal	دو طرفہ
Relic	یادگار، نشانی
Relish	چٹنی
Recluse	گوشہ نشین
Region	علاقہ
Remunerative.	نفع بخش
Repast.	طعام
Requisition	مطالبہ
Rhapsodical	پرجوش
Ritual	مذہبی رسم
Ridiculous	مضحکہ خیز
Rob of Honour	خلعت
Royal Baton	دورباش
Royal Standard	شاہی علم
Sartorial equipment.	لباس سے متعلق ساز و سامان

Salutation	سلامی
Scandal	شرمناک واقعہ
Seat	صدر مقام ، مرکز
Serf	رعیت ، غلام ،
Sketchy	مجمل
Sophistication	پُر تصنع ، سوفسطائی
Soldier	اہل تیغ
Sovereign	حاکم اعلیٰ
Standard	معیار
Standard	عَلَم
Standpoint	نقطۂ نظر
Stereotyped	غیر مبتدل ، رسمی
Staff	عصا
Stigma	بدنامی
Steward	شحنۂ بار (منتظم)
Striking	متاثر کن
Structure	ڈھانچہ
Stupefaction	مدہوش
Subservient	تابع
Subjection	محکومی
Supply	بہم رسانی ، سپلائی
Superstition	ضعیف الاعتقادی
Superimpose	اہمیت دینا
Successor	جانشین
Survivals	باقی ماندہ آثار

Survey	جائزہ
Suspended	معطل، معلق
Symmetry	موزونیت
Taboo	حرام
Teetotaler	تارکِ مسکرات ،منشیات سے پرہیز کرنے والا
Tentative	تجرباتی
Territory	حدود
Theologian	عالم دین
Tiara	دستار، کلاہ ، تاج
Toilet	سنگھار
Torpedo	تباہ کن
Transaction	لین دین
Tradition	روایت ، حدیث
Transient	عارضی ، ناپائیدار
Tragic	المناک
Trickster	شعبدہ باز، کرتب دکھانے والا
Triple Band	نوبت
Turn coat	غدار
Turkish origin	ترکی النسل
Tutelage	نگرانی
Unavoidable	ناگزیر
Undemocratic	غیر جمہوری
Unequivocal	واضح
Unhallowed	خبیث ، یکساں
Uniform	یکساں ، غیر متبدل

Universal	عالمگیر
Unqualified	غیر مشروط
Unsavoury	ناگوار
Utterance	تقریر
Value	قیمت
Token	علامتی قیمت
Intrinsic	ذاتی قیمت ، اصلی قیمت
Vanity	خود بینی
Vermillion	سیندور
Vicious	بدطینت
Vigourous	پرجوش
Virile	موثر
Vouch	مردانہ ، قوی
Value - token	علامتی قیمت
Vulture	کرگس
Wand	عصا
Want	احتیاج ، ضرورت
Watch post	حفاظتی چوکی
Wench	بازاری عورت
White ant	دیمک
Whiskers	گل مچھے
Wily	چالاک
Workout	حساب لگانا ، حل کرنا

ہندوستانی معاشرہ عہدِ وسطیٰ میں